JANUARY 2006

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

سال نو مبارک

پہلی شعاع — رضیہ جمیل — 10
حمد — آغا سہراب — 11
نعت — زہیر کنجاہی — 11
نبی کی باتیں — میاں عابد احمد — 12
صحابیات — سلیمان ندوی — 17

باتیں یادیں — بابر علی — 30
دستک — شاہین رشید — 24
شاعری — رشنا جلالی — 300
شعاع کے ساتھ — ادارہ — 304
سیر دو جہاں — سائرہ غلام نبی — 18

زرد موسم — راحت جبیں — 36

رنگ چاہت کے — نازیہ کنول — 94
دل نے دھوکا دیا — سدرہ سحر — 182
میرے چارہ گر — رخسانہ نگار — 256
چاک داماں کی خیر — زہیرہ ممتاز — 220

گھر تتلی کا پر — ثمرہ بخاری — 136
طلب کی تتلی — میمونہ خورشید — 56

وہم کا علاج — آمنہ مفتی — 128
روشن خیال — نعیمہ ناز — 84
برادر خوردار — ثروت نذیر — 116
بات تو سچ ہے مگر — ثمینہ عظمت — 214
تیری آنکھ میں — [illegible] — 242

گیت — میرا جی — 280
نظم — نذا فاضلی — 280
غزل — انشا جی — 279
نظم — فرزانہ سہیل — 279

خط آپ کے — رضیہ جمیل — 292
مسکراہٹیں — سائرہ غلام نبی — 281
آئینہ خانے میں — غزل قمر — 308
کھلا کسی پیر — خالدہ جیلانی — 289
باتوں سے خوشبو آئے — شگفتہ جاہ — 285
تاریخ کے جھروکے — امتہ الصبور — 316
موسم کے پکوان — خالدہ جیلانی — 312
خوبصورت بنیے — ادارہ — 320

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) — 500 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ — 3500 روپے

جنوری 2008
جلد 22 شمارہ 5
قیمت 35 روپے

پیارے نبی کی پیاری باتیں

میاں عابد احمد

عرب دور جاہلیت میں

دور جاہلیت میں عرب اپنی فطری صلاحیتوں اور بعض عادات و اخلاق میں تمام دنیا میں ممتاز تھے۔ فصاحت و بلاغت اور قادر الکلامی میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ آزادی و خودداری ان کو جان سے زیادہ عزیز تھی۔ شہسواری و شجاعت میں وہ بے بدل تھے۔ عقیدہ کے پرجوش صاف گو اور جری، حافظے کے قوی، مساوات، بے تکلفی اور جفاکشی کے عادی، ارادہ کے پکے، زبان کے سچے، وفاداری اور امانت داری میں ضرب المثل تھے۔

لیکن انبیاء اور ان کی تعلیمات سے دوری اور ایک جزیرہ نما میں صدیوں سے مقید رہنے کی وجہ سے اور باپ دادا کے دین اور قومی روایات پر سختی سے قائم ہونے کا سبب وہ دینی و اخلاقی حیثیت سے بہت گر چکے تھے۔ چھٹی صدی میں زوال اور انحطاط کے آخری نقطہ پر تھے۔ کھلی ہوئی بت پرستی میں مبتلا اور اس میں دنیا کے امام تھے۔ اخلاقی و اجتماعی امراض ان کے معاشرے کو گھن کی طرح کھا رہے تھے۔ مذہب کی اکثر خوبیوں سے وہ محروم اور جاہلیت کی زندگی کی بدترین خصوصیتوں میں مبتلا تھے۔

عرب میں ہر گھر کا بت جدا تھا جس کی گھر والے پرستش کرتے تھے۔ جب کوئی شخص سفر کا ارادہ کرتا تو روانگی کے وقت گھر پر اس کا آخری کام یہ ہوتا کہ اپنے بت کو حصول برکت کے لیے چھوتا اور جب سفر سے واپس آتا تو گھر پہنچ کر پہلا کام یہ کرتا کہ اپنے بت کو جا کر ہاتھ لگاتا۔

کسی نے تو ایک بت خانہ بنا رکھا تھا کسی نے بت تیار کر لیا تھا، جو بت خانہ نہیں بنا سکتا تھا یا بت نہیں تیار کر سکتا تھا وہ حرم کے سامنے ایک پتھر گاڑ دیتا یا حرم کے علاوہ جہاں بہتر سمجھتا پتھر گاڑ کر اس کے گرد اس شان سے طواف کرتا جس طرح بیت اللہ کے گرد طواف کیا جاتا ہے۔ ان پتھروں کو وہ انصاب کہا کرتے تھے اور اگر اچھی قسم کا پتھر مل جاتا تو وہ پہلے پتھر کو پھینک کر اس نئے پتھر کو لے لیتے اور اگر پتھر نہ پاتے تو مٹی کا ایک ڈھیر بناتے اور اس پر بکری کو لا کر دودھ دوہتے پھر اسی کا طواف کرتے۔

مشرکوں کا ہر زمانہ اور ہر ملک میں جو حال رہا ہے وہی حال عرب کا تھا۔ ان کے متعدد اور مختلف معبود تھے جن میں فرشتے، جن، ستارے سب شامل تھے۔ فرشتوں کے بارے میں ان کا یہ عقیدہ تھا کہ اللہ کی بیٹیاں ہیں، اس لیے ان سے شفاعت کے طلب گار ہوتے، ان کی پرستش کرتے اور ان کو وسیلہ بناتے، جنوں کو اللہ کا شریک کار سمجھتے، ان کی قدرت اور اثر اندازی پر ایمان رکھتے اور ان کی پرستش کرتے۔

اجتماعی اعتبار سے ان کے اندر بہت سی بیماریاں پائی جاتی تھیں۔ شراب عام طور سے پی جاتی تھی اور ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ شراب کی دکانیں عام تھیں اور علامت کے طور پر ان دکانوں پر جھنڈا لہراتا۔ جوا بہت بہادری اور فخر کی بات تھی اور اس میں شرکت نہ کرنا بزدلی کی علامت تھی۔ زمانہ جاہلیت میں ایک شخص اپنے گھربار کو داؤ پر رکھ دیتا۔ پھر حسرت سے اپنے گئے ہوئے مال کو دوسروں کے ہاتھ میں دیکھتا۔ اس سے نفرت اور دشمنی کی آگ بھڑکتی اور جنگوں کی نوبت آتی۔ حجاز کے عرب اور یہودی سودی لین دین اور سود در سود کا معاملہ کرتے۔ اس سلسلے میں بڑی بے رحمی اور سخت دلی کے مظاہرے ہوتے۔

عورت کے ساتھ ظلم و بدسلوکی عام طور سے روا سمجھی جاتی تھی۔ اس کے حقوق پامال کیے جاتے۔ اس کا مال مرد اپنا مال سمجھتے۔ وہ ترکہ اور میراث میں کچھ حصہ نہ پاتی۔ شوہر کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد اس کو اجازت نہیں تھی کہ اپنی پسند سے دوسرا نکاح کر سکے۔ دوسرے سامان اور حیوانات کی طرح وہ بھی وراثت میں منتقل ہوتی رہتی تھی۔ مرد تو اپنا پورا پورا حق وصول کر لیتا لیکن عورت اپنے حقوق سے مستفید نہیں ہو سکتی تھی۔ کھانے میں بہت سی ایسی چیزیں تھیں جو مردوں کے لیے خاص تھیں اور عورتیں ان سے محروم تھیں۔ لڑکیوں سے نفرت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ انہیں زندہ دفن کرنے کا بھی رواج تھا۔ بعض ننگ و عار کی بنا پر، بعض خرچ و مفلسی کے ڈر سے اولاد کو قتل کر دیتے۔ عرب کے بعض شرفا اور روسا ایسے موقعوں پر بچیوں کو خرید لیتے اور ان کی جان بچاتے۔ [illegible] کے ظہور کے وقت میں تین سو زندہ درگور ہونے والی لڑکیوں کو فدیہ دے کر بچا دیا تھا۔ بعض اوقات کسی سفر یا مشغولیت کی وجہ سے لڑکی سیانی ہو جاتی اور دفن کرنے کی نوبت نہ آتی۔ تو ظالم باپ دھوکہ دے کر اس کو لے جاتا اور بڑی بے دردی سے زندہ دفن کر دیتا۔ اسلام لانے کے بعد بعض عربوں نے اس سلسلے میں بڑے اندوہناک اور رقت انگیز واقعات بیان کیے ہیں۔

عرب کے سفاکانہ اعمال میں سب سے زیادہ بے رحمی و سنگدلی کا کام معصوم بچیوں کو مار ڈالنا اور لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینا تھا کیونکہ لڑکیاں شرم و عار کا باعث سمجھی جاتی تھیں۔

اہم خصوصیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کتاب (قرآن پاک) اس علانیہ دعوے کے ساتھ پیش کی کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو مجھ پر نازل ہوا ہے۔ اس کتاب کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو یقینی طور پر محسوس ہوتا ہے کہ اس میں کوئی آمیزش نہیں ہوئی ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کوئی قول بھی اس میں شامل نہیں ہے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کو اس سے بالکل الگ رکھا گیا ہے۔ بالکل کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات اور عربوں کی تاریخ اور زمانہ نزول قرآن میں پیش آنے والے واقعات کو اس میں کلام الٰہی کے ساتھ غلط ملط نہیں کر دیا گیا۔ یہ خالص کلام اللہ (WORD OF GOD) ہے۔ اس کے اندر اللہ کے سوا کسی دوسرے کا ایک لفظ بھی شامل نہیں ہوا ہے۔ اس کے الفاظ میں سے ایک لفظ بھی کم نہیں ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے جوں کا توں یہ ہمارے زمانے تک منتقل ہوا ہے۔ یہ کتاب جس وقت سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونی شروع ہوئی تھی اسی وقت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے لکھوانا شروع کر دیا تھا۔ جب کوئی وحی آتی اسی وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کسی کاتب کو بلاتے اور اسے لکھوا دیتے تھے۔ لکھنے کے بعد وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا جاتا تھا اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اطمینان کر لیتے تھے کہ کاتب نے اسے صحیح لکھا ہے تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے محفوظ جگہ رکھوا دیتے تھے۔ ہر نازل شدہ وحی کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کاتب کو یہ ہدایت بھی فرما دیتے تھے کہ اسے کس سورہ میں کس آیت سے پہلے اور کس کے بعد درج کیا جائے۔ اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پاک کو ترتیب بھی دیتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ تکمیل کو پہنچ گیا۔

پھر نماز کے متعلق آغاز اسلام ہی سے یہ ہدایت تھی کہ اس میں قرآن مجید پڑھا جائے، اس لیے صحابہ کرام اس کے نزول کے ساتھ ساتھ اس کو یاد کرتے جاتے تھے۔ بہت سے لوگوں نے اسے پورا یاد کر لیا اور ان سے بہت زیادہ بڑی تعداد ایسے صحابہ کی تھی،

جنھوں نے کم و بیش اس کے مختلف حصے اپنے حافظے میں محفوظ کر لیے تھے۔ ان کے علاوہ وہ متعدد صحابہؓ جو پڑھے لکھے تھے' قرآن کے مختلف حصوں کو بطور خود لکھ بھی رہے تھے۔ اس طرح قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہی میں محفوظ ہو چکا تھا۔

لیں یہ ایک ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ آج جو قرآن ہمارے پاس موجود ہے' یہ لفظ بہ لفظ وہی ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام اللہ کی حیثیت سے پیش فرمایا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے تمام حافظوں اور تمام تحریری نسخوں کو جمع کر کے اس کا ایک مکمل نسخہ کتابی صورت میں لکھوایا۔

حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اسی کی نقلیں سرکاری طور پر دنیائے اسلام کے مرکزی مقامات کو بھیجی گئیں۔ ان میں سے دو نقلیں آج بھی دنیا میں موجود ہیں۔ ایک استنبول میں دوسری تاشقند میں۔ جس کا جی چاہے قرآن مجید کا کوئی مطبوعہ نسخہ لے جا کر ان سے ملا لے۔ کوئی فرق نہ پائے گا اور فرق ہو کیسے سکتا ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر آج تک ہر پشت میں لاکھوں اور کروڑوں حافظ موجود رہے ہیں۔ ایک لفظ بھی اگر کوئی شخص بدلے تو یہ حفاظ اس کی غلطی پکڑ لیں گے۔ پچھلی صدی کے آخر میں جرمنی کی میونخ یونیورسٹی کے ایک انسٹی ٹیوٹ نے دنیائے اسلام کے مختلف حصوں سے ہر زمانے کے لکھے ہوئے قرآن مجید کے قلمی اور مطبوعہ بیالیس ہزار نسخے جمع کیے تھے۔ پچاس سال تک ان پر تحقیقی کام کیا گیا۔ آخر میں جو رپورٹ پیش کی گئی وہ یہ تھی کہ ان نسخوں میں کتابت کی غلطیوں کے سوا کوئی فرق نہیں ہے۔ حالانکہ یہ پہلی صدی ہجری سے چودھویں صدی تک کے نسخے تھے اور دنیا کے ہر حصے سے فراہم کیے گئے تھے۔ افسوس کہ دوسری جنگ عظیم میں جب جرمنی پر بمباری کی گئی تو وہ انسٹی ٹیوٹ تباہ ہو گیا لیکن اس کی تحقیقات کے نتائج دنیا سے ناپید نہیں ہوئے۔

ایک اور بات قرآن کے متعلق یہ بھی نگاہ میں رکھیے کہ جس زبان میں یہ نازل ہوا تھا' وہ ایک زندہ زبان ہے۔ عراق سے مراکو تک کروڑوں انسان آج بھی اسے مادری زبان کی حیثیت سے بولتے ہیں اور غیر عرب دنیا میں بھی کروڑوں افراد اسے پڑھتے اور پڑھاتے ہیں۔ عربی زبان کی گرامر' اس کی لغت' اس کے الفاظ کے تلفظ اور اس کے محاورے چودہ سو برس سے جوں کے توں قائم ہیں۔ آج ہر عربی داں اسے پڑھ کر اسی طرح سمجھ سکتا ہے جس طرح چودہ سو برس پہلے کے عرب سمجھتے تھے۔

یہ ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اہم خصوصیت جو ان کے سوا کسی نبی اور کسی پیشوائے مذہب کو حاصل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نوع انسانی کی ہدایت کے لیے جو کتاب ان پر نازل ہوئی تھی' وہ آج اپنی زبان میں جوں کی توں اصل الفاظ کے ساتھ بلا تغیر و تبدل موجود ہے۔

ارشادات رسول صلی اللہ علیہ وسلم

اللہ کا ہاتھ جماعت کے اوپر ہوتا ہے جو جماعت سے الگ ہو گا وہ آگ میں جا پڑے گا۔

بھائی سے مراد مسلمان بھائی ہے۔ ظالم کی مدد اس طرح کہ اسے ظلم سے روکا جائے۔

مظلوم کی بددعا سے ڈرو' اس لیے کہ اس کی بددعا اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے۔

انسان اپنے بھائی کے سبب بہت کچھ بن جاتا ہے۔ یعنی زیادہ لگتا ہے۔

اوپر والا (دینے والا) ہاتھ نیچے والے (لینے والے) ہاتھ سے بہتر ہے اور سب سے پہلے اسے دو جس کی تم پر ذمہ داری آتی ہے۔

بہترین کمائی کرنے والا وہ مزدور ہے جو نیک نیتی سے محنت کرے۔

جب تم میں سے کوئی کام کرے تو اسے پختہ طریقے سے انجام دے۔

اللہ کے نزدیک بہترین کام وہ ہے جس میں باقاعدگی ہو۔

کسی قوم کی زبان سیکھ لو' اس کے شر سے محفوظ ہو جاؤ گے۔

مومن وہ ہے جسے اپنی برائی سے افسوس ہو اور اپنی نیکی سے مسرت حاصل ہو۔

دو آدمیوں کا کھانا تین کے لیے اور تین کا کھانا چار کے لیے کافی ہوتا ہے۔

فراخی و خوش حالی کی امید رکھنا بھی عبادت ہے۔

انسان کے اسلام کا حسن یہ بھی ہے کہ وہ فضول باتوں کو چھوڑ دے۔

لوگوں کو تم دولت سے اپنا گرویدہ نہیں کر سکو گے' اس لیے انھیں اپنے اخلاق سے گرویدہ کرو۔

نعمتیں ایسی ہیں جن سے بہت سے لوگ محروم ہیں۔ صحت و فراغت۔

اگر تم بولنے کی بہترین صلاحیت کے مالک ہو تو ان صلاحیتوں کو اپنے اس بھائی کی ترجمانی میں صرف کرو جو گفتگو پر قادر نہیں تو یہ بھی صدقہ ہے۔

بھلائی تو بہت ہے مگر اسے کرنے والے بہت تھوڑے ہیں۔

نیک بخت وہ ہے جو دوسروں سے عبرت حاصل کرے۔

دل کا اندھا پن سب سے بڑا اندھا پن ہے۔

راستوں میں مت بیٹھو۔ اگر بیٹھنا ہی ہو تو پھر نظریں جھکا کر رکھو' سلام کا جواب دو' بھٹکے ہوئے کو راستہ دکھاؤ اور کمزور کی مدد کرو۔

اگر انسان کے پاس دو جنگل کی وادیاں بھی ہوں تو وہ تیسری وادی کا طلب گار بن جائے گا۔

جس کا کھانا بہت ہو' اس کی بیماری بہت ہو اور جس کی غذا کم ہو اس کی دوا کم ہو۔

دو چہروں والا (منافق) اللہ کے نزدیک کبھی معزز نہیں ہو سکتا۔

ایمان میں وہی کامل ترین ہے مومن' جو اخلاق میں سب سے بہتر ہے۔

مومن تو اپنے حسن اخلاق سے' روزہ دار اور نماز گزار کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔

زبان کی تیزی سے بڑھ کر انسان کو کوئی بری چیز نہیں دی گئی۔

دنیا اور اس کی زینت کے بارے میں فرمایا۔ موسم بہار جو کچھ اگاتا ہے' اس میں ایسے پودے بھی ہوتے ہیں جن کے کھانے سے جانوروں کے پیٹ پھول جاتے ہیں اور وہ مر جاتے ہیں۔

بحران کا شدت اختیار کرنا اس کا حل ہوتا ہے۔

مومن کی مثال شہد کی مکھی کی ہے جو پاکیزہ کھاتی ہے اور شہد کی شکل میں پاکیزہ کھلاتی ہے۔

عمل کا دار نیت پر ہے اور ہر شخص کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے نیت کی۔

جھوٹ کے ثبوت کے لیے یہ کافی ہے کہ انسان جو کچھ سنے اس کو بیان کرتا پھرے۔

جس نے لوگوں کو شکریہ ادا نہ کیا اس نے اللہ کا شکریہ بھی ادا نہ کیا۔

فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم

مشورہ کر لینے کے بعد کوئی انسان تباہ نہیں ہو گا۔

مجھے بلند اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا۔

متکبر کے ساتھ تکبر کرنا صدقہ ہے۔

چغل خور جنت میں داخل نہیں ہو گا۔

ہر نیکی صدقہ ہوتی ہے۔

انسان کا حسن اس کی زبان میں پوشیدہ ہے۔

دین اخلاص و خیر خواہی کا نام ہے۔

بھلائی کا راستہ بتانے والا اس کے کرنے والے کی طرح ہے۔

امیری دل کی امیری ہے۔

اور حیا بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے۔

www.paksociety.com

مانگنا ذلت ہے۔
اپنے بھائی کی مدد کرو وہ ظالم ہو یا مظلوم۔
ظلم قیامت کے دن تاریکی ہی تاریکی ہوگا۔
جس سے مشورہ لیا جاتا ہے وہ امین ہوتا ہے۔
مومن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔
طاقتور مومن کمزور مومن سے بہتر ہے۔
آدمی کی جنت اس کا گھر ہوتا ہے۔
ندامت بھی توبہ ہے۔
شر کا دامن چھوڑ دینا بھی صدقہ ہے۔

ایک اور امتحان سامنے آیا

بدر کا معرکہ ایثار اور جانبازی کا سب سے بڑا حیرت انگیز منظر اور ایک نیا امتحان بن کر سامنے آگیا تھا کیونکہ اس سے پہلے مکہ کا شاید ہی کوئی مسلمان ہوگا جو رضائے الٰہی کی خاطر ظلم و ستم کے دو پاٹوں کے درمیان گندم کی طرح پیسا نہ گیا ہو۔

اس جسمانی تشدد کے بعد ان پر دوسرا امتحان آیا اور یہ جان، کاروبار، تجارت، گھربار، اعزہ و اقربا اور وطن کی محبت سے دستبرداری اور سب علائق سے دامن جھاڑ کر مکہ کی سرزمین کو خیرباد کہنا اور مدینہ کی جانب ہجرت کرنا تھا۔

اور اب معرکہ بدر کی صورت میں ایک اور امتحان سامنے آیا۔

جو لوگ سچے مومن تھے انہوں نے فی الواقع سب کی آنکھوں کے سامنے ان تمام رشتوں کو کاٹ پھینکا جو اللہ کے دین کے ساتھ ان کے تعلق میں حائل ہوگئے۔

بھائی کے سامنے بھائی اور باپ کے سامنے اس کا بیٹا سینہ تان کر کھڑا تھا۔ جب دونوں فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہوئیں تو لوگوں کو نظر آیا کہ خود ان کے جگر کے ٹکڑے ان کے سامنے ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بیٹے (جو ابھی تک ایمان نہ لائے تھے) میدان جنگ میں بڑھے تو حضرت ابوبکرؓ ان کے مقابلے میں تلوار کھینچ کر نکلے۔ حضرت ابو عبیدہ نے اپنے باپ عبداللہ بن جراح کو قتل کیا۔ حضرت مصعب بن عمیر نے اپنے بھائی عبید بن عمیر کو قتل کیا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے ماموں عاص بن ہشام بن مغیرہ کو قتل کیا۔

حضرت عمرؓ نے اسیران جنگ کے معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے اور ہم میں سے ہر ایک اپنے رشتہ دار کو قتل کرے۔

قیامت کے دن

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا۔ اے آدم کے بیٹے! میں بیمار تھا تو نے میری عیادت نہیں کی۔ وہ کہے گا۔ اے پروردگار! میں تیری کیسے عیادت کرتا تو تو رب العالمین ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا تو نے اس کی عیادت نہیں کی کیا تو نہیں جانتا کہ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔ وہ کہے گا اے پروردگار! میں تجھے کیسے کھانا کھلاتا تو تو خود رب العالمین ہے۔ اللہ تعالیٰ جواب میں فرمائے گا۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا اور تو نے اس کو کھانا نہیں کھلایا۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اگر تو اس کو کھانا کھلاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔

اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے پانی مانگا تو نے مجھے پانی نہیں پلایا۔ وہ کہے گا۔ اے پروردگار! میں تجھے کیسے پانی پلاتا تو تو خود رب العالمین ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا تھا تو نے اس کو پانی نہیں پلایا۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اگر تو اس کو پانی پلاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔

ماڈل ____ عینی
ٹرانسپیرنسی ____ موسیٰ رضا
میک اپ ____ روز بیوٹی پارلر

صحابیات

سلیمان ندوی

حضرت خولہؓ بنت حکیم

نام و نسب: خولہ نام، ام شریک کنیت، قبیلہ سلیم سے تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خالہ ہوتی ہیں۔ نسب نامہ یہ ہے خولہ بنت حکیم بن امیہ بن حارثہ بن الاوقص بن مرہ بن ہلال بن فالج بن ذکوان بن ثعلبہ بن بہثہ بن سلیم۔

نکاح: حضرت عثمانؓ بن مظعون سے جو بڑے رتبہ کے صحابی تھے نکاح ہوا۔

عام حالات: مسلمان ہو کر مدینہ کو ہجرت کی۔ [illegible] عثمان بن مظعون نے وفات پائی تو حضرت خولہؓ نے دوسرا نکاح نہیں کیا، اکثر پریشان رہتی تھیں۔ صحیح بخاری میں روایت آئی ہے کہ انہوں نے اپنے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

فضل و کمال: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چند حدیثیں روایت کیں، راویان حدیث میں حضرت سعد ابن ابی وقاص، سعید بن مسیب، بشیر بن سعید، عروہ اور ربیع بن مالک داخل ہیں۔

اخلاق: اسد الغابہ میں ہے۔ ترجمہ "وہ ایک نیک بی بی تھیں۔" مسند میں ہے۔ ترجمہ: "یعنی دن کو روزہ رکھتی تھیں اور رات کو عبادت کرتی تھیں۔"

ابتدا میں زیور کا بڑا شوق تھا چنانچہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ اگر طائف فتح ہو تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کو فلاں عورت کا زیور دے دیجئے گا۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اگر خدا اس کی اجازت نہ دے تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں۔""

حضرت حمنہؓ بنت جحش

نام و نسب: حمنہ نام، حضرت زینبؓ کی ہمشیرہ ہیں۔ سلسلہ نسب اوپر گزر چکا ہے۔

نکاح: حضرت مصعبؓ بن عمیر سے نکاح ہوا۔

اسلام: اور ان ہی کے ساتھ دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں۔

عام حالات: مدینہ کی ہجرت کا شرف حاصل کیا اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کی عورتوں سے بیعت لی تو اس میں یہ بھی شامل ہوئیں۔ مسند ابن حنبل اور ابن سعد وغیرہ میں اکثر عورتوں کے تذکرہ میں لکھا ہے کانت من المبایعات اس سے یہی بیعت مراد ہے چنانچہ حضرت اسماء بنت یزید کے حالات میں ہم اس کا ذکر کر آئے ہیں۔

غزوات میں سے احد میں نمایاں شرکت کی، وہ پانی پلاتی تھیں اور زخمیوں کا علاج کرتی تھیں ان کے علاوہ اور عورتیں بھی یہ خدمت انجام دے رہی تھیں۔ چنانچہ رفیدہ اور ام کبشہ وغیرہ کی نسبت بھی اس قسم کی تصریحات موجود ہیں۔

اس واقعہ میں حضرت حمنہؓ کے شوہر حضرت مصعبؓ بن عمیر نے شہادت پائی جن کے بعد انہوں نے حضرت طلحہؓ سے جو کہ عشرہ مبشرہ میں سے تھے نکاح کیا۔

افک کے واقعہ میں منافقین کے ساتھ غلطی سے

جو مسلمان شریک ہوگئے تھے ان میں حضرت حسانؓ اور حضرت مسطحؓ کے ساتھ حضرت حمنہؓ بھی تھیں، چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے منقول ہے۔
ترجمہ: یعنی حضرت زینبؓ کی بہن حمنہ برابر میرے خلاف رہیں، یہاں تک کہ اور اصحاب افک کی طرح برباد ہوگئیں۔
فتح الباری میں ہے کہ حضرت حمنہؓ کے شریک ہونے کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عائشہؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں سے گرا کر حضرت زینبؓ (اپنی بہن) کو بلند کریں۔ لیکن تعجب ہے کہ خود حضرت زینبؓ نے اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا، چنانچہ اس کا تذکرہ ان کے حالات میں آچکا ہے۔
وفات: وفات کا سنہ صحیح طور پر معلوم نہیں، اتنا علم ہے کہ حضرت زینبؓ کی وفات تک زندہ تھیں، حضرت زینبؓ نے 20 ہجری میں وفات پائی ہے۔
اولاد: حضرت طلحہؓ سے حضرت حمنہؓ کے دو لڑکے پیدا ہوئے، محمد اور عمران، محمد کو سجاد کے لقب سے شہرت تھی۔

حضرت ام حرامؓ

نام و نسب: نام معلوم نہیں، ام حرام کنیت تھی، قبیلہ خزرج کے خاندان بنو نجار سے تھیں، سلسلہ نسب یہ ہے، ام حرام بنت ملحان بن خالد بن زید بن حرام بن جندب بن عامر بن غنم بن عدی بن نجار، والدہ کا نام ملیکہ تھا جو مالک بن عدی بن عمرو بن مالک بن نجار کی دختر تھیں، اس بنا پر ام حرام حضرت ام سلیمؓ کی بہن اور حضرت انسؓ کی خالہ ہوتی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ان کا کچھ رشتہ تھا۔
نکاح: عمرو بن قیس انصاری سے نکاح ہوا، لیکن جب انہوں نے احد میں شہادت پائی تو حضرت عبادہؓ بن صامت کے عقد نکاح میں آئیں، جو بڑے رتبہ کے صحابی تھے۔
عام حالات اور وفات: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی قبا کی طرف تشریف لے جاتے تو حضرت ام حرامؓ کے گھر آتے اور کھانا نوش فرماتے تھے، حجۃ الوداع کے بعد ایک روز آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور کھانا کھا کر آرام فرمایا چند لمحوں بعد آپ کو نیند آگئی لیکن تھوڑی دیر کے بعد مسکراتے ہوئے اٹھے اور فرمایا۔
"میں نے ایک خواب دیکھا ہے"، اور وہ یہ کہ میری امت کے کچھ لوگ سمندر میں غزوہ کے ارادے سے سوار ہیں۔ "حضرت ام حرامؓ نے کہا۔
"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کیجئے کہ میں بھی ان میں شامل ہوں۔" آپ نے دعا کی اور پھر آرام فرمایا، کچھ دیر کے بعد پھر مسکراتے ہوئے اٹھے اور اسی خواب کا اعادہ کیا، حضرت ام حرامؓ نے پھر اپنی شرکت کی درخواست کی دعا فرمانے کے لیے کہا۔
فرمایا۔ "تم پہلی جماعت کے ساتھ ہو۔" اس خواب کی تعبیر 28 ہجری میں پوری ہوئی۔
حضرت امیر معاویہؓ حضرت عمرؓ کی طرف سے شام کے حاکم تھے، انہوں نے متعدد بار جزائر پر حملہ کرنے کی خواہش ظاہر کی، لیکن حضرت عمرؓ نے اجازت نہیں دی، حضرت عثمانؓ کے زمانہ خلافت میں انہوں نے اپنا ارادہ [illegible] حملہ کرنے کے لیے ایک بیڑا تیار کیا۔ اس حملہ میں بہت سے صحابہ شریک تھے، حضرت ابوذرؓ، حضرت ابودرداؓ، حضرت عبادہؓ بن صامت، حضرت ام حرامؓ بھی ان ہی میں داخل تھیں، بیڑا حمص کے ساحل سے روانہ ہوا، اور قبرص فتح ہوگیا، واپسی میں حضرت ام حرامؓ سواری پر چڑھ رہی تھیں کہ نیچے گر پڑیں اور جاں بحق تسلیم ہوگئیں، لوگوں نے وہیں ان کو دفن کر دیا۔
اولاد: حضرت ام حرامؓ سے تین لڑکے پیدا ہوئے، پہلے شوہر سے قیس اور عبداللہ اور حضرت عبادہؓ سے محمد۔
فضل و کمال: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چند حدیثیں روایت کیں، راویوں میں حضرت عبادہؓ، حضرت انسؓ، عمرو بن اسود، عطاء بن یسار اور یعلی بن شداد بن اوس ہیں۔

بیٹھ کر سیرِ دو جہاں کرنا

غارِ حرا میں ایک رات

مصنف: مستنصر حسین تارڑ

تبصرہ: عامرہ غلام نبی

معروف سیاح و مصنف مستنصر حسین تارڑ نے یوں تو کئی سفر کیے اور انہیں قلم بند کیا۔ تارڑ نے اب کے جو سفر کیا، وہ غار حرا کے مقام تک تھا۔ اس مقدس مقام پر شب بسر کرنے کی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ عازم سفر ہوئے اور وہ ایک رات جو وہاں انہوں نے گزاری۔ اس رات کی کیفیات و احساسات کو انہوں نے "غار حرا میں ایک رات" کے عنوان سے محفوظ کر دیا ہے۔ الف لیلوی حسن بیان تارڑ کی [illegible] ہے جو انہوں نے اس ایک رات کو جاودانی [illegible] سے [illegible] بنا دیا کہ قاری کی توجہ مقام پر کتاب سے جدا نہیں ہو سکتی اور پھر وہ مقدس مقام اور اس کی فیوض و برکات کہ اس کی چاہ میں دنیا ایک طرف رہ جاتی ہے۔
اس کتاب میں اپنے سیاحتی دوروں اور پھر زیر تبصرہ کتاب کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں۔
"کئی لوگ پوچھتے ہیں، جاننا چاہتے ہیں کہ کیا میں سفر محض اس لیے اختیار کرتا ہوں کہ واپسی پر سفرنامہ لکھ سکوں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ میں نے زندگی کے بیشتر سفر ان زمانوں میں کیے جب میں واپسی پر کچھ بھی نہ لکھتا تھا۔ میں ایک ادیب نہ بھی ہوتا تو بھی اٹھتے ہی سفر کرتا چلنے کر میں نے سیکھے، کہ میرے لیے آوارگی جذبہ اول ہے اور اس کی روئیداد قلم بند کرتا ہوں تو لوگوں کو اپنے سفر میں شریک کرنے کے لیے اور اس سفر کو پھر سے زندہ کرنے کے لیے۔ گویا میں ایک اور سفر پر نکل جاتا ہوں اور یہاں ایک سفرنامہ نگار دوسرے مسافروں سے کہیں زیادہ بخت والا ہوجاتا ہے کہ وہ دوبارہ ان ہی کیفیتوں، مسرتوں، اذیتوں اور مشقتوں اور خوب صورتیوں میں سے گزرتا ہے۔ کچھ طور میں نے غار حرا میں تو صرف ایک شب بسر کی۔ جو سرسری دیکھا تھا اس کی تفصیل میں گیا جو ان دیکھا تھا وہ بھی اس شب کی تنہائی میں نظر آنے لگا۔ ایک شب کا ہیجان اور کیفیت سینکڑوں شبوں پر محیط ہوگئی تو گویا اب بھی اس لمحے جب کہ اس شب کو گزرے ہوئے ایک برس ہو چکا ہے۔ میں ہنوز غار حرا کی رات میں ہوں۔"
تارڑ صاحب نے بے شمار سفر کیے بے جواز بھی بے ارادہ بھی اور جو تازہ سفر درپیش تھا۔ اس کے حوالے سے ان کے احساسات عجیب ہو رہے تھے وہ ان کیفیات کو سمجھنے کی تگ و دو میں تھے۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں۔
"میں مخمصے میں پڑ گیا، بہت الجھ گیا۔ ہزاروں خواہشیں بے جواز ہوسکتی تھیں لیکن غار حرا میں رات بسر کرنے کی خواہش ہرگز بے جواز نہیں ہوسکتی تھی۔ جواز اگر میرے پاس نہ تھا تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا کہ جواز نہ تھا۔ وہ مقام بذات خود ایک جواز تھا اور اس نے میرے اندر یہ خواہش بھری تھی۔"
اور یہ خواہش دُور تو ہونے سے جاتی تھی۔
اور اب میں آپ کو دل کی اس بات میں شریک کرتا ہوں۔ جوں ہی جدہ ائیرپورٹ پر اترتا ہوں، پہلا قدم رکھتا ہے تو گویا ہو کلو میٹر دور جبل نور کے دامن میں جا قدم رکھتا ہے تو میرے پاؤں میں شدید خوف ایک

آکاس بیل کی مانند لپٹ گیا ہے۔ ان میں ڈر بھر گیا ہے ایسا ڈر جو رینگتا ہوا میرے پاؤں سے سر تا ناخنوں کے راستے میرے دل کے گرد تانے تک ایک آسیب کی مانند مسلط ہو جاتا ہے اور پھر اس ڈر سے سیاہ کونپلیں پھوٹتی ہیں اور بڑھتی جاتی دماغ کے ان خلیوں کے گرد پھیلتی جاتی ہیں، جن میں غار حرا میں ایک رات بسر کرنے کا خیال مقیم ہے۔"

* * *

ایک مبہم جو ڈر، خوف، وسوسہ ایسی پشت ڈال دینا ہے اور ارادے کی تکمیل کے لیے کمربستہ ہو جاتا ہے۔ مگر سیاح در حقیقت ایک روحانی سفر کی جستجو رکھتا تھا اور روح کی مسافرت اتنی آسان نہ ہو سکتی تھی۔

"میں یوں سمجھ لیجیے کہ جنہوں جیسے ہی قدم رکھتے ہی میں یکدم شدید طور پر یوں خوف زدہ ہو گیا کہ یہ میں کیا سوچتا رہا ہوں۔ یہ میں کیسے سوچ سکتا تھا کہ جہاں حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم راتیں بسر کرتے تھے۔ میں؟ ہے وہاں رات بسر کروں۔ جہاں جبرئیل امین بہ نفس نفیس اترے اور ہم کلام ہوئے... وہاں میں؟ جو قریب یا انسان گزر چکے کہ جو اب یا انسان اس روئے زمین پر موجود ہیں۔ ان سب نے جس کتاب میں شک نہیں اس پر سر جھکائے اور اس کتاب کا پہلا نازل ہونے والا حکم "اقرا" پڑھا اور پڑھتے ہیں تو جہاں وہ نازل ہوا اس مقام پر... جہاں جن پتھروں پر حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے پاؤں کا لمس ہوا۔ ان کے سانس ان پر تم ہوئے، جہاں وہ سوال کرتے تھے۔ ان کے ذہن میں جو سوال جنم لیتے تھے ان کے جواب چاہتے تھے۔ بیٹھتے تھے۔ سوتے تھے اور جاگتے تھے تو میں وہاں؟ یہ انسان یہ خبط، دیوانگی کی ہر سرحد عبور کر جاتی لیکن اس سرحد کے پار اگر یہ مقام ہو تو اس کی دیوانگی میں بھی خلل آ جائے گا... وہ رک جائے گا... ڈر جائے گا۔"

* * *

اور پھر یہ سفر شروع ہوا جس کی تیاری کچھ آسان نہ تھی دل و روح کی آمادگی کے ساتھ ساتھ اپنی توانائیاں جمع کرنا تھیں۔ اور تارڑ اس سفر کی راہ پر اپنا قدم رکھ چکے تھے پیچھے نہ ہٹنے کے لیے۔

دکانوں کی گنتی واپس جا چکی تھی۔ واپسی کے راستے مسدود ہو چکے تھے اور اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ آگے جایا جائے اور آگے جبل نور تھا۔ جس پر سائے طویل ہو رہے تھے۔ "دامن کی دکانوں سے آگے ایک پکی سڑک اور اتنی بلند ہوتی تھی کہیں وہ اوجھل جاتی تھی... کہیں سیمنٹ شدہ کچھ حصے پاؤں میں آتے تھے اور کہیں سنگ ریزے... چھوٹے پتھر اور روڑے... میں آہستہ آہستہ سانس سنبھالتا چڑھتا چلا جاتا تھا۔

یہ تو میں نے پہلے قدم سے ہی طے کر لیا تھا کہ میں بہت دھیرج اور اطمینان سے آہستہ آہستہ بڑھوں گا۔"

* * *

اور یہ کشمکش کہ لوٹا جائے یا اوپر بلندی کا سفر کیا جائے [illegible] مقام پر اگر آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے [illegible] نفسیرے تن بدن میں ایک عجب سا قدم کیا تھا۔ ایک چکر آیا۔ ایک بھنور سا اٹھا کہ آنکھوں کے سامنے دھندلاہٹ پھیلی کہ میں اس چٹان کو فورا" نہ تھام لیتا تو یقینا" گر جاتا۔ یہ کیا ہے؟ میں نے شدید خوف زدگی کا شکار ہو کر اپنے آپ سے پوچھا ایسا پہلے تو کبھی نہ ہوا تھا۔ کسی بھی بلندی پر شدید ترین حالت میں بھی یوں بے اختیار نہ ہوا تھا یہ کیا ہے؟ بلندی سے تمہاری عمر ہے اور تمہاری حماقت ہے۔ مجھے واقعی آج تک اس قسم کا بے جان کر دینے والا چکر نہیں آیا تھا۔

میں نے بہت سنجیدگی سے بہت ٹھنڈے دل سے غور کیا کہ اگر بدن کی یہی کیفیت رہی تو کیا لوٹ جانا مناسب نہ ہو گا۔ ابھی تو فرش نگاہ میں تھا اور عرش کہیں بلندی پر فائز تھا۔ میں نے سوچا چند قدم اور سہی۔ اتنا تردد کر کے آیا ہوں۔ اتنی تمنا لے کر آیا ہوں۔ ایک دھچکا لگے تو فرار کے راستے سوچنے لگا ہوں تو ایک

آخری کوشش تو کر دیکھوں۔ جیسے کہ کوئی جواری بازی قریب پا کر ایک کمال طور پر بڑھتے چکا کو اور ایک اور قدم بہر طور کوشش کر کے اٹھا لیتا ہے... میں حوصلہ ہارنے کو تھا کہ ایک اپاہج فقیر نے مجھے حوصلہ دے دیا۔"

* * *

نیت کی تھی ارادہ باندھا جا تھا۔ حوصلہ، لگن، شوق، جستجو ساتھ ساتھ تھی۔ مگر منزل۔ اس بارے میں دیکھیے۔ وہ کیا کہتے ہیں۔

"ویسے میں چڑھتا تو جاتا تھا لیکن سراسیمگی کے عالم میں پھونک پھونک کر قدم دھرتا تھا کہ کہیں میں عمر کے تابع ہو کر چکرا نہ جاؤں۔ لاچار نہ ہو جاؤں اور وہ مقام آ ہی گیا جو جبل نور کے دامن سے یوں دکھائی دیتا ہے جیسے یہی منزل ہو یہی آخری بلندی ہو۔ وہاں پہنچ کر کھلتا ہے کہ نہیں۔ ابھی تو منزل بلاو راست۔

اور منزل قریب تھی...

میں نے گویا کہ یہ آخری قدم ہو۔ جبل نور کی چوٹی پر ایستادہ چھپر تھے۔ تھا۔ جوں ہی چھپر تلے گیا تاریکی بڑھ گئی، وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ آسمان دکھائی نہ دیتا تھا کہ راستے میں چھپر حائل تھا۔"

* * *

اور پھر وہ منزل آ گئی۔ جس کی جستجو تھی...

"دوسری جانب سرنگ کے اختتام پر ایک ہلکی ملائم روشنی ظاہر ہو رہی تھی۔ جیسے سویر ہونے کو ہے اور وہ چار قدموں کے بعد میں سویر میں آ گیا۔ اور جب میں اس سویر میں آیا تو گویا آج تک کائنات بھر میں جتنی بھی سویریں آ چکی تھیں ان سب میں سے ممتاز ایک ایسی انوکھی سویر میں آیا کہ میرا اگلا قدم ایک صحن میں تھا۔ جو کہ غار حرا کا صحن تھا۔

غار حرا در اصل۔ لغوی معنوں میں ایک غار نہیں ہے۔

غاریں تو ایک خاص ہیئت ایک مخصوص شکل رکھتی ہیں اور صدیوں سے غاروں کے طور پر پہچانی جاتی ہیں۔ جیسے موہنجو داڑو کی خانقاہ کے کھنڈروں کے عین اوپر پہاڑوں میں ٹیکسلا کی وادی میں ایک واضح غار ہے جس میں ہزاروں چمگادڑیں قیام کرتی ہیں اور وہ غار جانے کہاں اختتام پذیر ہوتی ہے۔

یا فرانس اور اسپین کی غاریں ہیں، جن میں قدیم عہد کے انسان کے مصوری کے نمونے محفوظ ہیں۔

اصحاب کہف کی غار تھی۔

یہ غار تو غار نہ تھی۔ پچھلے زمانوں میں۔ شاید لاکھوں برس پہلے کے زمانوں میں کسی زلزلے کے نتیجے میں۔ کسی قدرتی آفت کے اتھل پتھل کے باعث جیسے یہاں تک آنے والی سرنگ وجود میں آئی تھی۔ تقریبا" ایسی چند بہت بڑی بڑی چٹانیں گریں۔ یا انہوں نے مقام چھوڑا اور جب وہ ساکت ہوئیں تو ان کے درمیان میں کچھ جگہ بن گئی۔ ایک کھوہ وجود میں آ گئی۔ بے ترتیبی سے اندھے سیدھے پڑے پتھروں اور چٹانوں میں ایک خلا سا پیدا ہوا۔ چنانچہ حرا کی پہاڑی کی ڈھلوان پر اس کھوہ نے جنم لیا۔ جسے ایک باقاعدہ غار نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے اندر اتھاہ تاریکی تھی۔

تو میں اس غار میں تھا جسے ایک شمع نے اجالا تھا۔

میں شعوری طور پر کوئی بھی کیفیت اپنے آپ پر طاری نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنے آپ کو آمادہ نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ جو کچھ ہونا ہے خود ہو اس میں میرا کچھ عمل دخل نہ ہو۔

میں اگرچہ ایک حالت سکون میں تھا۔ گہرے اطمینان میں تھا اور مسکراہٹ ابھی تک میرے لبوں سے رخصت نہ ہوئی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ عارضی ثابت ہوا۔ ایک دم مجھے اس ویران اور تاریک چٹانی آماجگاہ کے اندر پوری رات بسر کرنے کے خیال سے وحشت ہونے لگی۔ وہ ڈر پھر سے میرے اندر جڑیں پکڑنے لگا کہ اس مقام پر... جہاں حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کھڑے ہوا کرتے تھے۔ میں کھڑا ہوں۔ جہاں جبرئیل زمین پر آتے تھے۔ تو میں کیسے ایک رات یہاں "سہج" سکوں گا۔ میں ایک ڈرپوک شخص ہوں... مجھ

میں نہ وہ وابستگی ہے اور نہ اجالا جس کی روشنی میں مجھے یہاں سب کچھ دکھائی دیتا رہتا۔ میں تو اندھیروں میں بھٹکنے والا تھا' مجھے یہاں کچھ دکھائی نہ دے گا۔ یہ میرے بس کی بات نہ تھی بس...؟"

✩ ✩ ✩

غار حرا کی بناوٹ کے حوالے سے مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں۔

"حرا کی غار کمال کی پوشیدگی تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانوں سے بھی پہلے جو "حنیف" تھے... جو تلاش میں تھے۔ جستجو میں تھے۔ معاشرتی اور مروج مذہبی اقدار سے مطمئن نہ تھے۔ ایک بڑے آدرش کے تمنائی تھے تو وہ سب سے الگ ہو کر غور و فکر کی دنیا میں غرق ہونے کے لیے اگر اس بلند مقام میں پناہ لیتے ہیں تو یہ قابل فہم تھا۔ جبل نور کی چوٹی سے ذرا نیچے ایک عمیق ڈھلوان میں یا تھوڑی سی جگہ ہموار اور چند آڑی ترچھی چٹانیں منہدم حالت میں ایک دوسرے کے سہارے قائم اور ان میں ایک کھوہ۔ اس میں صرف اتنی گنجائش کہ ایک شخص اطمینان سے لیٹ سکے... بیٹھ سکے یا عبادت کر سکے...؟"

✩ ✩ ✩

تارڑ وہاں جا کر اپنی آنکھ ماضی کے دریچوں پر رکھ دیتے ہیں' جہاں تخیل کیا کچھ دیکھ رہا ہے اس کا بیان دیکھیے۔

"حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چوٹی پر نہیں۔ غار حرا تک پہنچنا ہوتا تھا۔ اس لیے غالب امکان یہی ہے کہ وہ اس مقام سے جہاں زائرین دائیں جانب مڑتے ہیں' وہ وہاں سے سیدھے بلندی کی جانب چڑھتے جاتے ہوں گے اور عین اس مقام پر جہاں میں بیٹھا تھا۔ اس تنگ سرنگ کے دہانے پر آ جاتے ہوں گے۔ چوٹی سے انہیں کچھ غرض نہ تھی۔

یہ محض حساب کتاب ہے کہ کوہ نوردی کے حساب سے... شاید یہ سراسر غلط ہے اور وہ کسی اور رخ سے آتے تھے لیکن سب اشارے سب گمان یہی گواہی دیتے ہیں کہ ادھر سے ہی آتے تھے اور اس سرنگ تک پہنچ کر جان لیتے تھے کہ غار اس کے پار ہے۔

یہاں پہنچ کر وہ اپنا سانس بھی درست کرتے ہوں گے... فوری طور پر سرنگ میں داخل نہیں ہو جاتے ہوں گے اور سانس درست کرنے کے لیے بھی یہی جگہ تھی یہ کھائی کے کنارے جہاں بنگالی کا چھپر تھا اور میں تھا۔

تو ان زمانوں میں نہ یہ چھپر تھا اور نہ میں تھا۔

اگر میں ہوتا... تو کیا ہوتا۔

اگرچہ میں کیسے ہو سکتا تھا... لیکن ہوتا تو کیا ہوتا۔"

✩ ✩ ✩

اس مقدس ترین مقام پر آنے کے بعد انہوں نے کیا کیا۔ اس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

"غار میں داخل ہو گیا تو کچھ دیر کھڑا رہا۔ سر جھکا رہا ... تھا تو ... کیا کروں۔ حرا کی غار کے ہر پتھر ہر مسام اور ہر ابھار کو چوموں کہ وہاں تو ان کے لمس تھے۔ ان کے مس سرایت ہو چکے تھے اور ان سانسوں کی پھوار اپنے گالوں پر نمی چھوڑ کے محسوس کروں۔ کیا کروں... بہت سے لوگ ہاتھوں میں کیلکولیٹر لیے پھرتے ہیں... اس مقام پر ایک نماز پڑھنے سے چالیس ہزار نمازوں کا ثواب ہو گا۔ یہاں دو نفل پڑھ لینے سے جنت کے محلوں میں جگہ مل جائے گی۔ ایسے لوگ جو مجھ سے برتر... عقیدے میں مجھ سے بڑھ کر پختگی رکھتے ہیں۔ میں ذرہ بھر گنجائش شک کی نہیں رکھتے جن کا روز حشر کچھ حساب کتاب نہ ہو گا اور میرے تو رجسٹر کے رجسٹر کھل جائیں گے اور کوئی بھی بڑے سے بڑا چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ان میں سے میری بخشش کا کوئی ایک جواز بھی تلاش نہ کر پائے گا۔ میں تو شروع سے ہی حساب کے پرچے میں رعایتی نمبروں سے پاس ہونے والا تھا تو یہاں بھی کچھ حساب کرتا۔ کتاب کرتا۔ میرے بس میں نہ تھا کہ میں بابا کے گھر میں پہنچ کر اپنے نامہ اعمال میں نوافل اور نمازوں کے طویل اندراج کر لیتا۔ چنانچہ میں نے یہ پرچہ جو میرے بس میں نہ تھا خالی چھوڑ دیا۔ غار میں داخل ہوا تو سمٹنے پر چوکڑی مار کر بیٹھ گیا۔ دو نفل اور ادا کر لوں۔ وہ بھی کر لیے۔ تو اب کیا کروں۔ اب میں لیٹ گیا۔"

✩ ✩ ✩

غار حرا وہ مقدس مقام ہے۔ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کی یاد میں' عبادت میں وقت گزارتے تھے۔ تارڑ نے وہ ایک رات وہاں گزاری اور رات کے ایک حصے میں کیا کچھ سوچا۔

"یہ جو ربط ہے میری تمناؤں کا اس غار سے اس کے صحن سے۔ ہر ایک پتھر سے اس میں دراڑ آ جائے گی۔ اس لیے کیا یہ غار چاندنی کے تماشائی بنے لیے ہے۔ اگر کوئی عرضی پیش کرنی ہے تو ابھی کر دو۔ کچھ مانگنا ہے تو اس کا وقت ہے۔ اگر کچھ پڑھنا ہے تو تماشائی ... کا یہ تحیر زائل ہو جائے گا۔ یکسوئی بکھر جائے گی۔ اگر کوئی آ جاتا ہے تو تم اس سے یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ تم یہاں نہیں آ سکتے بھائی صاحب۔ یہ میری غار ہے۔ اس میں میں نے اپنا گھر بنا رکھا ہے۔ میں یہاں رہتا ہوں۔ تم نہیں آ سکتے۔ یہ نہیں کہہ سکتے۔"

✩ ✩ ✩

ان لمحات میں ان کے دل کی کیا کیفیات تھیں؟ اس کے بارے میں وہ کہتے ہیں۔

"مسلسل نوافل' دعاؤں اور التجاؤں کے ساتھ میں باتیں بھی کرتا جاتا تھا۔ جی ہاں میں غار حرا میں بہت مغلوب ہو کر اپنی آنکھوں سے گرنے والے آنسوؤں کو سنبھالتا نہ تھا بلکہ بڑے اطمینان سے زیر لب بڑبڑاتا باتیں بھی کرتا چلا جاتا تھا۔ مجھے عربی میں تو کچھ یاد نہ تھا۔ تو بھی اردو میں اہل دل کی مانند لب ہلاتے یہ خیال کرتا کہ میاں جی جو... سمجھ لیں گے تو ... اپنی نظر کو ٹھہرائے رکھتا۔ ہاں اور کبھی انگریزی میں جو کچھ سوجھتا اور آخر پنجابی میں کہ اس نے جتنے بھی پیغمبر اتارے انہوں نے اپنی مادری زبان میں ہی اس کے پیغام دیے۔ چنانچہ جو کچھ بھی... اور جس زبان میں بھی مجھے سوجھتا تھا کہے چلا جاتا تھا... باتیں کیے جاتا تھا۔"

✩ ✩ ✩

اور پھر اس مقدس مقام سے واپسی کا سفر شروع ہوا۔

"مجھے یوں نفل ادا کرنے کی عادت ہی نہ تھی کہ پشت پر آوازوں کا شور ہو۔ منتظر لوگ ہوں جن کی بے چین آنکھیں میرے کندھوں کو چاٹتی ہوں۔ ایک ہجوم ہو... میں نے اس مقام پر ٹھہرنے کے بہت بہانے بنائے۔ آہستہ آہستہ ایک ایک لفظ الگ الگ کر کے پڑھتا کہ کچھ وقت لگے... سجدے میں گیا تو گیا ہی رہا' سلام پھیرنے کے بعد ہاتھ دعا میں اٹھائے تو غار حرا کے آخر میں جو شگاف تھا' جس میں سے ہلکی نامعلوم سی روشنی آ رہی تھی اسے تکتا رہا۔ دعا کے بعد میں نے اس پاس کے پتھروں پر ہاتھ پھیرے... انہیں الوداع کہا۔"

✩ ✩ ✩

اس کتاب کا آخری پیراگراف جو اس سفر کا اختتام بھی ہے۔

"نور کے پہاڑ سے اترتے ہوئے... میرا قیمتی تھیلا خالی ہو چکا تھا۔ بابا کی مانند میری پوٹلی میں جو خوراک تھی وہ میرے کام آ چکی تھی۔ کھجوریں' جالی دودھ' سینڈوچ اور ایک سیب اور میں بھی ہلکا پھلکا اور پرسکون ہو چکا تھا۔ کوئی تھکاوٹ نہ تھی جیسے ایک موسیٰ کوہ طور سے اترتے ہوئے سکون اور سرخوشی میں ہوتا ہے۔ ایسے میں جبل نور سے اس سویر اتر رہا تھا۔"

کھٹک کھٹک دستک

شاہین رشید

عثمان وڑائچ (ایف ایم 103 کے پریزینٹر)

"کیسے ہیں عثمان! کیا مصروفیات ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔ ایف ایم 103 کا پریزینٹر ہوں اور جیسا کہ میں نے آپ کو پہلے بتایا تھا کہ ایک انٹرنیشنل کال سینٹر میں سپروائزر ہوں۔"

"پریزینٹر بننے کا خیال کیسے آیا؟"

"ہمارے کالج میں ایک نوٹس لگا تھا کہ پریزینٹر کی ضرورت ہے۔ اس نوٹس کو پڑھ کر ہی ریڈیو اسٹیشن گیا تو معلوم ہوا کہ اس کام کے لیے ایک عدد آڈیشن کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے آڈیشن دیا اور اس کے بعد اپنا "سی وی" دیا لیکن وہاں پر اسٹیشن ڈائریکٹر "نوید وڑائچ" صاحب سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ ان سے تو ہمارے بہت اچھے فیملی تعلقات ہیں کیونکہ وہ بھی وڑائچ تھے اور میں بھی تو انہوں نے میری بہت مدد کی ایف ایم 103 میں آنے کے لیے۔ یوں سمجھیے کہ نوید وڑائچ کی وجہ سے ہی اس فیلڈ میں آیا۔"

"پہلے پروگرام کے وقت کیا محسوس کر رہے تھے اور کیا اسکرپٹ لکھ کر کیا تھا؟"

"میرا پہلا شو کمبائنڈ شو تھا اور میرے ساتھ لاہور کا ایک پریزینٹر تھا اس وقت [illegible] قسم کا کوئی اسکرپٹ نہیں تھا بلکہ لائیو [illegible] اور ایک بات آپ کو بتاؤں احساسات کیا ہونے تھے کیونکہ اس شو میں کچھ بھی نہیں تھا اور اس پہلے شو کے بعد مجھے دوسرا شو ملنے کی کوئی امید بھی نہیں تھی۔ لیکن مجھے دوبارہ چانس ملا اور پھر میں نے اپنے آپ کو منوایا بھی۔"

"کتنے سال ہو گئے آپ کو اس فیلڈ میں۔ اور کتنے دن چلتا ہے آپ کا پروگرام؟"

"تقریباً تین سال سے میں اس فیلڈ میں ہوں۔ پہلے تو میں 103 میں سات دن مسلسل کرتا تھا لیکن میری مصروفیات کچھ اس طرح کی تھیں کہ پھر مجھے ویک اینڈ پر شو کرنا پڑے۔ تو میں سنڈے نائٹ کو شو کرتا ہوں رات بارہ سے دو بجے تک۔ "مڈنائٹ چیٹ" کے نام سے۔"

"تو کن مصروفیات کی وجہ سے آپ نے ایسا کیا؟"

"مصروفیات کچھ یوں تھیں کہ لاہور میں جاب کرتا تھا اور مجھے فیصل آباد سے لاہور جانا پڑتا تھا اس لیے میں سنڈے نائٹ کو ہی شو کر سکتا تھا اس لیے فی الحال ایک ہی شو کر رہا ہوں۔"

"فیصل آباد سے لاہور اور لاہور سے فیصل آباد خاصا فاصلہ ہے۔ اور راستے میں اور کوئی تنگ کرے نہ کرے، پولیس ضرور تنگ کرتی ہے۔ آپ کے ساتھ ایسا کچھ ہوا؟"

"ایسا بہت دفعہ ہو چکا ہے۔ پولیس سے پالا پڑتا رہتا ہے اور میں اپنے پروگرام میں بھی اس کو ڈسکس کرتا رہتا ہوں۔ پولیس بہت اچھی ہوا کرتی تھی لیکن اب پولیس کو دیکھ کر غصہ آتا ہے کیونکہ پولیس کا رویہ اس طرح ہوتا ہے کہ جب تک انہیں کچھ دیں گے نہیں وہ ہماری جان نہیں چھوڑیں گے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ پورے ملک کی پولیس ہی کرپٹ ہے۔"

"جی ہاں بالکل اور میں نے اپنے پروگرام میں خاص طور پر کراچی کا ذکر کیا تھا کہ میرے ایک دوست کراچی [illegible] کراچی کی پولیس اتنی ایماندار ہے کہ اگر انہیں 100 روپے دو تو انہوں نے 90 روپے فولڈ کر کے رکھے ہوتے ہیں جو وہ آپ کو واپس کر دیتے ہیں۔"

"آپ کے دوست نے غلط کہا ہے کراچی کی پولیس اب اتنی بھی ایماندار نہیں ہے۔ خیر اتنا کماتے ہیں خرچ بھی اسی طرح کرتے ہیں کیا؟"

"خرچ کرتا نہیں ہوں۔ میں بہت سوچ سمجھ کر خرچ کرتا ہوں۔ اپنی کمائی کو فضول خرچی میں نہیں اڑاتا۔"

"سفر کے دوران کوفت کب ہوتی ہے؟"

"جب سگنل پر کھڑے ہونا پڑتا ہے۔ بندہ بڑی جلدی میں جا رہا ہوتا ہے کہ ایک دم ریڈ لائٹ آن ہو جاتی ہے۔ پھر انتظار کا یہ لمحہ بڑا بھاری ہوتا ہے۔ جب لائٹ ریڈ سے گرین ہوتی ہے تو سکون ملتا ہے۔"

"آپ رات کو پروگرام کر کے گھر آئیں اور پھر آپ کو کوئی کہے کہ فلاں چیز لا دو تو؟"

"یہ چیز کی نوعیت پر منحصر ہے کہ کیا چیز منگوائی جا رہی ہے۔ اگر میری پسند کی چیز بھی شامل ہوگی تو میں بھاگا بھاگا جاؤں گا۔ اور چیز لاؤں گا ورنہ سوری کر کے سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا جاؤں گا۔"

"آپ کافی عرصے سے ہیں اس فیلڈ میں، کوئی یاد وابستہ ہو تو بتایئے۔"

"ہاں جی۔ ایک یاد آپ کو بتاؤں کہ آٹھ نومبر 2004ء کا دن میرے لیے بہت یادگار ہے۔ اس دن میری سالگرہ بھی تھی اور میں پروگرام کر رہا تھا۔ بارہ بجے کے بعد ایک نہ رکنے والا فون کا سلسلہ شروع ہوا اور بے شمار لوگوں نے مجھے میری سالگرہ کی مبارک باد دی۔ اور میں چار گھنٹے تک آن ایئر لوگوں سے مبارک باد وصول کرتا رہا۔"

"آپ گھر میں بڑے ہیں۔ رعب کس پر چلتا ہے آپ کا؟"

"بہنوں پر...... میری تین بہنیں ہیں اور بہنیں ہی ایک ایسی ہستی ہوتی ہیں جن پر آسانی سے چیخا چلایا اور رعب جمایا جا سکتا ہے۔ ویسے ایسا نہیں کہ میں ہر وقت ہی چیختا چلاتا ہوں۔ مجھے اپنی بہنوں سے بہت پیار ہے۔"

"آپ کی اس بات سے اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ غصے کے تیز ہیں؟"

"جی ہاں۔ میں غصے کا تیز ہوں۔ اور اپنی یہ عادت مجھے خود بھی پسند نہیں ہے لیکن غصہ میرے اختیار میں بھی نہیں ہے۔"

"شوبز کے اسکینڈلز تو بہت مشہور ہیں۔ آپ کی آواز کی دنیا میں بھی اسکینڈلز بنتے ہیں؟"

"جی ہاں۔ اس فیلڈ میں بھی اسکینڈلز بنتے ہیں اور بعض اوقات تو بندہ اسکینڈلز کو انجوائے کرتا ہے۔ اکثر لڑکیاں کہتی ہیں کہ آپ نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔ یا اس نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا مگر اب وہ میری بات نہیں سنتا۔ تو بھی میں تو ان کو جانتا بھی نہیں ہوں۔ میں شادی کا وعدہ کیسے کر سکتا ہوں۔"

"سارا دن کی مشقت کے بعد گھر آتے ہیں تو کیا خواہش ہوتی ہے۔؟"
"یہی کہ کوئی مجھ سے زیادہ بات نہ کرے بلکہ میں جو نیند کو ترسا ہوا ہوتا ہوں تو مجھے سونے دیا جائے۔"
"کبھی ڈپریشن ہوا؟"
"بہت مرتبہ۔ ایسی حالت میں میں گھر سے چلا جاتا ہوں اور مجھے بھوک بہت زیادہ لگنے لگتی ہے جس میں کھاتا بہت ہوں۔"
"لوگ تعریف کرتے ہیں یا تنقید؟"
"یہ سچ ہے کہ لوگ میری تعریف ہی کرتے ہیں۔ میری آواز کی بھی بہت تعریف کرتے ہیں اور میرے بولنے کے انداز کو بھی لوگ بہت پسند کرتے ہیں۔"
"اور کوئی خاص بات جو آپ بتانا چاہتے ہوں۔"
"ہاں جی۔ ایک خاص بات کہ نومبر کے مہینے میں ہی میری بہنوں کی سالگرہ ہوتی ہے اور نومبر کے مہینے میں ہی میری بھی سالگرہ ہوتی ہے۔ جبکہ ایسا شاذونادر ہوتا ہے کہ سب بہن بھائی ایک ہی مہینے کی پیدائش ہوں۔"
"واقعی ایسا بہت کم ہوتا ہے اور ایسا تب ہوتا ہے جب سب بہن بھائی ایک ساتھ دنیا میں آگئیں۔"

مائرہ خان

"کیسی ہو مائرہ؟"
"اللہ کا شکر ہے بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔"
"بہت دبلی ہوتی جا رہی ہو۔ کیا کھاتی پیتی نہیں ہو۔"
"آپ مجھے اسمارٹ کہہ سکتی ہیں۔ دبلی نہیں کہہ سکتیں۔ کھاتی پیتی تو میں ہوں۔ مگر مصروفیات کی وجہ سے کبھی کبھی افراتفری میں کھانا پڑتا ہے۔ تو کبھی کم کھایا کبھی زیادہ۔ ویسے آپ کہہ رہی ہیں کہ مجھے خیال رکھنا چاہیے تو اب سے اپنا خیال رکھوں گی۔"
"لگتا ہے کام بھی بہت زیادہ کرنے لگی ہو۔ تب ہی تو ہر ڈرامے میں نظر آ رہی ہوتی ہو۔"
"اس کا احساس تو مجھے بھی ہو رہا ہے کہ میں ہر وقت اسکرین پر ہوتی ہوں۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ ہر چینل سے سیریل چلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ سارا ریکارڈ کیا ہوا مال باہر آ جاتا ہے اور پھر جب وہ ختم ہو جاتا ہے۔ تو گیپ آ جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ جب میں غائب ہوتی ہوں تب کوئی نہیں پوچھتا۔ مگر جب آ رہی ہوتی ہوں تو سب ہی کہتے ہیں کہ کیا بات ہے بہت نظر آ رہی ہیں۔"
"گزرے زمانے میں بارہ پندرہ اقساط کے سیریل اور طویل دورانیے کے کھیل ہوا کرتے تھے اب "سوپ" کا رواج چل پڑا ہے۔ تمہیں کیا پسند ہے؟"
"پسند تو مجھے تینوں چیزیں ہیں لیکن سوپ سے مجھے اب چڑ سی ہو گئی ہے کیونکہ اس میں کام بہت لگتا ہے کئی کئی سو اقساط پر مبنی سوپ ہوتے ہیں۔ سیریل اور طویل دورانیے کے کھیل جنہیں اب ہم ٹیلی فلم کہتے ہیں مجھے اچھے لگتے ہیں اس لیے اب میں نے سوچا ہے کہ زیادہ تر ٹیلی فلمز اور سیریلز میں کام کروں گی۔"
"کیا فلموں [illegible] ہے۔ کیا فلمیں [illegible]"
"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ اس لیے آج کل میری توجہ اس طرف ہے۔ عنقریب میری دو ٹیلی فلمز آن ایئر آنے والی ہیں۔ "بھید بھاؤ" کے نام سے اور "حسینہ" کے نام سے۔ دونوں میں میرے کردار بہت عمدہ ہیں اور بالکل نئے ہیں۔ یعنی ایسے ہیں جو بہت ہی کم لوگوں نے کیے ہوں گے۔"
"اچھا۔۔۔؟ کچھ بتاؤ ان کے بارے میں۔"
"بھید بھاؤ میں لڑکی نما لڑکے کا کردار ہے۔ اس میں لڑکی کو اپنے لڑکی ہونے پر شرمندگی ہوتی ہے۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ لڑکا بن جائے اور لڑکا بن کر عیش و عشرت کی زندگی گزارے اور حسینہ میں بنگال کی حسین لڑکی کا کردار ہے۔ دونوں ہی بہترین ہیں۔"
"تم خوبصورت اور اسمارٹ ہو۔ فلم کی ڈیمانڈ پر پوری اترتی ہو۔ جانے کا ارادہ ہے؟"
"نہیں جی۔ فی الحال تو ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ مجھے ٹی وی کے ڈراموں سے ہی فرصت نہیں ہے تو فلم میں بھلا کیسے جا سکتی ہوں۔"
"اور فرصت مل جائے تو؟"
"تو بھی نہیں۔ ہاں شعیب منصور کہیں گے تو ان کی فلم میں ضرور کام کروں گی۔ ورنہ نہیں۔ مجھے کوئی شوق نہیں ہے اوٹ پٹانگ فلموں میں کام کرنے کا۔ میں تو کمرشلز میں کام نہیں کرتی حالانکہ کمرشلز میں ٹھیک ٹھاک پیسے ملتے ہیں۔ کمرشلز میں کام کرنا مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں ہے۔"
"لوگ کہتے ہیں تم میں کچھ غرور آ گیا ہے۔ بات ہی نہیں کرتیں۔"
"غرور۔۔۔؟ نہیں اللہ نہ کرے۔ غرور کس بات کا۔ شہرت تو آنی جانی چیز ہے اور یہ کام بھی ایک طرح سے جاب ہے اور میں بھی جاب ہی کر رہی ہوں اور یہ کس نے کہا کہ میں بات نہیں کرتی۔ آپ بتائیں کہ کبھی ایسا ہوا کہ آپ کا فون آیا ہو اور میں نے بات نہ کی ہو۔"
"[illegible] ہیں اور تمہارے میاں نعیم کیسے ہیں۔"
"وہ بھی ٹھیک ہیں اور نعیم بھی فٹ فاٹ۔"
"اب اجازت دو۔ تمہاری ٹیلی فلمز دیکھ کر بات کروں گی۔"
"اوکے ڈیئر۔"

عائشہ خان

عائشہ خان جب اس فیلڈ میں نئی نئی آئی تھیں تو ہم نے ان کا انٹرویو کیا تھا پھر ہوا یوں کہ یہ منظر سے غائب ہو گئیں۔ پتا یہ چلا کہ عائشہ نے یہ فیلڈ چھوڑ دی ہے۔ اب کچھ عرصے سے یہ تواتر کے ساتھ ڈراموں میں نظر آ رہی ہیں۔ سوچا کہ کچھ باتیں ہو جائیں۔
"کیسی ہیں عائشہ اور فیلڈ میں دوبارہ آمد کو سب نے ویلکم کیا ہے۔ آپ کو خود کیا رسپانس ملا ہے؟"
"مجھے بھی بہت اچھا رسپانس ملا ہے۔ لوگوں نے میری آمد کو پسند کیا ہے یہی وجہ ہے کہ اب آج کل میرے پاس بہت کام ہے۔ کئی سیریلز انڈر پروڈکشن ہیں تو کئی سیریلز آن ایئر ہیں آپ تو دیکھ ہی رہی ہوں گی۔"
"ہاں میں دیکھ رہی ہوں۔ "[illegible]" ہم ٹی وی سے آن ایئر ہے اور بہت مختلف رول ہے تمہارا دیگر کیے گئے کرداروں سے اور من و سلویٰ میں بھی تمہارا رول اچھا تھا مگر یہ بتاؤ کہ تم غائب کہاں ہو گئی تھیں؟"
"میں ڈرامہ سیریل صندلی کرنے کے بعد بیرون ملک چلی گئی تھی اور بیرون ملک جانے کا مقصد اپنی تعلیم کو مکمل کرنا تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں پاکستان آئی اور جب میری آمد کی خبر سب کو ہوئی تو یقین کریں کہ مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔"
"آپ نے پاکستان آ کر سب سے خود رابطہ کیا یا ویسے ہی سب آپ کی آمد کے منتظر تھے؟"
"جب میں پاکستان آئی تو شوبز کے لوگوں سے جن کے ساتھ میری اچھی خاصی دوستی ہے "ملاقات" ہوئی تو سب کو پتہ چل گیا کہ میں پاکستان آ چکی ہوں تب پھر ڈائریکٹرز اور پروڈیوسرز نے مجھ سے رابطہ کیا اور پوچھا کہ آپ کام کریں گی۔ میں نے کہا Why not۔ بس تو پھر یہ خبر پھیلتی چلی گئی کہ عائشہ خان آ گئی ہیں اور

وہ کام کرنے میں دلچسپی رکھتی ہیں۔"

"پاکستان آنے کے بعد کون کون سے سیریل آن ایئر ہوچکے ہیں اور کن پر مزید کام ہو رہا ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ پہلا سیریل "مقدس" چلا تھا جو میں نے زیبا بختیار کے ساتھ کیا تھا۔ اس کو زیبا بختیار نے ڈائریکٹ کیا تھا اور ہمایوں محبوب نے پروڈیوس کیا تھا اس کے بعد من و سلویٰ چلا اور اب مانے نہ دل آن ایئر ہے۔ اور مزید جو کام ہو رہا ہے اس میں یاسر نواز کا سیریل ہے جاوید فاضل صاحب کا سیریل ہے۔ پر کچھ کے لیے بات چل رہی ہے۔"

"اچھا خاصا کام آپ کر رہی ہیں۔ گھر والوں کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوتا ۔۔۔ گھر والوں کو ٹائم دے پاتی ہیں۔"

"اچھا خاصا کام نہیں ہے بس کام ہے۔ ورنہ تو لوگ مجھ سے زیادہ کام کر رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ اس فیلڈ میں جو لڑکیاں ہیں۔ وہ تو بہت زیادہ کام کر رہی ہیں۔ جہاں تک گھر والوں کی بات ہے تو میرے والدین نے مجھے اجازت دی ہوئی ہے۔ ہاں! اگر کہیں کہ کام نہیں کرو یا کم کرو تو پھر یقیناً میں ایسا ہی کروں گی۔"

"آپ تھک نہیں جاتیں کیا؟"

"کام کوئی بھی ہو خواہ جاب ہو یا کچھ اور جس میں محنت ہوگی تھکن تو ہوگی۔ اور محنت کا جو ریٹرن ملتا ہے وہ بھی دیکھیں کہ کتنا مزہ آتا ہے گھر میں فضول وقت گزار کر تھکنے سے تو بہتر ہے کہ بندہ کام کرکے تھکے تاکہ کچھ حاصل تو ہو۔"

"آپ نے بتایا کہ آپ پڑھنے کے لیے ملک سے باہر گئی تھیں۔ آپ کیا پڑھ کر آئی ہیں؟"

"میں نے آرکیٹیکچر اور انٹیریئر ڈیکوریشن میں ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ اور اس کو ان شاء اللہ پریکٹیکل لائف میں بھی استعمال کروں گی۔"

"اس فیلڈ میں آنے کے لیے خوبصورتی کا حصہ کتنا ہے؟"

"خوبصورتی ایکسٹرا کوالٹی ہے۔ اصل خوبصورتی تو آپ کی صلاحیت ہے۔ اگر آپ کے اندر اداکاری کے جراثیم نہیں ہیں تو خوبصورتی کتنی دیر چلے گی۔ آخر آپ کو لوٹ کر گھر واپس جانا پڑے گا۔"

"شہرت کیسی لگتی ہے؟ پہچانے جانے پر کیا احساسات ہوتے ہیں؟"

"شہرت کا اپنا مزہ اور اپنا نشہ ہے مگر اس وقت حاصل ہوتی ہے جب آپ کی پہچان بن جاتی ہے۔ آپ کو منواتے ہیں لوگ پہچانتے ہیں عزت کے ساتھ بلاتے ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے اور آپ یقین کریں کہ اتنے سال گزرنے کے باوجود میری پہچان "مہندی" سیریل ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سیریل مقبول بھی بے انتہا ہوا تھا۔"

"ماڈلنگ چل رہی ہے؟"

"ہاں۔ مگر کم کم۔ کیونکہ یہ میرا ایم نہیں ہے۔ مجھے اداکاری کا جنون ہے اور جتنا جنون ہوگا اتنا ہی زیادہ اچھا میں پرفارم کرسکوں گی۔"

"باہر کے خوبصورت ملکوں میں جاکر پاکستان آنے کے لیے دل مچلتا ہے یا وہیں رہنے کو دل چاہتا ہے؟"

"اگر وہیں رہنے کو دل چاہتا تو شاید میں اپنی تعلیم مکمل کرکے باہر اچھی سی جاب کر رہی ہوتی اور مزے کی زندگی گزار رہی ہوتی لیکن پاکستان ہمارا اپنا ملک ہے اس لیے باہر کی خوبصورتی نہیں اپنے ملک کی آزادی کے لیے دل مچلتا ہے اس لیے ہی واپس آگئی ہوں۔"

بابر علی

شاہین رشید

بابر علی فلم اور ٹی وی کا وہ فنکار ہے کہ جس کے کریڈٹ میں بہت سی کامیابیاں ہیں۔ اس نے جب اس فیلڈ میں قدم رکھا تو کامیابیوں نے اسے ویلکم کہا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے شہرت' دولت نے اس کے قدم چومے۔ فنی زندگی کا آغاز اس نے ٹی وی سے کیا۔ اور قاسم جلالی نے تاریخی سیریل "لبیک" میں محمد بن قاسم' کا رول کر کے اسے امر کر دیا۔ اس کے بعد بابر علی نے چند ڈراموں میں کام کیا اور فلم کی راہ لے لی۔ ہمیں یاد ہے کہ جب بابر علی اس فیلڈ میں آئے تھے تو ان کا سب سے پہلا انٹرویو ہم نے ہی کیا تھا' جب انہوں نے محمود خاور (مرحوم) کے سیریل "کنول" میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ پھر یہ فلموں میں چلے گئے تو ہمارا ان سے رابطہ نہیں ہوا۔ اتنے اچھے فنکار کا فلم میں چلے جانا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے لیے اچھا ثابت ہوا ہو لیکن صرف ٹی وی کو پسند کرنے والوں کو افسوس ہوا۔ ان میں ایک ہم بھی شامل تھے۔ ہمارے خیال میں۔ خیر اب بابر علی کی ٹی وی میں واپسی ہو چکی ہے اور یہ کئی ڈراموں میں کام کر رہے ہیں۔ بابر علی کی شخصیت میں ٹھہراؤ اور بردباری ہے جو ان کو دوسرے فنکاروں سے ممتاز کرتی ہے۔

"کیا بچپن سے ہی اداکار بننے کی خواہش تھی جیسا کہ عموماً فنکاروں کو ہوتی ہے؟" ہم نے پہلا سوال کیا۔

"جی ہاں' عموماً فنکار لوگ یہی کہتے ہیں کہ ہمیں تو بچپن سے ہی شوق تھا اداکار بننے کا۔ اور اسی لیے ہم اداکار بن گئے۔ جبکہ میرے ساتھ ایسا نہیں ہے میں نے تو بچپن میں کچھ بھی نہیں سوچا تھا کہ مجھے کیا بننا ہے۔"

"تو کیا چلتے چلتے ہی آپ اداکاری کے میدان میں آ گئے؟"

"سچ تو یہی ہے کہ اچانک ہی اس میدان میں آ گیا۔ میدان کی بات کی تو آپ کو بتاؤں کہ مجھے بچپن میں کرکٹ سے بہت لگاؤ تھا اور اگر اداکار نہ بنتا تو یقیناً ایک اچھا کرکٹر بنتا کیونکہ میرے گیم کی سب ہی تعریف کرتے تھے۔"

"کرکٹ میں کیا رجحان تھا آپ کا؟ بیٹنگ یا باؤلنگ؟"

"میں بیٹنگ بہت اچھی کرتا تھا اور وکٹ کیپنگ کا بہت شوق تھا۔ اگر کرکٹر بنتا تو ان دونوں خوبیوں کے ساتھ بنتا۔"

"جس فیلڈ میں آپ جانا چاہتے تھے اور جس میں آپ چلے گئے ہیں۔ دونوں میں ہی بہت پیسہ ہے۔ اس لحاظ سے تو آپ لکی ہیں۔"

"جی ہاں۔ بالکل۔ اللہ نے دولت شہرت سب کچھ ہی عطا کر دیا ہے۔"

"آپ اداکار بننا نہیں چاہتے تھے مگر بن گئے۔ کیسے؟"

"بہت سیدھی سی کہانی ہے۔ کراچی کے ایک بڑے ہوٹل میں ورائٹی پروگرام ہو رہا تھا جس میں ٹی وی کے نامور فنکار اور ڈائریکٹرز بھی آئے ہوئے تھے۔ معین اختر کمپیئر تھے۔ میں اس زمانے میں ایک خوبرو نوجوان تھا۔ جب معین اختر کمپیئرنگ کر رہے تھے تو ان سے ملنے کی خاطر میں اسٹیج پہ چلا گیا۔ مگر مجھ سے کچھ زیادہ اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔ اب اتفاق دیکھیں کہ کیمرے نے یہ سب کچھ نوٹ کر لیا۔ اس پروگرام کا جب پرومو چلا تو مجھے بھی دکھایا گیا۔ اب پتہ نہیں کہ قاسم جلالی اور حیدر امام رضوی کو مجھ میں کیا نظر آیا کہ انہوں نے اس پروگرام کے حوالے سے مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ اور اس طرح میں اس فیلڈ میں بغیر کسی منصوبے کے آ گیا۔"

"جب آپ سے رابطہ قائم کیا گیا تو آپ کے کیا احساسات تھے؟"

"یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ قاسم جلالی صاحب نے بلایا باتیں کیں' پھر آڈیشن لیا اور کہا کہ ہم ایک تاریخی سیریل کر رہے ہیں۔ اس کے ایک اہم کردار "محمد بن قاسم" کا رول آپ سے کروائیں گے۔ میری تو خوشی کی انتہا نہیں تھی۔"

"آپ نے کہا نہیں کہ آپ کو اداکاری نہیں آتی؟"

"کہا مگر انہوں نے کہا کہ یہ ہمارا کام ہے۔ اس زمانے میں میرے بال بھی لمبے تھے اور اس زمانے کے لوگوں میں بال لمبے کرنے کا فیشن تھا۔ اس لیے شاید میں ان کو اس کردار کے لیے فٹ نظر آیا۔ "لبیک" سیریل بہت کامیاب رہا۔ اس کے بعد محمود خاور مرحوم کا سیریل "کنول" کیا اور پہلے ہی سیریل نے میرے لیے راستے ہموار کر دیے۔ اس کے بعد حیدر امام رضوی کا سیریل "ننگے پاؤں" کیا اور بس۔"

"پھر 'چل سو چل' والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ گھر والوں نے مخالفت کی؟"

"جب تک میں ڈراموں میں کام کرتا رہا کوئی مسئلہ نہیں ہوا کیونکہ میں نے ڈراموں میں بہت اچھے رول کیے تھے ہاں جب فلم کی طرف قدم بڑھایا تو والد صاحب نے اعتراض کیا۔ اور خیر اعتراض بھی ہوئے مگر پھر مان گئے اور کچھ نہیں کہا۔ بس ایک بات کی شرط رکھی کہ رات نو بجے کے بعد گھر سے نہیں نکلنا اور نو بجے تک گھر پہنچ جانا ہو گا۔ اور میں نے ایسا ہی کیا۔"

"پہلی فلم کون سی تھی کیسا رسپانس ملا تھا؟"

"پہلی فلم "جیوا" تھی جو کہ سید نور صاحب نے بنائی تھی اور میں پہلی ہی فلم میں ہیرو تھا۔ فلم بے حد کامیاب ہوئی تھی اور بہت ہی اچھا رسپانس ملا تھا۔ یہ فلم میں پہلی کامیابی تھی پہلی سیڑھی تھی اور پھر اس کے بعد ایک کے بعد ایک فلمیں ملتی رہیں۔"

"پہلی فلم کس سال ریلیز ہوئی اور اب تک کتنی فلموں میں کام کر چکے ہیں؟"

"پہلی فلم 3 مارچ 1995ء میں ریلیز ہوئی اور تب سے اب تک میں تقریباً ساڑھے تین یا پونے چار سو کے قریب فلموں میں کام کر چکا ہوں۔"

"ٹی وی چھوڑا' فلم میں آئے۔ فلم چھوڑی ٹی وی میں آئے۔ اس کے پیچھے کیا کہانی ہے؟"

"ٹی وی سے فلم کی طرف آیا کہ میں فن اداکاری میں بہت آگے تک جانا چاہتا تھا اور ویسے بھی ہر ٹی وی فنکار کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ترقی کرے اور سلور اسکرین تک آئے۔ چنانچہ میں بھی فلم کی طرف آ گیا اور ٹی وی میں نے چھوڑا نہیں تھا' مصروفیت کی وجہ سے وقت نہیں دے پاتا تھا۔ اور فلم چھوڑ کر ٹی وی کی طرف اس لیے آیا کہ میں دیکھ رہا تھا کہ اب معیاری فلمیں نہیں بن رہی ہیں' اس لیے میں نے گیپ دیا۔ چھوڑا اسے بھی نہیں۔ جب فلمی مصروفیات کم ہوئیں تو ٹی وی سے آفرز آنا شروع ہو گئیں اور اب تو آپ کو پتا ہی ہے کہ کتنا کام کر رہا ہوں۔"

"دو تین سال آپ فلم انڈسٹری سے غائب رہے۔"

اب دوبارہ آپ نے اس طرف قدم رکھا ہے۔ اب کیا تبدیلیاں آگئی ہیں؟"

"میں ٹی وی اور فلم دونوں کا فنکار ہوں۔ میں پھر فلم کی طرف واپس آیا ہوں اس لیے کہ میں اچھے لوگوں کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہوں تاکہ اس کی ساکھ بحال ہوسکے ویسے بھی آپ نے دیکھا ہوگا کہ اب پہلے کے مقابلے میں فلموں کا معیار کچھ بہتر ہوگیا ہے۔"

"آپ نے اردو اور پنجابی فلموں میں کام کیا۔ کہاں زیادہ مزہ آیا؟"

"مزہ کی تو بات چھوڑیں۔ پنجابی فلموں میں بھی کام کرکے اچھا لگا اور اردو میں بھی۔ مگر اردو میں زیادہ اچھا لگا کیونکہ پنجابی فلمیں حقیقت سے دور ہوتی ہیں۔"

"آپ اس فیلڈ میں کافی کام کرچکے ہیں اور کافی تجربہ بھی حاصل کرلیا ہوگا۔ ہمارے ہاں کئی فنکار ریٹائرمنٹ کے بعد یا اس فیلڈ کو اپنا پروفیشن سمجھ کر ڈائریکشن کی طرف آجاتے ہیں۔ آپ کا بھی ایسا کچھ ارادہ ہے کیا؟"

"جی ہاں۔ بالکل میرا بھی ایسا ہی ارادہ ہے لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد نہیں کیونکہ ابھی ریٹائرمنٹ میں بہت وقت باقی ہے میں تو عنقریب اس فیلڈ میں آنے والا ہوں۔ بحیثیت پروڈیوسر کے نہیں بحیثیت ڈائریکٹر کے اور ایک اچھی سی فلم بنانے کا ارادہ ہے جس کی ڈائریکشن میں خود دوں گا۔"

"کبھی نیگیٹو رول بھی کیے آپ نے؟"

"کبھی؟ ... کیا مطلب ہے؟ میں تو نیگیٹو رول کرچکا ہوں مگر فلموں میں۔ اب ٹی وی میں بھی نیگیٹو رول کرنے کا ارادہ ہے اور مجھے شوق ہے کہ میں نیگیٹو رول کروں کیونکہ اس میں کافی چیلنج ہوتا ہے پرفارمنس کا مارجن کافی ہوتا ہے۔"

"آپ کہہ رہے کہ آپ نے فلموں میں نیگیٹو رول کیے ہیں۔ کن فلموں میں کیے اور کیا فیڈ بیک ملا آپ کو؟"

"میں نے جاوید شیخ کی فلم "یہ دل آپ کا ہوا" میں اور "مہندی والے ہاتھ" میں نیگیٹو رول کیا اور مجھے اچھا فیڈ بیک ملا۔ اصل میں شائقین بھی اپنے پسندیدہ فنکاروں کو مختلف روپ میں دیکھنا پسند کرتے ہیں اس لیے میں نہیں چاہتا کہ لوگ کہیں کہ بابر علی ایک جیسے رول کرتا ہے بلکہ یہ کہیں کہ بابر علی کے کرداروں میں ورائٹی ہوتی ہے۔"

"انڈین فلموں میں کام کرنے کی پیشکش ہوئی؟"

"نہیں جی۔"

"ارے آپ جیسے ٹاپ کلاس ہیرو کو آفر نہیں آئی؟"

"سچ کہہ رہا ہوں کہ پیشکش نہیں ہوئی۔ اور اگر ہو بھی تو میں جانا پسند نہیں کروں گا" اس کا مطلب یہ نہیں کہ چونکہ مجھے آفر نہیں ہوئی" اس لیے میں ایسا کہہ رہا ہوں بلکہ میں تو کام کرنا ہی نہیں چاہوں گا۔ کیونکہ مجھے یہاں اپنے ملک میں بہت کام ہے۔"

"انڈیا میں کبھی کبھار آرٹ فلمیں بھی بن جاتی ہیں۔ آرٹ فلموں کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟"

"ان کا اپنا مزہ ہوتا ہے [illegible] ہوگا۔ آرٹ فلموں کی اپنی ہی کلاس ہوتی ہے اگر مجھے بھی کسی آرٹ فلم میں کام کرنے کا موقع ملا تو ضرور کروں گا۔"

"ہندوستان اور پاکستان میں آپ کے پسندیدہ فنکار کون ہیں؟"

"ہندوستان میں ایک ہی فنکار ہے نصیر الدین شاہ جو آرٹ فلموں کا بہترین فنکار ہے ویسے بھی مجھے اس کی پرفارمنس بہت اچھی لگتی ہے۔ شبانہ اعظمی بہت اچھی فنکارہ ہیں۔ اور پاکستان میں کسی ایک کا نام لینا دوسرے کو ناراض کرنا ہے۔"

"اب تو آپ بہت زیادہ جانی پہچانی شخصیت ہیں ملک سے باہر کیا صورت حال ہے؟"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ اپنے ملک میں تو کسی بھی حلیے میں چلے جاؤ لوگ پہچان لیتے ہیں جبکہ باہر پہچان کا تناسب ذرا کم ہے لوگ پہچان لیتے ہیں مگر

انھیں کنفرم نہیں ہوتا کہ یہ میں ہی ہوں۔ ٹی وی کے حوالے فنکار زیادہ پہچانے جاتے ہیں۔ کیونکہ اب وہ پاکستانی چینل جو یہاں ہم دیکھتے ہیں باہر بھی دیکھے جاتے ہیں اور ہمارے ڈرامے بھی چلتے ہیں تو لوگ ڈراموں کے حوالے سے پہچان لیتے ہیں۔"

"ملک سے باہر ہمارا ڈرامہ کیا اب بھی مقبول ہے؟"

"میں نے دیکھا ہے کہ لوگ ہمارے ڈرامے اب بھی شوق سے دیکھتے ہیں' بے شک وہ پہلے والی بات نہیں رہی لیکن اب بھی ہمارا ڈرامہ شوق سے دیکھا جاتا ہے۔ اور لوگ ڈرامے دیکھتے ہیں تو ہمیں پہچانتے ہیں اگر نہ دیکھتے ہوتے تو کون ہمیں پہچانتا۔"

"اس مقام تک پہنچنے کے لیے کتنی محنت کرنا پڑی؟"

"آج جو مقام اللہ تعالیٰ نے مجھے دیا ہے' اس تک پہنچنے کے لیے لوگوں کو بہت محنت کرنی پڑتی ہے لیکن اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مجھے اس مقام تک پہنچنے کے لیے کوئی خاص محنت نہیں کرنا پڑی۔ میں نے جو چاہا حاصل کیا۔ میں جب تھیٹر تھا تب بھی کامیاب تھا۔ ڈراموں میں آیا تو کامیابی ملی۔ فلموں میں گیا تو اللہ نے وہاں بھی کامیابی دی۔ تو میں اپنے رب کا بہت شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے مسلسل کامیابیاں دیں اور دے رہا ہے۔"

"عموماً خاندان کا ایک بندہ اس فیلڈ میں آجائے تو پھر وہ اپنے خاندان کے سب ہی بندوں کو لے آتا ہے۔ آپ کے علاوہ کون ہے اس فیلڈ میں؟"

"کوئی نہیں۔ کیونکہ جب میں اس فیلڈ میں آیا تو مجھے تھوڑی سی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا مگر پھر سب سیٹ ہوگیا اور اگر کسی کو شوق ہوتا اور وہ آتا تو جس طرح مجھے تھوڑی سی مخالفت کے بعد سپورٹ ملی اسے بھی ملتی۔"

"اس فیلڈ میں خوبصورتی چلتی ہے یا سفارش؟"

"خوبصورتی ایکسٹرا پوائنٹ ہے۔ ٹیلنٹ ہمیشہ چلتا ہے اور سفارش ایک مرتبہ چلتی ہے۔ سفارش سے ایک مرتبہ تو اس فیلڈ میں آجائیں گے مگر جب آپ میں ٹیلنٹ ہی نہیں ہوگا تو کون آپ کو بار بار موقع دے گا اس لیے انسان کا باصلاحیت ہونا ضروری ہے۔"

"اب تھوڑا سا ذاتی زندگی کے بارے میں بتائیے کہ کب کہاں جنم لیا۔ کہاں سے تعلیم حاصل کی؟"

"میں یکم مئی کو کراچی میں پیدا ہوا ویسے ہمارا تعلق سیالکوٹ سے ہے۔ میں نے گلستان شاہ عبداللطیف بھٹائی اسکول سے میٹرک کیا اور پھر نیشنل کالج سے انٹرمیڈیٹ کیا اور اس کے بعد کراچی یونیورسٹی سے گریجویشن کی ڈگری حاصل کی۔"

"آپ پڑھائی میں کیسے تھے اور بہن بھائی آپ کے کتنے ہیں آپ کا نمبر کون سا ہے؟"

"پڑھائی میں اچھا تھا۔ اس لیے جب بچپن میں شرارتیں کرتا تھا تو زیادہ ڈانٹ مار نہیں پڑتی تھی اور بہنوں بھائیوں میں میرا نمبر آخری ہے' ویسے ہم پانچ بہن بھائی ہیں اور سب شادی شدہ ہیں۔"

"چلیں اور بتائیں [illegible]؟"

"غصہ ایک فطری عمل ہے لہٰذا مجھے بھی غصہ آتا ہے۔ مگر بہرحال بے جا نہیں۔ اس وقت بہت غصہ آتا ہے جب کوئی بلاوجہ جھوٹ بولتا ہے۔ مجھے جھوٹ سے سخت نفرت ہے۔"

"فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟"

"فارغ اوقات ملتے ہی کہاں ہیں اور اگر قسمت سے کبھی وقت مل جائے تو پھر میری کوشش ہوتی ہے کہ وہ وقت میں اپنے گھر والوں کے ساتھ گزاروں۔"

"اور اب آخری سوال کہ اس ساری کامیابی کا کریڈٹ کس کو دیں گے؟"

"صرف اور صرف والدین کو۔ کیونکہ وہ اگر مجھے سپورٹ نہ کرتے تو شاید میں آج اس مقام پر نہ ہوتا۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے انٹرویو کا اختتام کیا۔

گل رحمت جبیں

ڈاکٹر شہروز اور حرا کے جوڑے کو پورے خاندان میں آئیڈیل حیثیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر شہروز ایک نیک دل اور سلجھے ہوئے سائیکاٹرسٹ ہیں جبکہ حرا انتہائی کالج میں انگلش کی لیکچرار ہے۔ عمر اور عادل کی خوبصورت کلکاریاں ان کے گھر کی رونق ہیں۔ ڈاکٹر شہروز کے پاس ایک مشکل لیکن دلچسپ کیس آتا ہے۔ وہ اس عورت کو پہچان جاتے ہیں۔ انہوں نے اسے ایک بار پارک میں دیکھا تھا اور اس کی عجیب و غریب حرکتوں نے انہیں چونکایا تھا۔ یہ کیس ایک ایسی عورت کے متعلق ہے جس کی ہر گزرتی حالت اور آئے دن پڑنے والے دوروں نے اس کے شوہر کو پریشان کر رکھا تھا۔ اس عورت کا رویہ پہلے سیشن میں خاصا حوصلہ شکن رہتا ہے لیکن ڈاکٹر شہروز کی کوشش سے وہ ان پر اعتماد کر لیتی ہے اور دھیرے دھیرے اپنے ماضی کے واقعات بیان کرتی ہے۔

وقار الحسن اور سارا نے محبت کی شادی کی تھی۔ وقار احمد کی یہ دوسری شادی تھی۔ پہلی بیوی مہر النساء ہے جو وقار کی خالہ زاد بھی ہے۔ مہر النساء کی زبان درازی اور بدتمیزی کی وجہ سے اس کے پہلے شوہر نے اسے طلاق دے دی تو وقار کی ماں نے وقار کو مجبور کیا کہ وہ مہر النساء سے شادی کر لیں لیکن وقار کے ساتھ بھی اس کی نہ بن سکی۔ وقار نے سارا سے شادی کر لی تو مہر النساء میکے چلی گئی۔ سارا کے ہاں ایک بچی ایمن پیدا ہوئی۔ وقار بہت خوش تھے لیکن اچانک سارا کا انتقال ہو گیا۔ ایمن ماں کی کمی بہت محسوس کرتی ہے۔ اس کی ضدی طبیعت وقار الحسن کو بے حد پریشان رکھتی ہے۔ اسے سنبھالنے کے لیے وقار نے خدیجہ بی بی کو اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے جو ان کی دور پرے کی رشتہ دار ہیں اور اپنے بیٹے بہو سے ناراض ہو کر ان کے ساتھ

وہ بہت دیر تک کچھ بھی نہ بول سکی۔

"نہیں.... کیتھی.... نا! آؤ نا.... ہم شادی کرلیں۔" شاہ میر نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں جکڑ لیے۔ کیتھی نے محسوس کیا' وہ کانپ رہا ہے۔ اس نے نظریں اٹھا کر سامنے بیٹھے مرد کو دیکھا جس کے ساتھ اس نے 13 سال کا عرصہ گزارا تھا اور جسے چند دن پہلے وہ چھوڑ دینے کا فیصلہ کرچکی تھی۔

وہ سامنے بیٹھا پُرامید نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

کیتھی نے اس کی نگاہوں کی عجیب سی کیفیت سے نظریں چرائیں اور ٹھنڈے لہجے میں پوچھا۔

"لیکن میں تم سے شادی کیوں کروں گی؟"

اس نے دھیرے سے اپنے ہاتھ چھڑائے۔

"ہماری کمٹمنٹ ختم ہوچکی ہے۔ تم اپنا سامان باندھ چکے ہو۔ آج کے بعد ہمیں ایک دوسرے سے نہیں ملنا تھا۔ اگر ہمارے درمیان یہ مصیبت...."

"پلیز.... اسے مصیبت مت کہو۔" شاہ میر نے اسے بے اختیار ٹوکا۔

کیتھی نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ اسے لگا' وہ ایک بدلے ہوئے شاہ میر کو دیکھ رہی ہے۔

"میں مانتا ہوں' ہمارے درمیان اب کچھ بھی نہیں رہا۔ مجھے اعتراف ہے کیتھی کہ میں پچھلے کچھ عرصے سے تمہارے ساتھ زیادہ اچھا سلوک نہیں کر رہا ہوں۔ میں تمہیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جانے والا تھا مگر کیتھی! قدرت ایسا نہیں چاہتی۔ ہماری تقدیر میں کچھ اور رقم ہے۔ ہمارے درمیان سب کچھ ختم نہیں ہوا۔ ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ یہ جو میرے اور تمہارے درمیان آگیا ہے۔ اسے سائن کیتھی کہ ہمیں ایک دوسرے سے دور نہیں ہونا۔ یہ ہمیں دور ہونے ہی نہیں دے گا۔"

وہ تیز تیز لہجے میں بولتا چلا گیا۔ گویا اسے سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ وہ سامنے بیٹھی عورت کو جسے کل تک وہ شدید نفرت کرنے لگا تھا' کیسے قائل کرے۔

کیتھی نے بے حد اکتا کر اپنے چھوٹے سے پرس سے سگریٹ نکال کر اضطراری انداز میں سلگایا اور اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ باہر بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ وہ لمبے لمبے کش لیتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔

"بہت سال پہلے میرے باپ نے بھی اسی طرح میری ماں کی منت کی ہوگی۔"

ایک لمبا کش بھر کر دھوئیں کو کھلی سرد فضا کے حوالے کرتے ہوئے وہ تلخی سے مسکرائی۔

"اور میری ماں اس کی باتوں میں آکر اس سے شادی رچا بیٹھی۔ اب وہ کہاں ہے اور وہ میرا باپ....؟"

شاہ میر نے بڑے صبر سے اس کی تکلیف دہ خاموشی کو جھیلا پھر اٹھ کر اس کے عقب میں آکھڑا ہوا اور اپنے بازو آہستگی سے پھیلا کر خود سے قریب کرلیا۔

"عورت مشرق کی ہو یا مغرب کی' ممتا کا جذبہ ایک سا رکھتی ہے کیتھی! ماں بننے کی خوشی بڑی اچھوتی اور انمول ہوتی ہے۔ کیا تم اسے محسوس نہیں کرنا چاہتیں۔" کیتھی نے بالکل غیر محسوس انداز میں اپنے سکے اور تنے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ گویا اس نے جذبات کو محسوس کرنے کی کوشش کی مگر اندر کا ہر سو ویرانہ سناٹا تھا۔

"تمہارے ہاں کی عورت لمحہ لمحہ گن کر اس خوش خبری کا انتظار کرتی ہے کیتھرائن!" شاہ میر نے اس کے بالوں میں چہرہ چھپاتے ہوئے گرفت مضبوط کی۔

"میں تمہارے ہاں کی عورت نہیں ہوں شمیر...!" اس نے سگریٹ کا آخری کش لیا اور بچا ہوا حصہ کھڑکی سے باہر اچھال دیا۔

"ضرورت تو ہو۔ کیتھی! کیا تمہارا دل نہیں چاہتا' ہم ایک گھر بنائیں۔ ایک چھوٹا سا خوب صورت گھر جس

میں' تم اور ہمارا بچہ۔"

کیتھی تڑپ کر اس کی گرفت سے نکلی اور تیزی سے پلٹی۔ اس کی تیز نگاہیں شاہ میر کے چہرے پر جم گئیں پھر وہ پھنکاری۔

"تاکہ ایک دن تم بھی ہمیں چھوڑ کر چلے جاؤ۔ بالکل میرے باپ کی طرح۔ اس نے بھی تو یہی باتیں کی ہوں گی۔"

"سب ایک جیسے نہیں ہوتے کیتھی!" شاہ میر نے آہستگی سے کہا۔

"تم میں اس سے مختلف کیا ہے شمیر! کچھ بھی نہیں۔ تم بالکل ویسے ہی ہو۔ سوچو' جب تم ہمیں چھوڑ جاؤ گے اور میں بھی کسی سے شادی نہ کی یا جارج ہی سے کرلوں گی تو اس بچے کا کیا ہوگا۔ پور چائلڈ کیتھی کی طرح کسی ویلفیئر سینٹر میں پلے گا۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا کیتھی! یہ تمہارے خدشے ہیں اور بالکل بے بنیاد ہیں۔" وہ بے بس ہو کر بولا۔

"شمیر! تم پیارے لڑکے ہو ڈارلنگ بوائے۔ میں نے تمہارے ساتھ اچھا وقت گزارا مگر اب نہیں۔ ہمیں اچھے دوستوں کی طرح جدا ہونا چاہیے۔ سو گڈ بائے ڈارلنگ شمیر....!"

کیتھی نے ایک الوداعی بوسہ دیا پھر اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر عقب میں دھکیل دیا۔ گویا اپنے لیے راستہ چاہ رہی ہو۔

شاہ میر کا چہرہ فق ہوگیا۔ وہ ذرا سا لڑکھڑایا پھر گھٹنوں کے بل نیچے گر گیا۔ اس کے بازوؤں نے کیتھی کی ٹانگیں جکڑ لیں۔ کیتھی نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر وہ اپنی آہنی گرفت کے ساتھ بولتا چلا گیا۔ وہ رو رہا تھا' بول رہا تھا اور کیتھی کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا۔

"نہیں کیتھی! تم ایسا نہیں کرو گی.... تم اسے نہیں مارو گی.... وہ میرا اپنا آپ ہے.... میرے وجود کا حصہ.... میرے ہونے کا جواز.... وہ میرا آنے والا کل ہے.... میرا مستقبل' میرا نام و نشان.... تم مجھے بے نشان مت کرو.... تمہیں تمہارے خدا کا واسطہ ہے کیتھی! میں تمہیں چھوڑ کر کہاں جاؤں گا کہ میں نے تو اپنی جڑیں تمہارے وجود میں گاڑ دی ہیں۔ کہیں اور چلا گیا تو بنجر ہوجاؤں گا.... میں تمہارے اور اس کے لیے گھر بناؤں گا.... ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے.... شاہ میر تم سے وعدہ کرتا ہے کیتھی.... وہ اسے پال لے گا' تم پر بوجھ نہیں بنے گا.... اسے ختم مت کرو.... ورنہ شاہ میر ختم ہوجائے گا۔"

کیتھی خود کو چھڑانے کی کوشش میں اسے گالیاں دیتی اور اس کے بال نوچتی رہی مگر نہ شاہ میر کی گرفت کمزور ہوئی' نہ وہ بولنا بند ہوا۔ یہاں تک کہ کیتھی کو محسوس ہوا' وہ ہار رہی ہے۔ اس کی مزاحمت دم توڑ رہی ہے۔ آخری کوشش کے طور پر وہ حلق کے بل چلائی۔

"یو بلڈی باسٹرڈ...."

☆ ☆ ☆

احمد عالی نے تعجب سے دیکھا۔

وہ اپنی سیٹ پر موجود تھا۔ نہ صرف موجود تھا بلکہ کام بھی کر رہا تھا۔ احمد عالی کے خیال میں آج اسے نہیں آنا تھا۔ شاہ میر نے بتایا تھا' وہ بغیر کسی نوٹس کے فیکٹری چھوڑ جائے گا اور آج فیکٹری کیا اسے تو اس شہر میں بھی نظر نہیں آنا چاہیے تھا لیکن وہ نہ صرف موجود تھا بلکہ کام بھی کر رہا تھا۔

"کیسے ہو شاہ میر....؟" احمد عالی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

شاہ میر نے چونک کر اسے دیکھا پھر مسکرا دیا۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔" احمد عالی نے بہت دنوں کے بعد شاہ میر کے لبوں پر مسکراہٹ دیکھی تھی۔

"تمہیں تو آج جانا تھا۔" احمد عالی پوچھے بنا رہ نہ سکا۔

"ہاں۔" اس ایک لفظ سے وہ پتہ بھی نہ اخذ کر سکا اور شاہ میر کام میں مصروف ہو گیا۔ احمد عالی نے دیکھا سپروائزر ان کی طرف آ رہا تھا' وہ اپنی مشین کی طرف بڑھ گیا۔ کام کے دوران بھی اس کا دھیان بلک بلک کر شاہ میر کی طرف جاتا رہا جو مگن سے انداز میں اپنی مشین پر مصروف تھا۔ آج اس کے انداز میں روز والا اضطراب نہ تھا بلکہ عجیب سی طمانیت تھی جو احمد عالی نے پوری طرح محسوس کی۔

"گھر چلیں۔" آف ہونے پر احمد نے کہا۔ شاہ میر ذرا سا مسکرا دیا۔ اس کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

شاہ میر کو گھر جانے کی جلدی تھی۔ احمد متعجب سا اسے جاتا دیکھتا رہا۔ شاہ میر کچھ دور جا کر پلٹا۔ قریب آ کر کچھ دیر اپنی بڑھی ہوئی شیو کھجانے کے بعد کھنکھارا۔

"کیا تم مجھے کچھ رقم ادھار دے سکتے ہو۔ پے ملنے پر لوٹا دوں گا۔"

احمد عالی کا ہاتھ بے اختیار اپنی جیب تک گیا۔ والٹ میں جو کچھ تھا اس نے نکال کر شاہ میر کے حوالے کر دیا۔

"شکریہ دوست۔"

"شاید وہ یہ قرض لوٹانے کبھی نہ آئے۔" اس نے نظروں سے اوجھل ہوتے شاہ میر کو دیکھ کر سوچا۔ اسے افسوس اپنی رقم جانے پر نہ تھا۔

"مگر اس نے یہ کیوں کہا' پے ملنے پر لوٹا دوں گا۔ کیا وہ مہینے کے آخر تک یہیں رکنے کا ارادہ رکھتا ہے؟" ظاہر ہے ان کے سوالوں کا جواب دینے والا جا چکا تھا۔

باہر برف باری ہو رہی تھی اور کیتھی اپنے بستر میں دبکی موٹا کمبل اوڑھے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اسے کل سے بخار تھا اور شاہ میر نے ساری رات اس کے سرہانے جاگ کر گزاری تھی۔

شاہ میر نے اس کی جلتی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"کیسی طبیعت ہے؟" بے حد نرم لہجہ۔

کیتھی خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔ تازہ شیو کی نیلاہٹیں اس کے چہرے پر نمایاں تھیں۔ اس کی آنکھیں نسبتاً کم سرخ اور چہرہ گزشتہ دنوں کی نسبت قدرے فریش دکھائی دیتا تھا۔

"تم آج دیر سے آئے؟" وہ کروٹ بدل کر بالکل سیدھی لیٹ گئی۔ شاہ میر نے اس کے سر کے نیچے تکیہ ٹھیک کیا۔

"تم نے پوچھا نہیں کیا۔ میں لڑا سے کہہ گیا تھا۔"

"ہوں۔"

"کچھ لو گی۔" وہ لفافے کھول کر چیزیں نکالنے لگا۔ کیتھی کے پسندیدہ سینڈوچ' پھل' ٹافی کا ڈبہ' ایک خوبصورت نیلا کوٹ۔

"تمہارے لیے۔"

کیتھی کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔ انہوں نے گزشتہ دو سالوں سے بہت کچھ شیئر کیا تھا لیکن ایک ایک پونڈ کے حساب کے ساتھ۔

"مجھے اچھا لگا... سوچا تمہارے لیے خرید لوں۔"

"کتنے کا ہے؟" کیتھی کے منہ سے پھسلا۔
"قیمت کا کیا ہے" تمہیں اچھا لگا؟"
"ہاں۔" کیتھی نے آہستگی سے ہاتھ پھیر کر کوٹ کی نرماہٹ محسوس کی۔
"تم مجھے تحفے دیتے رہتے ہو۔"
"ہمارے ہاں شوہر اکثر بیویوں کو گفٹ دیتے رہتے ہیں۔" شاہ میر نے خوش گوار لہجے میں بتایا۔ کیتھی نے جھنجلا کر کوٹ ایک طرف ڈال دیا۔ اس نے ابھی تک شاہ میر سے شادی کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اچانک لگنے والی ٹھنڈ نے اسے بستر پر ڈال کر شاہ میر کو تیمارداری کا موقع دے دیا تھا اور وہ اسے یوں سنبھال رہا تھا گویا وہ کوئی ننھی سی بچی ہو۔
"تم میرے شوہر نہیں ہو۔" وہ تیزی سے گویا ہوئی۔
"تم نے شادی کے لیے کون سی تاریخ سوچی؟" شاہ میر کچن کی طرف جاتے ہوئے پوچھنے لگا۔
"تم سے کس نے کہا میں تم سے شادی کر رہی ہوں؟"
"میں زیادہ مہمان نہیں بلاؤں گا۔ تم جانتی ہو میرے پاس کچھ زیادہ سیونگ نہیں ہے۔ بس لیڈی مارگریٹ، احمد علی اور اس کی فیملی۔ تم کسے انوائٹ کرو گی؟" وہ کچن ہی سے بات کر رہا تھا۔
"جہنم میں جاؤ تم۔" کیتھی چلائی۔
"تم شادی پر کیسا لباس پہنو گی؟" وہ کافی اور سینڈوچز سمیت کچن سے برآمد ہوا۔
"میں تمہیں یہاں سے دھکے دے کر نکال دوں گی۔" کیتھی نفرت سے گویا ہوئی۔
شاہ میر نے ٹرے ایک طرف رکھی پھر آخری لفافہ کھولا۔ اس میں سے ایک تصویر بے حد احتیاط سے نکالی۔ کچھ لمحے کمرے کی دیواروں کو دیکھنے کے بعد اس نے کلاک اتار کر ایک طرف رکھا اور اسی احتیاط سے تصویر دیوار پر ٹانگ دی۔ کچھ لمحے بے حد محبت سے تصویر کو دیکھنے کے بعد وہ کیتھی کی طرف پلٹا۔
"کیسی ہے؟"
کیتھی نے کچھ کہنا چاہا تو وہ دوبارہ گویا ہوا۔
"یہ میں ہوں کیتھی!"
کیتھی گم صم سی تصویر دیکھنے لگی جس میں ایک گول مٹول سا بچہ صرف نیکر پہنے تالاب سے نہا کر نکلا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں شادی کر رہا ہوں۔"
احمد عالی کے لیے یہ انکشاف اتنا اچانک تھا کہ وہ حیرت زدہ اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اس نے شاہ میر کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔
"تم نے کیا کہا۔۔۔ تم شادی کر رہے ہو؟"
شاہ میر نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ ابھی ابھی احمد کے گھر آیا تھا۔ فاطمہ انہیں کافی اور [illegible] کر بچوں کو سلانے کے لیے گئی تھی جن کے لیے وہ ڈھیر سارے چاکلیٹ لایا تھا۔
"او شاہ میر!" فرط جذبات سے احمد عالی کے ہونٹ کانپنے لگے۔ اس نے بے اختیار شاہ میر کو بھینچ لیا۔
"تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے دوست!"
"میں جانتا ہوں۔"
"تو تم اسی لیے اتنے مطمئن اور خوش دکھائی دے رہے تھے۔"

"اچھا۔۔۔ تمہیں ایسا محسوس ہوا۔" شاہ میر نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔
"میں نے فاطمہ سے کہا تھا شاہ میر کے ساتھ کچھ خاص ہوا ہے۔"
"تم نے کہا تھا۔ تقدیر میری واپسی کے اسباب پیدا کر رہی ہے۔"
"ہاں کہا تھا۔" احمد عالی نے زور زور سے سر ہلایا۔
"لیکن ایسا نہیں ہوا۔" شاہ میر نے کافی کا بڑا سا گھونٹ بھرا۔ "تقدیر نے میری جڑیں اسی سرزمین پر گاڑ دی ہیں۔"
احمد عالی نے ناسمجھی سے اسے دیکھا پھر ہنس دیا۔
"مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم اپنی فیملی بنانے جا رہے ہو۔"
"تو ٹھیک ہے اسی اتوار کو میں اور کیتھی تمہارا انتظار کریں گے۔" وہ خالی مگ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔
"کیتھی۔۔۔!" احمد عالی نے سر اٹھا کر تعجب سے اسے دیکھا پھر وہ اٹھ سا گیا۔
"تم کیتھی سے شادی کر رہے ہو؟"
"ہاں۔" شاہ میر نے اثبات میں سر ہلایا۔
"مگر۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رکا پھر کھڑا ہو گیا۔ وہ شاہ میر سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ سکا اور شاہ میر اس کی الجھن جانتا تھا تبھی تو آہستگی سے گویا ہوا۔
"پاک باز عورت کی تمنا وہ کرے احمد عالی! جو خود پارسا ہو۔"
احمد بمشکل مسکرایا پھر اس نے دونوں ہاتھ شاہ میر کے کندھوں پر رکھے۔
"بہرحال میں خوش ہوں شاہ میر!"
"میں جانتا ہوں۔" شاہ میر نے ممنونیت سے اسے دیکھا۔ "تم میرے واحد دوست ہو۔"
"تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو۔۔۔"
"کچھ زیادہ نہیں۔" وہ تذبذب کا شکار ہوا۔ "بس شادی کے انتظام کے لیے کچھ رقم۔۔۔ خدا کی قسم اب کہیں نہیں بھاگوں گا۔ سارا قرض لوٹا دوں گا۔ دراصل احمد! میں خالی ہاتھ ہوں۔ بہت بری عادت ہے میری۔ میں نے کبھی کچھ بھی جوڑ کر نہیں رکھا۔ بری عادت ہے نا!"
"ہاں! تمہیں اب اس عادت سے چھٹکارا پا لینا چاہیے۔" احمد عالی نے خوش دلی سے کہا۔
"میں چاہتا ہوں کیتھی کے لیے سرخ جوڑا بنواؤں۔ میرا خیال ہے وہ دلہن بن کر پیاری لگے گی۔"
"میرا بھی یہی خیال ہے۔" احمد نے تائید میں سر ہلایا۔ "لیکن کیا وہ سرخ جوڑا پہن لے گی؟"
"ہمارے ہاں دلہن یہی رنگ پہنتی ہے۔" شاہ میر نے سنجیدگی سے بتایا۔
"وہ تمہارے ہاں کی دلہن نہیں ہے۔" احمد عالی کہنا چاہتا تھا مگر کہا نہیں۔
"ٹھیک ہے۔ تم صبح فاطمہ کو ساتھ لے کر کسی پاکستانی بوتیک پر جائیں گے۔ شاید وہاں تمہاری پسند کا لباس مل جائے۔"
احمد عالی واقعی ایک مخلص اور اچھا دوست تھا۔
گھونٹ گھونٹ گرم سوپ اپنے اندر اتارتے ہوئے کیتھی نے شاہ میر کو دیکھا۔ وہ کھڑکی میں کھڑا آدھی رات کے دھندلے اوراق پر نجانے کیا لکھ رہا تھا یا وقت کی تحریر پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیتھی کچھ نہ جان سکی لیکن جھرجھری ضرور لے کر رہ گئی کہ وہ اس سرد موسم میں ہلکا سا سویٹر پہنے کھڑا تھا۔
"کھڑکی بند کر دو شاہ میر! مجھے سردی لگ رہی ہے۔" اس نے ہلکی سی آواز میں کہا۔

شاہ میر نے فی الفور کھڑکی بند کی اور اس کے قریب آ بیٹھا۔ سوپ کا خالی پیالہ کیتھی کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ سے کیتھی کی پیشانی چھوئی اور بشاشت لہجے میں بولا۔

"اب تو تمہارا بخار بالکل ٹھیک ہے۔"

"ہاں۔" کیتھی نے اس کا ہاتھ بہت عرصے بعد تھاما تھا اور بہت عرصے بعد ہی شہیر نے ہاتھ چھڑایا نہیں بلکہ ہولے ہولے سہلانے لگا۔

"تمہارے ہاتھ بہت ٹھنڈے ہیں۔" کیتھی نے کہا۔

"ابھی گرم ہو جائیں گے۔"

"تم نے اس بیماری میں میرا بہت ساتھ دیا۔"

پچھلے چند دنوں میں شاہ میر نے کیتھی کا جتنا خیال رکھا تھا' وہ اس کے سارے نہیں تو آدھے خیالات ضرور تبدیل کر گیا تھا۔ خواہش کی کونپل اس کے اندر ہی سر اٹھانے لگی۔ اگرچہ وہ اس کی خوشبو سے ابھی تک انجان تھی مگر شہر کے ہنگاموں سے دور پکی ہوئی گندم کے سنہری خوشوں سے بھرے کھیتوں میں گھرا اک چھوٹا سا گھر یاد آنے لگا تھا' جہاں اس کے ماں باپ نے اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ اس کے بے حد چھوٹے فارم ہاؤس میں دو سرخ گائیں' چند بکریاں اور بہت سی مرغیاں تھیں۔ کیتھی جانتی تھی' وہ کھیت' وہ گھر اور وہ فارم ہاؤس اس کے باپ کا نہیں بلکہ نانا کا تھا' جہاں اس نے اپنے بچپن کا بہت مختصر حصہ گزارا تھا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"تمہارے بارے میں۔" اس نے ہلکا سا جھوٹ بولا۔

"کیا.....؟"

"تم میری زندگی میں آنے والے عجیب مرد ہو۔"

"اچھا....." وہ لیٹ گیا اور کمبل ٹانگوں پر ڈال لیا۔ اس کی نظروں کے سامنے اس کی تصویر کھنچی ہوئی تھی [illegible] میں موجود ننھے شاہ میر کو نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ اس کی نگاہیں عقب میں موجود درختوں میں گھرے تالاب کے پانیوں پر تھیں۔ اسے محسوس ہوا کافی جما پانی حرکت کرنے لگا ہے۔ درختوں کی شاخیں ہواؤں کے زور پر لہرانے لگیں۔ اس نے واضح طور پر ہواؤں کی سرسراہٹیں سنیں۔ کیتھی نے آگے کو جھک کر اس کی کھلی آنکھوں میں کچھ پڑھنے کی کوشش کی پھر بے اختیار پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

"شاہ میر۔"

"کہاں سے آئے ہو؟"

"پاکستان۔"

"کیوں؟"

یہ وہ سوال تھا جس کا جواب وہ ترنت نہیں دے سکتا تھا۔ یہاں ہونٹوں پر قفل لگ جاتے تھے' اس سوال سے آگے جواب نہیں' دلدل تھی۔ وہ اس دلدل میں اترتا چلا گیا۔ اس نے پہلی بار کیتھی کے سامنے اپنا آپ کھول کر رکھ دیا۔

"میری ماں' میرے باپ کی بچپن کی مانگ تھی۔ ہمارے ہاں رشتے یونہی طے ہو جاتے تھے۔ کچھ بھی دیکھے سوچے بغیر۔ عادات' خیالات' فطرت کی تو بات ہی کیا' عمروں کا فرق تک نہ دیکھا جاتا۔ ایک ننھی سی بچی کو جوان سال آدمی سے باندھنے کے لیے یہی جواز کافی تھا کہ خاندانی جائیداد باہر نہ جائے۔ خواہ اس کے نتیجے میں کسی کے

جذبات کا خون ہی کیوں نہ ہو۔ میرے باپ نے شادی اپنی مرضی سے کی۔" اس کے دھیان کی گرم دوپہر میں ماضی کے ورق پھڑپھڑاتے کھلتے چلے گئے۔

خاندان میں طوفان اٹھا لیکن فائدہ؟ یہ اس خاندان کی پہلی کہانی نہ تھی۔ یہاں پہلے بھی تو خیر خواہیاں رات کے اندھیروں میں سر پٹختے پٹختے ادھیڑ عمری کی منزلیں طے کرتی رہی تھیں۔ وہ اس خاندان کی پہلی لڑکی نہ تھیں۔ نہ یہ المیہ پہلا المیہ تھا۔

سو جب میرا باپ تین بچوں کا باپ بن گیا تو اس سے التجا کی گئی کہ وہ خدیجہ بانو کو بھی شرف قبولیت بخش دے اور اس نے یہ عنایت کر دی۔ وہ اسے اپنے گھر نہیں لے کر گیا مگر میرے ننھیال والوں کے لیے یہی کافی تھا کہ ان کی بیٹی شوہر والی ہے۔ کنواری بی بی بن کر گھر نہیں بیٹھی' میں اسی عنایت کی دین تھا۔ کچھ سال خدیجہ بانو کو برت کر یوں بھولا کہ کبھی ادھر کا رخ ہی نہ کیا۔ کسی کو کوئی فرق نہ پڑا تھا مگر میں نے اس عورت کو ساری ساری رات روتے دیکھا تھا۔

وہ سمجھتی تھی میں سو چکا ہوں۔ اس کے آنسو میرا چہرہ بھگوتے رہتے اور میرے اندر نفرت و بغاوت کے وہ بیج بوتے گئے جو میرے رخصت ہوتے بچپن کے ساتھ ساتھ تناور درخت بن گئے۔ میں نفرت کی آگ سے نیلو نیل ہوتا جا رہا تھا' جب اس شخص کی پہلی بیوی مر گئی۔ بچے اگرچہ چھوٹے نہ تھے مگر گھر کا انتظام و انصرام بکھرنے لگا تھا' تب ہی وہ شخص خدیجہ بانو کو لینے چلا آیا۔ میں نے لاکھ سر پٹخا کہ وہ مت جائیں مگر انہیں نہ ماضی یاد آیا' نہ ہی گزری ہوئی سفاک راتیں' نہ میرا پیاسا' محروم بچپن تک بھول گئیں۔ انہوں نے کہا۔

"شاہ میر! میرے ساتھ چلو' وہ تمہارا باپ ہے۔ وہی تمہارا اصل گھر ہے۔ دیر سے سہی' تمہیں تمہارا جائز مقام ملنے جا رہا ہے۔ یہاں کیا ہے' تمہارے لیے کچھ بھی نہیں۔" میں نے کہا۔

"[illegible] ہوا تھا اور میری ماں تین جوان بچوں کی ماں بن کر میرے لیے مر گئی۔ میں نے وہ شہر ہی نہیں' ملک ہی چھوڑ دیا۔ گھر گھر بھٹکا ہوں' صحرا صحرا آبلہ پا سفر کیا ہے' بھوک کا عذاب سہا' مزدوری کی مشقت سہی۔ لوگ کہتے ہیں میں اپنے باپ جیسا ہوں۔ اثر ہے' تندی' ہٹ دھرمی' شاید ایسا ہی ہو' خون کا اثر تو ہوتا ہی ہے۔ یہ سن کر مجھے تو خود سے ہی نفرت محسوس ہوتی' تب ہی اپنے آپ کو تھکاتا رہا۔

بے فکری عمری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا

کبھی واپس جانے کی خواہش ہی پیدا نہیں ہوئی۔ شاید بے سمتی مجھے بھا گئی تھی۔ جو کمایا' خود پر اڑا دیا۔ سر چھپانے کا ٹھکانا ملا تو ٹھیک نہیں ملا تو جہاں رات ہوئی وہیں سو گئے لیکن اب میں تھکنے لگا ہوں۔ بھاگتے بھاگتے کر ساگیا دل چاہتا ہے اب لنگر ڈال دوں' کہیں رک جاؤں' تھوڑا سستا لوں۔ کیتھی! دل چاہتا ہے' ایک گھر ہو....."

کہتے کہتے اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔

"شام ڈھلے گھر لوٹنے کی خواہش میرے قدموں میں بجلی بھر دے۔ میری بیوی دروازے پر میری منتظر ہو۔ مجھے دیر ہو تو فون کر کے پوچھے۔ یہ سب... یہ سب... یہ ساری خواہشیں اس آنے والے کی بدولت ہیں۔ اس نے مجھے روک لیا ہے' باندھ دیا ہے۔"

اس کے لہجے میں دبا دبا جوش بیدار ہوا۔

"دیکھو! محسوس تو کرو' سوچو۔ اس کی کلکاریاں' کھلکھلاہٹیں۔ اس کے نرم ہاتھوں کا لمس۔ اس کی معصوم آواز۔"

اس نے دھیرے سے کیتھی کی طرف کروٹ بدلی۔ وہ پوری آنکھیں کھولے اس کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی پرجوش سرگوشیوں نے کیتھی کے وجود میں سنسناہٹ سی دوڑا دی۔ کوئی تھا جو اس کے اندر کروٹ بدلنے لگا۔

"وہ مجھے بابا کہے گا اور تمہیں ممی۔" کیتھی! وہ یہاں میرے سینے پر سر رکھ کر سوئے گا۔ ہیں کیتھی پیدا ہو......"

ایک خوش گوار سنڈے کو مقامی چرچ میں وہ دونوں رشتہ ازدواج میں بندھ گئے۔ چرچ میں تقریب کیتھی کی خواہش تھی، جس پر شاہ میر نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ کیتھی اپنے روایتی سفید لباس میں اپنی عمر سے کہیں کم اور معصوم دکھتی تھی۔ اسی سنڈے ایوننگ میں اسلامک سینٹر میں ان کا نکاح ہو گیا۔ شاہ میر کی خواہش پر کیتھی نے روایتی پاکستانی سرخ جوڑا پہنا تھا جس میں اس کی گوری رنگت دمک رہی تھی۔

"ننھے جوڑے کے لیے پہلا ڈنر احمد عالی کے گھر۔" اسلامک سینٹر سے نکلتے ہی احمد نے اعلان کیا۔

"لیکن آخری ہرگز نہیں۔ ہم اکثر تمہیں تنگ کرتے رہیں گے۔"

سیاہ ڈنر سوٹ میں ملبوس شاہ میر بے حد مسرور و شاداں دکھائی دیتا تھا۔ لگتا ہی نہ تھا یہ وہی وحشت زدہ زندگی سے بیزار انسان ہے۔

انہوں نے واقعی ایک گھر کی بنیاد رکھ دی ہے۔

احمد عالی اور فاطمہ نے چپکے سے سوچا۔

☆ ☆ ☆

گاڑی گولی کی سی رفتار سے آگے بڑھی۔

اردگرد گاڑیوں میں موجود لوگوں نے سر نکال کر جلی کٹی سنائیں۔ کچھ نے نوجوان نسل کی ایڈونچر پسند طبیعت کو کوسا۔

ایمن کے اندر ایک جنون سا بیدار ہوا۔ اس کا جی چاہا وہ یونہی گاڑی بھگاتی جائے۔ یہاں تک کہ زمین کا آخری کنارہ سامنے ہو اور خلا اس کا مقدر۔ سامنے آتے ٹرک کو دیکھ کر اس نے اپنے انجام کے بارے میں سوچا تو عین وقت پر اسٹیئرنگ گھما دیا۔

"کیا سوچ کر اس نے میری جگہ کسی اور کو دی۔"

ہنستا مسکراتا چہرہ نگاہوں کے سامنے آ گیا۔

"وہ مجھ سے جان چھڑانا چاہتا ہے، وہ جو مجھ پر جان نچھاور کیا کرتا تھا۔"

سامنے سے آنے والوں نے اس کریزی ڈرائیور سے بچنے کے لیے اپنی سی سعی کی۔ اگر وہ بچ کر ذیلی سڑک پر نکل آئی تھی تو یہ اس کی لاشعوری کوشش کے ساتھ ساتھ اللہ کا معجزہ ہی تھا۔ وہ وہاں تک گئی جہاں اس سڑک کا خاتمہ ہوتا تھا۔ سامنے کھیتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ سورج گول تھال کی شکل میں دھرتی کی ہریالی کو نارنجی رنگت میں ڈبوتا افق کے آخری کنارے کو چھو رہا تھا۔ چہار سو پرسکون سناٹا چھایا تھا جس میں گھر لوٹتے پرندوں کی سرسراہٹیں دم توڑ رہی تھیں۔ وہ دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر جمائے تیز تیز سانس لیتی رہی۔ یوں لگتا تھا وہ بہت دور سے دوڑتی ہوئی آ رہی ہے۔ تھوڑا وقت یونہی گزرا۔

پھر اتھل پتھل ہوتی سانسوں میں ہمواریت ظاہر ہوئی۔

اسٹیئرنگ پر بھی سخت گرفت کمزور پڑ گئی۔

تنے ہوئے اعصاب پر ماحول کی خاموشی اثر انداز ہوئی۔ یہی سناٹا دھیرے دھیرے اس کے اندر سرایت کر گیا۔ اس نے ہلکی سی سانس کھینچی، دونوں ہاتھ گود میں رکھ لیے اور خالی خالی نظروں سے افق کے کنارے کو دیکھنے لگی۔

آفتاب کا سفر ختم ہوا۔ وہ جاتے جاتے اپنے رنگ چھوڑ گیا تھا جنہیں دھیرے دھیرے رات کی تاریکی نے نگلنا تھا۔

خیالات کی شوریدہ سری دم توڑ چکی تھی۔

"ہاں، وہ کر سکتا ہے۔ اس کے پاس جواز ہے۔ آخر ان گزشتہ سالوں میں، میں نے اسے دیا ہی کیا۔ بے توجہی، بے اعتنائی، بے رخی۔ یہی تحفے تو ملتے رہے اسے پھر شکوہ کیسا۔؟ اور کس سے....؟" وہ ہارے ہوئے سپاہی کی طرح سوچ رہی تھی جس کے ہتھیار اس کے سامنے پڑے ہوں مگر نہ بازوؤں میں اٹھانے کی سکت ہو نہ دل میں لڑنے کی خواہش۔

"ایمن بی بی! یہ ہار تم نے خود اپنے نصیب میں لکھی ہے۔ آغاز تم نے خود کیا تھا اب انجام تو دیکھو۔" کھیتوں کے پار گاؤں کے گھروں میں روشنیاں جگنوؤں کی طرح ٹمٹمانے لگیں۔ اندھیرے کی چادر دھیرے دھیرے کھلنے اور کائنات پر پھیلنے لگی۔ تھوڑی دور کسی نے آگ جلائی۔ ایمن نے محسوس نہیں کیا۔ آگ کے گرد بیٹھے تین نفوس بار بار پلٹ کر گاڑی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

وہ تو اپنے دم توڑتے وجود پر خود ہی نوحہ کناں تھی۔ اندر کہیں واپسی کی خواہش ہوتی تو ہی حرکت کرتی۔ اسے تو احساس ہی نہ تھا کہ وہ کس طرف نکل آئی ہے۔ واپسی کا رستہ کون سا ہے۔

"پچھتاوؤں کا یہ سفر کہاں تک جائے گا ایمن!"

ایک سایہ سا کھڑکی کے شیشے پر لہرایا پھر کسی نے زور سے شیشے پر ہاتھ مارا۔ وہ بری طرح ڈر گئی۔

گاڑی کے شیشے کو زور زور سے کھٹکھٹاتے وہ کچھ کہہ رہا تھا۔

ایمن نے بوکھلا کر چابی گھمائی اور گاڑی اسٹارٹ کر لی۔

وہ اب دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایمن نے گاڑی ریورس کی۔ وہ شخص لڑکھڑا کر پیچھے گرا۔ ایمن تیزی سے گاڑی نکال لے گئی۔

☆ ☆ ☆

ان کا خیال تھا کہ ماں جی کے لیے یہاں ایڈجسٹ کرنا ذرا مشکل ہو گا مگر اماں جی کے کسی بھی انداز سے ایسا محسوس نہ ہوا۔ وہ خاموشی سے اس گھر کی روٹین کا حصہ بنتی گئیں بلکہ ان کے آنے سے حرا کو بڑی راحت مل گئی۔ فارغ بیٹھنے کی عادی نہ تھیں۔ حرا کالج جاتی تو اس کی غیر موجودگی میں ملازمہ کے سر پر کھڑی ہو کر صفائی کرواتیں۔ کھانا اپنی نگرانی میں پکواتیں بلکہ اکثر تو خود اپنے ہاتھوں سے بناتی تھیں۔ بچے بھی اسکول سے آ کر ان ہی کے ساتھ لگے رہتے۔

بظاہر یہی لگتا تھا، وہ یہاں خوش ہی نہیں اور مطمئن بھی ہیں۔ اب یہ تو کوئی ان کے دل سے پوچھتا جو حویلی کی رونقیں بھولتا ہی نہ تھا۔

"لیموں کے پودوں پر پھول آ گئے ہوں گے۔" یوں ہی چلتے پھرتے لیموں کے پودوں کی ترش و خوش گوار مہک ان کا احاطہ کر لیتی۔

"موتیے کے جھنڈ تو سوکھنے لگے ہوں گے۔"

ہلکی سی مایوسی و اداسی دل میں اترتی پھر ایک ایک کر کے گاؤں کی وہ ساری عورتیں یاد آنے لگتیں جو ان کے پاس اپنے اپنے مسائل لے کر آتی تھیں۔

جائے نماز پر بیٹھی وہ تسبیح کے دانے گرا رہی تھیں مگر ذہن تھا کہ ادھر ادھر ہی بھٹک رہا تھا۔ جب حرا نے جھانک کر پوچھا۔

"اماں جی! آپ فارغ ہو گئی ہیں تو کھانا لگا دوں۔"

انھوں نے اثبات میں سرہلا دیا۔ مغرب کی نماز کے بعد وہ عموماً وہیں جائے نماز پر بیٹھی رہتی تھیں۔ حرا نے کھانا لگایا۔ بچوں کو آواز دی پھر اسٹڈی میں چلی آئی جہاں ڈاکٹر شہروز موٹی سی کتاب میں گم تھے۔

"کلینک سے نکلے اسٹڈی میں گھس گئے۔ زندگی میں کچھ اور بھی ہے یا نہیں۔" اس نے کتاب بند کر کے اس پر دونوں ہاتھ رکھ دیے۔

"کیوں نہیں 'میری زندگی میں بہت کچھ ہے۔ ہمہ وقت دعا کرنے والی ماں 'دو پیارے پیارے شرارتی بچے اور ایک منتظر سی بیوی جو ہمہ وقت میرے ہی پیچھے پڑی رہتی ہے۔"

"اس کے باوجود آپ ہاتھ کم ہی آتے ہیں۔ اب اٹھ جائیں کھانے پر انتظار ہو رہا ہے۔"

باہر سے بچوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ ڈاکٹر شہروز نے ہی اپنی چیزیں سمیٹ لیں۔

"اماں جی ٹھیک تو رہتی ہیں حرا؟" انھوں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ ایڈجسٹ کر گئی ہیں۔"

"نہ بھی کر سکیں تو وہ بتاتی کہاں تھوڑا ہی۔"

"ہوں۔ کل شاہ زیب کا بھی فون آیا تھا۔"

وہ دونوں باتیں کرتے ڈائننگ ٹیبل تک آ گئے 'جہاں اماں جی بچوں کے ساتھ ہلکی پھلکی گفتگو کر رہی تھیں۔

"بچے آپ کے ساتھ بہت مانوس ہو گئے ہیں اماں جی!"

"وہ پہلے بھی میرے ساتھ خاصے مانوس تھے۔" وہ مسکرائیں۔

"اب آپ نے جانے کا نام بھی لیا تو یہ رونے لگیں گے۔" حرا نے کھانا سرو کرنا شروع کر دیا۔

"میں نے کب جانے کا نام لیا ہے۔ میں جانتی ہوں 'مجھے اب واپس نہیں جانا۔" انھوں نے ہاٹ پاٹ سے روٹی نکال لی۔

حرا اور شہروز ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے اماں جی! جب آپ کہیں گی 'میں آپ کو لے چلوں گا۔ ہم تو صرف آپ کے تنہا رہنے کے خیال سے کہہ رہے تھے۔"

وہ چپ کر کے عادل کے منہ میں نوالے دینے لگیں۔ جب سے آئی تھیں 'وہ ان ہی سے کھانا کھاتا تھا۔ ابھی پہلا نوالہ سب کے ہاتھ میں تھا 'جب مسلسل ہوتی بیل نے انھیں ڈسٹرب کر دیا۔

"اس وقت کون آ گیا؟"

ڈاکٹر شہروز اٹھنے لگے تھے حرا نے روک دیا۔

"کریم دیکھ لے گا۔"

کریم کے ساتھ آنے والی ہستی کو دیکھ کر جہاں باقی لوگ حیران ہوئے 'وہیں ڈاکٹر شہروز پریشان ہو کر کھڑے ہو گئے۔

"ایمن ... تم۔"

وہ بے حد پریشان اور حواس باختہ نظر آتی تھی۔ ننگے پاؤں اور جوتے ہاتھ میں۔

"وہ ... میں ..." وہ کچھ کہتے کہتے ہکلائی۔

"ادھر بیٹھو۔" ایک کرسی گھسیٹ کر اسے بٹھاتے ہوئے انھوں نے پانی کا گلاس پکڑا۔

"وہ میرے جوتے ٹوٹ گئے تھے۔" ایمن نے حاضرین کی طرف شرمندہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے جوتے ایک طرف ڈال دیے۔

"تم پیدل آ رہی ہو؟" ڈاکٹر شہروز نے دیکھا اس کے پیر گندے اور دھول سے بھرے ہوئے تھے۔

"جی وہ.... میری گاڑی۔" اس نے پانی کا گلاس لبوں سے لگا لیا۔ وہ بیٹھی نہیں تھی ایک ہاتھ سے کرسی کی پشت سنبھالے کھڑی تھی۔

"خراب ہو گئی؟"

ایمن نے پانی ختم کیا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

"اس میں پٹرول ختم ہو گیا تھا۔ آپ کا گھر نزدیک تھا اس لیے....."

"تم گھر نہیں گئی تھیں۔" ڈاکٹر شہروز نے پوچھا تو ایمن نے شرمندگی سے گردن جھکا لی۔

"کھانا کھاؤ گی؟" انھوں نے اس کے چہرے سے بھوک پڑھ لی تھی لیکن ایمن نے نفی میں گردن ہلا دی۔ تب ہی ڈاکٹر شہروز کو باقی لوگوں کا خیال آیا جو منہ اٹھائے ان ہی کو دیکھ رہے تھے۔

"اماں جی! یہ ایمن ہے۔ میں اسے اسٹڈی میں لے جا رہا ہوں۔ حرا! ایمن کے لیے کھانا وہیں بھجوا دو۔" ڈاکٹر شہروز نے محسوس کیا کہ وہ نہ تو وہاں بیٹھنے پر آمادہ ہے اور نہ ہی کھڑی ایزی فیل کر رہی ہے۔

"آؤ ایمن!" وہ اسے لے کر اسٹڈی کی طرف بڑھ گئے۔

"ممالیہ کون ہیں؟" بچوں نے اشتیاق سے دریافت کیا۔

"خاموشی سے کھانا کھاؤ۔" حرا نے ڈانٹا۔ ناگواری اس کے چہرے سے ہویدا تھی۔ اماں جی نے بغور اسے دیکھا پھر سرسری انداز میں کہا۔

"شہروز کی مریضہ لگتی ہے۔"

"جی اب تو مریضوں نے گھر کا رستہ بھی دیکھ لیا ہے۔" اگرچہ اس نے لہجہ سادہ ہی رکھا تھا مگر اماں جی جانتی تھیں، وہ اندر ہی اندر جھنجلا رہی ہے۔

"ٹرے بنا دو، میں دے آتی ہوں۔" انھوں نے رسانیت سے کہا تو وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

"گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔" ڈاکٹر شہروز نے بے حد احتیاط سے پوچھا۔

"کون گھر والے.... میرا شوہر....." وہ تلخی سے مسکرائی۔

"وہ اس وقت مجھے یاد کرنے کے لیے بالکل بھی فارغ نہیں ہے۔ خوب صورت چہروں کی سنگت میں مجھ جیسے بجھے ہوئے چہرے کسے یاد رہتے ہیں۔"

"میں اسے فون کر دوں۔" ڈاکٹر شہروز نے موبائل نکالا۔

"آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں، میں چلی جاؤں گی۔" وہ زور زور سے انگلیاں مروڑنے لگی۔

"ایمن! میں تمھارے لیے کہہ رہا ہوں۔" انھوں نے بے حد نرمی اور رسانیت سے کہا۔ وہ چپ چاپ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر شہروز خاموشی سے باہر نکل گئے۔ اماں جی ٹرے اٹھائے آ رہی تھیں۔ وہ ذرا کی ذرا رکے۔

"آپ اسے کھانا کھلائیں، میں اس کے گھر والوں کو فون کر کے آتا ہوں۔" انھوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کلینک پر آ کر فائل میں مطلوبہ نمبر تلاش کر کے واپس آنے میں انھیں دس پندرہ منٹ لگے تھے۔ واپس آئے تو وہ کھانا کھا رہی تھی۔ اماں جی پاس ہی بیٹھی تھیں۔ ڈاکٹر شہروز کو دیکھ کر اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔

"اور لو نا۔" اماں جی نے شفقت سے اصرار کیا۔

"بس۔" وہ ٹشو سے ہاتھ صاف کرنے لگی۔ اماں جی نے سوالیہ نظروں سے شہروز کی طرف دیکھا۔ انھوں نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اماں جی مطمئن ہو گئیں۔ ایمن اب سر جھکائے نجانے کیا سوچ رہی تھی۔

"ممی! آج گھر جانے کو جی نہیں چاہ رہا۔"

وہ اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ اماں جی ٹرے اٹھا کر باہر نکل گئیں۔

"آج میں نے اسے دیکھا۔" ایمن نے آہستگی سے سر اٹھایا تو آنکھیں لبالب پانیوں سے بھری تھیں۔

"اپنے شوہر کو، وہ کسی اور کے ساتھ تھا۔ وہ گاڑی میں اس کے برابر بیٹھی تھی، خوش اور مطمئن نظر آ رہی تھی۔"

"تمھیں اچھا نہیں لگا؟"

"میرا گھر تباہ ہو رہا ہے۔"

ڈاکٹر شہروز نے پہلی بار اسے اپنے گھر کی فکر میں مبتلا دیکھا تھا۔ یہ ایک مثبت تبدیلی تھی۔

"تو تمھیں وہاں ہونا چاہیے تھا۔ اپنے گھر میں۔" انھوں نے آہستگی سے جتایا۔

"یہی تو المیہ ہے ڈاکٹر! ایمن کبھی وہاں نہیں ہوتی جہاں اسے ہونا چاہیے۔ ایمن نے ہمیشہ اپنی راہیں خود کھوئی ہیں۔ جب مجھے عثمان کی پناہ میں ہونا چاہیے تھا تب بھی میں ظاہر کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ ایمن بھی یہاں موجود نہیں ہوتی جہاں اسے ہونا چاہیے تھا۔ اسی لیے تو یہ بے سکونی ہے۔"

ڈاکٹر شہروز ایک طویل سانس لے کر رہ گئے۔ انھیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ایمن خود ہی اپنی کہانی سنانے پر آمادہ ہے اور انھیں بہرحال اس بے وقت ٹپک پڑنے والی مریضہ کو اس وقت تک باتوں میں لگائے رکھنا تھا جب تک اس کے گھر سے کوئی لینے نہ آ جاتا۔ گویا ایمن کا اگلا سیشن چند گھنٹوں کے وقفے سے ان کے گھر کے اسٹڈی روم میں شروع ہو گیا تھا۔

٭ ٭ ٭

کچھ عجیب سی کیفیت میں وہ عثمان سے ملنے گئی تھی۔ کوئی خاص تیاری بھی نہ کی۔ یونہی اٹھ کر چلی گئی۔ دروازہ مائرہ نے کھولا تھا۔

"تم...." اس کے انداز میں گرم جوشی مفقود تھی۔

"ہاں میں۔"

وہ رستہ دے کر اندر چلی آئی۔ نہ سلام، نہ دعا، نہ آنے پر خوشی کا اظہار۔ ایمن اس کے رویے پر کچھ حیران ہوتی اندر آ گئی۔ اس کی ممالیہ حسب معمول گرم جوشی سے ملی تھیں۔

"ڈرائنگ روم میں مہمان بیٹھے ہیں، تم مائرہ کے کمرے میں چلی جاؤ۔" انھوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ایمن کو اندازہ ہو گیا مہمان کون ہے۔

"مائرہ کی طبیعت ٹھیک ہے۔" ایمن نے کچھ الجھ کر پوچھا۔

"ہاں، کیوں؟" انھوں نے پلٹ کر حیرت سے پوچھا۔

"مجھے تو ویسے ہی سست لگ رہی تھی۔" ایمن ٹال کر مائرہ کے کمرے میں آ گئی۔

"خیریت گھر آئے مہمان کے ساتھ ایسی بے رخی۔"
مائرہ نے قدرے سنجیدہ اور شاکی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور چپ رہی۔
"مس مائرہ! میں تم سے مخاطب ہوں۔" وہ یہاں آنے سے قبل ہی ذہنی خلجان کا شکار تھی۔ مائرہ کے رویے سے چڑ سی گئی۔
"سن رہی ہوں، بہری نہیں ہوں۔"
"تو اس طرح کیوں بات کر رہی ہو؟" ایمن کو غصہ آ گیا۔ "واپس چلی جاؤں۔"
"مرضی ہے تمہاری۔"
ایمن کو غصہ تو شدید آیا مگر کچھ بے بس ہو کر ایک طرف بیٹھ گئی۔ کچھ دیر دونوں کے مابین خاموشی چھائی رہی پھر مائرہ نے رخ بدل کر اسے دیکھا تو ایمن پوچھ بیٹھی۔
"اس طرح کیوں بی ہیو کر رہی ہو؟"
"تو کیا کروں، تم نے مجھے بہت شرمندہ کروایا ہے ایمی!"
"میں نے....." ایمن نے کچھ حیرت سے پوچھا۔ ذہن عفان کی طرف گیا۔ شاید اس نے کچھ کہا ہے، پہلا خیال یہی آیا تھا۔
"میں نے کیا کہا ہے؟" اس کا لہجہ خود بخود مدھم ہو گیا۔
"ایمی!" مائرہ نے فیصلہ کن انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ "تم نے وہ سارے گفٹ کس کو دیے تھے؟"
"کون سے؟"
"انجان مت بنو، وہ سب کچھ جو تم میرے ساتھ جا کر خرید لائی تھیں جس کے بارے میں تم نے اپنی ممی سے جھوٹ بولا کہ مائرہ کی برتھ ڈے ہے۔" وہ چبا چبا کر بولی۔
"اوہ، تو تم اس لیے ناراض ہو۔"
"وہ سب کچھ عفان کے لیے نہیں تھا۔"
ایمن کچھ لمحے اسے دیکھتی رہی پھر آہستگی سے بولی۔
"میں نے تم سے کب کہا تھا کہ وہ سب عفان کے لیے ہے۔"
"تو پھر وہ سب کس کے لیے تھا ایمن! اور میں..... میں بے وقوف عفان سے کہہ بیٹھی کہ ایمن نے آپ کے لیے بہت کچھ خریدا ہے۔"
ایمن کو عفان کی فکر نہ تھی کہ وہ اسے خود بتا چکی تھی۔
"تم نے خود ہی فرض کر لیا۔ میں نے بتایا تو تھا کہ....."
"ایمن! تم نے وہ سب کچھ کس کو دیا تھا۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ میں کس قدر پریشان رہی ہوں۔ تم گھر میں بھی جھوٹ بول کر گئی تھیں۔" مائرہ واقعی پریشان تھی۔
"تم سے کس نے کہا؟" ایمن نے پوچھا۔
"تمہاری ممی نے اور کس نے۔ ایمی..... بتاؤ۔ تم نے وہ سب کس کو دیا؟"
مائرہ نے بے اختیار اس کے قریب آ کر جھنجوڑ ڈالا۔
"تم مجھ پر شک کر رہی ہو مائرہ!" ایمن اپنا آپ چھڑا کر پیچھے ہٹی۔

"تم بتاؤ گی نہیں تو میں کیا کر سکتی ہوں۔"
ایمن پلٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔
"میں نے وہ سب طاہر بھائی کو دیا تھا۔" کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے بتا دیا۔
"کون طاہر بھائی؟" مائرہ کچھ لمحے کو غائب دماغ ہوئی پھر بری طرح چونکی۔ "وہ تمہارے ٹیوشن ماسٹر!"
"وہ صرف ٹیوشن ماسٹر نہیں ہیں۔" ایمن ناگواری سے گویا ہوئی۔ "وہ میرے کزن بھی ہیں۔"
"تم جھوٹ بول رہی ہو۔"
"میں تمہارے سامنے جواب دہ نہیں ہوں مائرہ!" ایمن کو غصہ آ گیا۔ "لیکن تم میری واحد دوست ہو اس لیے بتا رہی ہوں کہ طاہر بھائی میرے کزن ہیں اور ان کے دادا میرے نانا جان ہیں۔" اس نے مختصر ترین الفاظ میں باقی تفصیل سنائی۔
مائرہ بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی پھر ایمن کے چپ ہونے پر سر جھٹکتے ہوئے بولی۔
"تم مجھے فلمی کہانی سنا رہی ہو۔"
"تم جو مرضی سمجھو۔" ایمن نے رکھائی سے کہا اور اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی جہاں سے پچھلا صحن دکھائی دیتا تھا۔
مائرہ متذبذب سی اس کی پشت کو گھورتی رہی۔
"اب عفان سے کیا کہو گی؟"
"میں ابھی عفان کے سامنے بھی جواب دہ نہیں۔ سارہ! پلیز ہماری صرف منگنی ہوئی ہے نکاح نہیں۔ ابھی میں اپنے باپ کے گھر میں بیٹھی ہوں۔" ایمن کے لہجے میں تلخی در آئی۔
"عفان بھائی! تم سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟" مائرہ نے اس کے لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ گویا عفان اس سے کہہ چکا تھا۔
"وہ خود جانتے ہوں گے۔ بہرحال ملنے کی خواہش میں نے نہیں کی تھی اور نہ مجھے یہ معلوم تھا کہ مجھے اپنے ہر عمل کے لیے ہر کسی کے سامنے یوں جواب دینا ہوگا۔"
"یہ بات نہیں ہے ایمن! اور اصل تم جھوٹ بول کر گئی تھیں اس لیے....." مائرہ نے صفائی دینا چاہی، ایمن نے تیزی سے اس کی بات قطع کی۔
"تم میرے حالات بہت اچھی طرح سے جانتی ہو مائرہ! اگر مہرالنسا بیگم کو معلوم ہو جاتا تو کیا وہ مجھے اپنے ننھیالی عزیزوں سے ملنے دیتیں۔ وہ تو کیا شاید ڈیڈی بھی ایسا نہ چاہیں۔ میں انہیں کھونا نہیں چاہتی کسی بھی قیمت پر نہیں اور تم لوگ ہو کہ میری اتنی سی خوشی بھی برداشت نہیں کر رہے۔"
مائرہ نے اپنے قریب عفان کی موجودگی کو محسوس کیا۔ سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر خاموشی سے باہر نکل گئی۔ وہ آہستگی سے چلتا ہوا ایمن کے عقب میں جا کھڑا ہوا۔ ایمن چپ ہو گئی تھی۔
"کیسی ہو ایمی؟"
ایک بار تو ایمی کا دل ڈوب کر ابھرا پھر وہ تیزی سے پلٹی۔

باقی آئندہ شمارے میں

میمونہ خورشید علی
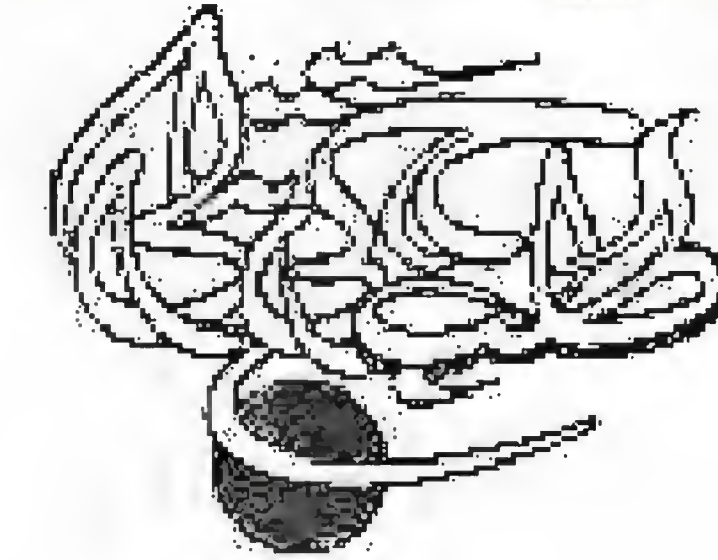
جب نبیل اماں سے لڑ کر گھر سے نکلا تو وہ رو رہی تھیں۔ آنسو صاف کرتے ہوئے اچانک ان کی نگاہ جھاڑو سے پڑی جو سیدھی کھڑی تھی۔ بس پھر کیا تھا اماں کی توپوں کا رخ میری طرف ہو گیا۔

"کم بخت کو ہزار بار کہا ہے جھاڑو کو سیدھا نہ کھڑا کیا کر اس سے گھر میں جھگڑا ہوتا ہے۔ مگر باز ہی نہیں آتی۔ نجانے کیا کرو گی کر کے یہ لڑکی۔"

اماں کے ایمان و اعتقاد پہ حسب معمول مجھے ہنسی آنے لگی۔

"اس میں جھاڑو کا کیا قصور ہے؟ قصور تو آپ کی سوچ کا

مکمل ناول

بے نہ جیتے کو سر پہ چڑھاتیں نہ آج یہ نتیجہ بھگتنا پڑتا۔"
میں سوچ کر رہ گئی۔ اماں سے بحث کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔
میں جانتی تھی اماں ان توہمات پہ دل سے کاربند ہیں اسی لیے میں کچھ الٹا سیدھا ضرور کرتی رہتی۔ یہ سب کچھ کر کے میں دراصل ان محرومیوں کا بدلہ لیتی تھی جو مجھے بچپن سے ملی تھیں۔ بچپن سے ہی میں سب بہن بھائیوں سے مختلف تھی۔
بقول اماں کے میں ددھیال والوں پہ چلی گئی تھی اور ددھیال والے اماں کو ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ اس لیے اماں مجھ سے بھی محبت نہیں کرتی تھیں۔ رہی سہی کسر اس طرح پوری ہو گئی کہ میری پیدائش کے بعد ابا فوت ہو گئے۔

اماں کا بس نہ چلتا تھا کہ مجھ منحوس کو اٹھا کر باہر پھینک دیتیں۔ انھوں نے مجھے ایک طرف ڈال دیا اور یوں بڑی جتنوں سے مجھے پالا۔
اماں کی ناانصافیوں نے میرے اندر جارحیت اور ہٹ دھرمی پیدا کر دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتی تھی۔ اور اماں ان سے تو میرا ہمیشہ معرکہ رہتا۔ نتیجتاً "وہ میری خوب ٹھکائی کرتیں۔" تب میں بہت چھوٹی تھی اور بہ آسانی اماں کے ہاتھ لگ جایا کرتی لیکن ذرا سی بڑی ہوئی تو پیچھے ہی اماں جوتی اٹھاتیں میں گھر سے بھاگ جاتی اور گلی محلے کے لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں مشغول ہو جاتی۔ نبیل میرے ساتھ ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ گلی کے سارے لڑکوں سے میری اچھی خاصی دوستی تھی۔
نبیل مجھ سے ڈیڑھ برس ہی چھوٹا تھا۔ لیکن اماں کی بے پناہ توجہ اور بالی بہنوں کی محبت کی وجہ سے وہ بالکل چھوئی موئی اور ڈرپوک سا تھا۔
میری وجہ سے اسے بھی گلی میں کھیلنے کا حوصلہ ہو جاتا۔ پھر جب شام ڈھلے ہم دونوں گھر آتے۔ تو نبیل کو نہلا دھلا کر اسے صاف ستھرے کپڑے پہنا کر اماں اپنے ہاتھ سے لسی کی چوریاں کھلاتیں اور مجھے وہی بس تھی کی جاتی جس سے بچ کر میں گھر سے بھاگی تھی۔ مجھے اماں کا یہ دوہرا رویہ سخت برا لگتا تھا اور اپنی ان دونوں بہنوں کا بھی جو ہمہ وقت اماں کی چمچیاں بننے کی کوشش میں لگی رہتیں۔ مجھے اماں، صدف اور انیلا پہ ہی غصہ آتا تھا نبیل سے میری کبھی لڑائی نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ ڈرپوک اور بدھو سا تھا۔ اور اماں جو اسے چوریاں کھلاتی تھیں۔ وہ مجھے بچا کر چھپا کر رکھ دیا کرتا۔ اس لالچ میں کہ میں اسے باہر لے کر جاؤں گی۔
اماں نے جب ہمارے درمیان اتنی دوستی دیکھی تو انھیں کوئی خیال آیا کہ ہم دونوں کو ایک ہی اسکول میں داخلہ دلوایا جائے۔ مقصد یہ تھا کہ ان کا لاڈلا میری تحت جگہ محفوظ رہ سکے۔
اسکول جاتے ہوئے اماں مجھے خوب سمجھاتیں۔
"بھائی کا خیال رکھنا، دیکھنا دوسرے بچے اسے نہ ماریں۔ اسے پیاس لگے تو اس تھرماس سے پانی پلا دینا۔ یہ چپس بھائی کا پراٹھا ہے اور یہ تمہاری روٹی۔ یہ چاکلیٹ باکس بھائی کا بستہ لے کر تم آ جایا کرو۔ بھائی ابھی چھوٹا ہے اور کمزور بھی بہت ہے۔"
یہ نصیحتیں میں گھر کے دروازے تک سنتی۔
باہر نکلتے ہی میں سب کچھ نبیل کو تھما دیتی اور اسے ڈنڈے سے ہانکتی ہوئی چلتی۔
بریک میں پراٹھا خود کھاتی۔ روٹی اسے کھلانے کی کوشش کرتی۔ وہ کھا لیتا تو ٹھیک۔ ورنہ روٹی بھی خود ہی کھا لیتی۔ یہ بازار کی چیزیں کھانے کا شوقین تھا۔ اماں سے ملنے [illegible] دیتی تھیں۔ اس [illegible] خوش ہو جاتا۔
اس نے کبھی گھر آ کر اماں سے میری شکایت نہیں کی۔ کیونکہ اسے اچھی طرح پتا تھا جب بچے اسکول میں اسے مارتے تھے۔ تو میں ہی تھی کہ ان کی ایسی ٹھکائی کرتی کہ وہ آئندہ کے لیے توبہ کر لیتے تھے۔ دوسرے مجھ سے جھگڑنے کا مطلب تھا۔ اسے گھر میں قیدی بن کر رہنا پڑتا۔
"نبیل یہ کھالو، نبیل وہ کھالو، نبیل اوپر نہ چڑھو، تیز نہ دوڑو، یہاں لیٹ جاؤ، چپ کیوں بیٹھے ہو۔"
تینوں عورتوں کی ان ہدایات کی وجہ سے نبیل بھی دل ہی دل میں فرار کے راستے تلاش کرتا تھا اور وہ فرار میں ہی اسے دلوا سکتی تھی۔ یہ پرائمری دور تو گزر گیا۔ مڈل میں ہم دونوں علیحدہ ہو گئے۔ اماں تو نہیں چاہتی تھیں کہ ہمیں علیحدہ کریں لیکن میری اٹھان دیکھ کر انھیں اپنے دل پہ پتھر رکھنا پڑا۔
میرا قد کیا ہی نکلا چلا گیا تھا اور ایسا قد نکلا کہ میں نے صدف اور انیلا دونوں کو ہی پیچھے چھوڑ دیا۔ میں سمجھتی ہوں اللہ کے ہر کام میں ضرور انسان کے لیے بھلائی ہوتی ہے۔ اگر میرا قد کاٹھ نہ نکلتا تو مجھے اب بھی انیلا اور صدف کی اترن پہننا پڑتی۔ لیکن اب معاملہ الٹ تھا۔ ہر گرمی سردی کے آغاز میں اماں کو سب سے پہلے میرے کپڑے بنوانے کی فکر ہوتی اور میں قدرت کے اس احسان پر دل و جان سے شکر گزار بھی لیکن جوں جوں وقت گزر رہا تھا مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ میں اپنی تمام کلاس فیلوز سے لمبی اور علیحدہ نظر آتی ہوں۔ میری آواز بھی کچھ بھاری سی تھی۔
اپنی ہم عمر لڑکیوں کو چھوٹی موٹی سا پا کر مجھے اندر ہی اندر احساس کمتری نے آ گھیرا۔ میرے اندر شدت سے خواہش ابھرتی کہ میں بھی ان تمام لڑکیوں کی طرح عام سی لڑکی ہوتی لیکن یہ احساس زیادہ دیر تک باقی نہ رہ سکا۔
پھر کالج میں داخلہ ہوتے ہی میری دوستی نگہت سے ہوئی۔ نگہت چھوٹی موٹی سی خوب صورت ترین لڑکی تھی۔ میں اس کی تعریف کیا کرتی لیکن وہ تو خود میرے قد کی دیوانی نکلی اور پھر مجھے معلوم ہوا۔ فقط وہی نہیں بہت سی لڑکیاں میری ہائٹ کو توصیفی نگاہوں سے دیکھتی ہیں اور یہ ہائٹ میری پہچان بن گئی ہے۔ قد میرا لمبا ضرور تھا لیکن نسوانیت کا میں مکمل پیکر تھی۔
اور نگہت کی شخصیت کا نتیجہ تھا کہ نگہت نے مجھے [illegible] کا موقع دیا اور اس طرح میں پورے کالج میں مقبول ہو گئی۔
کالج کے ان چار سالوں نے میرے اندر کی اس لڑکی کو ختم کر دیا جو اپنے قد اور آواز کی وجہ سے احساس کمتری کا شکار ہو رہی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کب اور کیسے میری فطری جارحیت، ہٹ دھرمی نرم اور حساس سی طبیعت میں ڈھل گئی۔
بالآخر کالج کے چار سال بھی گزر گئے اور مجھے پھر گھر کی چار دیواری میں بیٹھنا پڑا۔ صدف کی شادی کے بعد انیلا کی شادی کا سلسلہ چل رہا تھا۔ اماں نے ساتھ ہی مجھے بھی ٹھکانے لگانے کا سوچا اور میرے رشتے کے لیے ہاتھ پیر مارنے لگیں۔ لیکن اگر رشتے اس طرح آسانی سے ملتے تو کیا ہی بات تھی۔
یوں انیلا گھر سے اکیلی ہی رخصت ہوئی۔ اماں کو اس بات کا قلق تو بہت ہوا۔ پھر انھوں نے شاید یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ مجھے ابھی تربیت کی ضرورت ہے۔
"یہ تم لڑکوں والا حلیہ کیوں بنا رکھا ہے۔ جب دیکھو نبیل کی ٹراؤزر اور شرٹ پہنے پھرتی رہتی ہو۔ محلے کی عورتیں میرے پاس آتی ہیں کیا کہتی ہوں گی کہ ساجدہ کی تیسری بیٹی لونڈوں کی طرح پھرتی ہے۔"
"تو آپ کہہ دیں ناں ان سے کہ یہ بھی میرا بیٹا ہی ہے۔"
"توبہ توبہ توبہ۔" اماں نے ناگواری سے گال پیٹے۔
"اللہ کی پناہ میرے لیے تو ایک بیٹا بہت ہے۔ اللہ اس کو زندگی دے۔" اماں کی بات پہ میں نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ اور نبیل کی موٹر سائیکل کی چابی اٹھا کر نکل گئی۔
"ایسا بیٹا ہونے سے تو بہتر تھا کہ یہ بھی بیٹی ہی ہو جاتی۔"
میری بات پہ اماں کے دل پر گھونسا تو لگا لیکن دل ہی دل میں انھوں نے ماتم ضرور کیا ہو گا۔
ان کے بے جا لاڈ پیار کی وجہ سے نبیل بگڑتا چلا گیا تھا۔ نہ تو وہ میٹرک کے بعد آگے تعلیم حاصل کر سکا۔ اور نہ ہی اس کے اندر یہ احساس ذمہ داری پیدا ہوا کہ وہ اس گھر کا واحد چشم و چراغ ہے اور اس پہ کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ الٹا وہ اماں سے نت نئے مطالبات کرتا رہتا جنہیں اماں کو ماننا ہی پڑتا کیونکہ اگر وہ انکار کرتیں تو وہ دو دو دن اپنی شکل ہی نہ دکھاتا۔ جس سے مجھے تو کوئی پریشانی نہ ہوتی البتہ اماں کی چارپائی کے نیچے آگ لگ جاتی اور آٹھ پہر بیٹھیں تسبیح کرتیں۔ اس میں بھی اکیلی اماں ہی قصوروار نہیں تھیں۔ صدف اور انیلا کا بھی برابر کا ہاتھ تھا جنہیں وہ اب بھی بچہ ہی سمجھتا تھا۔
بلکہ میرا معاملہ ذرا کچھ اور تھا۔ میں اسے خاص اہمیت نہیں دیتی تھی۔ انیلا اور صدف کی طرح اس کی خدمتیں بھی نہیں کرتی تھی۔ کبھی اسے کھانا نکال کر نہیں دیا اور ناشتہ بنانے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ میں صبح کبھی جلدی اٹھی ہی نہیں تھی۔ اماں جز بز ہوتیں لیکن میں سنی ان سنی کر دیتی۔

جس شخص کو میں جانتی تک نہیں اس کے حوالے خود کو چپ چاپ کر دینا کتنا عجیب لگتا ہے۔
یہ خیال آتے ہی میری ساری شرم و حیا رفو چکر ہو گئی اور میں نے بڑے اطمینان سے میک اپ اور زیور اتار کر کپڑے تبدیل کیے اور صوفے پہ بیٹھ گئی۔
یہ تو میں جانتی تھی کہ مضراب محمود پڑھا لکھا ہے اور اس کی اسپیئر پارٹس کی بہت بڑی دکان ہے جو شخص بڑے صنعتی اداروں سے ڈیلنگ کرتا ہے کیسے ممکن ہے کہ اسے گفتگو کا سلیقہ نہ آتا ہو۔ وقت کی سوئیاں رک رک کر چل رہی تھیں۔ اور نت نئے خیالات دبے پاؤں میرے نزدیک آ رہے تھے۔
تب ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور محترم اندر تشریف لے آئے۔ چہرے پہ عجیب کھسیانی سی ہنسی سجائے سفید اچکن اور پاجامے میں ملبوس وہ شخص میری طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے مجھے سلام کیا اور میرے نزدیک آ گیا۔
"دراصل میں اپنی بہنوں کو نیگ دے رہا تھا۔ اسی وجہ سے دیر ہو گئی۔ میری بہنوں کو میری شادی کا بہت ارمان تھا۔ مگر میں شادی پہ آمادہ نہیں تھا۔ (یہ مجھ سے کس قسم کی گفتگو کر رہا ہے) سوچتا تھا نجانے آنے والی کیسی ہو۔ کہیں وہ ہم بہن بھائیوں کو ایک دوسرے سے دور نہ کر دے مگر اب یہ بھی ممکن نہیں تھا وہ مجھے کنوارہ ہی رکھتیں۔ اس لیے انہوں نے اپنی کوششیں جاری رکھیں اور میرے سر پہ سہرا سجا ہی دیا۔"
یہ کہتے ہوئے وہ پھر کھسیانے سے انداز میں ہنسا۔
"اب یہ آپ پر منحصر ہے کیسے ان رشتوں کو نبھاتی ہیں۔ میری پانچ بہنیں ہیں اور میں ان کا اکلوتا بھائی ہوں۔ دو بہنیں مجھ سے بڑی ہیں اور تین مجھ سے چھوٹی ہیں۔ امی نے آپ کا انتخاب کیا ہے تو ضرور آپ میں کچھ صلاحیتیں دیکھی ہوں گی۔ میں نے تو آپ کے متعلق کچھ بھی جاننے کی کوشش نہیں کی۔ سب کچھ گھر والوں پہ چھوڑ دیا تھا۔ اگر آپ میرے گھر والوں کو خوش رکھیں گی تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔"
(یعنی کہ میں بلاواسطہ نہیں بالواسطہ تم تک رسائی حاصل کروں گی) میں اس کی گفتگو پہ اندر ہی اندر تلملا رہی تھی۔
"ارے میں بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں۔" اس کی وہی کھسیانی سی ہنسی جس سے مجھے اب چڑ ہونے لگی تھی۔
"میرا نام مضراب محمود ہے۔ میں سیدھا سادہ سا شریف بندہ ہوں۔ آپ سے پہلے میری زندگی میں کوئی عورت نہیں آئی۔"
"عورت!" میں چلا کر احتجاج بھی نہ کر سکی۔
"آپ پہلی خاتون ہیں اور شاید آخری بھی۔" اس نے اسی کھسیانی ہنسی سے کہا تو میرا دل لہولہان ہو گیا۔ اگر وہ یہی جملے کسی اور طرح سے کہتا تو میں ہواؤں میں اڑنے لگتی۔ پھر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک سرخ مخمل کی ڈبیا نکالی اور اسے میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔
"یہ میری طرف سے آپ کی رونمائی ہے۔ بس جلدی میں تو یہی بن سکی تھی۔ اگر آپ کو کچھ اور پسند ہو گا تو میں لا دوں گا۔"
اور میں نے ذہن پہ زور ڈالنے کی کوشش کی کہ جو مرد اپنی بیوی کو رونمائی میں انگوٹھی دیتا ہے وہ کن خصوصیات کا مالک ہوتا ہے۔ مگر لاکھ کوشش کے میں یاد نہ کر پائی۔ اس کے تحفہ دینے کا انداز ہی اتنا نرالا تھا کہ میری سوچ جامد ہو کر رہ گئی۔
"آپ شاید میری باتوں سے بور ہو رہی ہیں۔
اگر آپ کہیں تو میں خوب بولتا رہتا ہوں۔"
اب اس کی باتیں میری برداشت سے باہر تھیں۔
"آپ کچھ بول نہیں رہیں۔ بولتا تو میں بھی زیادہ نہیں ہوں۔ بس آپ کی وجہ سے بول رہا ہوں۔ آخر اس خاموشی کو کسی ایک نے تو توڑنا ہی ہے۔"
وہ یہ کہہ کر ہلکا سا مسکرایا تھا میں ٹس سے مس نہ ہوئی بیٹھی رہی اور سوچتی رہی۔
کیا کوئی شخص اتنا بدھو بھی ہو سکتا ہے۔ اسے یہ بھی احساس نہیں ہوا کہ میں سمجھ رہی ہوں کہ "بیک" کیوں ہوں۔ آخر وہ کچھ تو احتجاج کرتا۔ لعن طعن کر کے ناراض ہوتا۔ پھر سر اٹھا کر مجھ کو تکتا۔
"لگتا ہے آپ بہت تھک گئی ہیں۔"
میں نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔
"ارے یہ سب سامان کون رکھ گیا تھا؟" اس کی نگاہ رکھی اشیاء کی طرف اب گئی تھی۔
"لگتا ہے یہ میری بہنوں کی کارگزاری ہے۔ شاید یہ بھی کوئی رسم ہوگی۔" اس کی لاعلمی تھی یا جان بوجھ کر بن رہا تھا۔ دونوں میں سے جو بھی وجہ تھی مجھے سخت زہر لگ رہی تھیں اس کی باتیں۔
"لڑکیوں کو تو ویسے بھی بہت سی پٹیاں پڑھانے والی مل جاتی ہیں۔ مگر میرا تو کوئی قریبی دوست نہیں ہے جو مجھے یہ سب کچھ بتاتا۔ آپ کو تو ان سب رسومات کا علم ہوگا۔"
اس نے مٹھائی کا ڈبہ اٹھاتے ہوئے کہا تو میں جل کر خاک ہو گئی اور میرا دل چاہا کہوں جی ہاں میں تو دس کو بھگتا کر آئی ہوں۔
"مٹھائی میں کون سی چیز آپ کی فیورٹ ہے؟"
بجائے کچھ اٹھا کر میرے منہ میں ڈالنے کے اس نے سارا ڈبہ ہی میرے آگے کر دیا۔
مجھے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ میری قسمت پھوٹ چکی ہے اور میرے خواب ریزہ ریزہ ہو چکے ہیں۔ یا تو یہ شخص بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ یا واقعی ایسا ہے۔ اگر واقعی مسٹر شوہر ایسے ہی ہیں تو زندگی تو ہو گئی عذاب۔
میں تنگ کر اس کے نزدیک سے اٹھ گئی۔
"مجھے کچھ نہیں کھانا۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"
اس نے مٹھائی کا ڈبہ رکھ کر فوراً میری کلائی پکڑ لی۔ اس کی گرفت اتنی کمزور تھی کہ میں نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔ لیکن اس نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔
"اگر آپ کی طبیعت خراب ہے تو آرام کر لیجیے۔ میں آپ کو کچھ نہیں کہوں گا۔"
مجھے تو پہلے ہی ایسے حالات دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی اتنی بے اعتنائی پہ میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔
اور میں خود بھی سمجھ نہ پائی کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ میں جو مضراب کے آنے سے پہلے سوچ رہی تھی کہ پہلے انڈر اسٹینڈنگ ہو گی پھر۔ اب نہ جانے کیوں اس کی سرد مہری مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔
"ارے آپ رو رہی ہیں؟" وہ کچھ پریشان ہو گیا۔ اور اس کا پریشان ہونا مجھے پہلی بار کچھ اچھا لگا۔ کم از کم اس پریشانی کا محور صرف اور صرف میں تھی۔ وہ میرے نزدیک آ گیا۔
"اگر آپ آرام کرنا چاہتی ہیں تو آرام کر لیجیے۔ میں آپ کو کچھ نہیں کہوں گا۔"
اس نے نہایت سادگی سے یہ جملے کہے اور اپنی اچکن وغیرہ اتارنے میں مصروف ہو گیا۔ پھر وہ کمرے سے ملحقہ واش روم میں چلا گیا۔
میں تکیے میں منہ گھسیڑ کر لیٹ گئی اور چپکے چپکے اپنی قسمت پہ آنسو بہانے لگی۔
پھر جیسے ہی اس نے لائٹ آف کی میری ساری حسیات بیدار ہو گئیں۔ ظاہر ہے کمرے میں آرام کرنے کے لیے فقط ایک ہی بستر تھا اور جب اس نے یہ پوچھا۔
"اگر آپ پسند کریں تو میں یہاں لیٹ جاؤں؟" تو میرے سارے ہی اندازے غلط ہو گئے۔ اور میرا جی چاہا کہ میں چیخ چیخ کر رو دوں۔
"چلو ٹھیک ہے۔ اگر آپ کو پریشانی ہوتی ہے تو میں ادھر صوفے پہ لیٹ جاتا ہوں۔ ویسے بھی دن تو نکلنے ہی والا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ دوسری طرف جانے لگا تو میں تنگ کر بستر سے اٹھ گئی۔
"اگر میری وجہ سے آپ یہ ڈرامہ کر رہے ہیں تو میں ادھر صوفے پہ لیٹ جاتی ہوں۔" رونے کی وجہ سے میری آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور لہجے میں تڑپ تھی۔ وہ حق دق میرا چہرہ دیکھنے لگا۔
یہ کہتے ہوئے میں صوفے کی طرف بڑھ گئی۔ نیند تو مجھے کیا آنی تھی۔ بس کروٹیں ہی بدلنا تھیں چاہے بیڈ ہو یا صوفہ۔ میں نے آنکھیں میچ لی تھیں۔ میں اس فلاپ منظر سے غائب ہو جانا چاہتی تھی۔ مگر آنکھوں میں ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیاں تھیں وہ نیند کو کوسوں دور بھگا رہی تھیں۔
کچھ دیر تک تو کمرے میں خاموشی رہی۔ پھر وہ کمرے سے چلا گیا۔
اس کے جانے کے بعد جو میں اتنی دیر سے گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی۔ دل کھول کر روئی پھر نجانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

☆ ☆ ☆

کمرے کا دروازہ ظاہر ہے کھلا ہوا تھا۔ اس لیے میری شادی شدہ نندیں کمرے میں آ گئیں۔ ان کے پیچھے پیچھے ان کے بچے بھی آ گئے اور کنواری نندیں بھی۔ شور سے میری آنکھ کھلی تو بڑی نندیں بچوں کو شور کرنے اور چیزوں کو چھیڑنے سے روک رہی تھیں۔
اتنے سارے افراد کو اپنے سر پہ دیکھ کر پہلے تو مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا کیونکہ ماشاءاللہ روز تو دس بجے سو کر اٹھتی

تھی۔ وہ بھی فقط اماں کی ڈانٹ پھٹکار کے بعد۔
پھر یک دم ہی میرا ذہن بیدار ہو گیا۔ اب میں اماں کے گھر میں نہیں تھی۔
"ہم لوگوں کی وجہ سے آپ کی نیند خراب ہو گئی۔ گیارہ بج رہے ہیں ناشتہ کریں پھر سو جائیں۔" یہ میری بڑی نند تھی۔ جو خدا کو ہی خوش مزاجی کا ذرا اہتمام کر رہی تھی۔ میں خود کو سنبھالتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔
"تم لوگ بچوں کو لے کر باہر جاؤ۔ ہم ابھی آتے ہیں۔" دوسری والی نند میرے قریب بیٹھ گئی۔
میں اپنے حنائی ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ میرے ہاتھوں پہ مہندی سج کر رچی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی کہ میں نے زندگی میں پہلی بار مہندی لگائی تھی۔ مہندی کی وجہ سے میرے ہاتھ بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔ اس سے قبل میں عام لڑکیوں کی نسبت اپنے ہاتھوں کو بڑے لاپروائی سے دیکھتی تھی۔ لیکن آج اپنے ہاتھوں کا حسن دیکھ کر میں خود بھی حیران تھی۔ یہ چوڑیوں اور مہندی کا حسن تھا یا دلہن کا مجھ پر بہت روپ چڑھا تھا۔
"ہم نے آپ سے چند باتیں کرنی ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ آپ ہمیں فریش ملیں گی۔ لیکن ابھی تو آپ۔۔۔" جملہ ادھورا چھوڑتے ہوئے وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔
میں کچھ خجل سی ہوتے ہوئے واش روم میں چلی گئی۔ واش روم میں جانے کے بعد میرے ذہن میں رات کی باتیں تازہ ہو گئیں اور میں معتراب کی شخصیت میں الجھنے لگی۔ رات اس نے مجھ پہ ذرا بھی اچھا تاثر نہیں چھوڑا تھا آخر وہ مجھ سے ہر بات پوچھ پوچھ کر کیوں کر رہا تھا۔ کیا دنیا میں ایسے مرد بھی ہوتے ہیں؟
وہ شخص لگتا ہے مجھے کتنا کمزور اور بے وقوف تھا۔
میں نے شاور لیا تھا۔ وہیں کھونٹی پہ میرا سادہ لباس اور ایک عدد نائٹی بھی لٹک رہی تھی۔ میں نے وہ سادہ کاٹن کا سوٹ پہن لیا۔
جب واش روم سے باہر نکلی سینٹرل ٹیبل پہ ناشتے کے انواع و اقسام کے لوازمات رکھے تھے۔ رات کا تمام کھانے پینے کا سامان وہاں سے غائب تھا۔ معتراب صاحب صوفے پر ایستادہ تھے۔ کریم کلر کے قمیص شلوار میں ملبوس وہ رات کی نسبت نکھرا نکھرا سا اچھا لگ رہا تھا۔
اسے سامنے دیکھ کر مجھے یک دم حیا سی آ گئی اور میں جو تولیہ بالوں میں لپیٹے بنا دوپٹے کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ جلدی سے دوپٹہ اٹھا کر اوڑھ لیا۔ یہ میری اچانک لاشعوری حرکت تھی۔
میرا ارادہ تھا کہ بال کھول کر سکھاؤں۔ لیکن میرا ارادہ بھانپتے ہوئے اس نے کہا۔
"ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ پہلے ناشتہ کر لو۔ پھر بال بنا لینا۔"
مجھے اس کے اس خشک رویے پہ چپ لگ گئی۔
اس کی رات والی ساری زیادتیاں تازہ ہو گئیں۔
"مجھے ناشتہ نہیں کرنا۔" میں نے اکھڑے ہوئے انداز میں کہا۔
"مجھے پتا ہے کہ تم مجھ سے جس بات پہ ناراض ہو۔ مگر تم فکر نہ کرو۔"
میں جو آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ شرمندہ ہو کر رہ گئی مجھ میں اتنی ہمت بھی نہ ہو سکی کہ پلٹ کر اسے دیکھوں۔ آئینے میں میں نے اسے دیکھا۔ وہ بے حد سنجیدگی سے ناشتہ کرنے لگا تھا۔ رات کی نسبت اس وقت وہ خاصا پُراعتماد لگ رہا تھا۔
وہ ناشتہ کر کے کمرے سے چلا گیا۔ میں ناشتے کی ٹیبل پہ آ گئی۔
اس وقت میں ایک پیالی چائے ہی پی سکی جو کہ ٹھنڈی اور بدذائقہ تھی۔ اس کے لفظوں کی بازگشت مجھے اب بھی شرم سار کر رہی تھی۔ اتنی بڑی بات کو اس نے کس قدر معمولی انداز میں کہہ دیا تھا۔ اس پہ میرا کیا تاثر پڑا ہے؟ میں جانے کب تک اس بات پہ غور و فکر کرتی۔ مگر میری دونوں نندیں پھر سے میرے کمرے میں آ گئیں۔ ان کی آنکھوں میں شرارت اور ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی۔
"ہمارا بھائی آپ کو کیسا لگا؟" ہما نے مجھ سے پوچھا۔
میں اس بات کا کیا جواب دیتی۔ میں تو خود الجھی ہوئی تھی۔
"تو بھلا یہ بھی کوئی بات ہے پوچھنے کی۔" امبرین نے ہنس کر کہا۔ پھر کہنے لگیں۔ "یہ تو وقت کے ساتھ ساتھ ہی تم دونوں ایک دوسرے سے واقفیت حاصل کرو گے۔ لیکن اپنے بھائی کے بارے میں اتنا ضرور بتاؤں گی کہ وہ ہم پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ ہمارے ساتھ کھیلا کودا ہے اسی وجہ سے تھوڑا شرمیلے مزاج کا ہے اور طبیعتاً بھی سادہ ہے۔ تم اس کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی ہو اس لیے معتراب تمہیں عام لوگوں سے مختلف لگے گا۔ وہ ہم سب سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس نے باہر کی دوستیاں نہیں پالیں۔ ہم سب بہن بھائی ہی ایک دوسرے کے دوست رہے ہیں۔ مگر لحاظ اور ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔ ہم بہنیں تو پھر بھی ایک دوسرے سے فری ہو جاتی ہیں۔ لیکن معتراب ہم سے بھی محتاط ہی رہا ہے۔ اس لیے ہم چاہتے تھے کہ خاندانی اور نیک سیرت لڑکی لائیں تاکہ ہمارے گھر کا سکون اسی طرح برقرار رہے۔ تمہاری بڑی دونوں بہنوں کو میں اچھی طرح جانتی ہوں ایک تو میرے سسرالی رشتہ داروں میں ہی آئی ہے۔ ان ہی کے کردار کو دیکھتے ہوئے ہمارا دھیان تمہاری طرف آیا تھا۔ ہمیں امید ہے تم ہمارے گھر کا سکون قائم رکھو گی اور امی ابو کا معتراب کی طرح ہی خیال رکھو گی۔"
میں چپ چاپ ان کی باتیں سنتی رہی۔
دوپہر تک میری بہنیں مجھے لینے آ گئیں۔ مجھے دو دن میکے کے لیے جانا تھا۔ کیونکہ رات کو ولیمہ تھا۔
صبح سے میری ساس میرے کمرے میں نہیں آئی تھیں۔ مجھے یہ بات عجیب سی لگ رہی تھی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ عجیب تب لگا۔ جب جاتے ہوئے میں نے انہیں سلام کیا تو وہ ذرا جھینپ کر بولیں۔
"جاؤ امبرین کو میں نے تمہارے پاس بھیج دیا تھا۔ مجھے تو کچھ شرم آتی ہے تمہارے کمرے میں جاتے ہوئے۔ اس لیے میں تمہارے پاس نہیں آئی۔"
اپنی ساس کی شرم پہ مجھے شرم سے ڈوب مرنا چاہیے تھا۔ وہ بے چاری بڑھاپے میں اتنی ادب لحاظ والی تھیں۔ بلکہ میں۔ مجھے تو ایک بار بھی شرم نہیں آئی تھی۔
لیکن خیر جو کچھ بھی تھا گھر کا ماحول میری ساس کے زیر اثر تھا۔ اسی وجہ سے معتراب محمود بھی شرمیلے مزاج کے تھے۔ میں راستے بھر مختلف نتائج نکالتی رہی۔
"کیا بات ہے تمہاری بالکل بولتی بند ہو گئی؟" مثال نے مجھے چھیڑا۔
میں اتنی الجھی ہوئی تھی کہ بات کا کوئی سرا ہی نہ نکال سکی۔ اماں نے میری خوب آؤ بھگت کی۔
اپنا صدف اور مثال کی چھیڑ چھاڑ میں وقت گزر گیا۔ شام کو مجھے معتراب کی بہن لینے آ گئی۔ وہ مجھے سیدھا بیوٹی پارلر لے گئی۔ پھر وہیں سے ہم میرج ہال چلے گئے۔
ولیمہ کا فنکشن بالکل سادہ سا تھا۔ مختصر سے مہمان تھے مرد حضرات کا علیحدہ انتظام تھا اور خواتین کا علیحدہ۔ علاوہ ازیں ہمارے یہاں تو لڑکا لڑکی ولیمہ کے روز اکٹھے بیٹھتے تھے۔ میری سہیلیاں معتراب سے ملنا چاہتی تھیں۔ لیکن ایسا موقع ہی نہ بن سکا اور وہ تشنہ خواہش لیے چلی گئیں۔ رات گئے ہم لوگ بھی گھر آ گئے۔ میں معتراب کے ہمراہ گاڑی میں تھی۔ ساتھ ہی ساس سسر اور ایک نند بھی تھی۔ اسی وجہ سے پیچھے راستہ خاموشی سے طے ہوا۔ گھر آنے کے بعد سب ہی تھکے ہوئے تھے۔ سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔
میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ ابھی معتراب اندر نہیں آیا تھا۔ میں چاہتی تو چینج کر لیتی لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں معتراب کی نظروں سے اپنی ستائش چاہتی تھی۔
آج سب ہی نے میری بہت تعریف کی تھی۔ بقول مثال کے کل والے دن سے زیادہ میں آج اچھی لگ رہی تھی۔ فالسئی رنگ کا کامدار غرارہ واقعی مجھ پہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میں نے آئینے میں خود کو دیکھا۔ تھوڑا سا اپ سیٹ کیا۔ میرا میک اپ ابھی تک ترو تازہ تھا۔ میں صوفے پر بیٹھی تھی۔ جب ہی معتراب اندر آیا۔ اس نے بلیک ٹو پیس پہن رکھا تھا۔ اس نے آہستہ سے مجھے سلام کیا۔
آج وہ بہت مختلف اور بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اسے اچانک دیکھ کر میرے دل کو کچھ ہوا۔ میں سیدھی ہو بیٹھی۔ پھر وہ میرے نزدیک آ کر بیٹھ گیا۔
میرے من میں ہلچل ہونے لگی۔ میرا خیال تھا وہ میری تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے گا۔ لیکن اس نے میرا چہرہ دیکھتے ہوئے اسی سادگی سے کہا۔
"نہ جانے خواتین اتنا میک اپ کیوں تھوپتی ہیں مجھے تو سادہ چہرے اچھے لگتے ہیں۔" حالانکہ اس کے انداز میں طنز نہیں تھا مگر مجھے اچھا نہیں لگا بلکہ میرے لیے یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ بہت سے لوگ ہوتے ہیں جنہیں میک اپ پسند نہیں ہوتا۔ لیکن جب میں کل بنا میک اپ کے تھی تب تو اس نے اس قسم کے خیالات کا اظہار نہیں کیا تھا۔
"کوئی بھی دلہن بنا میک اپ کے تیار نہیں ہوتی۔" میں نے قدرے روکھا سا جواب دیا۔ ساتھ یہ بھی جتا دیا کہ میں دو دن کی دلہن ہوں۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔
"اگر آپ کو میک اپ پسند ہے تو میں بھی اعتراض نہیں کروں گا۔" اس کی ملائمت مجھے ایک آنکھ نہ بھائی۔
"بندے میں کچھ تو کوئی ہونا چاہیے۔ پسند ناپسند مرضی یا نامرضی۔ یہ کیا کاٹھ کے الو کی طرح بیوی کی ہاں

میں ہاں ملانے لگے۔

"دو بجنے والے ہیں۔ رات کافی ہو رہی ہے۔ آپ چینج کرلیں۔ میں بھی چینج کرنے جا رہا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ میرے پاس سے اٹھ گیا۔ مجھے شدید غصہ آیا۔

اور میں بھی جوں کی توں بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سادہ سی قمیص شلوار میں واش روم سے نکلا تو مجھے یونہی بیٹھا دیکھ کر بولا۔

"کیا ارادہ ہے آپ کا؟"

"کیا مطلب؟" میں انجان بنی۔

"ظاہر ہے آپ نادان تو نہیں ہیں اور نہ ہی بچی ہیں۔" اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی کمرے کی لائٹس آف کرکے زیرو پاور کا بلب جلا دیا۔

وہ میرے نزدیک آگیا اور آہستگی سے میرے کان کا آویزہ چھیڑتے ہوئے بولا۔

"اگر تھکی ہوئی ہو تو میں چینج کرادوں؟"

"کل تو آپ کو اس بات کا خیال نہیں آیا۔" میری زبان بھلا کب تک رک سکتی تھی۔ وہ ہلکا سا مسکرا دیا۔

"کل آپ نے سب کچھ خود ہی اتار پھینکا تھا۔ میں بھلا کیا ہیلپ کراتا۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے خود سے قریب کرلیا۔

"آپ نے تو کل اس قابل ہمیں سمجھا ہی نہیں۔ اب میرے لیے کیا حیثیت ہے ان باتوں کی۔"

میرے دماغ میں چھناکا سا ہوا۔ میں تو اسے بدھو سمجھ رہی تھی لیکن وہ تو خاصا میسنا نکلا۔

وہ آہستہ سے بولا۔ "پہلے اپنے متعلق کچھ غلط فہمیاں دور کردوں۔"

"مجھے تو کوئی غلط فہمی نہیں ہے آپ کے متعلق۔" میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"اچھا... پھر آپ کا رویہ اتنا اکھڑا اکھڑا کیوں ہے مجھ سے؟"

مجھے بے حد سبکی محسوس ہوئی۔

"میرا خیال ہے وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے۔ آپ بھی سو جائیے اور میں بھی سو رہی ہوں۔" میں نے یکدم اکھڑے ہوئے انداز میں کہا۔

یہ کہہ کر میں لیٹ گئی۔ میں نے آنکھیں میچ لیں۔ میری کنپٹیاں سلگ رہی تھیں اور مجھے خواہ مخواہ خود پہ غصہ آرہا تھا۔

"کیا ضرورت تھی نخرے دکھانے کی۔ اتنا دبو اور کمزور مرد ہے تب ہی تو وہ ہر معاملے کو میرے سر تھوپ رہا ہے۔ اتنا صبر و استقلال آج سے پہلے میں نے کسی مرد میں نہیں سنا۔ نہ جانے یہ آزمائش میرے لیے کیوں بنادی گئی۔"

میں نے آنکھیں کھول کر یونہی جائزہ لینا چاہا۔ مضراب سے آنکھیں چار ہوگئیں وہ میری طرف ہی دیکھ رہا تھا میں نے غور کیا اس کے چہرے پر الجھن تھی۔

میں سمجھ چکی تھی۔ اس کا سارا مسئلہ حوصلے کی کمی ہی ہے۔ اس چیز نے مجھے بے حد دل شکستہ کیا تھا۔ میں تو زندگی میں اس سے کچھ بھی نہیں دکھا سکتی تھی۔ نخرے کا مطلب تھا اس چیز سے ہاتھ دھونا۔

ابھی میں خیالوں کی رو میں بہہ رہی تھی کہ کسی نے میرے بازو پہ ہاتھ رکھا تو میں چونک گئی اور یکدم آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا اور مضراب میرے بالکل نزدیک۔ اتنا کہ میں کچھ بول نہ پائی۔

☆ ☆ ☆

صبح مجھے کوئی اٹھا رہا تھا۔ مجھے اس وقت شدید [illegible] تھا۔ [illegible] آنکھیں [illegible] تھیں۔ کسی بھاری سے ہاتھ نے میرا گال تھپتھپایا تب مجھے جھنجھلا کر آنکھیں کھولنا پڑیں۔ یہ میرے شوہر نامدار تھے۔ میرا جی چاہا کہوں۔ ایک نئی نویلی دلہن کو ایسے جگایا جاتا ہے۔ ادھر وہ چہرے پہ بیزاری لیے کھڑے تھے۔

"وقت دیکھیں کیا ہو رہا ہے۔ ابھی کوئی کمرے میں آجائے گا۔ کم از کم اپنا حلیہ تو درست کرلیں۔"

یہ کہہ کر وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر بال سنوارنے لگا۔ میں شرمندہ ہوتے ہوئے چپ چاپ واش روم میں چلی گئی۔ میں باہر آئی تو مضراب کمرے میں نہیں تھا۔ میں نے بیڈ کی چادر درست کی۔ اپنا ڈوپٹہ نہیں دیکھا۔ رات کے کپڑے لانڈری میں ڈالنے تب ہی میری نند اندر آگئی۔

"آپ ناشتہ نہیں کریں گی یا ہم سب کے ساتھ؟"

"سب کون؟" میں پوچھ تو نہ سکی لیکن شاید اس نے میرے چہرے پہ یہ سوال پڑھ لیا تھا۔

"امی اور ہم بہنوں کے ساتھ کیونکہ مضراب اور ابو تو جا چکے ہیں۔"

"میں آپ لوگوں کے ساتھ ہی ناشتہ کرلوں گی۔" میں نے دوپٹہ درست کیا اور اس کے ساتھ ساتھ باہر آگئی۔

پہلی بار میں گھر کا جائزہ لے رہی تھی۔

چار کمروں پہ مشتمل یہ گھر کوئی سات آٹھ مرلے کا ہو گا۔ دو کمروں کے آگے درمیانہ سا برآمدہ تھا اور اس کے بعد چھوٹا سا صحن۔ صحن کے ایک طرف کچن اور باتھ روم تھا۔

دوسری طرف میرا کمرہ تھا جس کے ساتھ اٹیچڈ باتھ تھا۔ اس کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم تھا۔ سامنے گیٹ میں داخل ہونے کے لیے راہداری تھی جہاں میں نے موٹر سائیکل کھڑی دیکھی تھی۔ جو اس وقت نہیں تھی۔ "یقیناً" وہ مضراب کے استعمال میں ہوگی۔ گھر کی کنڈیشن اور ساز و سامان ان کی اچھی حیثیت کا پتا دیتا تھا۔ میں سلام کرتے ہوئے ان لوگوں کے درمیان میں بیٹھ گئی۔ وہ سب برآمدے میں بیٹھی تھیں۔ میرے بیٹھتے ہی دستر خوان بچھ گیا۔

"کل سے ناشتے پہ امی ابو تم اور مضراب ہوں گے۔"

میں نے اپنی بڑی نند کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ میں خود بھی اپنی اس حرکت پہ حیران تھی۔ میں جو بچپن سے جواب دیے بغیر نہیں رہ سکتی تھی اب نہ جانے کیسے رہ رہی تھی۔

"ارے بھئی ہم تو آج شام کو اپنے اپنے گھر چلی [illegible]"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ناشتے پہ گپ شپ ہوتی رہی۔ میں چپ چاپ صرف مسکراتی رہی۔

دن یونہی مصروفیات میں پر لگا کر گزر گیا۔ شام کو نبیل کھانا لے کر آیا تو میں حیران رہ گئی۔

"کس نے بنایا ہے یہ سب کچھ؟"

"بریانی، شامی کباب، کڑاہی گوشت، سلاد، رائتہ۔ یہ سب اماں کے ہاتھ کا تو نہیں تھا۔"

"صدف آپی ہوئی تھی۔ اس نے بنایا ہے سب کچھ۔" نبیل نے بتایا۔ "وہ ادھر ہی رکے گی۔ شاید میں صبح کا ناشتہ بھی لے آؤں۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے فالتو خرچے کرنے کی۔" میں نے نبیل کو ٹوکا۔

وہ ہنسنے لگا۔ "ابھی تک ویسی کی ویسی ہی ہو۔" میں نے نبیل کو گھورا۔ نبیل اور مضراب کے درمیان بس دعا سلام ہی ہو سکی۔ نبیل چلا گیا تو مضراب نے اس سارے کھانے کو دیکھا جو میں کچن میں رکھنے جا رہی تھی۔

"کیا ضرورت تھی اس تکلیف کی۔ یہ سب کچھ تو یہاں بھی مل جاتا ہے۔"

"یہ سب کچھ میں نے کہہ کر تو نہیں منگوایا۔" میرے لہجے میں تلخی سی تھی۔ مضراب خاموش ہو گیا۔ اسے شاید زیادہ تو تو میں میں کی عادت نہیں تھی۔

میں بھی خاموشی سے برتن کچن میں لے آئی۔

رات کو سب نے یہی کھایا اور ہمارے گھر کے کھانے کی تعریف کی۔ کھانا کھا کر نندیں چلی گئیں۔

مضراب اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور میں دیر تک بابا کے ہمراہ اپنے ساس سسر کے پاس بیٹھی رہی۔ گپ شپ ہوتی رہی۔ درمیان میں میں نے دو بار چائے بھی بنائی۔

"رات کافی ہو رہی ہے۔ جویریہ تمہارے ابو نے صبح اسکول بھی جانا ہے اور تم بیٹا تم بھی جا کر آرام کرو۔ مجھے بھی ابھی عشاء کی نماز پڑھنی ہے۔"

امی کے کہنے پہ ہم سب باری باری اٹھ گئے۔

میں کمرے میں آئی تو وقت دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ مضراب ٹی وی دیکھ رہا تھا میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے ضرور پوچھے گا کہ اتنی دیر سے تم کہاں تھیں۔ ظاہر ہے وہ میرے انتظار میں ہی تو ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ مگر میری یہ خوش فہمی فوراً ہی دور ہو گئی۔

جب میں بستر کی طرف بڑھی تو اس نے عام سے انداز میں کہا۔

"لائٹ آف کردو۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے۔" یہ کہتے ہی اس نے ریموٹ سے ٹی وی آف کیا اور لیٹ گیا۔

"اتنی دیر سے کیوں جاگ رہے تھے۔ سو جاتے۔" میں نے لیٹتے ہوئے کہا تو مضراب نے میری طرف کروٹ لے لی اور مجھے خود سے قریب کرلیا۔

"تمہارے بغیر اب نیند نہیں آتی۔" اس کی یہ سرگوشی میرے من کے تار ہلانے لگی۔

"کیوں؟ کیا خاص بات ہے مجھ میں؟" میں نے اترا کر پوچھا۔ شاید میں اپنی تعریفیں سننا چاہ رہی تھی۔

"پتا نہیں۔" مضراب کا لہجہ بوجھل اور نشیلا تھا۔

میں اس سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ گفتگو کے موڈ میں نہیں تھا۔ رات خاموشی سے سرکتی چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

آج صبح پہلے میری آنکھ کھلی تھی۔ مضراب بے سدھ

ہو رہا تھا۔ میں اسے دیکھنے لگی۔ اس کے خدوخال جاذب نظر تھے۔

"بندہ ٹھیک ٹھاک ہی ہے۔" میں مسکرائی اور بال سمیٹتے ہوئے واش روم میں چلی گئی۔

"کیوں نہ آج موصوف کو اس طرح جگایا جائے کہ ہوش ٹھکانے آ جائیں۔ یعنی کوئی رومینٹک سا انداز یا کوئی شرارتی انداز۔"

واش روم سے نکلتے سارا رومینٹک اور شرارتی انداز دھرا کا دھرا رہ گیا۔ جب میں نے کمرہ خالی پایا۔

یکدم ہی میرا موڈ آف ہو گیا۔ میں نے بال جھٹک کر پیچھے کیے تب ہی میرے بالوں میں سرسراہٹ سی ہوئی۔ میں ڈر کر جو اچھلی تو کسی سے ٹکرا گئی۔ پیچھے ہی مضراب کھڑا تھا۔

"صبح بخیر......" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ میں حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ ابھی تو وہ کمرے میں نہیں تھا۔ اچانک کہاں سے آ گیا۔

"کیا بات ہے ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟"

"یونہی بس۔" میں نے سر جھٹکا اور خفیف سا مسکرا دی۔

"ڈر گئی تھیں مجھ سے؟"

مجھے ہنسی آ گئی "اتنے بھی ڈراؤنے نہیں ہیں آپ۔"

"یعنی کچھ کچھ ڈراؤنا ہوں۔" وہ ہلکا سا مسکرایا تھا۔ میں نے بے ساختہ اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اچھا لگ رہا تھا۔

میرا دل چاہا یہ لمحے یونہی تھم جائیں۔

"جانتا ہوں... کیا تمہیں پتا نہیں تھا کہ میں کمرے میں ہوں؟" میں جو اس سے کسی پیار بھری بات کی توقع کر رہی تھی یکدم بیزار ہو گئی۔

"کیا اس کے علاوہ ہم کوئی اور بات نہیں کر سکتے؟"

"مثلاً..." وہ دلچسپی سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"یعنی اب یہ بھی مجھے ہی بتانا پڑے گا۔" میں نے سرد آہ کھینچی تو وہ ہنس پڑا۔

"ظاہر ہے بات تم نے شروع کی ہے۔"

اور میں نے سوچا۔ اگر میں جل بھن کر ایک طرف بیٹھ گئی تو مضراب کی مجھ سے دلچسپی ختم ہو جائے گی۔ اس وقت میں اس کی توجہ کا محور ہوں اس لیے اپنی بے زاری پر قابو پا کر بولی۔

"بتائیں میں آپ کو کیسی لگی؟"

"کیا مطلب؟ جیسی تم ہو ویسی ہی لگیں۔ ظاہر ہے تمہیں یہاں مشترکہ پسند سے ہی لایا گیا ہے۔"

"اُفوہ!" میں اس کے جواب پر جھنجلا گئی۔

"میرا مطلب ہے پہلے دن سے اور اب تک۔"

"پہلے دن مغرور سی، دوسرے دن روٹھی ہوئی۔ تیسرے دن گم صم اور آج چوتھا دن ہے۔ کچھ کچھ بے وقوف سی۔"

"کیا مطلب؟" میں چلا پڑی۔ مجھے سخت غصہ آیا۔

"ایک بھی دن آپ نے میری شخصیت کی صحیح ترجمانی نہیں کی اور یہ بتائیں میں نے آج کیا بے وقوفی کی ہے؟"

"یہ بے وقوفی نہیں تو اور کیا ہے۔ خوامخواہ وقت ضائع کر رہی ہو۔ تمہیں ناشتے کی فکر ہی نہیں۔ مجھے ساڑھے سات بجے جانا ہوتا ہے۔"

"وقت میں نہیں آپ ضائع کر رہے ہیں۔" میں نے اس کے ہاتھ جھٹک کر کہا۔ میں اپنے اصل موڈ میں آ چکی تھی۔ وہ ہنس پڑا۔ "ایک ہی بات ہے۔" میرے بالوں کو چھیڑتا ہوا وہ واش روم میں چلا گیا۔

میں بالوں کی چوٹی بنا کر دوپٹہ درست کرتے ہوئے کچن میں گئی اور ناشتہ بنانے لگی۔ میرا ذہن عجیب سی سمت پرواز کر رہا تھا۔ وہ سمت میرے پڑھے ناولوں کی تھی۔ وہ سارے ڈرامے جن میں میں نے ہیرو کا کردار کیا تھا۔ میرے ذہن میں آ رہے تھے۔ اگر میں مرد ہوتا تو کتنا انجوائے کرتا ان لمحوں کو۔ اور اس لڑکی کو اپنے پیار بھرے جذبات کا کتنی خوب صورتی سے یقین دلاتا کہ وہ میری جیون ساتھی ہونے پہ فخر کرتی۔ مگر یہ قسمت کی ستم ظریفی نہیں تو کیا تھی۔ ہمیشہ میرے ساتھ ایسا ہی ہوتا آیا تھا۔ مجھے کیا خشک سا مرد ملا تھا۔

☆ ☆ ☆

حوریہ اور ماریہ اسکول چلی جاتی تھیں۔ گھر میں نوکر ہی ہوتے تھے۔ ان کو زیادہ بولنے کی عادت نہیں تھی۔ میرا زیادہ وقت کمرے میں گزرتا۔ مضراب صبح کا گیا رات کو آتا۔ رات اسی معمول سے گزرتی اگر میں کسی روز مضراب کا ہاتھ جھٹک دیتی یا کروٹ بدل لیتی تو وہ چپ چاپ سو جاتا۔ نہ کوئی شوق، نہ دلچسپی، نہ لگاوٹ۔ یہی روکھی پھیکی سی زندگی گزر رہی تھی۔ ابھی ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ نبیل

مجھے لینے آیا۔ وہ سخت پریشان تھا۔ اماں کو بخار ہو گیا تھا۔ میں نبیل کے ساتھ گھر آ گئی۔ اماں کی حالت دیکھ کر میں تڑپ اٹھی اور جو بے دلی اور بے زاری مجھ پر طاری تھی سب بھول گئی۔

میرے آنے کے بعد مضراب بھی اماں کی طبیعت پوچھنے آیا تھا۔ دو دن بعد وہ دوبارہ آیا۔ پہلے کی نسبت اماں کی طبیعت اب قدرے بہتر تھی۔ اماں کا اور نبیل کا خیال تھا کہ مضراب مجھے آج ضرور ساتھ لے جائے گا۔ لیکن وہ مجھے ساتھ لے کر نہیں گیا۔ جس سے اماں اور نبیل کو تو بہت خوشی ہوئی لیکن مجھے کچھ اچھا نہیں لگا۔

مجھے پورے سات دن ہو گئے تھے یہاں آئے ہوئے۔ ایک بھی دن اس نے نہ تو مجھے فون کیا تھا۔ نہ ہی مجھ سے کوئی بات کی تھی۔ بس اماں کے سامنے ہی جو دعا سلام ہو جاتی بس وہی ہوتی تھی۔ پھر اماں مضراب کے جاتے ہی مجھے اس کی خاطر تواضع کے لیے دو دو لیکچر دیتیں۔ کیا میں اس کے لیے اتنی ہی غیر اہم تھی۔ مضراب کا رویہ اکثر میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

اس کی ذات میں کتنا ٹھہراؤ اور سکون تھا۔ مجھے مضراب سے وحشت سی ہونے لگی تھی۔

تنہائی اور افسردگی کب تک قائم رہتی کہ اچانک موسم نے پلٹا کھایا۔ [illegible] اور تیز ہوا [illegible] اور پھر چھاجوں پانی برسا جیسے ساون کا آغاز ہو گیا تھا۔

بارش بھی ایسی ہوئی تھی کہ برستے ٹھہر گئی تھی۔ ہوا کی ٹھنڈک سے کپکپی سی طاری ہونے لگی تھی۔ میں دوڑ دوڑ کر اماں کے گملے اٹھا کر صحن میں رکھ رہی تھی۔ اس وقت اماں اور میں ہی گھر میں اکیلے تھے۔ اماں برآمدے میں بیٹھی مجھے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔

"نیلی ٹھنڈ لگ جائے گی تجھے۔ دو گھنٹے سے بارش میں نہا رہی ہے۔ ہوا بھی تیز ہے۔"

"اماں! میں تمہارے گملوں کو نہلا رہی ہوں۔ دیکھنا کیسی کونپلیں پھوٹیں گی۔ سارے گملے بھر جائیں گے۔"

"اچھا بس کر۔ نبیل آتا ہی ہو گا۔ تلی ہوئی مچھلی لے کر آ رہا ہے۔ تو جلدی سے نہا کر کپڑے بدل لے۔ شاید آج مضراب بھی تجھے لینے آ جائے۔"

میں نے چونک کر اماں کی طرف دیکھا۔ اماں اپنی دھن میں بیٹھی چھالیہ کاٹ رہی تھیں۔

میں نہانے چلی گئی۔ [illegible] رنگ کا شیفون دوپٹے کا لان کا یہ جوڑا میں نے اسی خیال کے تحت پہنا تھا کہ مضراب مجھے لینے آئے گا۔

لیکن ایسا نہیں ہوا بارش تھم گئی۔ پھر شام سے رات ہو گئی۔ اور رات کا پچھلا پہر مجھے کروٹیں بدلتے بیت گیا۔

"کیا وہ مجھے یاد آ رہا ہے؟ نہیں۔ پھر میں کیوں شام ڈھلے سے اس کا انتظار کر رہی ہوں۔ کیا ساون کی پہلی بارش نے اس کے من کو نہیں جھنجھوڑا ہو گا۔ کیا اسے میری یاد نہیں آئی ہو گی؟ کیا مجھ میں ایسا کچھ بھی نہیں جو مضراب محمود کو جھنجھوڑ سکتا۔" اپنی کم مائیگی کے احساس سے میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

نبیل باہر برآمدے میں سو رہا تھا اور اماں مجھ سے کچھ فاصلے پر خراٹے لے رہی تھیں۔ میرے بچپن کی محرومیاں پھر سے میرا احاطہ کرنے لگی تھیں۔ اس وقت مجھے منال بہت یاد آئی۔ اور میرا دل چاہا کہ میں اس سے اپنا دکھ شیئر کروں۔ لیکن رات کے گیارہ بجے اسے ڈسٹرب کرنا میں نے مناسب نہ سمجھا اور یونہی کروٹیں بدلتے بدلتے میری آنکھ لگ گئی۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح نہایت ہی خوشگوار تھی ہلکی ہلکی دھوپ ہر سو پھیلی تھی اور ہوائیں پرشور تھیں۔ گھر میں غیر معمولی چہل پہل سے میری آنکھ کھلی تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ اماں نے مجھے جگایا ہی نہیں تھا۔ میں ابھی تو ٹھٹک رہ گئی۔ سامنے ہی منال اماں سے باتیں کر رہی تھی اور پھر مجھے اٹھتا دیکھ کر وہ مجھ سے لپٹ گئی۔

"رات ہی میں تمہیں یاد کر رہی تھی اور تم صبح آن بھی پہنچیں۔" میری خوشی بھی دیدنی تھی۔

"اسے ہی تو کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ کال ایس ایم ایس کرنے کی بھی فرصت نہیں تھی تمہیں۔ یاد ہے کوئی بھی بارش ہم نے اکیلے انجوائے نہیں کی۔ ہمیشہ تمہارا فون پہلے آ جاتا تھا اور میں سوچتی رہ جاتی تھی۔ اور اب رات بارش تھمنے تک میں تمہارا انتظار کرتی رہی۔"

منال کی بات نے مجھے رنجیدہ کر دیا۔

"پھر دل کو یہ سوچ کر سمجھایا کہ اس وقت تم اپنے پیا کے ساتھ بارش میں نہا رہی ہو گی۔ لیکن جب صبح تک بھی

سے بات ہوئی تو پتا چلا تم یہاں ہو بلقیس کی روز سے۔ ان رکا ہی نہیں گیا۔ یہ تم نے کیا چکر کیا ہے؟ اتنے دن سے یہاں کیوں پڑاؤ ڈالا ہوا ہے؟"

"اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اسی لیے آئی تھی۔ تم بیٹھو میں ابھی فریش ہو کر آتی ہوں۔"

اس کے بعد ہم نے اکٹھے ہی ناشتہ کیا۔ منال کے پاس اپنے سسرال کی بے شمار باتیں تھیں۔ اس کے والہانہ جذبات تھے جو وہ مجھ سے شیئر کرنا چاہتی تھی۔ شاید وہ اسی وجہ سے آئی تھی۔

"بلقیس کو تو شادی کی بہت جلدی ہو رہی ہے۔ بڑے ابو کہتے ہیں پہلے راحیل کی شادی ہوگی تب منال کی شادی کریں گے۔ مگر راحیل صاحب کو کوئی لڑکی ہی پسند آ کر نہیں دیتی۔ یار تم ہی کوئی لڑکی بتاؤ۔"

"بہت جلدی ہو رہی ہے تمہیں شادی کی۔"

میری بات پہ منال جھینپ گئی اور مسکراتے ہوئے بولی۔

"فیضان مجھے خودکشی کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ کہتا ہے۔ اگر اس سال کے اینڈ تک کل نے ہمارا نکاح نہ پڑھوایا تو میں اپنی جان دے دوں گا۔"

"اور تم اس کی دھمکیوں میں آ گئیں؟"

"یار... سچ پوچھو ناں تو وہ ایسا ہی پاگل ہے۔ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اب یہ دیکھو زبردستی اس نے مجھے یہ رنگ پہنائی تھی۔ حالانکہ ہمارے ہاں یہ رواج بھی نہیں ہے اور بڑے ابو نے بھی بہت برا منایا تھا۔ مگر موصوف نے فرمایا 'اپنی چیز پہ مہر لگا رہا ہوں' یقین کرو کوئی اور ہوتا ناں تو جوتوں سے پٹتا مگر ابو کا لاڈلا بھتیجا تھا سو ابو کو برداشت کرنا ہی پڑا۔"

"اور تم بھی بے شرموں کی طرح انگوٹھی پہن کر پھر رہی ہو۔"

"تو کیا کروں... فون کر کر کے ناک میں دم کیے رکھتا ہے۔ کل رات بھی دو گھنٹے بات کی ہے۔"

"خوش نصیب ہو تم۔ زندگی کے ہر دور میں تمہیں چاہنے والے ہی ملے۔ یہاں تو بچپن سے اب تک ہر چیز چھین کر ہی لینا پڑی ہے۔"

"کیا مطلب؟" منال مجھے دیکھ کر چونک گئی۔

"نمرہ... ادھر دیکھو میری طرف۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تم خوش نہیں ہو۔"

"نہیں ٹھیک ہی ہے سب کچھ۔"

[illegible]

"نہیں تم جھوٹ بول رہی ہو۔ ضرور کچھ ہے۔"

"یار تم اتنی زبردست رومینٹک لڑکی اور... نہیں یہ ہو نہیں سکتا۔ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ مجھے بتاؤ معاملہ کیا ہے۔ کوئی بھی شخص تمہاری شخصیت پہ ناز کر سکتا ہے۔ تم کہیں بھی ہو تمہیں اپنا آپ منوا لیتی تھیں۔ پھر آج تم یوں بکھری کیوں لگ رہی ہو۔"

میں نے منال کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ "سچ بتاؤں اب میں اپنا آپ منوانا نہیں چاہتی۔ کیوں ہمیشہ ہی کوششوں سے خوشیاں میرے حصے میں آتی ہیں۔ قدرتی طور پہ سب کچھ کیوں نہیں ہوتا۔ فیضان بھی تو تم سے محبت کرتا ہے۔ کیا یہ محبت پانے کے لیے تم نے کوششیں کی تھیں؟ نہیں ناں؟ ایسا میرے ساتھ کیوں نہیں ہوا؟"

"شاید اس لیے کہ تمہیں محبت کا اظہار کرنے کا زیادہ سلیقہ ہے۔ پتا ہے کیا۔ جب فیضان نے پہلی بار تمہارے وہ اولیٹر اور شعر کا ذوق دیکھے تھے تو سخت جذباتی ہو گیا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ کسی لڑکی کے ہیں۔ اب اتنا جتنا تو ہر ایک میں نہیں ہوتا ناں۔"

"یہ میرا ہی تو دل ہے میرا ابھی دل چاہتا ہے کہ کوئی مجھے چاہے۔ اور ہر پل اس کا اعتراف بھی کرے۔"

[illegible] فیضان ہو کے سیراب کر رہا تھا بلکہ [illegible] بنا لی تھی۔

"یار بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ جنہیں چاہنے سے زیادہ چاہے جانا پسند ہوتا ہے۔" منال اپنی انگلی میں رنگ گھماتے ہوئے سر جھکا کر ایسے کہہ رہی تھی جیسے اعتراف جرم کر رہی ہو۔ "ہو سکتا ہے مضراب بھائی کی بھی ایسی ہی طبیعت ہو۔"

میں اس کی بات پہ ہنس پڑی ایک کھوکھلی اور بے جان ہنسی۔

"چاہنا اور چاہے جانا چاہت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اور چاہت کبھی یکطرفہ نہیں رہتی اور سچ تو یہ ہے کہ وہ ہر احساس سے عاری ہے اور اس میں کسی چیز کی چاہت ہی نہیں۔"

"ایسا نہیں ہوتا۔" منال نے سختی سے تردید کی۔

میں نے حیرت سے منال کی طرف دیکھا۔ "تم خوامخواہ ایک اجنبی شخص کی حمایت کر رہی ہو۔"

"بے شک مضراب بھائی میرے لیے اجنبی ہیں۔ لیکن

محبت کے جذبے ہر ایک کے لیے الگ ہوتے ہیں۔ تم اگر اسے پیار اور توجہ دو تو ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ تمہاری طرف متوجہ نہ ہو۔ اسے وش کرنے کے لیے مواقع ڈھونڈ کر دیکھو وہ چونک جائے گا۔"

"یعنی اب ایک مرد کو محبت کرنا میں سکھاؤں گی۔" میں خود چڑ گئی۔

مجھے غیر سنجیدہ دیکھ کر منال خاصی جذباتی ہو گئی۔

"یہ تو ایک چیلنج ہے تم خود قبول کر لو۔ ورنہ میں یہ کر کے دکھا سکتی ہوں۔" وہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے اٹھ گئی۔ اور اس کی سنجیدگی نے مجھے چونکنے اور سوچنے پہ مجبور کر دیا۔ اتفاق سے منال کے جاتے ہی میری ساس کا فون آ گیا۔ انہوں نے پہلے اماں کی خیریت دریافت کی۔ جب میں نے بتایا کہ الحمدللہ اب بالکل ٹھیک ہیں تو انہوں نے گلہ کیا۔

"اگر تمہاری اماں کی طبیعت سنبھل گئی تھی تو تمہیں گھر آ جانا چاہیے تھا۔ دو روز سے مضراب کو سخت بخار ہے اور وہ کمرے میں پڑا ہوا ہے۔"

"اگر دو روز پہلے ہی مجھے اس بات کی اطلاع مل جاتی تو میں یہاں رکتی ہی کیوں۔" مگر میں یہ بات اپنی ساس سے کہہ نہ سکی اور جی کر کے فون بند کر دیا۔

پھر اسی وقت فیصلہ کر کے ہمارے گھر آ گئی۔ مضراب ڈاکٹر کے پاس گیا ہوا تھا۔ گھر میں کچھ خاص چہل پہل تھی۔ مضراب کی بڑی بہنیں آئی ہوئی تھیں۔ میں سلام دعا کر کے کچن میں گئی کہ وہ شروع ہو گئیں۔

"میاں کی طبیعت خراب ہے اور تم ہو کہ اماں کے گھر بیٹھی ہوئی تھیں۔"

"لو بھلا یہ کیا بات ہوئی۔ اتنے دن جا کر بیٹھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔" یہ دوسری نند تھی۔

"ہم تو اتنا حیران ہوئے کہ نو دن سے مسلسل تم اپنے میکے میں ہو۔ آج کل کے دور میں تو کوئی [illegible] بھی نہیں چھوڑ کے [illegible]۔ ابھی اتنا میکے میں رہنا ہے تو مضراب کی شادی کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟"

اب وہ تینوں ہی مجھ سے مخاطب تھیں۔ میں اس اچانک یلغار کے لیے تیار نہیں تھی کہ ساس کی طرف سے بیان آیا۔

"بھئی میں تو ان میاں بیوی کے معاملے میں مداخلت نہ کرتی ہوں نہ کروں گی۔ ان دونوں کے درمیان کیا طے پایا ہے یہ انہیں ہی پتا ہو گا۔"

ان سب باتوں کا میرے پاس ایک ہی جواب تھا۔

"مجھے کوئی اطلاع کرتا یا لینے آتا تو میں کیوں رکتی فوراً آ جاتی لیکن کسی نے بھی میری بات پہ توجہ نہ دی۔ سب کا زور اسی بات پہ تھا کہ مجھے دو تین روز بعد خود ہی آ جانا چاہیے تھا۔

☆ ☆ ☆

مضراب ڈاکٹر سے دوا لے کر آ چکا تھا۔ اس کی بہنیں اس کے آگے پیچھے پھر رہی تھیں۔ سو مجھے بھی اپنی اہلیت دکھانی چاہیے تھی لیکن پانچ بہنوں کے ہوتے ہوئے مجھے یہ موقع نہ مل سکا اور میں چپ چاپ اپنے کمرے میں آ گئی۔ مضراب کے آنے تک میں نے کمرے کی حالت درست کر لی تھی۔

کمرے میں کاغذ کے پھولوں کی آرائش اور بے وجہ کے دل وغیرہ میں نے سب نوچ کھسوٹ کر پھینک دیے سادگی سے کمرے کی دلکشی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

تب ہی مضراب کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے حیرت سے کمرے کی دیواروں کو دیکھا پھر میری طرف اور چپ چاپ بستر پہ لیٹ گیا۔ پتا نہیں اسے اچھا لگا تھا یا برا۔

میں بھی منہ ہاتھ دھونے کی غرض سے واش روم میں چلی گئی۔ تولیے سے ہاتھ منہ پونچھ کر میں نے ایک طرف رکھا اور مضراب کے قریب آ گئی۔

اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ بخار نے اسے جھنجھوڑ ڈالا ہے۔ شیو اچھی خاصی بڑھی ہوئی تھی۔ اور یہ دو دن کی شیو نہیں تھی۔ قریباً آٹھ دن کی ضرور ہو گی۔ تو کیا اس نے میرے ہجر میں یہ حال کر لیا تھا۔ ہائے رے خوش فہمی۔

"اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" یہ سوال کرتے ہوئے من ہی من میں سوچ رہی تھی اگر مجھ سے اس پوزیشن میں میرا محبوب پوچھتا تو میں کہتی۔

"ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پہ رونق" پھر ہاتھ تھام کر اپنی شدتوں کا اظہار کرتی۔ مگر وہاں سے تو بڑا بوسیدہ سا جواب آیا۔

"ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک تو نہیں لگ رہے۔ یہ حالت کیا مجنوں نما سی بنا رکھی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے مضراب کا ہاتھ تھاما اور اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"دروازہ کھلا ہوا ہے۔ کوئی اچانک آ بھی سکتا ہے۔" اس نے تنبیہہ کی۔ تو میرا منہ ایک دم کڑوا ہو گیا۔ پھر

بھی میں ڈھٹائی سے بیٹھی رہی۔

"تو آج نے کہیں کوئی جرم کر رہی ہوں۔" مضراب نے مجھے چونک کر دیکھا۔

"فون میں خاصا چینج آ گیا ہے تم میں۔"

ایک اور دل جلانے والا جملہ۔ میں نے بڑی مشکل سے ضبط کیا اور مسکرا کر بولی۔

"آپ نے مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کی ورنہ میری خوش اخلاقی تو آپ سے چھپی نہ رہتی۔"

"خوش اخلاقی!" وہ طنزیہ مسکرا لیا۔

"آج سے قبل تو میں نے تمہیں کبھی مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ ہی مجھ سے لڑتی یا ناراض ہی رہتی ہو۔ بلکہ میں تو خود حیران ہوں کہ مجھے بیمار پا کر تمہیں کاہے کی خوشی ہو رہی ہے۔"

میری برداشت جواب دے گئی۔ میں نے مضراب کا ہاتھ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"درست سمجھا آپ نے۔ آپ کو بیمار پا کر میرا کیوں ٹڈوں کا فائدہ ہو رہا ہے۔ مجھے تو خوب جشن منانا چاہیے۔"

وہ چپ چاپ میرا منہ دیکھتا رہا۔ پھر مجھے خود ہی خیال آیا۔ اور میں نے خود کو نارمل کیا۔

"اگر آپ کی طبیعت اتنی ہی خراب تھی تو مجھے فون کیوں نہیں کیا؟"

"میری دیکھ بھال کرنے کے لیے یہاں بہت سے لوگ تھے۔" وہی روکھا سا جواب۔

"تو کیا ان بہت سے لوگوں میں میری کوئی اہمیت نہیں؟" میرے اندر کچھ ٹوٹا تھا۔

"دن ہی کتنے ہوئے ہیں تمہیں میری زندگی میں آئے ہوئے۔ فقط تین دن اور ان تین دنوں میں سے دو دن تو تم اپنے میکے میں رہی ہو۔"

"میں اپنی مرضی سے تو جا کر نہیں بیٹھی تھی۔ ضرورت تھی تو بلا لیتے۔" میں نے تنگ کر کہا۔

"الحمد للہ۔ میری سب ضرورتیں ہمیشہ بغیر کہے پوری ہو جاتی ہیں۔" لہجے کی ٹھنڈک نے مجھے اندر تک جھنجھوڑ دیا۔

"آخر آپ کی ان سب باتوں کا مطلب کیا ہے؟" میں اس کے سر پہ جا پہنچی۔

"میرا کوئی مطلب نہیں ہے۔ میں نے دوا لی ہوئی ہے اور مجھے نیند آ رہی ہے۔" اس نے اپنی سرد انداز میں کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

اس نے چہرے پہ ایسی سرد مہری تھی۔ اس نے مجھے اندر تک تحقیر کر کے رکھ دیا تھا۔ بہت دیر تک میں صوفے پہ یونہی بیٹھی رہی۔ تب تک وہ سو چکا تھا۔

رات کافی ہو چکی تھی۔ میں نے کمرے کی لائٹس آف کیں اور بیڈ کے دوسرے کنارے پہ پڑ گئی۔ اس شدید گرمی میں اے سی کولنگ نے کمرے کو ٹھیک ٹھاک جنت بنا رکھا تھا۔ مضراب کو شاید سردی لگ رہی تھی۔ اس نے کمبل ٹانگوں پہ پھیلا رکھا تھا۔ یونہی لیٹے لیٹے مجھے خیال آیا تو میں نے اس کی پیشانی پہ ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ جو اس کے مزاج کی طرح بالکل سرد ہو رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر کولنگ تھوڑی سی کم کر دی اور واپس آ کر لیٹ گئی۔

☆ ☆ ☆

صبح جب میری آنکھ کھلی تو میں بستر پہ اکیلی تھی۔ بیمار غائب تھا۔ میں ہڑبڑا کر تیزی سے اٹھی تو مضراب کو الماری میں کچھ تلاش کرتے پایا۔ وہ بہت عجلت میں تھا اور آفس جانے کے لیے بالکل تیار تھا۔

"اگر آج کی بھی چھٹی کر لیتے تو کیا ہو جاتا۔" میں نے اس کی طبیعت کے خیال سے ہی تو کہا تھا۔

[illegible] بات کا رخ بدل دیا۔

"پہلے ہی دو چھٹیاں ہو چکی ہیں اور پھر گھر میں پڑ کر بھی کیا ہے۔"

یہ دوسرا جملہ جو ذرا آہستگی سے کہا تھا میں نے با آسانی سن لیا تھا۔ میں اس کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔

"ایک بیمار انسان کو گھر میں رہ کر سکون ہی چاہیے ہوتا ہے اور وہ آپ کو با آسانی مل جاتا ہے۔"

"سکون انسان کے اندر ہوتا ہے اگر وہاں نہ ہو تو پھر کہیں نہیں ہوتا۔" یہ کہتے ہوئے وہ نکلا چلا گیا اور میں اس کے اس چھوٹے سے جملے میں جو فلسفیانہ بھی تھا اور معنی خیز بھی کھو سی گئی۔

زندگی پھر معمول پہ آ گئی۔

میں دوپہر کا کھانا پکا کر ابھی فارغ ہو کر لیٹی ہی تھی کہ منال کا فون آ گیا۔

میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے ان کی دن گننے کے لیے بے چین ہو گی۔ مگر میرے پاس تو کوئی خوش کن خبر نہ تھی۔ میں نے بے دلی سے فون اٹینڈ کیا۔ وہ مجھے سالگرہ کی مبارک باد دے رہی تھی۔ میری ظلمت دور ہونے لگی۔ میں کسی کے لیے تو اہم تھی۔

"صبح سے اب خیال آیا ہے۔" میں نے شکوہ کر ڈالا۔

"ذرا اپنے فون پہ میسج دیکھو تو سہی۔" وہ الٹا ڈپٹ کر بولی تو میں خاموش ہو گئی۔ اب یہ خرافات دیکھنے کی فرصت کہاں تھی۔

"اچھا سنو۔ رات کھانے پہ ہماری طرف آ جاؤ۔ مضراب بھائی کے ساتھ۔"

"پتا نہیں وہ کیا محسوس کریں۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کیا اورت ہے یار۔ میں کیا تمہیں کسی کلب یا ہوٹل میں انوائٹ کر رہی ہوں۔"

"اچھا" میں نے ہار مان لی۔ "شام کو آئیں گے تو پوچھ لوں گی۔"

"شام کو کیوں۔ ابھی فون کر کے پوچھ لونا۔ کیا فون نمبر نہیں ہے تمہارے پاس؟"

"چلو ٹھیک ہے۔ میں ابھی کال بیک کرتی ہوں۔"

میں نے مضراب کا نمبر ملایا۔ دوسری ہی بیل پہ اس نے فون اٹھا لیا۔ میں نے پہلی بار مضراب سے فون پہ بات کر رہی تھی۔

"ہیلو" ... اس نے سلام کی آواز ابھری اور تب ہی میرے دل میں اچانک شرارت جاگی۔ کیوں نہ اسے ستاؤں۔ رانگ نمبر بن کر۔

"ہیلو" میں نے آواز بدل کر کہا۔

"جی!" لہجے میں وہی ٹھہراؤ آ گیا جو میرے لیے مخصوص تھا۔ اور جس سے مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ وہ میری آواز پہچان گیا ہے۔ میں خاموش ہو گئی۔

"کیسے فون کیا ہے؟" وہ پوچھ رہا تھا اور میری خوش فہمیاں مجھ پہ ہنس رہی تھیں۔ جتنا بدھو میں اسے سمجھتی تھی وہ اتنا بدھو نہیں تھا۔

"میں یہ پوچھ رہی تھی کہ شام کو آپ مصروف ہیں یا نہیں۔"

"کیا مطلب کوئی کام ہے کیا؟" ابھی میرا جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ اس نے سوال جڑ دیا۔

"ہاں کہیں جانا تھا۔ ہم لوگ ڈنر پہ انوائٹڈ ہیں۔"

"ٹھیک ہے میں گھر آ کر تو پھر بات کریں گے۔" اس نے کہتے ہی فون بند کر دیا۔

اور میں سوچنے لگی۔ وہ نئے نویلے میاں بیوی کے درمیان ایسی گفتگو بھی ہو سکتی ہے۔ اتنی بے ربط اور بے رس... خیر میں نے رات کی ساری تیاری مکمل کر لی۔

رات کو آتے ہی اس نے پوچھا تھا "کہاں جانا ہے؟"

"میری دوست ہے منی اس نے انوائٹ کیا ہے۔" میں نے بتایا۔

"کس خوشی میں ڈنر ہے؟"

"وہ یہ ڈنر میری ہی خوشی میں دے رہی ہے۔ تمام کزنز اور دوست وہاں اکٹھی ہوں گی۔"

"کیسی خوشی؟" مضراب کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔

"آج میرا جنم دن ہے۔" میں نے آہستگی سے بتایا۔ میرا خیال تھا شاید وہ بھی مجھے وش کرے اور کہے کہ "تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔"

"تو تم ہر سال اپنی سالگرہ پہ کیک کاٹتی ہو۔" اس کے چہرے پہ استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔ "اگر ایسی ہی بات تھی تو مجھے بتا دیتیں میں کیک وغیرہ یہیں لا دیتا۔ اب یہ سب تکلیف کرنے تم ان کے گھر جاؤ گی۔ مجھے تو بہرحال یہ سب اچھا نہیں لگا۔ اگر تمہیں یہ سب کچھ اچھا لگتا ہے تو میں روکوں گا بھی نہیں۔ لیکن میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔"

اپنی بے قدری اور اس کے خشک رویے پہ میری آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے منال کو تو فون پہ انکار کر دیا پر اپنی آنکھوں میں آئی نمی کو نہ روک سکی۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر جب میں بستر پہ لیٹی تو میرا تکیہ بھیگتا چلا گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ مضراب کمرے میں کب آیا۔ جب وہ لائٹ آف کر کے میرے قریب لیٹا تو اسے محسوس ہو گیا کہ میں رو رہی ہوں۔

اپنے شک کو یقین میں بدلنے کے لیے اس نے لائٹ جلا دی اور میرے سامنے آ گیا۔

"تم رو رہی ہو؟" اس کے لہجے میں محبت نہیں حیرت تھی۔

میں نے انگلیوں سے آنسو جذب کرتے ہوئے آنکھیں میچ لیں۔

"اگر تم اپنی سالگرہ منانا چاہتی ہو تو میں ابھی تمہیں کیک اور دیگر اشیا لا دیتا ہوں۔ مگر اس میں رونے والی کون سی بات ہے۔ تم اب بھی اپنی سالگرہ منا سکتی ہو۔ اور

یہ بات تمہیں مجھے پہلے بتا دینی چاہیے تھی کہ تم سائکو، مزاجی ہو۔

اس کی گفتگو میں اندر ہی اندر کڑھ رہی تھی۔ اور اس سے زیادہ خود پہ کہ وہ خود پہ ضبط کر سکی نہیں کیوں تو خواہ مخواہ تماشا بن رہی ہوں۔

جو شخص صرف کیک کاٹنے کو ہی سالگرہ سمجھتا ہو اس کے سامنے جذبوں کی کیا تشریح کی جا سکتی تھی۔

"دیکھو مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے مجھ سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہو۔ پلیز اٹھو میں ابھی تمہیں کیک لا دیتا ہوں۔ تم اب بھی سالگرہ منا سکتی ہو۔"

فکار کا جواب۔ "نہیں چاہیے" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیا آپ کچھ دیر مجھے اکیلا نہیں چھوڑ سکتے؟" انہیں کچھ بھی کہنا تو وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔ پھر اٹھ کر واش روم میں چلی گئی۔ قسمت پتھر سے پھوٹ جاتی یا مضطرب سے ایک ہی بات تھی۔ وہ شخص جذبوں سے عاری تھا۔

میں کئی دن سے نوٹ کر رہی تھی۔ مضطرب اپنے موبائل پہ زیادہ ہی مصروف رہنے لگا تھا اور یہ سب میں جان بوجھ کر نظرانداز کر رہی تھی۔

ہر ماہ کی دوسری تاریخ کو وہ مجھے معمول کے مطابق جیب خرچ دیتا تھا جس کی مجھے خاص ضرورت نہیں ہوتی تھی اور وہ میں ایسے ہی دراز میں ڈال دیا کرتی۔ آج بھی جب وہ مجھے جیب خرچ دے رہا تھا تب ہی اس کا سیل فون بج اٹھا میرے سامنے ہی اس نے تین بار اس کال کو ریجیکٹ کیا مگر کرنے والا مستقل مزاج ہی تھا۔ بالآخر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں نے پیسے دراز میں ڈال دیے۔

پچھلے ماہ میں ٹھیک ٹھاک رقم جمع ہو گئی تھی۔ اگر میں انہیں تحفے تحائف میں اڑاتی تو ان پیسوں ایک روپیہ بھی نہ ہوتا۔ مگر اب میں تحفہ دیتی بھی تو کسے؟ مضطرب کو... تو مجھے اپنی انسلٹ اچھی طرح یاد تھی۔

شادی کے دو ماہ بعد جب میں نے مضطرب کے لیے ایک شرٹ اور ایک پرفیوم خریدا اور اسے اچھی طرح پیک کر کے مضطرب کو دیا تو اس نے بڑی بے دلی سے اسے دیکھا اور کہنے لگا۔

"تم نے خواہ مخواہ اتنا تکلف کیا۔ میرے ہی پیسوں سے مجھے ہی گفٹ دے رہی ہو۔ یہ پیسے تو میں تمہیں تمہارے خرچ کے لیے دیتا ہوں۔ اگر ان کو مجھ پر خرچ کرو گی تو اپنی ضروریات کہاں سے پوری کرو گی۔"

اف میں بیان نہیں کر سکتی۔ مضطرب کے یہ خیالات جب مجھ پہ آشکار ہوئے تو میری کیا حالت تھی۔ تم غصے سے میرا دل چاہا کہ اپنا سر پیٹ لوں یا اس بندے کا چہرہ نوچ لوں۔ تحفے تحائف تو محبت بڑھانے کے لیے ہوتے ہیں۔ مگر یہ حقیقت پسندی تو کچھ لوگوں کی طبیعت کا خاصہ ہوتی ہے۔ مگر ایسی بھی کیا حقیقت پسندی کہ کسی کے دل کا بھی خیال نہ رکھا جائے۔

☆ ☆ ☆

ایک تتلی تو میں بھی پکڑ ہی لیتا
ہاتھ میں پھول اگر لے کے نکلتا میں بھی

جب میں نے یہ شعر پڑھا تو صوفیہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ اور میں اس کی ہنسی کے ترنم میں کھونے لگا۔ نمرہ کی نسبت صوفیہ میں کتنی سادگی اور معصومیت تھی یہ اندازہ مجھے صوفیہ سے مل کر ہوا تھا۔

صوفیہ میری زندگی میں آنے والی دوسری عورت تھی۔ حالانکہ جب میں نے شادی کے بعد نمرہ کو دیکھا تھا تو یہ سوچا تھا کہ وہ میری زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری عورت ہے۔ تب ... سے ... تھا۔ واقعی میری زندگی میں آنے والی وہ پہلی عورت تھی ... مجھے بھی نہیں تھا کہ جلد ہی ایک اور لڑکی میری زندگی میں داخل ہو جائے گی۔ نمرہ میری زندگی میں باقاعدہ داخل ہوئی تھی۔ جبکہ صوفیہ بالکل اچانک۔

وہ مجھے بڑے عجیب عجیب سے ایس ایم ایس بھیجا کرتی تھی۔ اور یہ سلسلہ شادی کے ٹھیک تین ماہ بعد سے شروع ہوا تھا۔ پہلے پہل تو میں یہ سب یکسر نظرانداز کرتا رہا۔ لیکن اس کی مستقل مزاجی ہی تھی کہ میں جواب دینے پہ مجبور ہو گیا۔

پھر یہ سلسلہ فون کالز تک آ گیا۔ میں ان خرافات کا فطرتی طور پہ قائل نہیں تھا۔

لیکن نمرہ کی بہت سی باتوں نے مجھے اس کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ نمرہ کے اندر ہٹ دھرمی اور جارحیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جبکہ میں ایک صلح جو انسان تھا۔ میرے اپنے گھر کی ایسی خواتین نہیں تھیں جیسی نمرہ تھی۔ مردمار قسم کی خاتون۔

حالانکہ وہ غیر معمولی حسن کی مالک تھی۔ اور اس پہ کسی بھی شخص کو محبت ہو سکتی تھی۔ لیکن .... لیکن

نہیں وہ پہلے ہی دن سے مجھ پہ کیا جتانا چاہتی تھی۔

صوفیہ کی بے تکلفی کی حوصلہ افزائی میں نے اس لیے بھی کی تھی کہ میں عورت کو جاننا چاہتا تھا۔ ثمرہ کی شخصیت نے مجھے یہ قدم اٹھانے پہ مجبور کر دیا تھا۔

یہ سب کچھ ایک طرف اور ثمرہ کا رویہ دوسری طرف تھا۔

میں آج تک یہ سمجھ نہیں پایا کہ ثمرہ نے میرے ساتھ ایسا رویہ کیوں رکھا تھا۔

"جب میں شادی کی پہلی رات اپنے کمرے میں پہنچا تو ثمرہ سادہ لباس میں ملبوس صوفے پہ ایستادہ تھی۔ میں خلوت میں پہلی بار ایک لڑکی سے ملنے جا رہا تھا۔ ظاہر ہے میں کچھ نروس بھی تھا۔ لیکن جب مجھے مقابل فریق شرماتا لجاتا ملا تو میں اور بھی نروس ہو گیا۔ میں اپنی شریک سفر سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن میرے پاس وقت بہت کم تھا۔"

میری اس بات پہ صوفیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"وقت کم تھا کیا مطلب؟"

"ہاں وقت کم تھا۔ جب میں کمرے میں گیا تو صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ گھر کا اکلوتا فرزند اور بھائی ہونے کے ناتے سب کو مجھ سے بہت سی توقعات تھیں تو وہاں خدشات بھی بہت تھے۔ بیوی سے ملتے ہی کہیں میں بیوی کا ہی نہ ہو جاؤں۔ اسی لیے میں شادی کی پہلی صبح اپنے کمرے سے اسی وقت نکلا جس طرح روز نکلتا تھا۔ ٹھیک آٹھ بجے۔

اور اس بات پہ میری بہنوں کا اطمینان مجھ سے چھپا نہ رہ سکا۔ ظاہر ہے ایسا سب کچھ امی ابو بھی چاہتے ہوں گے تب ہی وہ مجھ سے خوش تھے۔

پھر اگر میں کمرے میں رکتا بھی تو الجھتا ہی رہتا۔ کیونکہ ثمرہ سے پہلی ملاقات کے بعد میں پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا اور دن بھر مجھے یہی احساس ہوتا رہا کہ اس کے بھی کچھ حقوق تھے۔ مجھے اس چیز کو پس پشت نہیں ڈالنا چاہیے تھا۔ وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہو گی۔

اگلی ملاقات پہ جب میں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو اس نے میری تردید نہیں کی اور چپ رہی۔ وہ شادی کی پہلی صبح تھی۔ ولیمہ کے بعد جب ہماری ملاقات ہوئی۔ تو میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ولیمہ کے ڈریس میں وہ اتنی حسین لگ رہی تھی تو شادی والے روز تو اس سے بھی زیادہ حسین لگ رہی ہو گی کیوں اس نے اپنا میک اپ اور جیولری اتار دی تھی۔ میرا حق تھا کہ میں اس سے یہ پوچھوں کہ اس نے ایسا کیوں کیا مگر میں نے نہیں پوچھا۔

پہلے ہی پہلی رات کون سی اچھی گزری تھی۔ جو میں یہ تلخ باتیں لے کر بیٹھ جاتا۔ ویسے بھی میں تو نظر آتا ہی صبح جو کوئی ہوں۔

لیکن مجھے پچھلی رات کی خلش ضرور تھی۔ اس لیے دانستہ میں نے اس کی تعریف نہیں کی۔ میں اس منافقت کا آج اظہار کر رہا ہوں۔ اگر وہ سمجھنا چاہتی تو میرے احساس کو جان سکتی تھی۔ لیکن مجھے ایسا لگا جیسے خود پسندی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ کیونکہ جب میں نے پیش قدمی شروع کی تو وہ اکڑ کر کھانے لگی۔ غالباً تلک میں نے تو سنا ہے کہ لڑکیاں ان لمحات میں شرمائی ہیں مگر وہ حساب کتاب کر رہی تھی۔ اس کی اس خود سری اور مجھ پہ حاوی ہونے والی فطرت ہی وہ وجہ تھی کہ میں نے اسے رونمائی کا تحفہ بھی اپنے ہاتھ سے نہیں پہنایا تھا جسے اس نے ایک طرف پھینک دیا تھا۔ تب میں پیچھے ہٹ گیا۔ اور سنے میرے سے الجھنے لگا۔ اور وہ جا کر لیٹ گئی۔

اس کے بعد بھی میرے لیے اس کا یہی رویہ [illegible] تھی بلکہ ناگواری تھی۔ مگر پھر بھی میں نے اس کی بدتمیزی کو نظر انداز کر دیا۔

اسے شاید صبح دیر تک سوتے رہنے کی عادت تھی۔ مجبوراً مجھے ہی اسے جگانا پڑا۔ میں یہ چاہتا تھا کہ وہ اپنی ذمے داری اچھی طرح سنبھال لے اور میرے والدین اور بہنوں کو کسی بھی شکایت کا موقع نہ ملے۔"

"واٹ نان سینس۔" صوفیہ نے میری بات پہ سر جھٹکا۔ "دو روز کی دلہن بھلا اپنی کیا کارکردگی دکھا سکتی ہے۔ آپ نے اس سے غلط توقعات وابستہ کیں۔ ابھی تو وہ آپ کے ساتھ ایڈجسٹ بھی نہیں ہوئی تھی۔ آپ کے گھر والوں کو کیسے قبول کر لیتی۔ آپ میں ان کی خدمتیں وہ تب ہی کر سکتی تھی جب وہ آپ سے خوش ہوتی۔ یہ تو آپ سے خوش ہی نہیں تھی۔ پھر وہ کیوں لوگوں کے دلوں میں جگہ بناتی کیوں انہیں خوش کرتی۔ اس چیز کے لیے وقت تو لگتا ہے نا۔۔۔"

میں نے صوفیہ کی بات بڑے دھیان سے سنی۔ کہہ وہ بھی ٹھیک ہی رہی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ انسان کا پہلا تاثر دیرپا ہوتا ہے۔ جتنے جوش و خروش سے میری بہنیں اور والدین ثمرہ کو بیاہ کر لائے تھے میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ماند پڑے۔ اور اس میں ثمرہ کا ہی فائدہ تھا۔ اسی کی تو عزت بڑھانا چاہتا تھا میں۔ وہی سارے گھر پہ چھائی رہے یہی میری خواہش تھی۔"

"تو کیا آپ نے اپنے ان احساسات کا اظہار اس کے سامنے کیا؟" صوفیہ نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"ہاں میں نے اس چیز کو بار ہا جتایا اور پہلی رات میں نے صرف اسی بات پر زور دیا تھا کہ وہ میرے گھر والوں کی چاہت بن کر آئی ہے۔ یہ چاہت کم نہ ہونے پائے۔"

"حیرت کی بات ہے پھر بھی آپ کی بیوی سمجھ نہ سکی۔" صوفیہ نے کاندھے اچکائے تو میں صوفیہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"اصل میں بات یہ ہے کہ اس نے میرے گھر والوں کو اہمیت ہی نہیں دی اور آج تک اس کا یہی رویہ ہے۔ وہ مجھ سے شاکی ہی رہتی ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے وہ کسی اور کو پسند کرتی تھی اور زبردستی میرے ساتھ نباہ کر رہی ہے۔"

"بڑی جلدی کی آپ نے اس نتیجے پہ پہنچنے کی۔ آپ مرد لوگوں میں یہی تو خرابی ہے۔ عورت پہ الزام لگانے میں ایک لمحہ نہیں لگاتے۔ جبکہ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں تو آپ خود اس وقت کیا کر رہے ہیں۔"

میں صوفیہ کی بات پہ محظوظ ہوا اور چلتے چلتے رک گیا۔ پھر صوفیہ کی خوب صورت آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

"میں آپ سے فلرٹ تو نہیں کر رہا۔"

صوفیہ میری بات پہ گھبرا گئی۔ ایسی گھبراہٹ میں نے کبھی ثمرہ کے چہرے پہ نہیں دیکھی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس پہ سے نظریں ہٹا لیں۔

روزانہ شام کو صوفیہ کے ساتھ وقت بتانا میرا معمول بن گیا تھا۔

مجھے اس کی سنگت میں خوشی حاصل ہوتی تھی۔ وہ مجھے سنتی بھی تھی اور مجھے سناتی بھی تھی لیکن اس نے کبھی مجھ پہ حاوی ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"شاید میں غلط بھی ہو سکتا ہوں۔ لیکن ثمرہ نے کبھی مجھے یا میرے گھر والوں کو اہمیت نہیں دی۔"

"آپ کے گھر والوں نے کبھی اس کو اہمیت دی ہے۔ کبھی اس کو سراہا اس کی تعریف کی؟"

"یہ سچ ہے کہ میرے گھر والوں میں سے آج تک اس کی تعریف کسی نے نہیں کی۔"

صوفیہ اس بات پہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ "یہ تو ہمارے معاشرے کا وتیرہ ہے کہ بہوؤں کی کوئی تعریف نہیں کرتا۔"

"مگر میرے گھر والے اس کی برائیاں بھی نہیں کرتے۔" میں نے سچائی سے کہا۔

"یہ تو پھر آپ لوگوں کا بڑا پن ہے کہ اس میں خوبیاں بھی نہیں ہیں۔ پھر بھی اس کی برائی نہیں کرتے۔" صوفیہ محظوظ ہوتے ہوئے مجھ پہ طنز کر رہی تھی۔

"ویسے یہ آپ کی بیوی کی خوبی نہیں کہ جب آپ رات کو دیر سے گھر جاتے ہیں تو وہ آپ سے پوچھتی نہیں کہ آپ کہاں تھے؟"

"مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اس نے اب مجھ میں دلچسپی لینا چھوڑ دیا ہے یا اپنے جذبات سے تائب ہو گئی ہے۔"

"صرف چند ہی ماہ میں۔" صوفیہ کو حیرانی ہوئی۔

"ہاں میں نے بتایا نا کہ خود پسندی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔"

"تو آپ اس خود پسندی کا یہ فائدہ اٹھا رہے ہیں کہ آپ نے راستہ ہی بدل لیا۔"

"نہیں۔" میں نے اس کی بات کو سختی سے رد کیا۔

"میں بھی زندگی کو اب ہنسی خوشی گزارنا چاہتا ہوں۔ ساری عمر میں نے اپنے جذبات صرف ایک لڑکی کے لیے سنبھال کر رکھے تھے۔ لیکن اس نے مجھے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ وہ کیا جتانا چاہتی تھی مجھے۔ میرے ہی پیسوں سے مجھے گفٹ دے کر کیا مجھے یہ سب کچھ کرنا نہیں آتا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار جو تحفہ کسی لڑکی کو دیا تھا وہ رونمائی کی انگوٹھی تھی۔ جسے اس نے آج تک انگلی میں نہیں ڈالا۔ یہاں تک کہ میں نے اس سے یہ بھی کہا تھا کہ اگر اسے یہ پسند نہیں تو میں دوسری کوئی اور چیز بھی لا سکتا ہوں۔"

"کیا وہ انگوٹھی آپ نے اسے خود پہنائی تھی؟" صوفیہ کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"جب اس نے تمام زیور ہی اتار کر پھینک رکھا تھا تو میں اسے انگوٹھی کیوں پہناتا؟ بندہ کا پہلا امپریشن ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ یہ جان بوجھ کر میری ہر بات کی نفی کرے گی۔ اس لیے میں نے اس سے

"آپ اتنی جلدی اتنا بڑا فیصلہ نہیں کر سکتے کیونکہ نہ تو آپ جلد باز ہیں۔ اور نہ ہی آپ اپنے خیالات و نظریات تبدیل کرنے والے شخص ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ اپنی بیوی کے ساتھ ہی کمپرومائز کر چکے ہوتے۔ دیکھیں مضراب صاحب! ایک بات کہوں برا مت مانیے گا۔ آپ کے ٹھوس خیالات نے آپ کی شخصیت کو مخمس کر رکھا ہے۔ بجائے اس کے آپ کے اردگرد تبدیلی آئے۔ خود کو تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔ آپ کے اردگرد اچھے اثرات رہیں گے۔"

صوفیہ کی گفتگو مجھے بہت سچی ثابت کر رہی تھی۔ اور تب مجھے احتیاط سے کام لینا پڑا۔

"یہ سب باتیں میرے سوال کا جواب تو نہیں ہیں؟"

اس نے ایک بار پھر حیرانی سے میری طرف دیکھا۔

"اگر آپ واقعی سنجیدہ ہیں تو میں سوچ کر جواب دوں گی۔"

مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری اور صوفیہ کی یہ آخری ملاقات ہوگی۔ جس طرح وہ بالکل اچانک میری زندگی میں آئی تھی۔ ویسے ہی روپوش بھی ہوگئی اور میں نے اسے تلاش کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

☆ ☆ ☆

منال کو رخصت کر کے جب میں نبیل کے ہمراہ گھر آئی تو بہت تھک چکی تھی۔ اور صرف سونا چاہتی تھی لیکن مضراب کو پہلے سے سویا ہوا پا کر میں نئے سرے سے بچ گئی۔ کچھ دن سے میں مضراب کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

"منافق!" میں چلا چلا کر کہنا چاہتی تھی مگر مجھے ضبط کرنا پڑا۔

میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مضراب اندر سے اتنا کھوکھلا ہوگا جس شخص نے پہلی رات اتنے بڑے بڑے دعوے کیے تھے۔ وہ بھی اندر سے وہی تھا۔ وہ ایک غیر لڑکی سے عشقیہ ڈائیلاگ بول سکتا تھا۔ بیوی سے یہ سب کچھ کہتے ہوئے اسے شرم آتی تھی۔ اور یہاں تک کہ اس نے منال کو پرپوز بھی کر دیا تھا۔

اور یہ بات مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

منال نے صوفیہ بن کر جہاں مضراب کی شخصیت کے اور پرت کھولے تھے۔ وہاں اس کی اصلی فطرت کو مجھ پر واضح کر کے مجھے سخت بددل کر دیا تھا۔

"وہ میری کوتاہیوں کو نظر انداز نہیں کر سکا۔ تو میں کیسے اس کے اتنے بڑے جرم کو معاف کر سکتی ہوں۔" میں نے آنسو ضبط کرتے ہوئے منال سے کہا تو اس نے اپنے بازو پھیلا کر مجھے سینے سے لگا لیا اور رونے لگی۔

"میں نے یہ سب تم دونوں کو ایک دوسرے سے دور کرنے کے لیے نہیں کیا تھا۔ میں تم لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا چاہتی تھی۔"

"وہ تم سے کہہ سکتا تھا۔ اس نے مجھ سے کیوں نہیں کہا سب کچھ۔" میں رو پڑی تھی۔ منال بھی پریشان ہو گئی۔

"میں نے ان کی ذات کی ساری کمزوریاں اس لیے تم پر واضح کی ہیں۔ تاکہ تم انہیں اچھی طرح سمجھ سکو اور پھر تم نے خود ہی تو آفر کی تھی مضراب بھائی کو دوسری لڑکی کی۔"

اس کا اشارہ اس نظم کی طرف تھا جو کالج مشاعرے میں ہماری ایک دوست نے پڑھی تھی اور جسے میں نے تب ہی اپنی ڈائری میں لکھ لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وقت کے ساتھ بہت سی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ اب نمرہ کی دلچسپیوں کا مرکز میں نہیں مضراب بن چکے تھے۔ نمرہ نے سب کچھ [illegible] حالانکہ اس کی طبیعت پریگننٹ ہونے کی وجہ سے خاصی گری گری رہتی تھی۔ نہ اس کے چہرے پر بشاشت تھی اور نہ آنکھوں میں وہ چمک اور تازگی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔

لیکن نہ جانے کیوں مجھے لگتا تھا کہ نمرہ مجھ سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ اسے مجھ سے کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی تھی۔ ہمارے درمیان ایک خلیج سی حائل ہو گئی تھی۔

میں گھر میں داخل ہوا تو گھر میں غیر معمولی چہل پہل تھی۔ میری تینوں بہنیں بمعہ بچوں کے آئی ہوئی تھیں۔ نمرہ بھی ان کے پاس بیٹھی تھی اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ابو ... نہایت سنجیدہ اور لیے دیے رہنے والے ابو نواسوں پر پھول نچھاور کر رہے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی تینوں نے قافلہ تیار ہونے کا آرڈر جاری کر دیا۔

"مگر مجھے پتا تو چلے معاملہ کیا ہے؟" میرے سوال پر آپی نے سب سے زیادہ مجھے شاکی نگاہوں سے دیکھا۔

"آج کے دن نمرہ ہمارے گھر میں آئی تھی۔"

"یعنی میری ویڈنگ اینی ورسری۔" میں زیر لب بڑبڑایا۔

"جی ہاں!" میری ساری بہنوں نے ایک ساتھ کہا اور میں نے نمرہ کی طرف دیکھا۔ وہ سپاٹ چہرہ لیے لاتعلق سی بیٹھی تھی۔

"اب تم جلدی سے نہا دھو لو۔ تمہارے بہنوئی بھی آنے والے ہوں گے۔" امی نے کہا۔

مجھے اپنے آپ سے شرمندگی ہونے لگی۔ میں نے تو کوئی اچھا سا گفٹ بھی نہیں خریدا۔ اب اتنی جلدی میں کیا لوں؟

"آپ کے ٹھوس نظریات نے آپ کی شخصیت کو مخمس کر دیا ہے۔" صوفیہ کی بات مجھے شدت سے یاد آئی۔

"کیا میں نمرہ سے پوچھوں کہ وہ کیا لینا چاہے گی؟"

"نہیں میں اپنی پسند سے نمرہ کے لیے گفٹ لوں گا۔"

میں الٹے قدموں گھر سے نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

سب نے میرے ہاتھ کے پکے کھانوں کی تعریف کی تھی۔ ابو چھوٹے سے فنکشن سے سب ہی بہت خوش تھے۔ مجھے اب ... نندوں نے نندوں کے بچوں نے اور امی نے یہاں تک کہ نبیل نے بھی۔ میں مضراب کی محبت ڈھونڈنے نکلی تو مجھے میرے بہت سی محبتیں مل گئیں۔ میں ان محبت کرنے والوں کے درمیان خود کو بہت پرسکون محسوس کر رہی تھی۔

"کیا مجھے اب مضراب کی محبت کی ضرورت نہیں تھی؟"

میں نے اپنے دل کو ٹٹولنا چھوڑ دیا تھا۔

سب کے چلے جانے کے بعد میں امی ابو کے درمیان بیٹھی رہی۔ جویریہ ہمارے لیے چائے بنا لائی تھی اور اب جویریہ اور ماریہ مل کر برتن وغیرہ سمیٹ رہی تھیں۔

مضراب کمرے میں جا چکا تھا اور [illegible] مجھے چونکہ نیند نہیں آ رہی تھی اس لیے میں باتوں میں مشغول رہی۔ تھوڑی دیر بعد ابو بھی سونے چلے گئے۔ تب میں کمرے میں آ گئی۔

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔

لیکن خوشبو آئی تھی کہ میں چکرا سی گئی کہ میں غلط جگہ آ نکلی اور تب ہی مضراب نے مجھے بازوؤں میں لے لیا۔

نعیمہ ناز

دستِ حنا

"بیگم! چھوٹی بھابھی کہاں رہ گئیں؟ اب تک نہیں آئیں۔ حماد ذرا فون تو کرو۔" شائستہ بیگم نے فکرمندی سے کہتے ہوئے اپنے چھوٹے بیٹے کی طرف دیکھا۔

"پارلر میں ہوں گی۔ جب تک سنگھار پورے نہ ہوں، وہ کہاں آئیں گی؟" بڑی بھابھی نے گنتا گنت تسبیح کے دانے گرانے کا عمل درمیان میں روک کر طنز کیا۔

"راستے میں ہیں۔ بس ابھی پانچ منٹ میں پہنچ جائیں گی۔" حماد نے موبائل آف کر کے اپنی امی کو جواب دیا۔

اور واقعی ٹھیک چھ منٹ بعد وہ حسب عادت قہقہے لگاتیں نک سک سے درست فیملی سمیت ان سب کے روبرو تھیں۔

"بہت بہت مبارک ہو شائستہ! اللہ تعالیٰ بچے کی عمر دراز کرے، اسے صحت و تندرستی عطا فرمائے۔" انہوں نے گلے لگتے ہوئے دیورانی کو پوتے کے عقیقہ کی مبارک باد بھی دی اور ساتھ ساتھ دعا بھی۔

"اور نیک بھی بنائے۔" بڑی بھابھی نے تسبیح درمیان میں روک کر لقمہ دیا۔

"آمین۔" شائستہ بیگم نے صدق دل سے کہا۔

گلابی اور فیروزی کنٹراس میں جدید تراش خراش کا سلا ہوا سوٹ، میچنگ جیولری، چمکتا دمکتا چہرہ جو کچھ تو پابندی سے پارلر کی حاضری اور کچھ قیمتی کاسمیٹکس اور سلیقے کے میک اپ کی مرہون منت تھا۔

"بچے جوان ہیں، شادیاں ہونے والی ہیں اور اس عمر میں بھی فیشن کا یہ حال ہے، شرم بھی تو نہیں آتی اتنی لیپا پوتی کرتے۔ پتہ نہیں خدا کو کیا منہ دکھائیں گی؟"

بڑی بھابھی اپنی چھوٹی دیورانی سے سلام دعا سے فارغ ہونے کے بعد ایک بار پھر تسبیح کے دانے گرانے میں مصروف، انہیں حسب عادت حقارت سے دیکھ رہی تھیں جن کے انداز و اطوار ان کی دانست میں بے پچھوڑے بھی تھے اور غیر شرعی اور غیر اسلامی، خاتون ان سے ذرا ہی دور ہمیشہ کی طرح محفل جما کے بیٹھی تھیں اور خوب چہک رہی تھیں اور لٹکے جھٹکے ہونے والی اپنے بیٹے کی منگنی کے بارے میں بتا رہی تھیں۔

"بھئی سب ہی جانتے ہیں کہ میں تو جدید خیالات رکھتی ہوں۔ بیٹے نے اپنی پسند بتائی، میں نے فوراً روشن خیالی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے بیٹے کی مرضی پہ لبیک کہا۔ اب وہ پرانے دور گئے کہ اولاد کے تمام معاملات انسان اپنی مرضی سے طے کرے۔ اب تو بھئی ماڈرن دور ہے۔ اولاد کو آزادی دینے کے معاملے میں تو والدین کو روشن خیال ہونا ہی چاہیے اور دنیا والوں کی پروا کیا کرنی۔"

بڑی بھابھی ان کی باتیں سن سن کر دل ہی دل میں ان پر نفرین بھیج کر خدا کے حضور ان کا انجام سوچ رہی تھیں۔

یہ ان میں ایک بہت بڑا کمال تھا کہ ان کی زبان خدا کے ذکر میں مشغول رہتی اور دل و دماغ آس پاس ہونے والی گفتگو اور سرگرمیوں میں مصروف رہتے۔ اذان کی آواز پر انہوں نے تسبیح کو سائیڈ میں رکھ دیا۔

"چلو بھئی، اٹھ جاؤ سب۔ نماز کا وقت ہو گیا۔"

اس طرح کی تبلیغ وہ ہر محفل میں ہی کرتی تھیں۔ نماز روزے کے فضائل، پردے کے احکامات، غیر شرعی اور غیر اسلامی کاموں کی تفصیلات اور ان کے عواقب۔ انہیں سب ازبر تھا جنہیں وقتاً فوقتاً بیان کر کے وہ سب کی اصلاح کرنے اور انہیں اپنی ہی طرح کا ایک نیک اور سچا مسلمان بنانے کی کوشش کرتیں۔

"ہم نے تو پرفیوم لگایا ہوا ہے۔ اس میں سنا ہے کہ الکحل ہوتا ہے۔ پتہ نہیں وضو ہو گا یا نہیں۔ نماز کیسے ہو گی؟" چھوٹی بھابھی نے ایک مسئلہ بیان کیا۔

"مامی! اللہ میاں کا دامن رحمت ہماری سوچ سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ بندہ ان کے حضور کھڑا ہو جائے تو شاید وہ ایسی چھوٹی موٹی باتوں کی پروا نہ کرتے ہوں؟" یہ زوار تھا جو زبان پر آئی بات کو روکنے کا دل میں رکھنے کا بالکل بھی قائل نہ تھا۔

"ارے بھئی، قضا پڑھ لیں گے۔ اللہ تعالیٰ بڑے غفور الرحیم ہیں۔" انہوں نے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ ویسے بھی ابھی ابھی تو ممی

پھر رقم دے کر میک اپ کروا کر آتی تھیں، وضو کیسے کرتی تھیں؟

"اللہ تعالیٰ رحیم و کریم ہونے کے ساتھ ساتھ جبار و قہار بھی تو ہیں۔ گرفت بھی پھر ایسی سخت ہوتی ہے۔" بڑی بھابھی نے اپنی دیورانی کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔

"اُفوہ.... آپ جیسے لوگوں نے تو بس اللہ تعالیٰ کا ایک ایسا امیج بنایا ہوا ہے کہ جیسے وہ اپنے ہر بندے کو سزا دینے کے لیے فوراً تیار بیٹھے رہتے ہیں کہ ذرا بندے سے کوئی بھول چوک، کوئی غلطی، کوئی قصور سرزد ہو اور سزا کا مستحق بنے۔" چھوٹی بھابھی جھنجلا کر بولیں۔

"تو بھلا میں نے کیا کہہ دیا؟" بڑی بھابھی کے بھی تیور بگڑ گئے۔ "نیک اعمال کے بغیر، فرائض پورے کیے بغیر، حیلوں بہانوں سے تو جنت ملنے سے رہی۔ نہ اللہ کی پکڑ سے کوئی بچ سکتا ہے اور میں تو...."

"چلیے چھوڑیے بھابھی جان! آپ ادھر آئیے۔" سب سے چھوٹی دیورانی اور میزبان شائستہ بیگم نے نرمی سے کہتے ہوئے ان کا ہاتھ پکڑا اور دوسرے کمرے میں لے آئیں۔

"آپ نماز پڑھ لیں، میں نے جائے نماز بچھا دی ہے۔" انہوں نے اشارہ کیا۔ "عارفہ نے تو حد ہی کر دی۔" جائے نماز پر کھڑے ہو کر وہ بڑبڑانے لگیں۔ "اب ایسا بھی کیا ماڈرن ازم کہ انسان اللہ کو بالکل ہی بھول جائے۔ دین کو بالائے طاق رکھ دے۔ ذرا نماز پڑھنے کو کہہ دیا تو برا لگ گیا۔"

"آپ نے کہہ کر اپنا فرض پورا کر دیا۔ آگے وہ جانیں ان کا کام۔ ہر ایک کا عمل اُس کے اپنے لیے ہے۔" انہوں نے سہولت سے بولتے ہوئے بات ہی ختم کر دی۔

وہ واپس آئیں تو چھوٹی بھابھی نے انہیں پکڑ لیا۔

"کیا کہہ رہی تھیں میرے بارے میں؟" انہوں نے شائستہ بیگم کو کریدا۔

"دیکھیں، بھئی مجھ سے تو کچھ نہیں کہا انہوں نے۔ بس نماز پڑھنے کھڑی ہو گئیں۔" انہوں نے ہمیشہ کی طرح مصالحت آمیز جواب دے کر بات کو مزید بڑھنے سے روکا۔

"ہونہہ۔ کیا میں جانتی نہیں ہوں جس جس سے بھی میرے متعلق جو بھی بات کرتی ہیں، سب مجھ تک پہنچ جاتی ہے۔ نماز، روزے اور پردے کے سارے مسائل معلوم ہیں۔ غیبت کے بارے میں کچھ نہیں پتا؟" ان کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

"چھوڑیں بھابھی! وہ بے چاری تو اپنی طرف سے نیک نیتی سے اللہ، رسول کی باتیں بتاتی ہیں، آپ تھوڑی کچھ کہتی ہیں۔ آپ برا نہ مانا کریں۔" صلح جو فطرت کی مالک شائستہ بیگم نے انہیں بھی ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں، یہ سمجھتی ہیں کہ بس یہ خود اللہ والی ہیں اور ہم تو جیسے خدانخواستہ کافر ہیں، مشرک ہیں۔ کبھی لباس پر اعتراض، کبھی زیور پہ تنقید، کبھی میک اپ پر طنز، سب کے سامنے نصیحتوں کے انبار، سب سے زیادہ مجھے ہی یہ سنانے کی کوشش کرتی ہیں۔" چھوٹی بھابھی پتا نہیں کب سے بھری بیٹھی تھیں۔

"بڑی ہیں، آپ یکسر سوچ کے درگزر کر جایا کریں۔ مجھے اور آپ کو کچھ سمجھتی ہیں تو نصیحتیں کرتی ہیں نا۔ کسی ایرے غیرے کو کوئی تھوڑی یوں کہتا ہے۔" شائستہ بیگم نرمی سے انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"اور رویے بھی آج کے جدید دور میں ہر ایک کی ہر بات کو لے کر ہم بیٹھ جائیں تو زندگی گزارنا مشکل ہو جائے۔"

شائستہ بیگم نے ان کے مزاج کی عین مطابق خاص طور پر جدیدیت کا ذکر کیا اور یہی ہوا۔ وہ فوراً کہنے لگیں۔

"ارے ہاں، چھوڑو، ہم تو ٹھہرے جدید دور کے تقاضے پورے کرنے والے لوگ۔ بھلا اتنی فرصت اور وقت کہاں کہ ان سب باتوں کو لے کر بیٹھے رہیں۔ تم نے میرا سیٹ نہیں دیکھا؟" انہوں نے بڑے ذوق شوق سے ان کی توجہ اپنے جیولری سیٹ کی طرف کروائی۔ "فریحہ اپنے لیے لائی تھی، میں نے اس سے لے لیا۔"

"ہاں، ماشاء اللہ بہت خوب صورت ہے۔ نزاکت بھی ہے اور نفاست بھی۔" شائستہ بیگم نے کھلے دل سے تعریف کی اور وہ سیٹ اگر اتنا خوب صورت نہ بھی ہوتا تب بھی وہ تعریف کرنے میں کبھی کنجوسی نہیں کرتی تھیں۔ وہ یہ سوچ رکھتی تھیں کہ اگر ہمارے چند لفظوں سے کسی کا مان بڑھتا ہے یا وہ خوش ہوتا ہے تو وہ چند لفظ کہنے میں بھلا کیا حرج ہے؟

شائستہ بیگم وہاں سے اٹھ کر اپنے دوسرے مہمانوں کو تھوڑا تھوڑا وقت دینے لگیں۔ ساتھ ساتھ دعوت کے انتظامات بھی ان کے زیر نگرانی تھے۔ ادھر عارفہ بیگم تو جوان لڑکیوں کے گروپ کو جوائن کر کے ان سے بال اور کھال کی حفاظت و خوب صورتی کے لیے ایک دوسرے سے مختلف ٹپس کا تبادلہ کرنے میں مصروف ہو گئیں۔

☆☆☆

ایک ماہ بعد بڑی بھابھی شائستہ بیگم کے گھر آئی تھیں۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ بڑے رازدارانہ انداز میں گویا ہوئیں۔

"سنا ہے فریحہ نے بھی اپنا بر خود ہی تلاش کر لیا؟ ظاہر ہے بھئی ماڈرن فیملی ہے۔ اس نے بچوں کو پوری چھوٹ دی ہوئی ہے جو گل کھلا لیں کم ہے۔ بھلا وہ کیوں اپنے بھائی سے پیچھے رہتی۔" بڑی بھابھی کے لہجے میں طنز بھی تھا اور تنفر بھی۔

"ایسی بات نہیں ہے بھابھی!" شائستہ بیگم ان کی پوری بات سن کر تحمل سے کہنے لگیں۔ "فریحہ ہمارے آپ کے سامنے کی پلی بڑھی بچی ہے۔ آج تک کوئی ایسی ویسی بات سننے میں نہیں آئی۔ ہاں بس یہ ہے کہ فریحہ کے کلاس فیلو نے اپنے گھر والوں کے ذریعے پروپوزل بھیجا ہے جو بھی بات ہوئی بڑوں کے درمیان ہوئی۔ ان شاء اللہ وہ عزت کے ساتھ اپنے گھر سے رخصت ہو گی۔ ہمیں کسی کے متعلق یوں بدگمانی نہیں کرنی چاہیے۔"

شائستہ بیگم نے اپنی نیک اور سادہ فطرت کے مطابق اچھے الفاظ اور انداز میں فریحہ کا دفاع کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ عارفہ بیگم نے تو فریحہ کے معاملے میں انہیں اعتماد میں لیتے ہوئے پوری بات بتائی تھی کہ لڑکا خاندانی اور مالی دونوں لحاظ سے ان کا ہم پلہ نہیں مگر فریحہ نے ضد باندھی ہوئی ہے وہیں کرنے کی۔

"چلو جی، میں نے بھی سوچا کہ ہماری روشن خیالی کس کام کی۔ اگر ہمارے بچے اپنی زندگی کے اتنے اہم معاملے میں بھی اپنی مرضی استعمال نہ کر سکیں۔" اپنے آخری فقرے میں انہوں نے عندیہ ظاہر کر دیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی ضد پوری کر دیں گی۔

شائستہ بیگم پہ اعتبار کرتے ہوئے عارفہ بیگم ہی کیا بہت سے لوگ ان سے اپنے راز اور مسئلے مسائل شیئر کر لیتے تھے اور وہ بھی کسی کے اعتبار کو ٹھیس نہیں پہنچاتی تھیں۔ اس وقت بھی انہوں نے مناسب انداز میں اس موضوع کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

"سنا ہے خاندانی بھی نہیں ہیں، جانے کون لوگ ہیں؟" بڑی بھابھی کافی "باخبر" ہو کر آئی تھیں۔

"سب حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ ہم بھلا کسی پہ کیسے حکم لگا سکتے ہیں۔ خاندانی اور غیر خاندانی ہونے کا۔"

"اے بھئی، ماں باپ کا فرض ہے کہ دیکھ بھال کے رشتے کریں۔ ایسی بھی کیا آزادی دیں بچوں کو کہ والدین کی ناک میں نکیل ڈال کر اپنے پیچھے پیچھے گھماتے پھریں۔" بڑی بھابھی کی سوئی ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔

"تمام والدین اپنی اولاد کے بہترین خیر خواہ ہوتے ہیں۔ فریحہ کے والدین جو مناسب سمجھیں گے، وہ کریں گے ہم اور آپ کیا کہہ سکتے ہیں؟" شائستہ بیگم نے بات ختم کرتے ہوئے موضوع بدل دیا۔

"اور آپ بتائیں، سدرہ ٹھیک ہے؟ اس کے بیٹے کا بخار ٹھیک ہو گیا؟"

"ہاں، اللہ کا شکر ہے میری بچی بالکل خیریت سے ہے اور اس کے بچے کا بخار بھی اب اتر گیا ہے۔ کل ہی

تو آئی تھی۔ بیٹا تو ماشاء اللہ چھدک چھدک ہو گیا ہے۔ گھٹنوں سرکنے لگا ہے۔ ہر چیز میں گھستا ہے۔ کبھی ادھر کبھی ادھر، بس اس کے پیچھے پیچھے لگے رہو۔"

بیٹی اور نواسے کے ذکر پر ان کے چہرے پر چمک سی آگئی اور وہ نان اسٹاپ شروع ہو گئیں۔ یہ ان کی وہی بیٹی تھی جس کی شادی اپنے کزن کے ساتھ ایک طویل معرکے کے بعد ہوئی تھی۔ سدرہ کی ممانی اسے اپنی بہو بنانے پر رضامند نہ تھیں اور اپنی بھاوج کے نخرے دیکھتے ہوئے بڑی بھابھی نے بھی اپنی انا اور ہٹ دھرمی کا گراف اونچا رکھنے کی کوشش کی مگر سدرہ اور اسعد کی مستقل مزاجی نے دونوں کی اناؤں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر ہی دیا۔

یہ داستان اتنی سادہ نہ تھی کافی رنگین و سنگین موڑ تھے اس میں اور عارفہ بھابھی نے یہ داستان لمحہ بہ لمحہ لائیو نشریات کی طرح شائستہ بیگم کو سنانے کی کوشش کی تھی، جنہوں نے ہمیشہ کی طرح اسے چٹخارے دار موضوع کو بار بار بدلنے کی کوشش میں اگر کچھ سن بھی لیا تو اسے خود تک محدود رکھ کے داستان آگے نہیں بڑھائی۔

* * *

فریحہ کی منگنی گو اس کے بھائی کی طرح بے حد دھوم دھام کے ساتھ تو نہیں ہوئی مگر پھر بھی خاندان کے تو تقریباً سب ہی افراد موجود تھے۔ پہلے کی طرح میوزیکل فنکشن تو ارینج نہیں کیا گیا مگر گھر پر میوزک اور ڈانس کا اہتمام کر کے یہ کسر پوری کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور اس میں عارفہ کے ساتھ ان کی ہونے والی سمدھن بھی پیش پیش تھیں۔

"بھئی واہ! انیلا تم نے تو کمال کر دیا۔" اس کی بے حد عمدہ پرفارمنس پر عارفہ بیگم تو قربان ہی ہو گئیں۔ سب خاندان کے ہی تو لوگ تھے۔ میکے والے اور سسرال والے اور پڑوس کے دو تین گھرانے۔ بیشتر افراد کی آنکھوں میں ستائش دیکھ کر انہیں اپنی ماڈرن اور اپ ٹو ڈیٹ (ہونے والی) بہو پر بے حد فخر ہو رہا تھا۔ ہاں بس بڑی بھابھی ہمیشہ کی طرح ناگواری کے ساتھ یہ سب دیکھ رہی تھیں اور برداشت کر رہی تھیں پھر حسبِ عادت تنقید کا آغاز کر ہی دیا۔ برابر میں ہی تو ان کی نند بیٹھی تھی۔

"عارفہ نے تو بالکل ہی لٹیا ڈبو دی۔ شادی سے پہلے ہی بہو کا گھر میں اتنا آزادانہ میل جول نہ کوئی شرم نہ حیا۔ توبہ توبہ۔ قیامت کی علامت ہے۔" انہوں نے توبہ تلا کرتے ہوئے اپنے کان چھوئے۔

"چھوڑیں امی! آج کل تقریبات میں اتنا تو چلتا ہی ہے اور شادی سے پہلے اب لڑکے لڑکیوں کا سسرالیوں میں آنا جانا عام سی بات ہے۔" سدرہ نے ان کی بات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔

"پھر بھی سب کے سامنے یوں ناچ گانا کرنا کوئی شریف بہو بیٹیوں کا کام ہے؟" وہ پھر بڑبڑانے لگیں۔

"اور یہ عارفہ کو دیکھو، بیٹی کی منگنی ہے اور بیٹی سے زیادہ خود تیار ہوئی ہے۔ نہ عمر کا کچھ خیال نہ شریعت کی کوئی پروا۔ سلیو لیس کرتا کے چیتھڑوں میں تمام کر لیا۔ فیشن دیکھو ایسے سج دھج کے بیٹھی ہیں جیسے یہی تو دلہن ہیں۔"

"جب ہو گا ایسی ماں کی بیٹی کیسی بات ہوئی۔" سدرہ نے بد مزہ ہو کر انہیں ایک بار پھر خاموش کرانے کی کوشش کی۔

"السلام علیکم بڑی مامی!" اریبہ نے ان کے قریب آکر انہیں سلام کیا اور وہیں بیٹھ گئی۔

"وعلیکم السلام۔ جیتی رہو۔" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"کب آئی ہو؟"

"جی بس فریحہ اور چھوٹی مامی سے مل کر یہاں آگئی۔"

"اچھا۔" بڑی بھابھی نے تسبیح نکال لی تھی اس میں مشغول ہو گئیں۔

"کون سا ٹانک استعمال کر رہی ہو؟ بڑی حسین و جمیل ہو گئی ہو۔" سدرہ نے آہستہ سے اسے ٹہوکا دیا۔ دونوں تقریباً ہم عمر کزنز تھیں اور بہت بے تکلف بھی۔

"اچھا!" وہ ہنس پڑی۔ اس کا خوب صورت چہرہ گلنار اور جگمگا اٹھا۔

"اوہ۔ خوشخبری کب سنا رہی ہو؟" سدرہ نے سرگوشی کی۔

"ابھی تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" اریبہ شرماتے ہوئے اور بھی پرکشش لگ رہی تھی۔ اس کی شادی کو ابھی پانچ ماہ ہی تو ہوئے تھے۔

"اس چمک دمک کا راز نہیں بتا رہیں؟" سدرہ نے پھر اسے چھیڑا۔

"ڈھیر ساری محبت اور ڈھیر ساری خوشیاں۔" اریبہ نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

اور اریبہ کی یہ مسکراہٹ ڈھیر ساری محبت اور ڈھیروں خوشیاں فقط ایک ماہ اور اس کا نصیب رہیں۔ ایک ٹریفک حادثے نے یہ سب کچھ اس سے دور کر دیا۔

چھ ماہ کی دلہن کی جواں سال بیوگی نے سب کی آنکھیں اشکبار کر دیں اور والدین اور گھر والوں پہ تو جیسے غم کا کوہ گراں ٹوٹ پڑا تھا۔ عدت کے بعد وہ اپنے گھر آگئی تھی۔

"اللہ تعالیٰ کوئی دکھ اپنی مصلحت کے بغیر نہیں دیتا۔ غم کے ساتھ ساتھ صبر بھی خود ہی دے دیتا ہے۔"

آہستہ آہستہ ان سب کے آنسو بھی تھمتے جا رہے تھے۔ قسمت کے لکھے کو قبول کرنے میں ہی عافیت ہے۔ سو اریبہ نے بھی اس حقیقت کو قبول کر لیا لیکن وہ جو حسین یادیں اور دل کے کسی کونے میں نہاں غم تھا وقت کے ساتھ ساتھ ہی جانا تھا۔

بیٹی کا یہ غم صرف بڑی آپا کا ہی نہیں تھا بلکہ ان کے تینوں بھائیوں کا بھی مشترکہ تھا، جنہیں اپنی اکلوتی اور چھوٹی بہن اور ان کے بچے بے حد عزیز تھے۔ سب سے پہلے چھوٹے ماموں نے اپنی بیگم سے بات کی۔ انہیں یقین تھا کہ ان کی بات رد نہیں ہو گی کیونکہ شریک حیات تو بے حد شرع کی پابند اور دینی مزاج اور اسلامی ذہن رکھنے والی خاتون تھیں مگر شوہر کی بات سنتے ہی ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"تو خدانخواستہ ہمارے بیٹے میں ایسی کیا خامی ہے کہ ایک بیوہ سے اس کی شادی کر دیں؟" ان کی حیرت ختم ہوئی تو وہ ناگواری سے بولیں۔

"کیوں، کیا وہ لوگ بیوہ سے شادی کرتے ہیں جن میں کوئی خامی ہو؟" ناگواری اب ان کے شوہر کے لہجے میں بھی جھلک آئی۔

"میرا مطلب ہے کہ ہمارا بیٹا جوان ہے، لائق فائق ہے۔ صحت و تندرستی بھی ماشاء اللہ ہے۔ ہم کیوں اس کے ارمانوں کا گلا گھونٹ کر ایک بیوہ سے اسے بیاہ دیں۔" ان کی بیوی اب ذرا سنبھل کے بولیں اور بیٹے کی مرضی اور خواہشات بھی سامنے لے آئیں۔

"لڑکے سے میں بات کر لوں گا۔ مجھے امید نہیں بلکہ یقین ہے کہ وہ راضی ہو جائے گا اور تم اللہ دین کی اور اللہ رسول کی باتیں کرنے والی بار بار اتنی حقارت سے بیوہ بیوہ کہہ کر کیوں بات کر رہی ہو کیا بیوہ ہونا کوئی بہت ذلت و حقارت کی بات ہے؟ اپنے بس میں ہوتا ہے یہ سب کچھ؟" ان کا لہجہ تیز ہو گیا۔

"وہ اپنی بیٹی کی جہاں چاہیں دوسری شادی کر دیں۔ ہم کیوں اپنے بیٹے کی قربانی دیں؟" بیوی کا لہجہ بھی تیکھا ہو گیا۔

"بس یہی دین داری ہے تمہاری؟ تسبیح اور مصلے پہ اللہ اللہ کرنے سے اللہ نہیں ملتا۔ بندوں کے کام آنے سے ان کی مشکلات دور کرنے سے ملتا ہے۔" شوہر کے لہجے میں بیوی کے لیے خود بخود طنز آگیا۔ "اور اللہ کے رسول نے مثال قائم نہیں کی بیواؤں سے نکاح کرنے کی؟ اتنا 'علم'، کس کام کا جو 'عمل' میں نہ ہو۔" وہ برابر طنز کے تیر برسا رہے تھے۔

"ائے ہائے۔ توبہ توبہ۔ استغفراللہ۔ کہاں وہ اللہ کے حبیب، ہر گناہ اور خطا سے پاک دنیا و آخرت کے عظیم بشر۔ کہاں ہم گناہ گار، خطا کار، ہم بھلا کیسے ان کی برابری کر سکتے ہیں؟" وہ بار بار کانوں کو ہاتھ لگا رہی تھیں۔

"افوہ، بے وقوف انسان۔" ان کے شوہر نے دانت پیسے۔ "کسی فرض یا سنت کو ادا کر کے ہم پیغمبر کی برابری

میں ان کی پیروی کرتے ہیں اور اسی پیروی کا انہوں نے حکم دیا ہے۔" وہ برابر اپنی بیوی کو سمجھانے میں لگے ہوئے تھے۔

"جہاں اپنی غرض ہو' وہاں سب فرض' سنت یاد آجاتے ہیں۔" وہ بڑبڑائیں۔ "پہلے بھی تو مانگی تھی' تب کیوں نہیں دی؟" وہ ایک پرانا موضوع چھیڑنے لگیں۔

"اچھی طرح جانتی ہو کہ کیوں نہیں دی تھی۔" انہوں نے اپنی بیوی کو گھورا۔ "تمہارے ساتھ ساتھ عارفہ نے بھی اپنے بیٹے کا رشتہ اریبہ کے لیے دیا تھا اور بڑی آپا کی مشکل یہ تھی کہ وہ ایک کو دیتیں تو دوسری ناراض ہوتی' اس لیے انہوں نے ہم تینوں بھائیوں سے مشورہ کر کے تیسری جگہ ہاں کر دی تھی اور ویسے بھی اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ اگر اریبہ کی قسمت میں بیوگی کا دکھ لکھا تھا تو وہ ہمارے گھر آکر بھی ہو سکتی تھی۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہے تھے۔

"اللہ نہ کرے۔" وہ ایک دم دہل گئیں۔ "اللہ میرے بچے کو گرم ہوا سے بھی بچائے۔ آپ کو شرم نہیں آتی اپنی اولاد کے متعلق ایسی منحوس بات منہ سے نکالتے ہوئے۔"

"موت منحوس نہیں' یقینی ہے۔ ہر ایک کو آنی ہے۔ اس میں اس طرح ری ایکٹ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" وہ بڑے اطمینان سے کہہ رہے تھے۔ "بہرحال' آپ میری بات پر جتنی جلدی ہو' غور کرلیں اور مجھے مثبت جواب چاہیے۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ہونہہ! مثبت جواب چاہیے۔ مثبت جواب دے گی میری جوتی۔ مجھے کیا مار پڑی ہے کہ اپنے کنوارے بیٹے کے لیے ایک بیوہ کو بیاہ لاؤں۔ شادی چھ سال رہی یا چھ ماہ' ہے تو بیوہ۔ خدانخواستہ اس کا منحوس سایہ میرے بیٹے پر بھی پڑ گیا تو...... توبہ توبہ' استغفراللہ۔" انہیں جھرجھری سی آگئی۔ وہ وضو کے لیے اٹھ گئیں۔ نماز کا وقت تنگ ہو رہا تھا۔

ادھر عارفہ بیگم کو یکے بعد دیگرے دو مشکلات نے ایسے لپیٹے لپیٹے میں لیا تھا کہ خلاصی کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔

پہلی مشکل تو جب کھڑی ہوئی' جب نیلما کے بھائی کی شادی میں اسے سلیولیس شارٹ قمیص اور چست پاجامے میں ملبوس دیکھ کر انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ چھوٹی آستینیں اور چست پاجامے تو خیر وہ بھی پہنتی تھیں مگر یہاں تو آستینیں سرے سے ہی غائب تھیں۔ ان کے شوہر ان سے زیادہ شاکڈ تھے۔ عارفہ بیگم کی روشن خیالی میں دراڑیں سی پڑنے لگی تھیں۔ گھر آکر شوہر صاحب اپنی بیوی اور بیٹے پہ برس پڑے تھے۔

"یہ لڑکی ہماری بہو بنے گی؟ کسی کیٹ واک کی ماڈل لگ رہی تھی۔ فیشن میں اور بے حیائی میں کوئی فرق ہوتا ہے یا نہیں۔" وہ ان دونوں پہ ایسے برس رہے تھے جیسے سارا ان دونوں کا قصور ہو۔

"مجھے کیا پتا تھا ابو! وہ اتنی زیادہ ماڈرن ہے۔" بیٹا منمنایا۔

محبت اپنی جگہ' آزاد خیالی اپنی جگہ' مگر [illegible] اس کے بھی روشن ہوتے گئے تھے۔ اس روشن خیالی کا مظاہرہ دیکھ کر بادل نخواستہ کچھ کہنے کی پوزیشن میں ہی نہ تھے۔ بہرحال دونوں ماں بیٹے نے اپنی اپنی جگہ نیلما کو اپنی "روشن خیالی" کی حدود سمجھانے کی کوششیں کی تھیں مگر وہ تو بات سنتے ہی چھتے سے اکھڑ گئی۔

"مجھ پہ آج تک میرے پیرنٹس نے پابندی نہیں لگائی۔ میں سلیولیس پہنوں یا برقعہ میری مرضی' تم کیا' کوئی بھی مجھ سے اس بارے میں پوچھ گچھ نہیں کر سکتا۔"

ادھر عارفہ بیگم کو تو اس نے دو ٹوک جواب دے کر چپ کرا دیا تھا۔

"یو ڈونٹ مائنڈ آنٹی! مگر آپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ آپ مجھے بتائیں مجھے کیسا لباس پہننا ہے اور کیسا نہیں۔ آپ اتنی ماڈرن اپروچ رکھنے والی خاتون کو کسی مڈل کلاس کی دقیانوسی ساس کی طرح بات کرتے دیکھ کر کم از کم مجھے تو بے حد حیرانی ہو رہی ہے۔" اس نے اپنے مخصوص اسٹائل میں کندھے اچکائے۔

دونوں روشن خیال خاندانوں کے مابین اس معاملے کو لے کر تلخی اس حد تک بڑھی کہ رشتہ ختم ہونے کی نوبت آگئی گو کہ وہ لڑکے والے تھے۔ منگنی ٹوٹنا ان کے لیے کوئی اتنا خاص مسئلہ نہ تھا اور رشتے بہت مگر پھر بھی پوچھنے اور جاننے والوں کے سامنے ذرا شرمندگی سی ہوئی۔ جب وہ اتنے چاؤ چونچلوں اور پسند سے کی جانے والی منگنی ٹوٹنے کا سبب بتاتیں تو کچھ منہ پھٹ لوگ بے دھڑک ان کے منہ پر ہی کچھ اس قسم کی حیرت کا اظہار کرتے۔

"ارے! اتنی چھوٹی سی بات پر رشتہ ختم ہو گیا۔ آپ تو خود اتنے ماڈرن خیالات رکھتی ہیں پھر بھی۔"

اور اس وقت عارفہ بیگم سے کوئی جواب نہیں بن پڑتا تھا ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سامنے والے کو کیسے سمجھائیں کہ وہ بے شک روشن خیال ہیں مگر اس معاملے میں ان کی اپنی کچھ حدود ہیں۔ دراصل ان کے [illegible] نیلما کی [illegible] میں اس نے کیا تھا۔

"ذرا دنیا کو دیکھیں' کس قسم کا فیشن اور لباس چل رہے ہیں آج کل۔ میں تو خود اتنی احتیاط رکھتی ہوں' نہ آگے پیچھے کے اتنے بڑے بڑے گلے پہنتی ہوں نہ ہی چاولوں سے اوپر تک کے کٹ جاتے اور ٹراؤزر۔ مجھے بھی اپنی لمٹس معلوم ہیں لیکن اب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ میں شامیانے پہننا شروع کر دوں۔"

آخر میں اس کے لہجے میں طنز ہی نہیں' تلخی بھی آگئی تھی اور عارفہ بیگم اب تک سمجھنے سے قاصر تھیں کہ بیک وقت دو آزاد خیال افراد کی لمٹس الگ الگ کیسے ہو سکتی ہیں؟ بہرحال اس قصے سے ابھی پوری طرح ان کی جان چھوٹی بھی نہیں تھی کہ وسیع و عریض حلقہ احباب کے جواب دیتے دیتے اور کھانے سمجھاتے وہ کچھ بے زاری ہو گئی تھیں کہ ان کے شوہر نے ایک نیا شوشا (ان کی دانست میں) ان کے سامنے چھوڑ دیا۔ انہیں ابھی تو ٹوٹا رشتہ غنیمت لگا

ایک تہمت لگا اور اپنے بیٹے کے لیے ڈھول سے جھٹ سے اپنی بھانجی کا نام پیش کر دیا۔

"دماغ ٹھیک ہے آپ کا؟" عارفہ بیگم نے انہیں یوں دیکھا جیسے سچ مچ ان کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔

"ہمارے بیٹے کی منگنی ختم ہوئی ہے' کوئی شادی نہیں جو آپ اس طرح کے رشتے لگا رہے ہیں اور ویسے بھی آج کل دوسری کیا تیسری شادی کرنے والے مردوں کو بھی کنواری لڑکیاں مل جاتی ہیں۔ ہمیں کیا ضرورت ہے ایک بیوہ کو بہو بنا کر گھر لانے کی۔"

"وہ میری بھانجی ہے' بیوہ ہے تو کیا ہوا' ہے تو میرا خون۔ مشکل وقت میں ہم آگے نہیں بڑھیں گے تو اور کون آئے گا۔ کس سے امید رکھیں گے وہ لوگ۔"

"ارے' اس کے اس حادثے میں کوئی ہمارا قصور ہے جو ہم سزا بھگتیں۔" عارفہ بیگم ویسے ہی شوہر پہ حاوی تھیں۔ اب تو اور تیز تیز کر رہی تھیں۔

"لاحول ولا قوۃ۔" وہ بھنا گئے۔ "کسی بیوہ سے شادی کیا کوئی سزا ہے؟ ویسے تو تم بڑی یورپ' امریکہ' لندن کی مثالیں دیتی ہو۔ وہاں نہیں ہوتیں کیا ایسی شادیاں۔ بیوہ' طلاق یافتہ' دو چار بچوں کی ماں' سب ہی کو شادی کے لیے پارٹنر مل جاتے ہیں۔ وہاں تو ایسی جاہلانہ تنگ نظری کا مظاہرہ کوئی نہیں کرتا جن سے متاثر ہو کر تم زندگی گزار رہی ہو۔"

وہ بھی خم ٹھونک کر بیوی کے مقابل میدان میں آگئے۔

"وہاں کی شادیوں کے نتائج بھی دیکھ لیں کیا ہوتے ہیں؟ کتنا چلتی ہیں ایسی شادیاں۔"

"نتائج ایک الگ چیز ہے' اس کی وجوہات پر ایک لمبی چوڑی بحث ہو سکتی ہے۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ اس ترقی یافتہ اور جدید معاشرے میں بھی اسے کوئی اتنا برا نہیں سمجھتا' نہ ہی یوں دھتکارا جاتا ہے جیسے تم کر رہی ہو۔"

"بیٹے سے تو پوچھ لیں' وہ بھی راضی ہو جائے گا یا نہیں۔"

عارفہ بیگم نے مزید بحث سے بچنے کے لیے گیند بیٹے

کے کورٹ میں ڈال دی۔

"اسے راضی کرنا میرا کام ہے، وہ میرا بیٹا ہے، میری بات کبھی نہیں ٹالتا۔ ویسے بھی ہم ایک بار اس کی مرضی پوری کر چکے ہیں مگر اس کی قسمت میں نہیں تھا۔ اللہ کی مرضی مگر تم تو اریبہ کے لیے ہاں بھرو، بیٹا بھی راضی ہو ہی جائے گا۔"

"مجھے کیا ضرورت ہے ایسے ایمرجنسی میں ہاں بھرنے کی۔" وہ تمسخر سے بولیں۔ "کوئی لولا لنگڑا ہے خدانخواستہ ہمارا بیٹا یا کھوٹ ہے یا دوسری، تیسری شادی ہے اس کی جو ایک بیوہ سے کر دیں۔ وہ تو اپنے چاؤ چونچلے پورے کر چکیں، ہمارا لڑکا نہ کرے؟ ابھی میرے بیٹے کی عمر ہی کیا ہے۔ ایک سے ایک اچھی، خوبصورت، ایجوکیٹڈ اور کنواری لڑکی مل سکتی ہے اسے۔" "خوبصورت" "ایجوکیٹڈ" اور "کنواری" پر ان کا خاص زور تھا۔

"دوپٹہ گلے میں ڈال کر یا فیشن کے تقاضے پورے کرنے سے کوئی روشن خیال نہیں بن جاتا، بہت سے معاملات کے لیے دل میں گنجائش رکھنا پڑتی ہے۔ وسعت قلب سے کام لینا پڑتا ہے۔ یہی اصل روشن خیالی ہے۔ اندر سے تو تم وہی جاہل، دقیانوسی عورت ہو جو ہمارے معاشرے میں عام ہے۔"

انہیں اتنا شدید غصہ آرہا تھا کہ اپنی بات کا ردعمل دیکھنے اور سننے کے لیے بھی نہیں رکے اور سیدھے لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر نکل گئے۔

دونوں بھائی اپنی اپنی بیویوں کو رضامند ہی کرتے رہ گئے اور میدان چھوٹے بھائی بھابھی نے مار لیا۔ بڑی بھابھی اور چھوٹی عارفہ بیگم دونوں کے لیے شائستہ بیگم کا یہ قدم صرف حیرت کا ہی نہیں بلکہ صدمے کا بھی باعث تھا۔ دونوں نے اپنے اپنے تئیں یہ فرض کر رکھا تھا کہ حماد کے لیے ان کی چھوٹی بیٹی بہت موزوں رہے گی۔ شائستہ بیگم سے اچھی ساس بھلا ان کی لڑکیوں کو کہاں ملتی؟ پر شائستہ بیگم نے تو حد ہی کر دی۔ اب بھلا بتاؤ "اتنا قابل لڑکا" صورت شکل سے بھی اچھا، اتنی اچھی نوکری، عمر بھی کوئی زیادہ نہیں، "انہیں کیا سوجھی

بے چارے بچے کو لے کے قربانی کا بکرا بنا دیا۔ ننھی سی محبت میں اسے قربان کر دیا۔"

بڑی بھابھی اور عارفہ بیگم دونوں حماد اور اریبہ کے رشتے کو بلکہ غیر متوقع رشتے کو ڈسکس کر رہی تھیں۔

"ہاں تو اور کیا۔" عارفہ بیگم نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"خاندان کی اور لڑکیاں نظر نہیں آئیں شائستہ کو حماد کے لیے۔ آپ کی یسریٰ ہے، ہماری ثمن ہے، دونوں کا جوڑ تھا حماد کے ساتھ۔ کسی سے بھی کر لیتیں۔" عارفہ بیگم کے دل میں بڑی حسرت نکل کے بول رہی تھی۔

"یسریٰ کی تو خیر شائستہ سے اچھی خاصی بنتی ہے، وہ تو آسانی سے ایڈجسٹ ہو جاتی مگر تمہاری ثمن کا گھل مل کے رہنا بڑا مشکل ہے۔ اس کے تو مزاج ہی الگ ہیں پھر تم نے ماڈرن ماڈرن کا پہاڑہ پڑھا کر اس کی پرورش کی ہے۔ اتنی آزاد خیالی کے ساتھ اس کا گزارہ کہاں ہو شائستہ کے گھر۔"

بڑی بھابھی نے حسب عادت عارفہ بیگم کی ان کی فیملی کو تنقید کا نشانہ بنایا اور عارفہ بیگم کو چپ سی لگ گئی تھی۔

"آپ کی بیٹیاں خیر سے کون سی کنویں کی مینڈک ہیں۔ ہمیں نہیں پتہ کہ سدرہ کی شادی کیسے ہوئی تھی؟" انہوں نے طنز کے تیر برسائے۔ "اور ویسے بھی میں نے اپنی بیٹیوں کو آزادی کے ساتھ ساتھ اچھے برے کی تمیز بھی دی ہے۔ وہ چھپ چھپ کے غلط حرکتیں نہیں کرتیں۔"

"تو میری بچی نے ایسا کون سا چھپ کے کوئی غلط کام کیا ہے۔ پسند کی شادی کی اجازت تو اسلام میں بھی ہے۔" بڑی بھابھی نے جوش کے ساتھ دلیل دی۔

"اسلام سے زیادہ روشن خیال مذہب کوئی نہیں ہے۔ یہ نام نہاد ماڈرن ازم بھی اس کے آگے کچھ نہیں ہے۔" وہ مزید بولیں۔

"اور مسلمانوں سے زیادہ تنگ دل اور تنگ نظر کوئی نہیں۔" عارفہ بیگم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "اللہ کا

شکر ہے کہ میں ایسی مسلمان نہیں ہوں، لبرل ہوں۔"

"بس کہنے کی باتیں ہیں یہ تم۔"

ان دونوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی بحث شروع ہو چکی تھی۔

اور شائستہ بیگم یوں تو اچھی تھیں، بہت اچھی تھیں مگر اتنی اعلیٰ ظرف پھر بھی نہیں تھیں کہ یوں اتنی آسانی سے فقط ایک دو بار اپنے شوہر کے اصرار پر اریبہ کے لیے مان جاتیں۔ بے شک وہ اریبہ کو بہت پسند کرتی تھیں اور پہلے پہل اپنی دونوں جٹھانیوں کے ساتھ ساتھ ان کا بھی ارادہ تھا کہ اریبہ کو اپنے گھر کی بہو بنا لیں مگر وہ ہو نہ سکا تھا اور اب ان بدلے ہوئے حالات میں ایسا کرنا ان کے لیے مشکل ہو رہا تھا کیونکہ بہرحال وہ ایک بیٹے کی ماں بن کر سوچ رہی تھیں۔ ساری بات بس اسی نکتے پر آ کر ٹوٹتی کہ "لوگ کیا کہیں گے کہ انہیں اپنے بیٹے کے لیے کوئی اور لڑکی نہ ملی اور پھر بیٹے کے بھی بہرحال کچھ ارمان ہوں گے، پتہ نہیں وہ دل سے قبول کرے گا یا نہیں اگر باپ کے اصرار پر قبول کر بھی لے تو خوش نہیں رہ سکا تو۔"

تین چار روز تک مسلسل گھر میں یہ کھچڑی پکتی رہی اور خود ان کا دماغ بھی سوچ سوچ کر بہت تھک گیا تھا۔ وہ تو اس دن سارہ کے ہاتھ پر جانے کیسے ایسا ہوا کہ گرم پانی گر گیا، شکر ہے کہ پانی تھوڑا سا تھا مگر پھر بھی تین آبلوں نے سارہ کو پوری رات بے چین رکھا اور بیٹی کی تکلیف نے ماں کی آنکھوں میں نیند نہیں آنے دی۔ تمام رات اس کے سرہانے بیٹھ کر اس کی اذیت کو کم کرنے کی اللہ سے دعا کرتی رہیں اور جانے کس پہر یونہی شوہر کی ایک بات ایسی ذہن میں آئی کہ لاکھ جھٹکنے پر بھی نہیں نکلی۔ انہوں نے اریبہ کے معاملے پر ان سے کہا تھا۔ "ایک بیٹے کی نہیں بلکہ بیٹی کی ماں بن کر سوچنا۔" اور اس وقت تو انہوں نے اس بات پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی مگر اب وہ صرف اور صرف ایک بیٹی کی ماں بن کر ہی سوچ رہی تھیں۔ "اگر خدانخواستہ میری بیٹی کے ساتھ ایسا سانحہ گزرے تو؟" اور اسی پل یوں لگا کہ جیسے کسی نے ان کا دل

دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا ہو۔

"اللہ نہ کرے، اللہ نہ کرے۔ میری بیٹی کا دل کبھی غم آشنا ہو۔" بے ساختہ ان کے اندر سے بڑی شدت سے یہ آرزو لبوں پہ آئی۔

"میری بیٹی کو میرے حصے کی خوشیاں بھی مل جائیں۔" ایک ماں کا دل بڑی دل سوزی سے دعا کر رہا تھا۔ انہیں صلہ رحمی کے تقاضے بھی یاد آرہے تھے۔

"اور دنیا والے؟" ان کا نفس پھر چیں بجبیں ہوا۔

"دنیا کی پروا کیا کرنی؟ اس دنیا نے تو پیغمبروں کو بھی نہیں چھوڑا۔" کسی نے چپکے سے اندر سے کہا۔

"امی...!" سارہ پھر کراہی، چھالے تکلیف دے رہے تھے۔

"میری بچی...!" امی اس کا سر سہلانے لگیں اور اس کا چہرہ دیکھتے دیکھتے انہیں خود بھی پتہ نہیں چلا جانے کب ان کا دل اتنا وسیع ہو گیا کہ اس میں سارہ کے ساتھ ساتھ اریبہ بھی سما گئی۔

☆

نازیہ کنول نازی

رنگ چاہت کے

ناولٹ
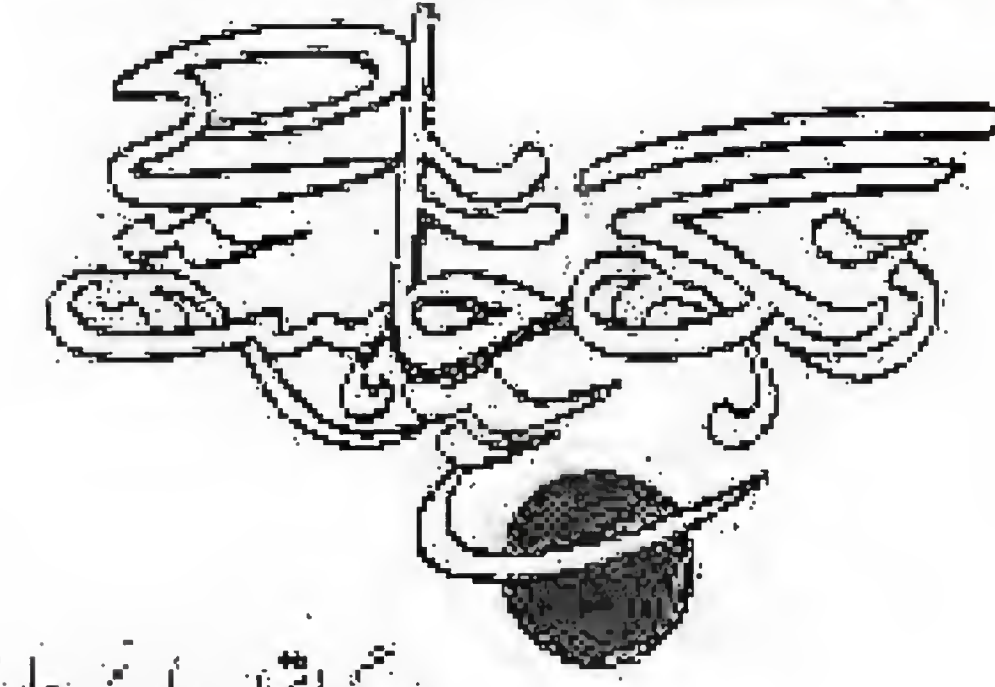
عشق کے علاقے میں حکم یار چلتا ہے
ضابطے نہیں چلتے
حسن کی عدالت میں
عاجزی تو چلتی ہے
مرتبے نہیں چلتے

موسم بے حد سرد ہو رہا تھا۔
جب وہ روٹیاں پکا کر فارغ ہوئی تو مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ جلدی جلدی وضو کر کے نماز ادا کی۔ دعا مانگی اور ابھی جائے نماز لپیٹ کر رکھ رہی تھی کہ جاذب حسن بڑے پرجوش انداز میں کمرے کا دروازہ دھکیلتے ہوئے تیزی سے اس کے قریب چلا آیا۔

"سارہ! یہ میں نے تمہارے لیے چوڑیاں خریدی ہیں۔ پہن کر دیکھو کیسی لگتی ہیں۔"

"دیکھ لوں گی، ابھی تو رکھ دو سائیڈ پر۔" اس نے بیزاری سے کہتے ہوئے ٹی وی آن کر لیا۔

جاذب اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

"کیا بات ہے؟ تم خفا ہو مجھ سے؟"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے، ابھی میرا سر بہت درد کر رہا ہے۔ پلیز! تم جاؤ یہاں سے۔"

وہ چاہ کر بھی اپنے لہجے کے روکھے پن کو چھپا نہیں سکی تھی۔

مگر جاذب حسن کو برا نہیں لگا۔ وہ اب بھی اسی لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"میں ٹیبلٹ لا دیتا ہوں، چائے کے ساتھ لے کر سو جانا۔"

"اچھا لے لوں گی، تم اتنی فکر نہ کیا کرو میری۔"

"کیسے نہ کروں جی! زندگی میں تمہارے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے میرے پاس۔"

تھکے تھکے سے لہجے میں کہتے ہوئے اس کے قریب ہی صوفے پر ٹک گیا تھا۔

سارہ کا غصہ مزید بڑھ گیا۔

"فضول باتیں مت کیا کرو جاذب! جو تم سوچ رہے ہو ایسا ممکن نہیں ہے۔" وہ تپی تھی۔

"کیوں ممکن نہیں ہے؟ مجھ میں ایسی کون سی کمی

ہے۔" وہ اداس لہجے میں بولا۔

"مجھے نہیں پتا۔ لیکن تم میرا خیال اپنے دل سے نکال دو۔"

"لیکن کیوں؟" "تمہیں وجہ بتانی ہوگی۔"

سارا کا بازو پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف کرتے ہوئے اس نے پھر پوچھا' جواب میں وہ بڑی ڈھٹائی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"وجہ اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں کہ میں نوید سے پیار کرتی ہوں' آج سے نہیں بلکہ پچھلے دو سال سے۔ اس کے پاس وہ سب کچھ ہے جو مجھے چاہیے دولت' حسن' وجاہت' معاشرے میں باعزت مقام' سب کچھ' اب تم ہی بتاؤ میں تمہیں اس پر ترجیح کیسے دے سکتی ہوں۔ تمہارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ مستقل ملازمت نہ حسن' نہ وجاہت' نہ معاشرے میں بلند مقام' کیا دے سکتے ہو تم مجھے' سوائے فکر اور پریشانیوں کے' ناکام تمناؤں اور تشنہ حسرتوں کے' پلیز جاذب' میری باتوں کا برا مت ماننا مگر حقیقت یہی ہے کہ نوید ہر لحاظ سے تم پر برتری رکھتا ہے۔"

وہ بلا تکان بولتی جا رہی تھی اور ادھر جاذب حسن کی خوبصورت آنکھوں میں دھول اڑنا شروع ہو گئی تھی۔ کتنی چھوٹی سوچ رکھتی تھی وہ اس کے بارے میں' جسے وہ اپنی جان سے بڑھ کر چاہتا تھا۔

"میں مانتی ہوں جاذب! کہ تم مجھ سے بے حد محبت کرتے ہو' مگر محبت انسان کا پیٹ نہیں بھرتی۔ معاشرتی تقاضوں کو پورا نہیں کرتی' لہٰذا پلیز یہ محبت' محبت' ڈاٹ کام کا کھیل بند کر کے کوئی مقام بناؤ اپنا' تاکہ کسی اچھی سی لڑکی کے ہم سفر بن سکو' پلیز۔"

وہ اس سے کہنا چاہتا تھا۔

"تم سے اچھی لڑکی کائنات میں اور کون ہے" مگر نہیں کہہ پایا۔

دل و دماغ جیسے کام کرنا ہی چھوڑ گئے تھے۔ وہ لڑکی جو اپنے حسن' خوش اخلاقی اور چنچل حرکتوں کے باعث پچھلے کئی سالوں سے اس کے دل و دماغ پر راج کر رہی تھی۔ اس لمحے اس پر اپنی پست سوچ عیاں کر کے محض چند سیکنڈز میں دل سے اتر گئی تھی۔

وہ آئینے کے سامنے کھڑا اس چہرے کو تک رہا تھا' جہاں ڈھونڈنے سے بھی اسے کوئی بدصورتی دکھائی نہیں دی تھی۔ سارا اس پر اپنی پسند ناپسند واضح کر کے بڑی مطمئن کھڑی تھی' جب وہ بمشکل اپنے قدموں کو گھسیٹتا اس کے مقابل آیا اور قدرے شکستہ لہجے میں بولا۔

"تم نہیں جانتیں سارا! سچی محبت اس کائنات کی سب سے بڑی خوشی اور طاقت ہے' میرا دل کھول کر دیکھو کتنا قیمتی ہے' تمہارا نوید صدیقی خود بھی بک جائے تب بھی اس دل کی قیمت نہیں چکا سکتا۔ کاش۔ کاش سارا! تم جان سکتیں کہ آج اس لمحے تم نے کیا کھو دیا ہے۔"

ڈھلے ہوئے چہرے کے ساتھ نم لہجے میں کہتا وہ پھر ایک لمحے کے لیے بھی اس کے مقابل نہیں ٹھہرا تھا۔ سارا حبیب بغور اس کی سرخ آنکھوں میں دیکھتی' بے نیازی سے کندھے اچکا کر رہ گئی تھی۔

تم مجھے چاہو گی اک دن دیکھنا
ہاں چلی آؤ گی اک دن دیکھنا
اس عشق نے مجھ کو جلایا ہے
تم بھی جل جاؤ گی اک دن دیکھنا

وہ سارا کے کمرے سے باہر آیا تو موسم کی خنکی کا احساس مزید شدید ہو گیا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے شدید بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ مگر اب چند لمحوں کے بعد جیسے ہر چیز سے دل بھر گیا تھا۔

ضبط گریہ کی کوشش میں آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

تھکے تھکے نڈھال قدم اٹھاتا وہ صحن میں سیڑھیوں پر آ بیٹھا تھا۔

اسے یاد آ رہا تھا' وہ بہت چھوٹا سا تھا جب اچانک اس کی والدہ کی وفات ہو گئی تھی۔ اس وقت اسے شعور نہیں تھا۔ لہٰذا اپنی جنت کے چھن جانے پر رو نہیں سکا تھا۔ تاہم اس سانحے کے کچھ ہی عرصے بعد جب اس کے بابا نے کسی دوسری عورت سے شادی کر کے اسے

اپنے گھر کی مالکن بنایا تو وہ بہت رویا تھا۔

گو اس وقت بھی وہ زیادہ باشعور نہیں تھا مگر اچانک ماں کی عدم موجودگی نے اسے حساس بنا ڈالا تھا' اوپر سے جو عورت "ماں" بن کر اس کے گھر میں آئی تھی' وہ ماں تو دور ایک انسان کہلانے کے لائق بھی نہیں تھی۔

بہت سارے دن بھوکے پیاسے رہ کر سوتیلی ماں کے ظلم سہنے کے بعد جب وہ اس زندگی سے تنگ آ گیا تو ایک روز بھاگ کر عابدہ بیگم کے پاس چلا آیا' وہ اس کی اکلوتی پھوپھو تھیں اور اولاد نرینہ سے محرومی کے باعث اس سے بے حد پیار کرتی تھیں۔

یہیں آ کر جاذب نے ایف اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ عابدہ بیگم کے شوہر حبیب علی پر فالج کا پہلا حملہ ہوا تو وہ بستر سے لگ کر رہ گئے۔ جاذب نے تعلیم کو خیرباد کہہ کر چھوٹی موٹی ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔

وہ اس گھرانے کو کسی آزمائش میں مبتلا نہیں دیکھ سکتا تھا' یہی وجہ تھی کہ ان کی خوشیوں کے لیے صبح سے رات گئے تک کولہو کے بیل کی طرح کام کرتا اور اس پر بھی خوش رہتا۔ ساجد علی کی وفات کے بعد ساری ذمہ داری اس کے سر پر آ پڑی تھی۔

عابدہ بیگم کو وہ اپنی ماں ہی سمجھتا تھا' جبکہ سارا کو چھوڑ کر ان کی باقی تینوں بیٹیوں کو اس نے کبھی اپنی بہنوں کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھا تھا۔

سارا چار بہنوں میں سب سے بڑی اور سب سے زیادہ چرب زبان تھی۔ وہی جاذب کے ساتھ سب سے پہلے فری ہوئی تھی۔ بچپن سے لے کر جوانی تک اس پر رعب جماتی آئی تھی' اپنا اسکول کا ہوم ورک' پروجیکٹ' وہ بڑے دھڑلے کے ساتھ اس سے کرواتی تھی۔ اپنی چھوٹی سے چھوٹی بات اسے بتاتی' اس کا ہر مسئلہ وہی حل کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ جاذب قطعی بے ساختگی میں اس کی طرف کھنچتا چلا گیا تھا۔

بچپن رخصت ہوا اور جوانی آئی تو سارا سے اس کا لگاؤ محبت میں ڈھل گیا اور یہ محبت کب وقت کے ساتھ ساتھ جنون میں ڈھلی اسے مطلق خبر نہ ہو سکی۔

اسے خود پر سارا کا رعب جمانا بھی اچھا لگتا تھا۔ اور اسے تھوڑا تنگ کر کے اس کا ہر حکم بجا لانا بھی خوب بھاتا تھا۔ سارا کو چٹ پٹی چیزیں اچھی لگتی تھیں' وہ اس کی خوشی کے لیے روزانہ کوئی نہ کوئی چیز اٹھا لاتا۔ عابدہ بیگم اسے منع بھی کرتیں اور کبھی کبھار فضول خرچی پر ڈانٹ بھی دیتیں مگر وہ ہنس کر ایک کان سے سنتا اور دوسرے سے اڑا دیتا۔

سارا کے معاملے میں کسی کی نصیحت اس پر کوئی اثر نہیں کرتی تھی۔

سارا سے چھوٹی فائزہ' حسن اور سلیقہ میں بے مثال تھی' مگر وہ خاموش طبع لڑکی تھی' زیادہ وقت اپنی کتابوں کے ساتھ مصروف رہتی۔ یا کچن میں کچھ نہ کچھ پکاتی رہتی۔

سارا کے ساتھ اس نے بھی صرف میٹرک کیا تھا' بعد میں فراغت سے تنگ آ کر پرائیویٹ انٹر کی تیاری شروع کر دی اور انٹر میں اچھے نمبروں سے پاس ہونے کے بعد گریجویشن کرنے کا ارادہ کر لیا۔ جاذب نے اس سے متاثر ہو کر کئی بار سارا کو بھی مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے کہا مگر اس کا ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا تھا۔

"میں کیوں مفت میں اپنا دماغ کھپاؤں' سولہ پڑھ کر بھی چولہا چوکی کرنی ہے اور بچے ہی پالنے ہیں تو پھر میٹرک کیا کم ہے' فضول کی ٹینشن نہیں لے سکتی میں۔"

جواباً وہ خاموش رہ جاتا۔

فائزہ سے چھوٹی عائزہ بھی بہت ذہین تھی۔ سب ہی اس کی سمجھداری کی وجہ سے اسے پسند کرتے تھے۔ سارا کے بعد وہی جاذب کے زیادہ قریب تھی۔

عائزہ سے چھوٹی فرا تھی' جو عام سی شکل و صورت کی حامل تھی۔ مگر حساس بہت زیادہ تھی۔ کچھ تو روپ رنگ اوپر سے اس کی "ناپسندیدہ آمد" اسے حساس بنانے کے لیے کافی تھی' وہ بھی فائزہ کی طرح خاموش طبع اور سلیقہ مند تھی۔ اپنے اسکول کی ذہین ترین طالبات میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ جاذب اس نے بہت

پیار کرتا تھا اور اس کی خوشی کا پورا خیال رکھتا تھا۔

اپنے پھوپھا کی رحلت کے بعد تو وہ اور بھی ذمہ داری سے ان سب کا خیال رکھنے لگا تھا۔ عابدہ بیگم کے لب اس کے لیے دعائیں کرتے نہیں تھکتے تھے۔

زندگی میں سب کچھ ہی تو حاصل ہو گیا تھا۔ مگر اب بھی کہیں اگر کوئی کمی تھی تو وہ صرف محبت کی تھی۔ اس کے اندر بچپن کی معصوم حسرتیں اب بھی سر اٹھاتی تھیں۔ کبھی کبھی شدت سے اس کا دل چاہتا کہ کوئی اس کی دھڑکنوں کی آواز سنے اور اس کے جذبوں کا راز پالے، اسے ڈھیر سارا پیار کرے، خود سے بڑھ کر اس کا خیال رکھے، اسے یوں خود میں سموئے کہ زندگی کی ساری محرومیوں کا ازالہ ہو جائے۔

اور ایسا سوچتے ہوئے صرف سارا حسیب کا چہرہ اس کی نگاہوں میں آتا تھا جو اپنی خودسری کے باوجود اسے بے حد اچھی لگتی تھی۔

آج تک کیا نہیں کیا تھا اس نے سارہ حسیب کے لیے۔ مگر وہ اس کی وفاؤں کی اہل نہیں تھی۔ اس کے دل نے غلط انتخاب کیا تھا اور یہی غلط انتخاب اسے جلا رہا تھا۔

وہ کبھی سوچ ہی نہیں پایا تھا کہ سارا کی خواہشات کیا ہیں؟

آئندہ زندگی کے لیے اس کی سوچ اور تقاضے کیا ہیں؟ جان جاتا تو شاید آج اتنا دکھی نہ ہوتا۔ ہوا میں خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔ مگر وہ بے نیاز سا ٹھنڈی سیڑھیوں پر بیٹھا ضبط سے آنسو پیتے ہوئے دل کے اندر ہی گراتا رہا۔

جانے کتنا وقت یونہی بیت گیا تھا۔ جب اچانک اسے اپنے شانوں پر نرم شال کی گرماہٹ محسوس ہوئی۔ چونک کر سر اٹھاتے ہوئے اس نے اوپر دیکھا تو فائزہ اس سے کچھ ہی قدموں کے فاصلے پر کھڑی بہت سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"سردی کافی بڑھ گئی ہے۔ میرے خیال میں اس وقت آپ کو یوں ٹھنڈی سیڑھیوں پر نہیں بیٹھنا چاہیے۔"

وہ ہمیشہ اس سے بہت مختصر بات کرتی تھی۔ جاذب آج تک کبھی چاہ کر بھی اس سے فری نہیں ہو پایا تھا۔ تاہم اس کی عزت اور احترام ضرور کرتا تھا۔ اس وقت بھی اس کے احساس دلانے پر فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور تیز قدم اٹھاتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆

اگلے روز اسے بہت تیز بخار چڑھ آیا تھا۔

ساری رات جاگ کر انگاروں پر لوٹنے کے بعد یہ لازم بھی تھا۔ عابدہ بیگم کی تو جان پر بن آئی تھی۔ جاذب کو ہمیشہ اپنے لیے ان کی فکر اچھی لگتی تھی مگر وہ کبھی بھی جان بوجھ کر انہیں اپنے لیے پریشان نہیں کرتا تھا۔

سارا بھی خبر ہوتے ہی اس کے کمرے کی طرف دوڑی آئی تھی۔ عابدہ بیگم وہاں موجود نہ ہوتیں تو شاید وہ رات والی بات پر اس سے مزید کچھ کہتی، معذرت ہی کر لیتی مگر عابدہ بیگم کی موجودگی میں کچھ بھی نہ کہہ سکی تھی۔

عابدہ بیگم نے اس کے ماتھے پر پٹیاں رکھی تھیں۔ بخار ہلکا ہو گیا تو اس کو اپنے ہاتھوں سے دلیہ کھلایا تھا۔ جاذب نے طبیعت سنبھل جانے پر بڑی مشکل سے انہیں واپس ان کے کمرے میں بھیجا تھا۔ خود وہ چونکہ دن بھر سویا رہا تھا لہٰذا انہیں واپس بھیج کر پلکیں موندنے کے باوجود اسے نیند نہیں آسکی تھی۔

بہت دیر تک وہ اضطراب کے عالم میں بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا تھا۔ ابھی اٹھ کر باہر جانے کا قصد کر رہا تھا کہ اچانک اس کے کمرے کا دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھلا اور لگے ہی لمحے کوئی نہایت محتاط انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے اس کے بستر کے قریب چلا آیا۔

جاذب کو سو فیصد یقین تھا کہ یہ سارا کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ سو وہ آنکھیں بند کیے بے نیاز پڑا رہا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ آدھی رات گئے یوں چوروں کی طرح اس کے کمرے میں آنے کا مقصد کیا ہے؟

جب کچھ لمحوں کے بعد اسے اپنے چہرے پر کسی کی گرم مگر مسکون آمیز پھونکوں کا احساس ہوا۔ شاید کوئی یقیناً اس پر کچھ پڑھ کر پھونک رہا تھا۔ وہ از حد حیران ہوا تھا کیونکہ سارا نے آج تک کبھی جاگتے میں بھی اس کے لیے کوئی ایسا عمل نہیں کیا تھا۔ کچھ ہی دیر کے بعد اس کو اپنی پیشانی پر کسی کی نرم انگلیوں کی پوروں کا لمس محسوس ہوا اور اس کے پورے وجود میں جیسے بجلی سی لپک گئی۔

اس لمحے اس کا شدت سے دل چاہا تھا کہ وہ آنکھیں کھول کر اس ہستی کا دیدار کرے جو اس پر چپ چاپ اپنی محبت نچھاور کر رہی تھی۔ مگر جانے کیا بات تھی کہ وہ چاہ کر بھی ایسا نہیں کر سکا تھا۔

تھوڑی دیر میں مسیحائی کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور اس کے قریب بیٹھی وہ ہستی جو خوشبو کا پیکر تھی اٹھ کر واپسی کے لیے پلٹ گئی۔ تب جاذب نے ذرا سی پلکیں وا کر کے نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں آنے والی ہستی کا سراپا دیکھنا چاہا تھا۔ مگر خواہش کے باوجود وہ شناخت نہیں کر سکا۔

اگلے روز وہ بیدار ہوا تو اس کی آنکھوں میں سرخی نمایاں تھی۔

فائزہ اور فروا نے اسکول جانے سے قبل اس کے کمرے میں آکر اس کی مزاج پرسی کی تھی پھر روزانہ کی طرح اس سے ڈھیروں پیار لے کر خوشی خوشی اسکول روانہ ہو گئیں۔ عابدہ بیگم نماز فجر کی ادائیگی کے بعد اس کے پاس ہی آبیٹھی تھیں۔

سارا اس کے لیے ناشتہ لے کر آئی تو جانے کس خیال کے تحت وہ ان سے پوچھ بیٹھا۔

"پھوپھو! آپ ہمیشہ مجھے میرا سوہنا پتر، میرا سوہنا پتر کہتی رہتی ہیں۔ میں بھی آپ کے لفظوں پر اعتبار کر کے خود کو سوہنا سمجھنے لگا تھا مگر۔ کل رات مجھے پتا چلا کہ میں کتنا بدصورت ہوں۔"

اس کے لبوں پر بڑی زخمی سی مسکراہٹ پھیلی تھی۔ عابدہ بیگم کا دل کٹ کر رہ گیا۔

"ہائے صدقے جاؤں تو ایسا کیوں سوچتا ہے؟"

"پتا نہیں پھوپھو! بس کل رات مجھے شدت سے یہ احساس ہوا کہ میں بہت بدصورت ہوں۔"

سارا اس کے الفاظ پر شرمندہ دکھائی دے رہی تھی۔ مگر وہ خاموش نہیں ہوا تھا۔

"آپ نے تو مجھے خوش فہم بنا دیا تھا۔ پھوپھو! شکر ہے کہ آئینہ دیکھ لیا۔"

"نہیں میرے بیٹے! مجھے تو تیرے جیسا سوہنا کوئی اور دکھائی نہیں دیتا۔"

وہ رو پڑی تھیں۔ جاذب نے کہنیوں کے بل اٹھتے ہوئے ان کے دونوں ہاتھ تھام کر اپنے سینے پر دھر لیے۔

☆ ☆ ☆

جاذب نے خود کو بہت مصروف کر لیا تھا۔

پہلے وہ صبح دیر سے اٹھتا تھا۔ پھر ناشتہ کر کے اپنی مرضی سے کام پر جاتا تھا مگر اب اس کے معمول میں تبدیلی آگئی تھی۔

اب وہ صبح فجر کی نماز کے لیے اٹھتا۔ نماز پڑھ کر کچھ دیر قرآن پاک کی تلاوت کرتا پھر چائے پی کر گھر سے نکل جاتا۔ پہلے دو تین روز تو اس نے چائے بھی نہیں پی تھی۔ بعد میں عابدہ بیگم کو پتا چلا تو انہوں نے ڈانٹا اور یوں فائزہ اب روز اسے چائے بنا کر دینے لگی۔

عابدہ بیگم اس کے صبح سویرے کام پر جانے سے بھی متفکر ہوئی تھیں مگر اس نے بہانے بنا کر انہیں راضی کر لیا تھا۔ اب صبح سویرے گھر سے نکل کر وہ کسی کی شاپ پر بیٹھتا تھا۔ پھر دو تین گھنٹے کی ڈیوٹی کے بعد اپنے مستقل کام پر چلا جاتا اور شام تک ساحل سمندر کے قریب رندا سنبھالے کشتی میں استعمال ہونے والی لکڑیاں چھیلتا رہتا۔ گھر میں کوئی بھی اس کے اس کام سے باخبر نہیں تھا۔

کچھ ماہ پہلے تک اس نے بھی مستقل یہ کام کرنے کا قطعی نہیں سوچا تھا مگر ایک دم سے اس کی سوچ بدل گئی تھی۔ اب اسے ایک لمحے کو بھی فارغ رہنا گوارا نہیں تھا۔

ہفتہ وار ملنے والی اجرت وہ خود ہی سنبھال کر جمع کرتی رہتا۔ اور مہینے کے بعد جب سات آٹھ ہزار روپے بن جاتے تو عابدہ بیگم کے ہاتھوں پر دھر دیتا۔ اسے محنت کر کے روزی حاصل کرنے میں کسی قسم کی کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔

فائزہ نے اختر کی طرح گریجویشن بھی بہت اچھے نمبروں سے کر لیا۔ اب وہ ایم اے کرنا چاہتی تھی۔ مگر عابدہ بیگم ایسا نہیں چاہتی تھیں۔ کیونکہ ان کا ارادہ اب سارا کے ساتھ ساتھ اسے بھی گھر سے رخصت کرنے کا تھا۔ اور اسی سلسلے میں وہ جاذب سے بات کرنا چاہتی تھیں۔

عابدہ بیگم اس کے لیے بہت پریشان رہنے لگی تھیں۔ کیونکہ اس کا مزاج اور معمولات یکسر بدل گئے تھے۔ پہلے کی طرح سب کے درمیان بیٹھ کر ہنسنا کھیلنا' کھانا پینا' سب چھوڑ دیا تھا اس نے۔ عابدہ بیگم نے ایک بار اسے احساس دلایا تو وہ مسکرا کر کہہ اٹھا۔

"وقت بدل گیا ہے پھوپھو! میری بہنیں اب بڑی ہو رہی ہیں۔ انہیں گھر سے رخصت بھی تو کرنا ہے اور ان کی رخصتی کے لیے میرا صبح شام کام کرنا بے حد ضروری ہے۔"

اس کی بات درست تھی۔ لہٰذا عابدہ بیگم سوائے اس پر نثار ہونے کے اور کچھ نہیں کہہ سکی تھیں۔

اس شام بہت دنوں کے بعد شاور لے کر وہ سب کے درمیان بیٹھا تو ایک عجیب سی سرشاری کا احساس ہوا۔ عائزہ اور فرا کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ عابدہ بیگم بھی مطمئن نظر آ رہی تھیں۔ جاذب نے سرسری سی نظر شوخ و چنچل سارا حسیب کے دلکش چہرے پر ڈالنے کے بعد اپنے مقابل بیٹھی فائزہ کو دیکھا تو وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے دلکشی سے مسکرا رہی تھی۔ اس سے نظریں ملیں تو فوراً سنجیدہ ہو گئی۔

کچھ دیر بعد وہ چائے پی کر اپنے کمرے میں آیا تو سارا بھی اس کے پیچھے ہی چلی آئی۔

"جاذی! کیا تم ابھی تک مجھ سے ناراض ہو۔؟"

وہ جو شرٹ اتار کر بیٹھنے کا ارادہ کر رہا تھا اس کی آواز پر قدرے حیرانی سے پلٹا۔

"نہیں میں تو کبھی بھی تم سے ناراض نہیں رہا۔"

"تو پھر تم پہلے کی طرح مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے' الگ تھلگ کیوں رہنے لگے ہو؟"

"پتا نہیں' شاید کچھ عقل آ گئی ہے۔"

بہت مدھم لہجے میں اس نے کہا تھا۔ پھر بات بدلتے ہوئے بولا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے سارا! مجھے وقتی طور پر بہت دکھ ہوا تھا کیونکہ میں نے تمہیں دوسری لڑکیوں سے بہت مختلف سمجھا تھا۔ مگر جلد ہی مجھے عقل آ گئی۔ تم اپنی جگہ پر صحیح ہو سارا۔ میرے پاس واقعی تمہیں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اور تم نے صحیح کہا تھا۔ محبت کبھی کسی انسان کا پیٹ نہیں بھرتی' ہر انسان کو اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزارنے کا حق حاصل ہے۔"

"ٹھیک ہے' سوچ جاذی' تم رئیلی بہت اچھے ہو۔"

وہ اس کے الفاظ پر خوش ہوئی تھی۔ مگر جاذب دکھ سے مسکرا اٹھا تھا۔

"پھر سے خوش فہمیوں میں مت الجھو چڑیل! یہ حصار ٹوٹتا ہے تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔"

اس بار اس کا لہجہ اتنا مدھم تھا کہ سارا کوشش کے باوجود کچھ نہیں سن سکی تھی۔

"نوید کون ہے۔؟" کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا۔

"میری ایک عزیز دوست کا بھائی ہے' دو سال پہلے ہم ملے تھے' تب وہ باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ تین بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ خود مختار ہے۔ امی نے بھی دیکھا ہے انہیں بہت اچھا لگا ہے وہاں کو بھی۔"

"او کے اب تم جاؤ پلیز' میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

ایک دم اسے ٹوکتے ہوئے وہ پھر روکھا ہو گیا تھا۔ سارا کو اس کا رویہ بے حد برا لگا۔ وہ فوراً ہی اس کے کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔

کبھی شکستوں سے دکھ اٹھائے تو اس سے پوچھوں
وہ میری مانند ٹوٹ جائے تو اس سے پوچھوں
اسے بھی کوئی ستارہ منزل سے دور کر دے
اسے بھی رستہ نظر نہ آئے تو اس سے پوچھوں
سفر میں وہ بھی کسی کڑے امتحاں سے گزرے
اسے بھی یوں کوئی آزمائے تو اس سے پوچھوں
اسے محبت میں کون سا دکھ دیا ہے میں نے
کبھی نظر سے نظر ملائے تو اس سے پوچھوں
میری طرح دن چڑھے تک وہ بھی نہ سوئے
اسے بھی شب بھر نہ نیند آئے تو اس سے پوچھوں

وہ سارا حسیب کے ساتھ ساتھ خود سے بھی ناراض تھا۔ ہزار خود کو سمجھانے کے باوجود اس کا دل سارا حسیب سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ وہ گھر میں آتا تھا تو سانس جیسے سینے میں گھٹنے لگتی تھی۔ جبکہ سارا کا چہرہ اب بھی پہلے کی طرح شاداب تھا۔

☆ ☆ ☆

اس روز رات میں حسب معمول وہ کافی دیر سے گھر لوٹا تھا۔ گھر ہو گیا میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لہٰذا چپ چاپ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ مگر برآمدے سے گزرتے ہوئے' اچانک اس کے قدم ٹھٹھک گئے۔

رات کے اس پہر سارا' بڑے مگن انداز میں ٹیلی فون اسٹینڈ کے قریب کھڑی' کسی سے کہہ رہی تھی۔

"آپ کب آ رہے ہیں نوید! گھر والے اب زیادہ دن مجھے آزاد نہیں رہنے دیں گے' چند روز پہلے میں نے اپنے کزن کو بھی آپ کے بارے میں بتا دیا ہے۔ اماں ہم بہنوں کی وجہ سے بہت پریشان رہتی ہیں۔ پلیز جلد واپسی کا پروگرام بنا لیں۔ نہیں تو کسی اور کے ساتھ رخصت کر دیں گے یہ مجھے۔"

دوسری طرف نوید نے شاید انتظار کرنے کو کہا تھا جبھی اس نے کہا تھا۔

"وہ تو کر ہی رہی ہوں۔ مگر ڈر لگتا ہے۔ آپ کی

واپسی سے قبل کہیں کچھ اور نہ ہو جائے۔ وقت تیزی سے ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے۔ اب تو عائزہ اور فرا بھی مجھ سے بڑی لگنے لگی ہیں۔"

اس نے شاید پھر امید کے پھول تھمائے تھے تب سارا کے چہرے پر شرمیلی سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی اور اس نے رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

دل میں بہت سی حسرتیں پنپ رہی تھیں۔

خود اچھی زندگی بسر کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے گھر والوں کو سپورٹ کرنے کی خواہش بھی رکھتی تھی۔ اسی لیے اب تک جس کسی نے بھی رشتے کی غرض سے ادھر کا رخ کیا تھا۔ اس نے اوٹ پٹانگ حرکتیں کر کے انہیں بھگا دیا تھا۔

جاذب اتنے سالوں سے یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ اس کے لیے ایسا کر رہی ہے۔ مگر وہ "کس" کے لیے ایسا کر رہی تھی' یہ اب اسے معلوم ہوا تھا۔ پچھلے دو سالوں میں کتنا بدل لیا تھا اس نے خود کو۔ وہ جو ہر وقت ہواؤں کے رتھ پر سوار رہتی تھی۔ اب گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ بیٹھے دھیمی جا رہی تھی۔

وقت مزید تیزی سے آگے بڑھ گیا تھا۔

جاذب کا کام بڑھ گیا تھا۔ اب اکثر رات میں بھی وہ گھر واپس نہیں آتا تھا۔ فائزہ نے بی اے کی طرح ایم اے بھی نہایت اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔ گھر کی تمام ذمہ داری بھی پہلے سے بڑھ کر اس نے سنبھال لی تھی۔ جاذب کے تمام چھوٹے موٹے کام بھی وہی سرانجام دیتی تھی' سارا اب یا تو خود کو کمرے میں محصور رکھتی یا جاب کے سلسلے میں گھر سے باہر رہتی۔

عابدہ بیگم کی صحت اب پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ بیٹیوں کی فکر انہیں ہر وقت مختلف سوچوں کے حصار میں جکڑے رہتی تھی۔ اب جو بھی لوگ سارا' فائزہ کو دیکھنے آتے وہ فائزہ کے ساتھ ساتھ عائزہ کو بھی پسند کر لیتے۔ نتیجتاً عابدہ بیگم کو خاموشی اختیار کرنی پڑتی تھی۔ کیونکہ وہ ہر صورت پہلے سارا کے فرض سے ہی سبکدوش ہونا چاہتی تھیں۔ جاذب سب کچھ دیکھتے

اور جانتے ہوئے بھی خاموش تھا۔ اور سارا اس کی اسی خاموشی پر کڑھ رہی تھی۔

اس نے جاذب سے کہا تھا کہ وہ عابدہ بیگم سے بات کرے اور انہیں سمجھائے کہ وہ سارا کے چکر میں دوسری بیٹیوں کے اچھے رشتے نہ گنوائیں۔ مگر وہ ابھی تک ان سے اس مسئلے پر بات نہیں کر سکا تھا۔

عائزہ نے قد کاٹھ بہت اچھا نکالا تھا۔ شکل و صورت کے لحاظ سے بھی وہ بالکل فائزہ پر گئی تھی۔ خوش اخلاق بھی تھی اور خوش لباس بھی۔ للذا سب اسی کے گرویدہ ہو گئے تھے۔

آج کل رشتے کے لیے آنے والی زیادہ تر خواتین اسی کو پسند کر جاتی تھیں اور یہی بات عابدہ بیگم کو پریشان کر رہی تھی۔ مگر سارا کو ان کی پریشانی کا احساس نہیں تھا۔ وہ اپنی ہی دنیا میں مدہوش تھی۔

نوید نے ہزاروں میل دور بیٹھ کر بھی اس پر اپنا حصار تنگ کر رکھا تھا۔ صرف اس کے حصول کے لیے وہ اپنی ماں، بہنوں، جاذب اور زندگی کے من پسند مشاغل سے دور ہوتی چلی گئی تھی۔

جاذب نے دن رات کی محنت سے کافی روپے جمع کر لیے تھے اور اب اس کا ارادہ ملک سے باہر جانے کا تھا۔ اس سلسلے میں ابھی تک وہ عابدہ بیگم سے بات نہیں کر سکا تھا۔ تاہم اس نے انہیں اس بات کے لیے قائل کر لیا تھا کہ اب فائزہ، عائزہ اور سارا میں سے جس کا رشتہ بھی آئے وہ بڑی چھوٹی کے مسئلے کو سائیڈ پر رکھ کر فوراً "طے کر دیں۔

اس سلسلے میں اس نے سارا سے بھی بات کی تھی اور اسے سختی سے ہدایت کی تھی کہ وہ نوید سے جلد پاکستان واپسی کے سلسلے میں بات کرے کیونکہ وہ عابدہ بیگم کو مزید پریشان نہیں دیکھ سکتا۔ اور سارا نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جلد از جلد نوید کی پاکستان واپسی کے لیے اس پر دباؤ ڈالے گی۔

☆ ☆ ☆

اس روز خلاف معمول طبیعت ناساز ہونے کی بنا پر وہ دوپہر میں گھر آ گیا تھا اور خاصا حیران ہوا تھا۔ کیونکہ بکھرے گھر میں کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بیرونی دروازہ بھی بند نہیں تھا۔

عائزہ اور فرزانہ تو اسکول کالج گئی ہوئی تھیں۔ یہ اسے معلوم تھا۔ مگر فائزہ، سارا اور عابدہ بیگم کی غیر موجودگی اسے ضرور حیران کر رہی تھی۔ اسی حیرانی کی الجھن میں مبتلا وہ آگے بڑھ رہا تھا جب اچانک فائزہ کو اپنے کمرے کی صفائی کرتے دیکھ کر رک گیا۔ ہر روز صبح جانے سے قبل افراتفری میں وہ کافی پھیلاوا بکھیرتا تھا مگر روز رات میں اسے اپنا کمرا نئے سرے سے سجا سنوار ملتا تھا۔

وہ حیران ہوتا تھا کہ سارا اس سے دلی وابستگی نہ ہونے کے باوجود اس کا کتنا خیال رکھتی ہے۔ مگر یہ انکشاف بھی ابھی ہوا تھا کہ اس کا اتنا خیال رکھنے والی سارا حسیب نہیں، بلکہ فائزہ حسیب تھی، جو چپ چاپ بنا کسی صلے اور تمنا کے اس کی خدمت کر رہی تھی۔

جاذب کو تلے ہوئے پکوان پسند تھے۔ جب بھی بارش برستی تھی وہ سارا سے پکوڑوں اور چپس وغیرہ کی فرمائش کرتا تھا مگر عموماً وہ اس کی فرمائش ٹال دیا کرتی تھی۔ جبکہ فائزہ بنا کہے کچھ ہی دیر میں پکوڑوں اور چپس کے ساتھ ساتھ چائے اور کیا کیا بنا لاتی تھی۔

اس وقت بھی وہ اپنے دھنک رنگ آنچل سے اس کی تصویر صاف کرتے ہوئے بے آواز رو رہی تھی۔ اور وہ دروازے کی چوکھٹ پکڑے کھڑا اس وقت ششدر رہ گیا تھا، جب تصویر صاف کرنے کے بعد اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے اچانک اپنے لب اس کی سادہ سی تصویر پر رکھ دیے۔

اس ایک لمحے میں اس پر یہ راز کھلا تھا کہ اس رات جب وہ تیز بخار میں پھنک رہا تھا تو اس پر دم کر کے اپنی محبت لٹانے والی وہ مسیحا لڑکی کون تھی...؟

وہ چہرہ جو سارا حسیب کو بد صورت لگتا تھا اس چہرے کی وہ لڑکی پرستش کر رہی تھی جو خود حسن اور سلیقے میں بے مثال تھی۔

وہ تیزی سے واپس پلٹا تھا اور برابر کے کمرے میں آ کر عابدہ بیگم کے بستر پر ڈھے گیا تھا۔

محبت کا جو رنگ ابھی ابھی اس پر منکشف ہوا تھا وہ کتنا مختلف تھا؟

کیسی محبت تھی اس کم گو لڑکی کی، جس میں کوئی غرض، کوئی مفاد، کوئی مطلب پوشیدہ نہیں تھا۔ یہاں تک دل کی چوری پکڑے جانے کے خوف سے وہ کبھی اس کے سامنے اپنی نگاہیں بھی نہیں اٹھاتی تھی۔

اس کی دھڑکنیں طوفان اٹھا رہی تھیں۔

وہ رونا چاہتا تھا۔ اپنے غلط انتخاب پر، اپنے سچے جذبوں کی بے قدری پر، مگر... آنکھیں تو جیسے پتھرا گئی ہوئی تھیں۔

مرد کے لیے رد کیے جانے کا دکھ بہت بڑا اور ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ وہ بھی پل پل اپنی تحقیر پر کڑھتا رہتا تھا۔ مگر آج۔ اس لمحے وہ تکلیف، کلفت کی وہ شدت پہلے سی نہیں رہی تھی۔ اس کے اندر چاہے جانے پر ایک انوکھا سا احساس جاگا تھا اور یہی احساس اسے پھر سے زندہ ہونے کا پتہ دے رہا تھا ورنہ پچھلے دو تین سالوں میں تو وہ بوڑھوں جیسا ہو گیا تھا۔ جس میں اس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

چہرہ کیسا بے رونق ہو گیا تھا! آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے تھے، مسلسل محنت کی وجہ سے ہاتھ الگ کھردرے ہو گئے تھے۔ صحت بھی پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ زندہ رہنے کا جیسے مقصد ہی ختم ہو گیا تھا۔ مگر آج اس لمحے روح کے کسی کونے میں تھکی ماندی زندگی نے پھر سے کروٹ لی تھی۔ فائزہ اس کا کمرا صاف کر کے عابدہ بیگم کے کمرے کی طرف آئی تو اسے بستر پر لیٹے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"آ... آپ کب آئے...؟"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے، طبیعت ٹھیک نہیں ہے، کام بھی نہیں ہو رہا تھا اسی لیے گھر چلا آیا۔ سارا اور پھوپھو کہاں ہیں...؟"

آج اس نے پہلی بار بہت غور سے اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔ بے شک وہ بے مثال لڑکی تھی۔ مگر اس کے باوجود بھی سارا کی جگہ نہیں لے سکی تھی۔

"امی سارا کے ساتھ بازار گئی ہیں۔ کچھ چیزیں لانی تھیں۔ نوید بھائی پاکستان آ گئے ہیں ناں" اس نے نظریں بدستور جھکائے اس نے ہمیشہ کی طرح بہت سادہ لہجے میں جواب دیا تھا۔ تاہم جاذب کے اندر جیسے پھر سے بے چینی دوڑ گئی۔

"او کے، پلیز۔ ایک کپ چائے بنا دو، میرا سر بہت درد کر رہا ہے۔"

سخت لہجہ بدلتے ہوئے وہ آنکھوں پر بازو رکھ کر سوتا بن گیا تو فائزہ بھی فوراً پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ اس کا دکھ سمجھتی تھی۔

سارا سے اس کی والہانہ محبت بھی اس سے پوشیدہ نہیں تھی۔ مگر اس کے باوجود وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس موضوع پر جتنی بار بھی اس نے سارا سے بات کر کے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی، اس نے اسے بری طرح لتاڑ کر رکھ دیا تھا۔ ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دے دیا تھا کہ اگر اسے جاذب کا اتنا ہی خیال ہے اور دل میں اس کے لیے اتنی ہی ہمدردی ہے تو وہ خود اس سے شادی کر لے، کم از کم وہ تو مزید غربت کی چکی میں پسنے کی خواہش نہیں رکھتی۔

اور اس کے مشورے پر وہ محض حسرت سے آہ ہی بھر سکی تھی۔ کیونکہ جاذب کی نگاہ میں مقام پانا اس کے اپنے اختیار میں نہیں تھا۔

سارا تو نوید کی پاکستان آمد پر بے تحاشا خوش تھی۔ اس کا غرور بھی دیکھنے کے لائق تھا۔ یوں اتراتی پھرتی تھی جیسے ہواؤں پر حکمرانی کا راج مل گیا ہو۔ جاذب کے ساتھ ساتھ اب اپنے گھر والوں کے ساتھ بھی اس کا رویہ کافی تبدیل ہو گیا تھا۔ یہ وجہ سب پر رعب جمانے لگی تھی۔

جاذب اس کے خوشی سے دمکتے چہرے کو بہت حسرت زدہ سی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

جانے اس شخص میں کیا خوبی تھی۔ جو وہ اس کی محبتوں کے خزانے کو ٹھوکر مار کر اس شخص کے لیے دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔

اس کا دکھ پھر سے بڑھ گیا تھا۔ خود کو ہزار حیلوں سے بہلانے کی ہر کوشش ناکام ثابت ہو رہی تھی۔

رقابت کی جلن اسے کسی پل چین لینے نہیں دے رہی تھی۔

اب اس نے اور بھی تیزی سے اپنے باہر جانے کی کوششیں تیز کر دی تھیں۔

☆ ☆ ☆

نوید اور اس کے گھر والے آئے تھے۔ سارا نے خود کو یوں شوق سے سجایا سنوارا تھا کہ کوئی کمی نہ رہنے دی تھی۔ شاید اسے خدشہ تھا کہ نہیں کسی معمولی سی کمی کے باعث وہ مسترد نہ کر دی جائے گو دل کو اپنی جگہ نوید کی وفاؤں پر یقین بھی تھا۔ جاذب نے اس موقع پر صرف اس کی خوشی کے لیے نہ صرف عابدہ بیگم کے سامنے انجانے نوید کی تعریفوں کے پل باندھے تھے، بلکہ بجٹ کی پروا کیے بغیر لوازمات کے ڈھیر لگا دیے تھے۔ وہ اسے کسی بھی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

عابدہ بیگم نے اس بار یہ ہوشیاری کی تھی کہ فائزہ اور عائزہ کو مہمانوں کے قریب پھٹکنے بھی نہیں دیا تھا۔ ان کی خاطر مدارت کے فرائض بھی انہوں نے خود ہی جاذب کے ساتھ مل کر سرانجام دیے تھے۔ فائزہ اور عائزہ مہمانوں کے جانے تک اوپر چھت پر بیٹھی رہی تھیں۔

خدا خدا کر کے یہ بیل منڈھے چڑھی اور اس کا رشتہ طے ہو گیا۔

اپنا من پسند ہمسفر مل جانے کی خوشی میں وہ دنیا کے ساتھ ساتھ دین سے بھی بے خبر غافل ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے دن میں عابدہ بیگم کے ڈانٹنے پر وہ چار نمازیں پڑھ لیتی تھی۔ اب ان کا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔ ہمہ وقت وہ ہوتی اور اس کا موبائل فون، جو نوید نے اسے منگنی کے تحفے کے طور پر خرید کر دیا تھا۔

جاذب کی صحت تیزی سے گرتی جا رہی تھی۔

رات میں دیر تک جاگنے کے ساتھ اب اس نے اسموکنگ بھی شروع کر دی تھی۔

اس روز شام میں وہ گھر واپس آتے ہوئے اپنے دوست سے ویزے کے بارے میں بات کر رہا تھا جب اچانک اس کا بائیک سامنے سے آتی گاڑی کے ساتھ ٹکرا گیا۔ اور خود کو لاکھ سنبھالنے کی کوشش کے باوجود گہری چوٹ لگوا بیٹھا۔

اس کا دوست جس کے ساتھ وہ گھر واپس آ رہا تھا فوری طور پر اسے ہاسپٹل لے گیا۔ جہاں اس کی ٹانگ پر پلستر چڑھا، پیشانی پر ٹانکے لگے اور کہنی کی ٹوٹی ہوئی ہڈی کو عارضی طور پر جوڑ کر اس کی مرہم پٹی کی گئی۔ دو اڑھائی گھنٹے وہاں رکنے کے بعد جس وقت وہ اپنے دوست کے ساتھ اس کا سہارا لے کر گھر کی دہلیز پر قدم رکھا۔ صحن میں کھڑی فائزہ کے ہاتھ سے آٹے کا تسلہ چھوٹ کر زمین پر آ گرا۔

عابدہ بیگم کی نگاہ جوں ہی اس کی طرف اٹھی، دو دل پر ہاتھ رکھ کر فوراً اس کی طرف لپکیں، عائزہ اور فائزہ بھی پریشانی سے اس کی طرف بڑھی تھیں۔ مگر وہ اپنی جگہ پر ساکت کھڑی یوں لگتا تھا جیسے اس کے وجود میں چلنے کی سکت بھی نہ رہی ہو۔

جاذب نے ایک مرتبہ پھر اس کے چہرے سے نگاہ چرائی تھی۔

رات میں جب وہ سب کو اپنے حادثے کی تفصیل بتا کر مطمئن کر چکا تو بظاہر اس کے لیے متفکر سارا نے قدرے ناراضی سے کہا تھا۔

"تم حد سے زیادہ لاپروا ہوتے جا رہے ہو جاذی! بندہ روڈ پر تو دیکھ بھال کر چلے۔ ابھی اگلے ہفتے پھر نوید کے گھر والے آ رہے ہیں۔ اب ان کی خاطر مدارت کون کرے گا۔ تم تو پندرہ بیس روز سے پہلے چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے، کتنی شرمندگی ہوگی اب ان کے سامنے۔"

وہ خود غرض لڑکی اب بھی صرف اپنے لیے سوچ رہی تھی۔

کمرے میں عابدہ بیگم نہیں تھیں، صرف وہ، سارا

فائزہ اور فرا تھیں۔ عائزہ اس کے لیے کچن میں کچھ بنا رہی تھی جبکہ عابدہ بیگم اس حادثے کے بعد اس کی سلامتی پر شکرانے کے نوافل ادا کر رہی تھیں۔

فائزہ نے سارا کے الفاظ پر کچھ کہنے کے لیے لب کھولنا چاہے تھے۔ مگر اس سے پہلے ہی وہ بول اٹھا تھا۔

"تم فکر نہ کرو سارا! وہ لوگ آئیں گے تو سارا انتظام ہو جائے گا، تمہیں ان کے سامنے شرمندگی نہیں اٹھانا پڑے گی اور نہ ہی میں اپنی زندگی میں ایسا کوئی موقع آنے دوں گا جب میری وجہ سے تمہیں کوئی پریشانی اٹھانا پڑے۔"

اس بار اس کے الفاظ پر جہاں سارا احساس تفاخر سے مسکرائی تھی۔ وہیں فائزہ چپ چاپ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

اس کے زخم کافی شدید تھے۔ اوپر سے سردی کے باعث ان زخموں سے اٹھتی ٹیسوں نے اسے مزید کمزور کر دیا تھا۔ بہت کوشش کے باوجود وہ خود کو کراہنے سے باز نہیں رکھ سکا تھا۔ تب ہی اس نے اپنے قریب فائزہ کی گھبرائی ہوئی آواز سنی تھی۔

"جاذب! کیا آپ کو بہت زیادہ درد ہو رہا ہے؟"

"ہاں" وہ بے بسی سے اعتراف کر گیا تھا۔ فائزہ کی دلی تکلیف مزید بڑھ گئی۔

"مم... میں کچھ کروں؟"

ستے چہرے کے ساتھ، خوبصورت آنکھوں کو بے دردی سے رگڑتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

"تم کیا کر سکتی ہو؟"

"نہیں۔ میں کوئلے دہکا کر لاتی ہوں، سنکائی کر لیں گے تو درد میں شدت نہیں رہے گی۔"

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے، پھوپھو جاگ گئیں تو رات بھر بے آرام رہیں گی۔ تم سو جاؤ جا کر۔"

"مجھے نیند نہیں آ رہی۔"

"سارا کہاں ہے؟ سو گئی ہے کیا؟"

"جی نہیں، ابھی تھوڑی دیر پہلے تو نوید بھائی سے بات کر رہی تھیں، میں نماز سے فارغ ہوئی تو وہ بستر میں جا چکی تھیں۔"

سادگی سے دھیمے لہجے میں جواب دیتے ہوئے اس نے بدستور گردن جھکائے رکھی تھی۔

"ٹھیک ہے تم بھی سو جاؤ، مجھ پر بھی دوا اثر کر رہی ہے۔ میں بھی تھوڑی دیر میں سو جاؤں گا۔"

اس نے اسے وہاں سے رخصت کرنا چاہا تھا مگر وہ ایسا کوئی ارادہ ظاہر نہ کرتے ہوئے بولی۔

"ایک بات کہوں۔ آپ مان جائیں گے ناں۔"

"کہو۔"

حقیقی معنوں میں وہ اب اس کی توجہ سے چڑنے لگا تھا۔

"آپ کام کے لیے باہر مت جائیں۔ آپ کے سوا یہاں گھر میں اور کون ہے جس سے تحفظ کا احساس ہو۔" کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بولی تھی یہ بات وہ جانے پچھلے کتنے دنوں سے کہنا چاہ رہی تھی۔ مگر ہمت ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

جاذب نے قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر بے بسی سے بولا۔

"مجھے اس بات کا احساس ہے فائزہ! مگر باہر جانا میری مجبوری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر میں تم سب لوگوں کو زندگی کی حقیقی خوشیاں نہیں دے سکتا۔"

"ٹھیک ہے، لیکن ہماری خوشیوں کے لیے کیا آپ خود کو مٹا دیں گے۔ اپنی پروا نہیں کریں گے۔ امی آپ کے لیے ہر لمحے پریشان رہتی ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ سارا کے ساتھ آپ کی شادی کا فریضہ بھی انجام پا جائے کیونکہ آپ کی عمر بھی تو تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔"

وہ اس کے الفاظ پر مسکرا دیا تھا۔

دھیمے لہجے میں گردن جھکائے جھجکتی جانے کیوں اس لمحے وہ اسے بے حد اچھی لگی تھی۔

"اچھا... لیکن مجھے تو اپنی بڑھتی عمر کا احساس نہیں رہا۔"

"کیسے رہ سکتا ہے خود پر توجہ دیں تو احساس رہے گا ناں۔"

صرف ایک لمحے کے لیے نظریں اٹھا کر اس نے پھر

جھکائی تھیں۔ پھر وہ کھ سے مسکرا دیا تھا۔

"مت اتنی اہمیت دیا کرو مجھے میں اس قابل نہیں ہوں بھئی۔"

وہ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہیں پایا تھا۔ کہا تھا تو محض اتنا۔

"میری فکر نہ کیا کرو فائزہ! سارا کے ساتھ ساتھ تمہارے اور عائزہ کے فرض سے سبکدوش ہونے کے بعد میں اپنے لیے سوچوں گا تب تک شاید کوئی مسیحا لڑکی مل جائے۔"

وہ دیکھ سکتا تھا کہ اس کی آنکھوں کی سطح تیزی سے نم ہو گئی تھی۔

"مجھے شادی نہیں کرنی کبھی بھی نہیں۔"

وہ بھرائے لہجے میں کہتی وہ فوراً اٹھ کر اس کے کمرے سے باہر نکل گئی تو جاذب محض سرد آہ بھر کر رہ گیا۔

مجھ کو معصوم سی لڑکی پہ ترس آتا ہے اس کو دیکھو تو محبت میں مگن کیسی ہے؟

اس بار نوید صدیقی کے گھر والے آئے تو سب نے مل کر ان کی خاطر مدارت کی تھی۔

عائزہ فائزہ دونوں بھی نوید کو بھرپور پروٹوکول دینے کی کوشش میں بہت دیر تک اس سے ہنسی مذاق کرتی رہی تھیں۔

"ماشاء اللہ، آپ کی یہ دونوں بیٹیاں تو بہت خوبصورت ہیں۔ پچھلے اتوار گھر میں نہیں تھیں اس لیے دیکھ نہ سکے ورنہ شاید ہمارا فیصلہ کچھ اور ہوتا۔"

نوید کی بڑی بہن نے فائزہ اور عائزہ کو بھرپور ستائشی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا تو سارا کے ساتھ ساتھ عابدہ بیگم کے چہرے پر بھی تاریک سا سایہ لہرا گیا۔

نوید اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گیا تھا جبکہ کمرے کی دہلیز سے ٹیک لگائے کھڑے جاذب کے لبوں پر دکھی سی مسکان بکھر کر رہ گئی۔

بھری محفل میں سارا کی یہ توہین اسے قطعی گوارا نہ ہو سکی تھی۔

☆ ☆ ☆

ان دنوں فائزہ کے لیے بھی ایک بہت اچھا رشتہ آیا تھا۔ لڑکا ملٹی نیشنل کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ گھر میں صرف ایک بوڑھی ماں اور بہن تھی۔ بڑی بہن جس کی شادی ہو چکی تھی اسی نے فائزہ کو اس کی دوست کے گھر دیکھ کر اپنے بھائی کے لیے یہ رشتہ ڈالا تھا۔

عابدہ بیگم کے پاؤں تو خوشی سے زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ اللہ نے کتنی جلدی ان کی سن لی تھی۔ ان کے ہونٹ اللہ کی پاک ذات کا شکر ادا کرتے نہ تھک رہے تھے۔ مگر فائزہ مسلسل رو رہی تھی۔

اس کو نہ لڑکے کی اچھی پوسٹ سے دلچسپی تھی نہ اس کے اعلیٰ گھرانے سے۔ اس کی ایک ہی رٹ تھی۔

"مجھے شادی نہیں کرنی کسی سے بھی نہیں۔"

جاذب اس کے انکار کی وجہ جانتا تھا اسی لیے اسے سمجھانا چاہتا تھا۔

اپنی حیثیت کام اور شکل صورت کے معاملے میں اب بہت زیادہ احساس کمتری کا شکار رہنے لگا تھا۔ وہ اس کانچ سی نازک حساس لڑکی کو کوئی دکھ دینا نہیں چاہتا تھا۔ اسی لیے اب تک لب سی رکھے تھے ورنہ وہ اس کی محبت کی شدتوں سے بے خبر نہیں تھا۔

اس کے باہر جانے کی تیاریاں بھی شروع ہو گئی تھیں۔ گھر کا ماحول عجیب سا بنا ہوا تھا۔

عابدہ بیگم اتنے اچھے رشتے سے فائزہ کے انکار کو قطعی نہیں سمجھ پا رہی تھیں۔ اسی لیے پریشان تھیں۔ جاذب اس روز رات میں ذرا جلدی گھر آ گیا تھا۔ ارادہ فائزہ سے بات کر کے اسے سمجھانے کا تھا۔ اسی غرض سے عابدہ بیگم سے سلام دعا کرنے کے بعد وہ فائزہ کے کمرے کی طرف آیا تو سارا کی کمرے میں موجودگی نے اس کے قدم وہیں دہلیز سے باہر روک لیے۔

غالباً نہیں یقیناً اندر اسی کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔

"پاگل پن کا مظاہرہ مت کرو فائزہ! خوب اچھی

طرح سمجھتی ہوں کہ تم اتنے اچھے رشتے سے انکار کیوں کر رہی ہو۔ مگر کان کھول کر سن لو۔ آج کل محبت کسی کو آسودگی نہیں دیتی۔ آج کل ہر طرف صرف پیسے کی قدر ہے، جس بندے کے پاس پیسہ ہو، صرف وہی زندگی کے حقیقی رنگوں کا لطف اٹھا سکتا ہے۔ ورنہ ہم مڈل کلاس گھرانوں کی لڑکیاں ساری زندگی دو جمع دو کرتی لاتعداد مسائل کا شکار ہو کر مر جاتی ہیں۔ قسمت سے اگر تمہیں راج کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ تو کیوں فضول حماقت کا مظاہرہ کر رہی ہو۔ وہ جاذب کا بچہ کچھ نہیں دینے والا تمہیں۔ اچھی خوراک اور لباس بھی نہیں۔"

"مجھے اچھی خوراک اور لباس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں یہ بھی نہیں کہتی کہ وہ مجھ پر اپنی محبتیں لٹائے، کچھ نہیں مانگتی سوائے اس چیز کے کہ وہ میرے پاس میری آنکھوں کے سامنے رہے کیونکہ میں اسے دیکھے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ سوائے اس کے میرے لیے زندگی کا کوئی مقصد، کوئی حسن نہیں ہے۔"

جاذب کو لگا اس لڑکی نے محض ایک لمحے میں اس کا کھوکھلاہٹ پاش پاش کر کے رکھ دیا ہو۔

"تم پاگل ہو گئی ہو، تمہیں کچھ بھی سمجھانا نری حماقت ہے۔ شاید تم جانتی نہیں ہو کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اس کے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ اچھے جملے کچھ خواب بھی نہیں ہیں۔"

سارا تلملاتی ہوئی بول رہی تھی مگر فائزہ مسلسل رو رہی تھی۔

"میں خوابوں میں نہیں جیتی، وہ حقیقت میں میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے اور میں اس حقیقت کو خواب بنانا نہیں چاہتی، وہ میرا آئیڈیل ہے سارا! میں اسے اپنے اندر سے نکال کر کسی اور مرد کو اس کی جگہ نہیں دے سکتی۔ وہ جیسا بھی ہے، میرے لیے کل کائنات ہے۔"

"ٹھیک ہے تو پھر رہو اسی چار مرلے کے مکان میں ساری عمر نوکرانی بن کر۔ کرو اس کی خدمتیں، چھوٹی چھوٹی آسائشوں کو ترستے ترستے مر جاؤ گی تم جیسی عشق سے پیدل لڑکیوں کی زندگی کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔" اس نے تنفر سے کہا

"وہ مجھے اپنی خدمت کی اجازت تو دے سارا! میں ساری زندگی چپ چاپ اس کے قدموں میں بسر کر لوں گی۔ کبھی کسی کو الزام نہیں دوں گی۔"

"ہاں! ابھی عشق کا بھوت سوار ہے نا دماغ پر اس لیے ایسی باتیں کر رہی ہو۔ کل کو مجھے عیش کرتے ہوئے دیکھو گی تو ٹھنڈی آہیں بھرو گی مگر افسوس تمہیں کوئی نوید نہیں ملے گا۔"

اس کا لہجہ غرور سے پر تھا۔ جاذب کے لیے مزید وہاں کھڑے رہنا دشوار ہو گیا۔ اندر سینے میں جیسے بہت سارا دھواں بھر گیا تھا۔

ایک ہی گھر میں پلنے والی دو بہنوں کی رائے اور سوچ اس کے بارے میں کتنی مختلف تھی۔

وہ لڑکی جسے اس نے دل کی گہرائیوں سے ٹوٹ کر چاہا تھا جسے بے تحاشا محبت اور عزت دی تھی وہ اسے کتنا بے مول کر گئی تھی اور وہ لڑکی جسے آج تک کبھی اس نے نگاہ بھر کر دیکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی وہ اسے انسان سے دیوتا بنا کر انمول کر رہی تھی۔

اسے اپنی بے بسی پر رونا آ رہا تھا۔ کوئی ایسی جگہ دکھائی نہیں دے رہی تھی، جہاں وہ اپنا شکستہ وجود گھسیٹ کر لے جاتا۔

اس رات وہ بے چینی سے بستر پر پہلو بدل رہا تھا، جب اس نے ایک مرتبہ پھر فائزہ کو اپنے روم میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے کمرے کی لائٹ چونکہ جل رہی تھی اور وہ اضطراب سے پاؤں بھی ہلا رہا تھا لہٰذا فائزہ کی آمد پر پھر سے حیران ہوتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

وہ اب بھی رو رہی تھی۔

"تم یہاں....؟"

"ہاں، مجھے آپ سے کچھ بات کرنا تھی۔" چہرے کے ساتھ ساتھ اس کی آواز بھی بھیگی ہوئی تھی۔

"ہاں کہو۔ میں سن رہا ہوں۔"

اسے پھر اس پر غصہ آیا تھا مگر وہ اس کے غصے سے بے نیاز نم لہجے میں بولی۔

"مجھے شادی نہیں کرنی۔ آپ پلیز امی کو سمجھا لیں۔ وہ آپ کی کوئی بات نہیں ٹالتیں۔ میں ہمیشہ ان کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔ ان کا بیٹا بن کر۔"

"ان کا بیٹا میں ہوں تم حماقت کا مظاہرہ مت کرو۔ آج کل کے دور میں اچھے رشتے ملنا بہت زیادہ مشکل ہو گئے ہیں پھر کیوں کفرانِ نعمت کر رہی ہو تم؟"

وہ نرم پڑ گیا تھا۔ جواب میں پہلی بار فائزہ نے آنسوؤں سے بھری آنکھیں اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا اور جاذب کہیں اس کی ایک نظر کے سوال سے ہار گیا۔

اگلے چند روز میں جانے اس نے عابدہ بیگم سے کیسے بات کی کہ وہ اس کی جگہ عائزہ کی بات پکی کر آئیں۔ لڑکے والوں کو دونوں ہی پسند تھیں لہٰذا یہ معاملہ خوش اسلوبی سے نپٹ گیا۔

فائزہ اتنی خوش تھی کہ جاذب کا شکریہ ادا کرتی نہ تھکتی رہی تھی۔ عائزہ بھی شرمائی شرمائی سی رہنے لگی تھی۔

پچھلے دنوں نوید کسی ایمرجنسی کے سلسلے میں دوبارہ سعودیہ گیا تھا جاذب کا بھی سعودی عرب کے لیے کنفرم ہو گیا تھا۔ لہٰذا وہ بھی اپنے دوست کے ساتھ ان سب کو اللہ کی امان میں چھوڑ کر سعودی عرب چلا گیا۔

دو سال کیسے گزر گئے، کچھ خبر نہ ہو سکی۔

ملک میں عید کا تہوار آ رہا تھا اور جاذب کی خواہش تھی کہ دو سال کے بعد وہ یہ تہوار اپنے گھر والوں کے ساتھ سیلیبریٹ کرے۔ سو چپ چاپ سرپرائز دینے کے چکر میں بنا خبر کیے پاکستان چلا آیا۔ اپنے گھر کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے اس کے ہاتھ لمحہ بھر کو کپکپائے تھے۔

دروازہ چھوٹی فوزیہ نے کھولا تھا اور وہ اسے غیر متوقع طور پر اپنے سامنے پا کر بے ساختہ چلاتے ہوئے اس کے ساتھ لپٹ گئی۔

وہ گھر میں داخل ہوا تو عابدہ بیگم، سارا اور عائزہ اپنے اپنے کاموں میں مشغول، اسے اچانک سامنے پا کر حیران رہ گئیں۔ عابدہ بیگم تو رو ہی پڑی تھیں۔ اس کی اپنی آنکھیں بھی لمحہ بھر کو نم ہو گئی تھیں۔ پورے دو سال کے بعد اسے وہ آغوش ملی تھی جس میں سر رکھ کر وہ ہر فکر اور پریشانی سے بے نیاز ہو جاتا تھا۔

بھائیں بھائیں کرتے گھر میں ایک دم سے جیسے رونق اتر آئی تھی۔

"پھپھو! فائزہ دکھائی نہیں دے رہی۔ کہیں گئی ہے کیا؟"

باتوں کے دوران اچانک اسے خیال آیا تو اس نے پوچھ لیا۔ تب ہی انہوں نے بتایا۔

"نہیں بیٹے! اندر اپنے کمرے میں ہے۔ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے اس لڑکی کو۔ کبھی ٹھیک ہی نہیں رہتی۔ پچھلے ہفتے ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا ابھی تک بستر سے اٹھ نہیں سکی ہے۔"

عابدہ بیگم کی اطلاع پر اس کے دل کو جیسے کچھ ہوا تھا۔

"او خدایا۔ آپ نے بتایا کیوں نہیں مجھے۔"

"کیا بتاتی بیٹا! پردیس میں تجھے پریشان بھی کرتی تو کیا فائدہ، تم آ تو نہیں سکتے تھے۔"

"مگر پھر بھی آپ کو مجھے خبر کرنا چاہیے تھا۔" الجھے لہجے میں کہتا وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں ایک نظر اسے دیکھ کر آتا ہوں۔"

دھیمے لہجے میں کہتا وہ فوراً اس کے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اس پر نظر پڑی تو ٹھٹک گیا، ٹھٹک گیا۔ یہ وہ فائزہ تو نہیں تھی جسے دو سال قبل وہ چھوڑ کر گیا تھا۔

"فائزہ...."

وہیں اس کے بستر کے قریب سمٹ کر بیٹھتے ہوئے جانے کس جذبے سے اس نے پکارا تھا کہ فائزہ نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ کچھ لمحے وہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھتی رہی تھی پھر یک لخت ہی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا گئیں۔

"آپ آ گئے؟" اس نے یوں پوچھا تھا جیسے خواب دیکھ رہی ہو۔ جاذب کا دل مچل کر رہ گیا۔

"وہ تم کبھی نہیں سدھر سکتیں۔"

سرخ چہرے تے ہوئے وہ دو تکیے میں رو پڑا یا پھر کچھ دیر خاموشی سے اس کے سراپے کا جائزہ لینے کے بعد اٹھ کر باہر آ گیا۔

عابدہ بیگم عید کے فوراً بعد سارا اور عائزہ کا بیاہ کرنے کا فیصلہ کیے بیٹھی تھیں اور جاذب اس معاملے میں ان سے پورا پورا متفق تھا کیونکہ پچھلے دو سالوں میں اس نے بہت کچھ کما لیا تھا۔ تاہم نوید کے گھر والے ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے۔ سارا اسی لیے آج کل پریشان رہنے لگی تھی کیونکہ نوید سے اس کا رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس روز بڑی مشکل سے وہ اس سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔

"نوید! مجھے لگتا ہے میں پاگل ہو جاؤں گی۔ پانچ سال ہو گئے ہیں ہماری محبت کو۔ دو سال ہو گئے منگنی ہوئے اور تمہارے گھر والے ابھی تک سنجیدہ نہیں ہیں۔ مسئلہ کیا ہے؟ کہیں تمہارا فیصلہ بدل تو نہیں گیا۔"

اسے غصہ بھی آ رہا تھا اور رونے کو بھی دل چاہ رہا تھا۔ نوید نے بڑے تحمل سے اس کی بات سنی تھی۔

"سارا! میں تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ دراصل گھر والوں کی تو پہلے ہی مرضی نہیں تھی۔ میرے مجبور کرنے پر وہ بددلی کے ساتھ راضی ہو گئے تھے مگر جب عائزہ اور فائزہ کو دیکھا تو ان کو احساس ہوا تمہاری عمر زیادہ ہے۔ میں نے ان کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کسی طور اس رشتے پر راضی نہیں۔ میں خود تم سے اس سلسلے میں بات کرنے والا تھا۔ تم بہت اچھی ہو سارا! یقیناً تمہیں مجھ سے بہتر لڑکا مل جائے گا۔ پلیز مجھے معاف کر دینا میں اپنی امی کا دل نہیں دکھا سکتا۔ انہیں اپنے بیٹے کے لیے دوسری تمام ماؤں کی طرح خوبصورت کم عمر لڑکی چاہیے۔ صرف میری ضد اور فرمائش پر انہوں نے تمہیں پسند کیا تھا مگر اب فائزہ اور عائزہ کو دیکھنے کے بعد وہ میری نہیں سن رہی ہیں۔ تم میری پوزیشن سمجھ رہی ہو نا سارا!"

بڑی تفصیل سے مکمل صورت حال اس پر واضح کرنے کے بعد وہ پوچھ رہا تھا۔ جواب میں سارا نے چپ چاپ ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ اس کے پاس رونے کے لیے آنسو بھی نہیں تھے۔

وہ کبھی اس کہاوت کو سمجھ ہی نہیں پائی تھی کہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں سجتا۔ جاگتی آنکھوں سے دیکھے گئے خوابوں کی تعبیر صرف دکھ کی صورت میں ملتی ہے۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس صورت حال میں نوید سے کیا کہے اور اپنے گھر والوں کو کیا بتائے؟ پچھلے چار سالوں سے جن خوابوں نے اسے پاگل کر رکھا تھا، یک لخت ان خوابوں کے ٹوٹ جانے پر وہ آنسو بہائے یا شرمندگی سے منہ چھپائے؟

نوید نے یہ کیسی بے وفائی کی تھی کہ وہ اندر سے ٹوٹنے کے باوجود احتجاج نہیں کر سکتی تھی۔

اپنی انا اور خودداری کا پرچم بلند رکھنے کے لیے اسے وہ چار کھری کھری بھی نہیں سنا سکی تھی۔

وہ چار روز رو دھو کر اپنی بے قدری کا ماتم کرنے کے بعد بالآخر اس نے خود کو سنبھال لیا کیونکہ ابھی جاذب اس کے ہاتھ میں تھا۔ پچھلے دو سال میں جتنا اس کی شخصیت مزید نکھری تھی، وہیں اب وہ ٹھیک ٹھاک کمانے بھی لگا تھا۔ سعودیہ سے آتے ہوئے وہ فائزہ کے علاوہ ان سب بہنوں کے لیے بہت اچھے اچھے قیمتی تحائف بھی لے کر آیا تھا۔

جاذب کا سوچ کر ہی اس نے نوید کی کمینگی بھلانے میں زیادہ وقت نہیں لگایا تھا۔ اس روز سب لوگ فائزہ کے کمرے میں اس کے پاس بیٹھے تھے۔ جب باتوں کے دوران اچانک اس نے عابدہ بیگم سے کہا۔

"امی۔ میں نوید سے شادی نہیں کروں گی۔"

اس کے الفاظ پر جہاں عابدہ بیگم کو شاک لگا تھا وہیں باقی سب لوگ بھی چونک اٹھے تھے۔

"کیوں کیا ہو گیا ہے نوید کو؟"

عابدہ بیگم کے بجائے جاذب نے پوچھا۔

"اسے کیا ہونا ہے، ایسے ذلیلوں کو کچھ نہیں ہوتا۔" وہ نخوت سے ناک چڑھا کر بولی۔

"پر بات کیا ہوئی ہے؟ یہ ایک دم سے نفرت سے ہو گئی ہے؟"

عابدہ بیگم پریشانی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ نوید کے گھر والوں کی ٹال مٹول سے ان کا ماتھا تو پہلے ہی ٹھنکا تھا۔

"وہ ہے ہی نفرت کے قابل امی! اس ذلیل نے بارے میں پہلے سے شادی کر رکھی ہے۔ وہ تین بچے بھی ہیں اس کے۔ اسی لیے اس کے گھر والے ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے۔ پتہ تھا اپنے بیٹے کے کرتوتوں کا۔ میری اسکول کی ایک دوست اس کی رشتہ دار ہے۔ ابھی پرسوں اس نے مجھے نوید کی اصلیت بتائی ہے۔ آپ خود ہی بتائیں امی! یہ سب جاننے کے بعد میں اس سے کیسے شادی کر سکتی ہوں؟"

اس نے اتنی ہوشیاری اور فراٹے سے جھوٹ بولا تھا کہ عابدہ بیگم کے ساتھ ساتھ باقی سب بھی اس کے کہنے پر ایمان لے آئے۔ عابدہ بیگم کے چہرے کا رنگ تو دیکھنے والا تھا۔

"کتنا بڑا فراڈ نکلا وہ۔ تم سے محبت کرتا تھا سارا!" جاذب کے لہجے میں [illegible] پڑنے نہیں دیا۔

"محبت تو وہ اب بھی کرتا ہے مجھ سے بلکہ جب سے مجھے اس کی اصلیت کا علم ہوا ہے اور میں نے اسے کھری کھری سنائی ہیں، تب سے ہر وقت کال کر کے معافی مانگتا رہتا ہے۔ علیحدہ گھر، بینک بیلنس سب کا وعدہ کیا ہے اس نے مگر۔ اب میرے لیے یہ چیزیں معنی نہیں رکھتیں۔ میں اپنے شوہر کی محبت تقسیم نہیں کر سکتی نہ ہی کسی کا چھوڑا کھا سکتی ہوں۔ بدنصیب ہے بے چارہ جو مجھ جیسی لڑکی کو حاصل نہ کر سکا۔"

وہ اب بھی اپنی "میں" کے غرور میں مبتلا تھی اور جاذب جو اتفاق سے اس کی اور نوید کی گفتگو دوسرے سیٹ پر سن چکا تھا، اس کے کھوکھلے بھرم پر دکھ سے مسکرا دیا۔

گھر والوں کی نظروں میں اپنا وقار بحال رکھنے کے بعد اس نے نوید کو کھری کھری سنائیں اور سختی سے کہہ دیا کہ اب وہ زندگی میں کبھی اس کے گھر کا دوبارہ رخ نہ کرے۔

جو جھوٹ وہ کہہ چکی تھی۔ اس کا دور جلدی ختم ہونے والا نہیں تھا، تاہم وہ خود کو بہلا رہی تھی۔ سب کے ساتھ بیٹھ کر ہنستی مسکراتی، عابدہ بیگم کی دل جوئی کرتی اور جاذب کا خصوصی خیال رکھتی۔ اس کے تمام کام بھی اس نے پھر سے اپنے ذمہ لے لیے تھے۔

☆ ☆ ☆

فائزہ کی طبیعت آہستہ آہستہ بہتر ہو رہی تھی۔ جاذب کا زیادہ وقت اب اس کے کمرے میں ہی گزرتا تھا اور سارا کو یہ بات بے حد ناگوار گزرتی تھی۔ اس نے صاف لفظوں میں کئی بار اسے ٹوکا بھی تھا مگر وہ مسکرا کر کہہ دیتا۔

"فائزہ بیمار ہے سارا! اس کا خیال رکھنا ہم سب کا فرض ہے۔"

جواباً وہ تلملا کر رہ جاتی۔

عائزہ کے سسرال والے اب شادی کی جلدی کر رہے تھے، اسی لیے عابدہ بیگم کی پریشانی بھی بڑھ گئی تھی کیونکہ سارا کا پہاڑ پھر سے سر پر آن کھڑا تھا اور فائزہ بھی مسلسل بیمار رہنے کے بعد اب وہ پہلی سی دل کشی کھو چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس روز وہ جاذب کے سامنے رو پڑی تھیں۔

"میں کیا کروں بیٹے! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ بڑی بیٹیوں کو چھوڑ کر تیسری کا بیاہ کیسے کروں؟"

"آپ فکر کیوں کرتی ہیں پھپھو! انشاءاللہ اللہ بہتر کرے گا۔ آپ ایک نہیں، چار شادیاں ایک ساتھ کریں گی۔" حسب عادت ان کے ہاتھ تھامتے ہوئے اس نے تسلی دی تو وہ چونک اٹھیں۔

"چار کیسے؟"

"چار ہی ہوں گی۔ تین بیٹیوں کی اور ایک بیٹے کی۔"

وہ مسکرا رہا تھا۔ سارا کے دل کی دھڑکن ایک لمحے

خود کو خوبصورت بنایا ہوا ہے۔ ہونہہ زیادتی۔ کہہ تو ایسے رہی ہو جیسے تم سے بڑا ہمدرد اس کا کوئی نہیں ہے۔"

سارا کو جانے کیا ہوا تھا' فوراً سنک کر بول اٹھی تھی۔ جواب میں عائزہ ہکا بکا رہ گئی۔ وہ اس کے بارے میں اتنی پست سوچ رکھتی ہوگی۔ عائزہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ میں نے کب حق مارا ہے ان کا۔"

وہ روہانسی ہو گئی تھی' سارا نخوت سے ناک چڑھاتے ہوئے بولی۔

"بس زیادہ معصوم بننے کی ضرورت نہیں ہے جیسی تم ہو مجھے سب پتہ ہے۔ پہلے نوید کے ساتھ لگ لگ کر بیٹھتی تھیں پھر اس انجینئر پر ڈورے ڈالنے۔ بالآخر ہتھیا کر رہیں۔ تم جیسی بہنیں ہی ہوتی ہیں جو اپنی سگی بہنوں کا گھر اجاڑ ڈالتی ہیں۔"

فائزہ کے ساتھ ساتھ وہ اب عائزہ سے بھی خوف زدہ رہنے لگی تھی کہ کہیں جاذب اس کے سحر انگیز حسن سے متاثر نہ ہو جائے۔

"بھائی! آپ سن رہے ہیں آپی کیا کہہ رہی ہیں؟"

عائزہ باقاعدہ رو پڑی تھی۔ جاذب نے چپ چاپ ہاتھ کے اشارے سے ایک ٹیکسی رکوائی پھر سب کو اس میں سوار کرنے کے بعد تحمل سے بولا۔

"چپ ہو جاؤ عائزی! تمہاری آپی کا دماغ تھوڑا کھسک گیا ہے۔ درست کرنا پڑے گا۔"

اس روز اس نے معاملہ سنبھال لیا تھا۔ سب کو ان کی پسند سے اتنی اچھی شاپنگ کروائی کہ کسی بات کا وجود نہ رہا مگر فائزہ کے دل کو بہت بری لگی تھیں۔ جاذب کا دل بھی اس کی اتنی پست سوچ پر دکھا تھا۔ دو دن سکون سے گزر گئے تھے۔ تیسرے روز صبح صبح وہ سو کر اٹھا تو سارا کی تیز آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔

"بس اب بہت ہو گیا یہ کھیل۔ میں مزید اپنی آنکھوں کے سامنے بے حیائی کے یہ کھلے مظاہرے برداشت نہیں کر سکتی۔ پوچھیں اپنی راج دلاری سے کیوں اس رشتے کے لیے نہیں مان رہی ہے۔ جب اچھا ہے' لڑکا شریف اور سمجھ دار ہے پھر اسے کیا تکلیف ہے اس رشتے سے؟ مگر جو تکلیف ہے اسے میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ اس کی نظر جاذی پر ہے جو اسی لیے سارا دن اس کے کمرے میں گھسی رہتی ہے اور آپ کی آنکھیں ہی نہیں کھلتیں۔ بیٹیاں جو مرضی گل کھلاتی رہیں کوئی پروا نہیں آپ کو۔" وہ شدید غصے میں بول رہی تھی۔ جاذب بے ساختہ بستر سے اٹھ بیٹھا۔

"بکواس بند کرو سارا! میں اپنے اور جاذب کے کردار پر ایک لفظ برداشت نہیں کروں گی۔" پہلی بار جاذب نے فائزہ کی بلند آواز سنی تھی۔

"شٹ اپ۔ جانتی ہوں تمہاری پارسائی کو بہت اچھی طرح سے۔ سارا دن میرے خلاف اس کے کان بھرتی رہتی ہو' اسی کے لیے جوگ لے رکھا ہے تم نے مگر وہ تمہارے ڈراموں میں آنے والا نہیں ہے۔ ہیرے اور پتھر کا فرق معلوم ہے۔"

وہ چلا رہی تھی' جاذب بستر سے نکل کر باہر آ گیا۔

"کیا بات ہے' صبح صبح جنگ کیوں چھیڑ رکھی ہے تم لوگوں نے۔"

ایک نظر فائزہ کے عام سے چہرے پر ڈالنے کے بعد اس نے سارا کی طرف دیکھا تو وہ بول اٹھی۔

"مجھے کوئی شوق نہیں فضول لوگوں کے منہ لگنے کا۔ نہ ہی شادی کے بعد مجھے ان لوگوں کے ساتھ رہنا ہے۔"

"بالکل صحیح ہے۔ پھوپھو! ابھی جو رشتہ آیا ہے میں نے اس کی تحقیق کروائی ہے' بہت اچھا لڑکا ہے۔ میرا خیال ہے سارا اس کے ساتھ خوش رہے گی۔"

فائزہ کے پہلو میں کھڑے ہو کر اس نے اتنے آرام سے کہا کہ وہ ہکا بکا اس کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

"تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو جاذی! میری شادی تمہارے ساتھ ہوگی' اس بڈھے کے ساتھ نہیں۔"

"وہ بڈھا نہیں ہے' اچھا خاصا سمجھ دار' میچور شخص ہے۔ تمہارے جیسی گرم مزاج لڑکی کے لیے وہی مناسب رہے گا۔ باقی جہاں تک میرا سوال ہے تو مجھے کوئی پاگل لڑکی ہی خوش رکھ سکتی ہے جسے سچی محبت کرنے کا فن آتا ہے جو بنا کسی صلے کے اپنی وفائیں لٹا کر بھی پیچھے ہٹ جانے کا ہنر جانتی ہے اور وہ لڑکی ہمارے گھر میں بس فائزہ ہی ہو سکتی ہے۔"

اس کی آنکھوں میں جگنو چمک رہے تھے۔

فائزہ ساکت کھڑی رہ گئی تھی گویا جسم میں جان ہی نہ رہی ہو۔

یہ کیسا معجزہ ہو گیا تھا' اس نے تو کبھی ہوا کو بھی اپنے جذبوں کا پتہ لگنے نہیں دیا تھا پھر یہ شخص کیسے مہربان ہو گیا تھا اس پر۔

"تمہیں جو بھی چیزیں پسند نہیں ہیں سارا! مگر میں جو ٹھا ہوں کیونکہ میری سوچ اور دل اب فائزہ کی امانت ہو چکے ہیں۔ تمہیں خوبصورتی اپیل کرتی ہے' میں خوبصورت نہیں ہوں یہ تم نے ہی مجھے بتایا تھا مگر جب میں نے اپنا عکس فائزہ کی آنکھوں میں دیکھا تو مجھے اپنا آپ اتنا حسین لگا کہ میں ششدر رہ گیا۔ تم نے دولت کو محبت پر ترجیح دی تھی' سنتی تھیں! محبت تمہارا در چھوڑ کر چلی گئی ہے پیٹ آئی جو کی منزل ملا پاتا تھا۔ میں اب بھی امیر نہیں ہوں سارا! میرے ہاتھ اب بھی مزدوری کرتے ہیں۔ قلم کی ملکی مزدوری سے لاکھوں روپے نہیں کماتے مگر پھر بھی مجھے کوئی احساس کمتری نہیں کیونکہ میرے پاس ہیروں سے بھی انمول رشتے ہیں اور اس پاک باز عورت کی سچی محبت ہے جسے سوائے میرے ساتھ کے اور کچھ بھی مطلوب نہیں۔ یاد رکھنا سارا! محبت ہر ریا اور غرض سے پاک ہوتی ہے جو لوگ اس مقدس جذبے میں کسی قسم کے لالچ یا غرض کا پیوند لگاتے ہیں' یہ ان کی کبھی نہیں ہوتی۔ آج کے بعد کبھی فائزہ سے جھگڑا مت کرنا کیونکہ کوئی میری محبت کا دل دکھائے' یہ میں برداشت نہیں کروں گا اور پھوپھو! پلیز آپ عید کے فوراً بعد شادی کی تقریب رکھ لیں۔ میرے پاس بہت کم چھٹیاں باقی رہ گئی ہیں۔ اس بار جاؤں گا تو سب کچھ سمیٹ کر جلد واپس آ جاؤں گا' پھر کوئی ہمارے ہجر میں حال سے بے حال نہ ہو جائے۔"

جگمگاتی روشن نگاہیں' ساکت کھڑی فائزہ کے شفاف چہرے پر جمائے اس نے کہا تو عائزہ اور فرا خوشی سے مسکرا اٹھیں کیونکہ ان کی اپنی خواہش بھی یہی تھی۔

"فائزہ! میں جانتا ہوں تم مجھ سے بہت محبت کرتی ہو' سچی اور بے لوث محبت۔ میں اس قابل تو نہیں ہوں مگر پھر بھی تم سے وعدہ کرتا ہوں' زندگی میں اپنی وجہ سے کبھی ان آنکھوں میں کوئی آنسو نہیں آنے دوں گا۔ ہر خوشی دوں گا۔ بس تم اسی طرح رشتوں کا مان رکھنا۔ میں سعودیہ سے تمہارے لیے سونے کی انگوٹھی لایا تھا' ابھی پھوپھو میرے نام سے تمہیں پہنائیں گی پھر شام میں عید کی شاپنگ کرنے چلیں گے۔ میرے ساتھ چلو گی نا؟"

اس کے لہجے اس کی ملتفت سی نگاہوں میں کیسے کیسے جذبے مچل رہے تھے۔ گم صم کھڑی فائزہ قدرت کی اس فیاضی پر بے ساختہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے رو پڑی تھی۔

"نہیں یار! اب نہیں۔" نہایت محبت سے اس کا آنسو انگلی کی پور پر چن کر اس نے کہا تو عابدہ بیگم نے بھی آگے بڑھ کر اسے اپنی آغوش میں سمو لیا جبکہ ان سے کچھ ہی فاصلے پر سارا حسب یوں نڈھال بیٹھی تھی جیسے وقت کی چال نے اسے ایک دم سے ہرا کر خالی کر ڈالا ہو۔

ثروت نازنین

ان کا ایک ہاتھ میرے کان کو پکڑے ہوئے تھا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی (جو ان کے وجود کا حصہ تھی) میری کمر، میری گردن اور میرے سر پر تابڑ توڑ حملے کر رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے، دل نفرت سے بھرا ہوا تھا۔ کمر میں جلن کا احساس تھا۔ لیکن یہ سب کچھ تو کچھ بھی نہ تھا۔ سب سے زیادہ تکلیف تو مجھے اس بات کی ہو رہی تھی کہ پورا محلہ میری یہ درگت بنتے دیکھ رہا تھا اور محظوظ ہو رہا تھا۔ ہچکی بھری آواز میں روتے ہوئے میں تیز تیز قدم چل رہا تھا تاکہ جلد گھر آجائے اور میری یہ ذلت ختم ہو۔

گھر کے دروازے کے پٹ کھلے تھے میں نے شکر ادا کیا۔ دروازہ بند ہونے کی صورت میں انہوں نے اسے اس خوف ناک طریقے سے کھٹکھٹانا تھا کہ محلے کے باقی ماندہ لوگ بھی اپنے گھروں سے نکل آتے اور پوچھنے لگتے

"کیا ہوا صوفی صاحب! کیا کیا ہے بچے نے؟" اور پھر بس اللہ دے اور بندہ لے والا معاملہ ہوتا۔

"ثریا! ثریا کہاں ہے عبدالشکور؟" وہ کرج دار آواز میں بولے۔ امی فوراً دوپٹہ سر پر سلیقے سے جماتے ہوئے باورچی خانے سے برآمد ہوئیں۔

"اسلام علیکم بھائی جی!"

"کہاں ہے شکور؟" انہوں نے میرا کان چھوڑ کر دھکا دیا اور میں لڑکھڑا کر سامنے پڑی کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔

"وہ تو ابھی دفتر سے نہیں..."

"بس دفتر میں فائلوں میں سر دیے کر بیٹھا رہے یہ نہ دیکھے کہ اولاد کیا گل کھلا رہی ہے۔"

"کیا کیا ہے اس نامراد نے؟" امی نے میری کمر پہ دھپ مار کر پوچھا۔

"نادر پان والے کی دوکان پہ بیٹھا اپنے لفنگے دوستوں کے ساتھ جوا کھیل رہا تھا۔"

"ہائے میں مر گئی۔" امی فوراً یقین کر بیٹھیں اور سینے پر دوہتڑ مار کر بین والے انداز میں رونے لگیں۔

"امی میں جوا نہیں کھیل رہا تھا تاش کھیل رہا تھا۔" میں اپنے دفاع میں منمنایا۔

"بند کر اپنی بکواس ایک تو بدمعاشوں کے ساتھ بیٹھ کر جوا کھیل رہا تھا اور اب جھوٹ بھی بول رہا ہے۔"

انہوں نے مارنے کے لیے دوبارہ چھڑی اٹھائی اور میں کرسی پر دبک کر رو گیا۔

"میں جا رہا ہوں، عبدالشکور آئے تو میری طرف بھیجنا۔" یہ کہہ کر وہ بپھرے ہوئے طوفان کی مانند گھر سے نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی میری جان میں جان آ گئی۔

امی اب دوپٹہ آنکھوں پر رکھ کر بڑبڑاتے ہوئے رونے لگیں۔

"ہائے میرے مولا! یہ دن بھی دیکھنا تھا۔ ایسی اولاد تو دشمن کو بھی اللہ نہ دے" وغیرہ وغیرہ۔

میں اپنی ہڈیاں پسلیاں سہلاتا ہوا امی کے قریب آ گیا۔

"امی میں کوئی جوا نہیں کھیل رہا تھا عصر کی نماز کے بعد میں نادر پان والے کے پاس سے گزرا، وہاں پرویز اور جعفر صابر سب تاش کھیل رہے تھے۔ میں بھی ذرا کی ذرا ان کے پاس بیٹھ گیا۔ بس یہی میری غلطی ہے اوپر سے بلا کی طرح تایا جی نازل ہو گئے۔"

"بے شرم تایا کو بلا کہتے شرم نہیں آتی۔"

"تو اور کیا کہوں انہوں نے میرا ذرا خیال کیا۔ پورے محلے کے سامنے میری اتنی بے عزتی کی۔ سارے لوگ مجھے مار پڑتا دیکھ رہے تھے۔" غصے اور ذلت کے احساس سے میری آواز پھٹ پڑی۔

"آہستہ بول زیادہ عزت والا۔ جو کچھ تیرے تایا جی نے کیا تیری بہتری کے لیے کیا۔"

"مجھے نہیں چاہیے بہتری ہر وقت پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ یہ نہ کرو وہ نہ کرو یہاں کیوں گئے تھے وہاں کیوں نہیں گئے۔" میں بڑبڑانے لگا۔

☆ ☆ ☆

یہ جو واقعہ میں نے آپ کو سنایا ہے یہ میرے بچپن کا واقعہ ہے۔ اس وقت میں نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ نئی نئی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ بچپن اور جوانی کا

سنگھ تھا۔ بچوں کے ساتھ جب کھیلنا اچھا نہیں لگتا اور
بچوں کو ان اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیتے۔ بس ایسی چھپنے
چھپانے کا وقت تھا۔ جن صاحب کا اوپر والے واقعہ
میں ذکر ہوا وہ میرے تایا جی حضور تھے۔ درمیانہ قد،
گٹھا ہوا جسم، سرخ و سفید رنگت، چہرے پر سفید داڑھی
اور سفید داڑھی سے ہم رنگ ٹوپی (یعنی سفید)
آنکھوں میں غصہ اور ہاتھ میں چھڑی اور چہرے پر ہمہ
وقت تحکم والا تاثر جیسے دنیا پر صرف رعب ڈالنے اور
حکم چلانے کے لیے تشریف لائے ہیں اور بات بھی
صحیح تھی، بچے تو دور کی بات میرے والد محترم کو بھی
ہمت نہ ہوئی نظریں اٹھا کر ان سے بات کرنے کی۔
والد صاحب تو تایا جی کی بات کہنے سے پہلے ہی آمنا
صدقنا کہہ چکے ہوتے۔

"ساجدہ اور رفعت کو اس بار دو سو عیدی منی آرڈر کر
دینا۔" تایا جی ہمارے گھر میں برآمدے کے موڑھے پر
بیٹھے میرے ابا جی کو احکامات دے رہے ہوتے۔

"جی بھائی جان!" ابا جی ایک مؤدب نیاز مند کی
طرح سر جھکائے بیٹھے ہوتے۔

"آڑھت سے کہنا چاول کی بوریاں میرے گھر سے لے
کر آسیہ کے گھر۔۔۔ دے آئے۔"

"جی بھائی جان!"

"عفت کے بارے۔۔۔۔"

"جی بھائی جی!"

"کیا جی بھائی جی کیا کہا ہے میں نے؟" وہ غصے سے
گرجے۔ وہ ابا جی کی بے دھیانی پر غصے سے کھول اٹھے۔

"میں یہ پوچھ رہا ہوں عفت کے بارے میں تم نے
کیا سوچا ہے؟" تایا جی نے کچھ دھیمے پڑتے ہوئے پوچھا۔

"آپ بڑے ہیں جو آپ کہیں گے ویسا ہی ہوگا میں
نے کیا سوچنا ہے۔"

مجھے ابا جی نے دوسرے کاموں کے علاوہ سوچنے کا
کام بھی تایا جی کے سپرد کر رکھا تھا۔ اب میں آپ کو کیا
بتاؤں۔ میرے ابا جی کے علاوہ میرے دو اور چچا دونوں
پھوپھیاں اور ان کے بچے ہم سب تایا جی کے آگے
کچھ بولنے کی تاب نہیں رکھتے تھے۔ وہ ایک طرح
سے ہمارے نگران تھے اور ہم سب ان کی رعایا اور
اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے ابا جی اور باقی بھائی بہن
چھوٹے چھوٹے تھے جب ان کے سر سے والد کا سایہ
اٹھ گیا۔ اور پھر ساری ذمہ داری میرے تایا جی نے
سنبھال لی۔ دادا جی کی دکان اور دادا جی کے بچے سب
کے وہ نگران بن گئے۔

بہن بھائیوں کی تعلیم ان کی شادیاں ان کے بچوں
کی تعلیم ان کی شادیاں سب کی فکر تایا جی کے کندھوں
پر آگئی جسے وہ بڑی خوش اسلوبی اور جابرانہ اصولوں کے
تحت نبھا رہے تھے اور کسی بہن بھائی یا ان کے بچوں کی
مجال نہ تھی کہ ان سے اختلاف کر سکے۔

پھوپھیاں تو بیاہ کر دوسرے شہروں میں چلی گئیں
اور دونوں چچاؤں میں ایک سعودی عرب ملازمت کی
وجہ سے مقیم تھے اور دوسرے اسی شہر میں تھے لیکن
سرکاری رہائش گاہ کی وجہ سے ان کا گھر ہمارے آبائی
گھر سے دور تھا۔ رہ گئی ہماری فیملی تو ہمارا گھر اور تایا جی
کے گھر میں بس ایک گلی کا فاصلہ تھا۔ ویسے تو تایا جی تو
اپنے تمام بہن بھائیوں کے حالات و واقعات بلکہ بچوں
کی تعداد اور ان کی کلاس، ان کی پڑھائی میں دل چسپی یا
غفلت، لڑکیوں کے رشتے کی فکر تمام طرح سے مکمل
واقفیت تھی۔ لیکن ہمارا گھرانہ چونکہ زمینی فاصلے کے
لحاظ سے ان کے سب سے زیادہ زیر نظر تھا اس لیے ان
کے آمرانہ رویے کی زد میں بھی زیادہ تھا۔

میں جیسے جیسے بڑا ہو رہا تھا میرے اندر تایا جی کے
خلاف بغاوت اور غصے کے جذبات ابھرنا شروع ہو گئے
ہماری زندگی کا بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا
فیصلہ تایا جی کے مشورے اور مرضی کے بغیر نہیں ہو
سکتا تھا۔

مجھ سے بڑی دو بہنیں زاہدہ باجی اور آسیہ باجی ان
کی شادیاں تایا جی کی مرہون منت تھیں۔ تایا جی نے
ان کے رشتے تلاش کیے تایا جی نے لڑکوں کے بارے
میں چھان پھٹک کی۔ تایا جی نے حق مہر تجویز کیا۔ غرض
ان کی شادی کے تمام بیرونی اور قانونی معاملات کے ذمہ
دار تایا جی تھے اور میرے ابا جی اور ان کی دوسرے بہت
سے احسانات کے علاوہ اس احسان کے بھی زیر بار ہو
چکے تھے۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے ان کی اپنے گھر میں
حد درجہ مداخلت بہت بے چین کرتی تھی۔ یعنی کہ
ہماری کوئی مرضی نہیں جو کریں تایا جی کریں۔ میں بھی
کبھار جز کر ان سے الجھ پڑتا۔

"بیٹا وہ ہمارے بڑے ہیں۔" امی مجھے پیار سے
سمجھاتیں۔

"بڑے ہونے کا یہ مطلب ہے کہ چھوٹوں پر ہر
وقت حکم چلاتے رہو۔"

"وہ کوئی غلط بات تو نہیں کرتے ہماری بھلائی کے
کام ہی کرتے ہیں۔"

"ایسی کوئی بھلائی ولائی نہیں کرتے انہیں صرف حکم
چلانے میں مزہ آتا ہے۔ بس سب لوگ ان کے آگے
ہاتھ باندھے کھڑے رہیں اور ان کا حکم بجا لاتے رہیں۔"
میں بڑے جلے ہوئے دل کے ساتھ امی سے بحث کر
رہا تھا اور میری کڑھن اور جلن بھی جائز تھی۔ میں
نے ایف اے کے امتحانات سے فارغ ہوا تھا لیکن
پھر دوست تھے اور میں تھا۔ فلموں کا بھی نیا نیا چسکا لگ
چکا تھا۔ ہیرو جیسے بننے کے چکروں میں کپڑے جوتے اور ہیئر
اسٹائل بھی ویسا ہی بنانے لگا۔ قلمیں لمبی اور بال ذرا
گردن کو چھونے لگے تو شامت اعمال تایا جی کی نظر
میں آگیا۔ میں گھر سے نکل رہا تھا اور وہ ہمارے گھر میں
داخل ہو رہے تھے۔ وہ ٹھٹک کر رک گئے۔

"یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے؟" انہوں نے
مجھے سر سے پاؤں تک مکمل گھورا۔

"جی کیا ہوا؟" میں نے انجان بنتے ہوئے اپنے
بازوؤں کو دیکھا۔

"جی کے بچے یہ کیا میراثیوں والا حلیہ بنا رکھا ہے؟
وہ کٹنگ کروالے۔"

"نہیں تو تایا جی!"

"نہیں تو تایا جی۔۔۔ یہ کھلا گریبان لمبی زلفیں یہ
تنگ پینٹ تم کسی تھیٹر میں کام کرنے لگے ہو۔" وہ
طنزیہ انداز میں گویا ہوئے۔

"وہ تایا جی۔۔۔ امتحانات کی وجہ سے فرصت نہیں
ملی بال کٹوانے کی۔" میں نے اپنی دانست میں بڑا اچھا
بہانہ گھڑا تھا جو الٹا انہی پر پڑ گیا۔

"اب تو امتحانات سے فارغ ہو گئے ہو نا؟"

"جی۔"

"تو چلو میں خود تمہاری حجامت بنوا کر لاتا ہوں۔"
وہ میرا ہاتھ پکڑ کر دروازے سے باہر لے آئے۔

"نہیں تایا جی میں خود کروا لوں گا پلیز تایا جی سنئے"
لیکن انہوں نے میری ایک نہ سنی اور مجھے عاشق
ہیر کٹنگ سیلون لے جا کر میرے بالوں کی وہ درگت بنائی
کہ بس ٹنڈ ہوتے ہوتے بچی۔

اور پھر پورا ہفتہ میں اپنی حسین زلفوں کی یاد میں
راتوں کو تکیے میں منہ دے کر روتا رہا اور تایا جی کو کوستا
رہا۔

☆ ☆ ☆

میں بظاہر اپنے کمرے میں بیٹھا کورس کی کتابیں
کھنگال رہا تھا لیکن میری ساری توجہ برآمدے میں
ہونے والی گفتگو میں اٹکی ہوئی تھی۔

"دیکھو بھئی شکور! ساجدہ نے مجھ سے خود بات کی
ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ آپ بڑے ہیں اگر مناسب
سمجھیں تو آگے بات چلائیں۔" مجھے یوں لگتا تھا کہ
تایا جی اپنے بڑے ہونے کو بڑے فخریہ انداز سے بیان
کرتے ہیں۔

"مجھے تو اس بات میں کوئی حرج نظر نہیں آتا۔
کیوں بھئی ثریا؟" اب انہوں نے امی کو مخاطب کیا
جن کے چہرے پر کچھ پریشانی در آئی تھی۔

"حرج تو کوئی نہیں لیکن بھائی جی میری عفت بی
اے کر رہی ہے اور مشتاق نے تو میٹرک بھی نہیں
مکمل کیا جو ذرا پڑھ۔۔۔۔" امی جھجک کر رہ گئیں۔

"یہ تو لڑکوں کی شکل و صورت یا تعلیم نہیں
بلکہ ان کی شرافت اور نوکری دیکھی جاتی ہے۔ اور پھر
مشتاق تو اپنے خاندان کا بچہ ہے نیک شریف ہے پان
سگریٹ کی عادت نہیں اس کو اور پھر جلدی پکی کر دیا

ہے ان کا کیوں شکوہ؟" اتنی لمبی تقریر کے بعد انہوں نے ابا جی کی طرف دیکھا۔

"زینت اور آسیہ کی شادیاں بھی آپ نے کی ہیں اور عفت بھی آپ ہی کی بیٹی ہے۔ آپ مناسب سمجھتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" ابا جی نے تو بات ہی ختم کر دی۔

"چلو پھر ٹھیک ہے ساجدہ کو تمہاری طرف سے ہاں کا جواب دے دوں گا پھر تم دونوں مل کر کوئی چھوٹی موٹی رسم کر لینا۔" تایا جی امی کی طرف دیکھ کر بولے۔

تایا جی کے دو ہی بیٹے تھے جن کی عرصہ دراز پہلے وہ شادیاں کر چکے تھے اور اب خاندان کے دوسرے تمام جوان لڑکے لڑکیوں کے رشتوں کا ٹھیکہ از خود تایا جی نے اپنے سر لے لیا تھا۔ اب پھوپھی ساجدہ کے بیٹے سالو سے مشتاق کا رشتہ مجھ سے چھوٹی بہن عفت سے طے کرنے آئے تھے۔ جس کی صرف ایک ہی خوبی تھی کہ ان کا انار کلی میں جما جمایا کاروبار تھا فوراً دے گا۔

"حد ہو گئی ہے بھئی! ابا جی کی سعادت مندی کی۔" میں نے بے زاری سے کتابیں میز پر پٹخیں۔

"اور ہاں یہ آج کل آوارہ کیا کر رہا ہے۔" اور اب تایا جی کا روئے سخن میری جانب تھا۔ میں چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔

"اس نے ایم اے اکنامکس میں داخلہ لے لیا ہے۔" ابا جی یوں بولے جیسے کوئی اعتراف جرم کر لیا ہو۔

"حد ہو گئی ہے اس لڑکے کی من مرضی کی..... کیا کرے گا یہ ایم اے وی اے کر کے تمہاری طرح کسی دفتر میں بابو بن کے بھرتی ہو جائے گا۔ یہ نوکریوں میں کچھ نہیں رکھا۔ اب تم نے کیا تیر مار لیا نوکری کر کے بتاؤ بھلا۔"

میں اندر بیٹھا غصے سے بل کھا کر رہ گیا۔ مجھے یوں لگا تایا جی میرے پیارے ابا جی کی بے عزتی کر رہے ہیں۔

"اب مجھے دیکھو حمید اور لطیف کو اپنے کاروبار میں سے الگ الگ دو کانیں کر دیں۔ خود بھی ابھی تک ایک آدھ چکر دوکان کا لگا لیتا ہوں۔ پیسے کا لالچ نہیں ہے مجھے بس چاہتا ہوں کہ ہاتھ پیر چلتے رہیں۔ اور پھر اس سے اپنا اور اپنے بہن بھائیوں کا بھی کچھ آسرا ہو جاتا ہے۔"

"آپ اپنے احسانات جتائے جا رہے ہیں۔" میں نے کڑھ کر سوچا۔

لیکن تایا جی کی بات درست بھی تھی ہمارے گھر کے مالی حالات کبھی بھی اتنے اچھے نہ تھے۔ لیکن سچ بات ہے کہ ہمیں کبھی کسی چیز کی تنگی یا کم مائیگی کا بھی احساس نہ تھا۔ شاید وہ زمانہ ہی سادگی کا تھا یا شاید وہ تایا جی کی ہر موقع پر بغیر پوچھے امداد بھی جو ہمارے گھر کبھی چاولوں کی بوری کبھی گھی کے کنستر کبھی پھلوں کے ٹوکرے کی صورت میں موجود رہتی۔ بہنوں کی شادیوں پر فرنیچر اور بارات کا کھانا بھی تایا جی نے خود اپنے ذمے لے لیا تھا یہ بات بہت عرصے بعد مجھے امی جی کی زبانی معلوم ہوئی۔ لیکن تب میں نے یہی سوچا ان سب کے بدلے انہیں بے زبان ہر حکم پر جی حضور کرنے والے غلام بھی تو ملے ہوئے تھے۔

عفت کے بعد بس حمید اور انیس بچے تھے۔ انیس تو خیر سب سے چھوٹا اور مجھ سے تو چودہ سال چھوٹا بھائی تھا۔ لیکن اب مجھے دھڑکا لگا رہتا کہ کسی روز تایا جی آئیں گے اور ابا جی امی جی کو میرے لیے کوئی لڑکی تجویز کر دیں گے اور بس پھر ویسا ہو گا جو وہ چاہیں گے لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ ایک رات تایا جی تہجد کی نماز کے لیے اٹھے وضو کرنے لگے۔ لیکن وہیں نلکے کی ٹونٹی کے پاس لڑکھڑا کے گر گئے۔

بس اس کے بعد وہ غصے، رعب اور حکومت سے بھرا ہوا شخص منوں مٹی کے نیچے جا سویا۔ ابا جی باقی ان کے بہن بھائی یوں بلک بلک کر روئے گویا آج ہی یتیم ہوئے ہیں اور ان کے بعد ایسا ہوا کہ تسبیح کے دانوں کی ڈوری ٹوٹ گئی اور سارے دانے ادھر ادھر بکھر گئے۔

لیکن سچی بات ہے کہ ان کی وفات پر میں نے دل میں ایک کمینی سی خوشی محسوس کی۔ مجھے یوں لگا میرے ابا جی امی جی اور خود میں کسی جابر دیو کی قید سے آزاد ہو گئے ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے فارسی کا یہ مقولہ "سگ باش برادر خورد مباش" اکثر میرے ذہن میں آتا اور یہ سوچ کر میرا دل اطمینان سے بھر جاتا کہ میں کسی کا چھوٹا بھائی نہیں ہوں بلکہ مجھ سے چھوٹا بھائی ہے۔ لیکن میں نے ہمیشہ یہ بھی سوچا کہ میں کبھی اپنے چھوٹے بھائی پر اس طرح ظلم نہیں کروں گا جس طرح کا میرے تایا جی نے میرے ابا جی پر روا رکھا۔ ان شاءاللہ اور پھر میں نے ساری عمر ایسا ہی کیا۔

☆ ☆ ☆

اگر غور کیا جائے تو ہم اپنی زندگی میں کس چیز کو حاصل زندگی کہہ سکتے ہیں۔ یا انگریزی میں achievement کہہ سکتے ہیں۔ میرے خیال میں متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کی بنا پر ہماری زندگیوں کے دو بڑے نصب العین ہوتے ہیں۔ ایک گھر بنانا اور دوسرا بچوں کی شادیاں کرنا۔ سفید پوش لوگ ساری زندگی ان دو کاموں میں کھپا دیتے ہیں۔ اور اگر ان میں کوئی اور تخلیقی صلاحیت ہو بھی تو وہ کہیں گم ہو جاتی ہے۔ میں بھی ایک متوسط طبقے کا فرد تھا جسے ورثے میں والدین کی دعاؤں ان کی تربیت ایمان داری اور محنت کے وصف ملے تھے جن کی بدولت میں ایک ایک قدم کر کے ترقی کی سیڑھیاں چڑھتا گیا۔

ایم اے اکنامکس کے بعد کالج میں لیکچر شپ کی پھر کسی کے مشورے پر مقابلے کا امتحان دیا۔ پھر آہستہ آہستہ سول سروس میں آ گیا۔ پھر اس میں اپنی زندگی کے پچیس سال لگا دیے اور حصول زندگی کیا ملا۔ ایمان داری اور محنت کے بل بوتے پر اتنا ہوا کہ اب لاہور کے ایک اچھے علاقے میں میرا ذاتی گھر ہے۔ اور دوسرا بڑا کام شادی کے بعد اللہ تعالیٰ نے جو بیٹے اور بیٹی کی نعمت سے نوازا تھا میں بخیر و خوبی ان کی شادیاں کر چکا ہوں۔

اور اب ریٹائرمنٹ کی بے کیف، بے رنگ زندگی گزار رہا ہوں۔ مجھے ریٹائر ہوئے چار سال ہو گئے ہیں۔ پہلے سال تو ریٹائر ہونے کے نقصانات اور فوائد کو سمجھنے میں لگ گیا۔ سب سے بڑا نقصان تو مہینے کے آخر میں ملنے والی وہ رقم تھی جو یک لخت بند ہو گئی۔ اب پنشن کے نام پر ملنے والی معمولی سی رقم میں اتنی جان بھی نہ ہوتی کہ میں یوٹیلٹی کے بل ہی ادا کر سکتا۔ دوسرا بڑا نقصان وہ بندھی ٹکی روٹین تھی جس سے میرے اندر چابی بھری رہتی ہر روز تیار ہو کر چاق و چوبند انداز میں سارا دن کام کرنے کا اپنا ہی لطف اور چارم تھا۔ یہ سلسلہ رک جانے سے طبیعت میں عجیب سی بیزاری اور سستی چھا گئی۔ کہاں وہ روز چھ بجے اٹھ کر شیو کرنا نہانا دھونا پینٹ کوٹ کسنا بریف کیس پکڑنا اور کہاں یہ کہ اٹھ تو چھ بجے ہی گئے لیکن اب شیو بنانا اور تیار ہونا بے معنی دارد۔ بقول ناصر کاظمی۔

ع نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں
اور بال بناؤں کس کے لیے

پھر دل نے سمجھایا کہ اگر یونہی یہی صورت حال رہی تو وہ دن دور نہیں جب دنیا ہی سے ریٹائرمنٹ کا بلاوا آ جائے گا۔ تو اب جو ہے اسی میں خوشی اور دل چسپی تلاش کرو۔ پھر دل نے ریٹائرمنٹ کے فوائد پر غور کرنے کا مشورہ دیا پہلے جب ساری دنیا نیند کے مزے لوٹ رہی ہوتی تھی تو ہم تھے کہ منہ اندھیرے اٹھ کر رزق کی تلاش میں خاک چھانتے تھے اب کم از کم اس صبح بیداری سے تو جان چھوٹ گئی۔ (وہ الگ بات تھی کہ برس ہا برس صبح اٹھنے کی ایسی عادت پڑ چکی تھی کہ اب بقول شاعر "چھٹتی نہیں منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔" جب دل چاہا اٹھو دل چاہا نہ اٹھو۔ پرانے دوستوں کے ساتھ پھر سے تعلقات استوار کیے گئے۔ کلب کی ممبر شپ بنوائی لائبریری کارڈ ایشو کروایا۔ باقاعدگی سے دل و دماغ کو طراوت پہنچانے کے گر آزمائے گئے۔ گھر کی مرمت کے غیر دلچسپ کاموں میں خود کو مصروف کیا۔ باتھ روموں کے نلکے، کچن کے کیبنٹ ٹھیک کروائے۔ اکھڑے ہوئے پلستر اور بیرونی مین گیٹ پینٹ کروایا۔ دنیا میں کیا کچھ کیا کرتے ہیں۔

دو سال ایسے ہی کاموں میں کھپا دیے جن کو کرنا ہمیشہ سے میری بیوی کا دل پسند مشغلہ اور میرا انتہائی ناپسندیدہ کام تھا۔ تیسرے سال سوچا چلو اب پھر دو

اور اللہ کی طرف بھی رجوع کیا جائے یہاں بھی صرف اسی نکتہ نظر کو سامنے رکھا گیا کہ اب فارغ ہیں تو کیوں نہ دین کا اکھڑا ہوا پلستر بھی دوبارہ مرمت کر لیا جائے۔ تو اسی مقصد کے تحت میں اور میری بیوی حج کرنے چلے گئے۔ حج کے علاوہ مقصود اپنی بیٹی سے ملاقات بھی تھی۔ چنانچہ حج بھی کیا اور دو ماہ جدہ میں بیٹی کے پاس گزارے۔ واپسی پر سامان میں جہاں احباب کے لیے کھجوریں، تسبیح، جائے نماز اور آب زم زم تھا وہاں احباب کو چونکانے کے لیے میرے چہرے پر داڑھی بھی تھی۔ حج کرنے جب گیا تھا تو پیش نظر صرف فراغت اور فرض کی ادائیگی تھی لیکن جب واپس لوٹا تو احساسات کا موسم بدل چکا تھا۔ اب آخرت کو سنوارنے کی ایسی مصروفیت ہاتھ آئی تھی کہ فارغ ٹائم بھی نہ ملتا۔ اب صبح اٹھنا تو ہوتا لیکن اس لیے کہ فجر کی نماز پڑھی جائے وہ بھی مسجد میں جا کر تاکہ واک بھی ہو جائے اور ثواب بھی مل جائے۔ واپس آ کر قرآن پاک کی تلاوت معہ ترجمہ پھر نمازوں کا سلسلہ چل سو چل اور اب مجھ پر یہ راز کھلا کہ اکثر لوگ ریٹائرمنٹ کے بعد پارسا اور نمازی کیوں ہو جاتے ہیں۔

میں نماز کے بعد قرآن پاک ترجمے کے ساتھ پڑھ رہا تھا کہ بیوی کورڈلیس فون لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔

"اور تم لوگ آپس میں فضیلت کو نہ بھولا کرو۔" البقرہ میں اس آیت کی تفسیر کے ذریعے سمجھ رہا تھا کہ۔

"یہ لیں علی کا فون ہے۔" بیوی فون پکڑا کر باہر چلی گئی اور میرے ذہن میں کسی علی کی کوئی شبیہ نہ ابھر سکی۔

"ہیلو کون بول رہا ہے۔"

"السلام علیکم تایا جان! میں علی بول رہا ہوں۔" دوسری طرف سے ایک بچے کی آواز سنائی دی۔

میرے ذہن میں شناسائی کی کوند لہرائی۔ "تایا جان" اپنے لیے یہ لقب مجھے ماضی کے کن کن صحراؤں میں بگولے کی طرح اڑا لے گیا۔

"علی آ... اچھا کیسے ہو علی بیٹا؟" میں نے کچھ توقف کے بعد بھرپور انداز میں پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں تایا جان!"

"اور تمہارے پاپا کیسے ہیں۔" میں نے اپنے چھوٹے بھائی انیق کا پوچھا۔

"تایا جان ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ آپ کو یاد کر رہے تھے امی نے مجھ سے کہا کہ آپ کو فون کر کے بتا دوں۔" وہ ایک ہی سانس میں بتاتا چلا گیا۔

"کیا ہوا ہے انیق کو؟" بے اختیار ہی میرے وجود میں بے چینی کی سنسنی سی دوڑ گئی۔

"پتہ نہیں۔" وہی بچپن والی بے پروائی سے جواب دیا گیا۔

"گھر پر ہیں تمہارے پاپا۔"

"جی گھر پر ہیں لیکن سو رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے میں آج آؤں گا بیٹے اپنی امی اور پاپا کو بتا دینا۔"

انیق میرا چھوٹا بھائی مجھے بہت عزیز ہے۔ اس میں اور مجھ میں چودہ سال کا فرق تھا۔ جب وہ پیدا ہوا تو میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ چار بہنوں میں رہتے ہوئے مجھے انیق کی آمد سے خوشی ہوئی۔ وہ میرے لیے بھائی سے زیادہ میرا کھلونا تھا جس سے میں خوب کھیلتا کبھی کندھوں پر بٹھا کر بازار کی سیر کروانے لے جاتا۔ کبھی اس سے جھوٹ موٹ کی کشتیاں لڑتا۔ کبھی اس کو سائیکل چلانا سکھاتا اور کبھی باغ میں لے جا کر اسے فٹ بال کھلاتا۔ وہ مجھ سے اتنا چھوٹا تھا کہ ہم دونوں کے مابین کبھی لڑائی یا ناراضی کی نوبت ہی نہ آئی تھی اور ویسے بھی اکلوتا بھائی ہونے کی وجہ سے اور چھوٹا ہونے کی وجہ سے میں نے انیق کے ساتھ ہمیشہ شفقت اور محبت کا برتاؤ ہی رکھا دوسرا اپنے تایا جی کے تحکمانہ رویے کی وجہ سے جسے میں سخت ناپسند کرتا تھا میں نے سوچ رکھا تھا کہ میں کبھی انیق کی زندگی میں بے جا دخل اندازی نہیں کروں گا اور میں نے اپنا کہا پورا کر دکھایا یہ الگ بات ہے کہ سول سروس کی ملازمت نے مجھے اتنا مصروف اور بدل دیا کہ میں حد سے زیادہ اپنے

رشتہ داروں سے لاتعلق ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

انیق کے گھر گاڑی روک کر میں مین گیٹ کی طرف گیا تو ایک بیزار سی شکل والی ماسی افق پر نگاہیں جمائے فرش دھونے میں مصروف تھی۔ اس کا یہ انداز صفائی غصہ دلانے کو کافی تھا۔ کیونکہ اس طرح فرش دھونے سے میرے سفید کڑک شلوار قمیص پر چھینٹے پڑ چکے تھے۔ اور راز کی بات بتاؤں ریٹائرمنٹ کے بعد ملازمین کی حرکات و سکنات پر غور کرنے کو بھی کافی ٹائم مل جاتا ہے۔

میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے رکنے کو کہا اور چھوٹے گیٹ سے سر جھکا کر اندر داخل ہو گیا انیق کا گھر لاہور کی ایک سادہ سی صاف ستھری کالونی میں واقع ہے۔ دس مرلے کا یہ گھر جب وہ تعمیر کر رہا تھا تو ان ہی دنوں میں، ہم سب بھائی بہنوں نے اپنا آبائی گھر جو کے کرشن نگر میں تھا فروخت کیا۔ بہنوں کے حصے دینے کے بعد میرے اور انیق کے حصے جو آیا وہ اس قدر کم تھا کہ میں نے [illegible] کے پیش نظر اپنا حصہ انیق کو ہی ہبہ کر دیا۔

مرکزی دروازہ کھلا تھا میں اندر داخل ہو گیا۔ لاؤنج میں عجیب سی ویرانی اور خاموشی سی تھی۔ میں بلاوجہ ہی کھنکھارا۔ آواز سن کر کچن سے میری بھابھی عاتکہ برآمد ہوئی۔

"السلام علیکم بھائی جان!" وہ دوپٹہ صحیح کرتے ہوئے میرے قریب آگئی۔

"وعلیکم السلام۔" میں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"کیا حال ہے تمہارا۔" میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

"میں تو ٹھیک ہوں بس آپ کے بھائی نے ہی پریشان کیا ہوا ہے۔" عاتکہ انگلیاں چٹخاتی ہوئی پریشان سی میرے سامنے والے صوفے پر آ بیٹھی۔

"کیا ہوا ہے انیق کو؟"

"رات کو سینے میں درد ہوا پہلے تو بتایا نہیں جیسے درد بڑھ گیا تو مجھے اٹھایا۔ میں نے ہمسائے کے لڑکے کو لے کر گاڑی میں بٹھایا ہسپتال لے کر گئے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ انہیں انجائنا کا درد ہوا تھا۔"

انیق بمشکل پچاس برس کا تھا۔ اسے اس تکلیف میں مبتلا ہونے کا سوچ کر ہی مجھے جھرجھری آگئی۔

"ہمسائے کو لے جانے کے بجائے تمہیں مجھے فون کرنا چاہیے تھا۔" میرے لہجے میں خود بخود درشتی در آئی۔

"آپ کا گھر اتنا دور ہے اور پھر ویسے بھی انیق نے منع کر دیا کہ بلاوجہ بھائی جان پریشان ہوں گے۔"

"اب کیسی طبیعت ہے اس کی؟" میں نے کچھ دھیما پڑتے ہوئے پوچھا۔

"ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ معمولی اٹیک تھا ویسے اس نے دوائیاں اور ٹیسٹ لکھ دیے ہیں۔ ابھی سو رہے ہیں۔"

"کیا بات ہے عاتکہ! کوئی پریشانی ہے انیق کو؟"

"میں نے آپ کو چائے تو پوچھی ہی نہیں آپ بیٹھیں میں چائے لاتی ہوں۔" عاتکہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی جیسے مجھے کچھ بتانا نہ چاہتی ہو۔

مجھے اپنے اوپر عجیب سی ندامت محسوس ہونے لگی میرا اپنا چھوٹا بھائی جو مجھے بہت عزیز تھا اس کے بارے میں میں نہیں جانتا تک نہ تھا کہ اسے کوئی پریشانی ہے اور اگر ہے تو کیا ہے اور ایک میرے تایا جی تھے جو ہمارے گھر کی ہر پریشانی ہر مسئلہ ہر تکلیف کو بغیر بتائے بغیر کہے جان جاتے تھے۔ مجھے بلاوجہ ہی تایا جی یاد آنے لگے۔

مجھے بیٹھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ سامنے والے کمرے سے ہیڈ فون لگائے علی صاحب نمودار ہوئے مجھے دیکھ کر اس نے ہیڈ فون کانوں سے اتار کر گلے میں لٹکا لیا۔

"السلام علیکم تایا جان۔" وہ سلام کر کے بے نیازی سے چیونگم چباتا میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

علی کو میں کافی عرصے کے بعد دیکھ رہا تھا۔ وہ بارہ تیرہ سال کا لڑکا تھا۔ چہرے پر وہی بچپن والی معصومیت کے

ساتھ ساتھ آکورین بھی نمایاں تھا۔

"اسکول کیسا جا رہا ہے تمہارا؟" میں نے بات شروع کرنے کی غرض سے سوال کیا۔

"ٹھیک جا رہا ہے۔" وہی بے اعتنائی والا انداز۔

"کون سی کلاس میں ہو؟"

"میں 4th میں ہوں۔"

"آج چھٹی تھی اسکول سے؟" میں اسے آج گھر پر دیکھ کر حیران تھا۔

"نہیں چھٹی تو نہیں تھی میں نے آج چھٹی کی ہے اسکول سے۔"

"کیوں کی ہے چھٹی؟" میں سمجھا اپنے باپ کی بیماری کے باعث اسکول نہیں گیا ہوگا لیکن یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔

"میرا آج میچ تھا گلی کے بچوں کے ساتھ کرکٹ کا اس لیے چھٹی کی ہے۔" اس نے بڑی بے خوفی سے اصل وجہ بتادی جیسے کہ اس مقصد کے لیے چھٹی کرنا کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔

علی کی باتوں میں مجھے بگڑے ہوئے ضدی بچوں والے تمام جراثیم نظر آگئے۔ پہلے میں نے نصیحت کے لیے منہ کھولا لیکن پھر میں خاموش ہوگیا کیونکہ مجھے لگا کہ ایسا کرنا اسے مجھ سے متنفر کر سکتا ہے۔

"اچھا باجیاں کہاں ہیں تمہاری؟" میں یہ تو جانتا تھا کہ انیق کی تین بیٹیاں ہیں اور پھر یہ علی صاحب تھے لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی بیٹیاں کتنی بڑی ہو گئی ہیں اور کون سی کلاس میں ہیں۔

"اقصیٰ باجی تو اسکول گئی ہیں۔"

"کون سی کلاس میں پڑھتی ہیں اقصیٰ باجی؟"

"وہ اسکول میں پڑھتی نہیں پڑھاتی ہیں۔" علی میری ناقص معلومات پر ہنس کر بولا۔

یہ انکشاف میرے لیے حیران کن تھا۔

"اچھا اور باقی دونوں؟"

"عائزہ باجی میڈیکل کے سیکنڈ ایئر میں ہیں اور عظمیٰ باجی ایف ایس سی میں ہیں۔"

اسی لمحے عاتکہ چائے کی ٹرے اور کچھ لوازمات لے کر کچن سے لاؤنج میں داخل ہوئی۔ چائے میرے سامنے میز پر رکھ کر خاموشی سے کپوں میں ڈالنے لگی۔ عاتکہ کے پورے وجود پر خاموشی اور فکر مندی کی چادر سی تنی تھی۔ "بچیاں کب آتی ہیں گھر میں؟" میں نے چائے کا کپ پکڑتے ہوئے عاتکہ سے پوچھا۔

"تین بجے تک آجاتی ہیں۔" اس نے کباب کی پلیٹ میرے آگے کرتے ہوئے جواب دیا۔

"اقصیٰ نے کب سے اسکول میں پڑھانا شروع کیا ہے۔" میں نے علی کی دی ہوئی معلومات سے فائدہ اٹھایا۔

"بس ایم اے کرنے کے بعد فارغ تھی تو اسکول میں جاب کرلی میں نے اور انیق نے بھی اجازت دے دی کہ چلو مصروف رہے گی۔"

"نہیں رشتہ وشتہ نہیں کیا اس کا۔" اپنے اس سوال پر ایک لمحے کو میں خود بھی حیرت زدہ رہ گیا۔ مجھے اپنے اندر میں ابا جی کی بازگشت سنائی دی۔

عاتکہ کچھ لمحے کو خاموش رہی جیسے سوچ رہی ہو کہ بتاؤں یا نہ بتاؤں پھر بولی۔ "پچھلے سال عفت باجی نے اپنے سہیل کے لیے بات تو شروع کی تھی [illegible]"

"پھر کیا؟" میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے عاتکہ سے پوچھا۔

"پھر جب سے انیق کی جاب ختم ہوئی ہے انہوں نے بات ہی نہیں چھیڑی۔" عاتکہ کی اس اطلاع سے یک لخت میرے ہاتھ میں کپ لڑکھڑا گیا چائے کے گرم گھونٹ نے صرف میری زبان کو نہیں جلایا بلکہ میرا اندر وجود سلگ سا اٹھا۔

"انیق کی جاب ختم ہوگئی۔" میں نے حیرت زدہ لہجے میں عاتکہ سے پوچھا۔ میں اپنے بھائی کے حالات سے اس قدر بے خبر تھا۔

"کب؟ کیسے؟" میں نے بے تابی سے عاتکہ سے پوچھا۔

"پچھلے سال۔"

"اتنا عرصہ ہوگیا اس بات کو اور تم مجھے آج بتا رہی ہو۔" "آپ اور بھابھی حج پر گئے ہوئے تھے۔ پھر جب

آپ آگئے تو انیق کہنے لگے کہ خواہ مخواہ آپ پریشان ہوں گے۔" عاتکہ دھیمے سے انداز میں بولی۔

میرے پاس اب خاموش ہوجانے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔ انیق نے اپنی ہر مشکل ہر تکلیف صرف مجھے پریشان نہ کرنے کی غرض سے چھپائی۔ اور میں اس کے حالات اس کی زندگی کے معاملات سے اس لیے دور رہا کہ کسی بے جا اخراجات کا مرتکب نہ ہو جاؤں۔ لیکن ان دونوں رویوں کی وجہ سے ہوا کیا کہ آج ہم دونوں بھائیوں میں اتنی دوری آچکی تھی کہ میں انیق کی زندگی میں آنے والے اتنے بڑے حادثوں سے بھی آگاہ نہیں تھا حالانکہ آج کل دنیا گلوبل ویلج بن چکی ہے۔ نہیں دنیا کے دوسرے کونے میں ہونے والے حادثے کی خبر تو چند سیکنڈ میں مل جاتی ہے۔ لیکن اپنوں کے ساتھ کیا ہوا یہ سب کچھ سرد رویوں کی نذر ہو کر کسی سرد خانے میں پڑا رہ جاتا ہے اور ایک وہ میرے ابا جی کا زمانہ تھا جب ذرائع ابلاغ نے اتنی ترقی بھی نہ کی تھی۔ لے دے کر ڈاک کا نظام تھا یا کسی کسی کے پاس ٹیلی فون کی سہولت موجود تھی لیکن اتنے محدود ذرائع کے باوجود ابا جی اپنے بہن بھائیوں رشتہ داروں کے پل پل کی خبر رکھتے تھے۔ ہر غمی خوشی کے موقع پر سب سے پہلے پہنچ جاتے۔ بہن بھائی کے کسی بھی مسئلے میں اپنی خدمات سے لیس ہو کر حاضر خدمت۔

پھر ابا جی کی یادوں نے میرے وجود پر یلغار کردی۔

"کیسے ختم ہوئی ہے انیق کی جاب؟" میں نے ان یادوں سے دامن چھڑا کے عاتکہ سے پوچھا۔

"بینک کی نئی انتظامیہ آئی تو انہوں نے ملازمین کی چھانٹی کردی اور ملازمت سے فارغ ہونے والے لوگوں کے ساتھ گولڈن ہینڈ شیک کرلیا۔"

"چلو پھر تو انیق کو فائدہ ہوا ہوگا۔" میرے لہجے میں اطمینان در آیا۔

"جی پچیس لاکھ ملے تھے۔" عاتکہ نے میرے پوچھے بغیر ہی بتادیا۔

"تو پھر کوئی بزنس شروع کردیتا۔"

"ان کو تو کوئی تجربہ نہیں بزنس کا ایک دو بار پارٹنر

شپ کی اور دھوکہ کھایا۔ پیسے بھی برباد ہوئے اور پریشانی الگ۔"

"ارے تو میرے پاس آتا میں کیا سال بھر حج کے لیے چلا گیا تھا۔ مشورہ کرتا میں اسے اچھے لوگوں سے ملاتا اپنے تعلقات ہیں میرے بہت سے ملنے ملانے والے بزنس کرتے ہیں۔" اب مجھے انیق پر سچ مچ غصہ آنے لگا۔

"جی اسی وجہ سے انیق نے آپ کو نہیں بتایا۔" عاتکہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔

"اس وجہ سے؟" میں نے حیرانی سے عاتکہ کی جانب دیکھا۔

"آپ برا نہ مانیے گا در اصل آپ کا ملنا ملانا آپ کے تعلقات سب آپ کی حیثیت اور رتبے کے تھے۔ انیق کو ہمیشہ یہ احساس رہا کہ ہم جیسے کم حیثیت والے لوگ آپ کے معیار کے نہیں ہیں اسی لیے آپ ہم لوگوں سے ملنا جلنا زیادہ پسند نہیں کرتے۔" عاتکہ کا یہ انکشاف ایک بم کی طرح میرے سر پہ پھٹا۔

"تو انیق یہ سوچتا ہے میرے بارے میں اور میں نے کیا سوچ کر اپنے آپ کو بہن بھائیوں سے دور رکھا اور وہ میرے بارے میں غلط فہمی کا شکار رہے۔ یہ کیسی عجیب سی صورت حال تھی جو میرے پیش نظر تھی۔ اب اگر میں وضاحت کے لیے لاکھ تاویلیں پیش کرتا تو انہیں ماننا انیق اور عاتکہ کے لیے مشکل تھا۔ میرے ماہ و سال کے رویے اور چلن نے انہیں مجھ سے دور کرنے کے ساتھ ساتھ متنفر بھی کر دیا تھا۔ اب وہ کیسے مان یا جان سکتے تھے کہ میں نے کیوں اپنے آپ کو ان سے فاصلے پہ رکھا۔ اور اب مجھے اس آیت کی تفسیر کہ "آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ فیاضی کا رویہ اختیار کرو" بڑی آسانی اور دل میں اتر جانے کی حد تک سمجھ میں آ چکی تھی۔

اور بار بار جگہ جگہ قرآن پاک میں رشتہ داروں سے حسن سلوک کی ہدایت کی وجہ بھی سمجھ میں آ رہی تھی۔ میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر خاموش ہو گیا کہ اب باتوں سے نہیں عمل سے ثابت کرنے کا وقت تھا۔ اسی وقت علی نے آ کر اطلاع دی۔

"ممی پاپا اٹھ گئے ہیں۔" میں عاتکہ کی رہنمائی میں کمرے میں داخل ہوا انیق بستر پہ چادر اوڑھے لیٹا تھا اس کو دیکھ کر میرے دل کو بہت دھچکا لگا۔ یہ وہی گول مٹول انیق تھا جو کبھی میرے کندھوں پہ چڑھا رہتا تھا۔ آج پچکے ہوئے گال۔ آنکھوں میں پڑے ہوئے حلقے والے مریض کی صورت میں میرے سامنے بیٹھا تھا اس نے مجھے دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کی میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا اور اس کے بستر پر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ میں نے محبت سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

"یہ کیا حالت بنائی ہوئی ہے تم نے نکو۔" میں بچپن میں انیق کو پیار سے کبھی کبھی نکو کہا کرتا ہے۔ جس سے وہ بہت چڑتا تھا۔

"بس بھائی جان اب کیا کہوں۔" وہ نقاہت سے مسکرا کر بولا۔

"تم جیسے جوان اگر بستر پہ پڑ جائیں گے تو میرے جیسے ریٹائر بڈھے کا کیا بنے گا۔" میں نے لہجے میں بشاشت پیدا کر کے کہا۔

میری بات کے جواب میں انیق نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

"ٹیسٹ وغیرہ کب کروانے ہیں انیق کے؟" میں نے عاتکہ سے پوچھا۔

"ڈاکٹر نے کل کا ٹائم دیا ہے۔"

"جاؤ اس کی فائل لے کر آؤ۔ میرا ایک دوست ہارٹ اسپیشلسٹ ہے۔ میں انیق کو اسے دکھاتا ہوں۔" عاتکہ فوراً فائل لینے چلی گئی۔

"انیق اپنے آپ کو مضبوط کرو زندگی میں مشکلات تو سب کو پیش آتی ہیں۔ لیکن یوں ہمت نہیں ہارتے۔ دل چھوٹا نہیں کرتے۔ اب ہمارے ابا جی کی زندگی کی مثال لو۔ بچپن میں یتیم ہو گئے۔ اتنے بڑے کنبے کو نامساعد حالات میں سنبھالا بچوں کی تعلیم بیٹیوں کی شادیاں سب کچھ سے انہیں بھی گزرنا پڑا لیکن۔۔۔"

"وہ اس لیے بھائی جان! کیونکہ وہ اکیلے نہیں تھے ان کے ساتھ ان کے بھائی کی سپورٹ تھی۔ مشکلات کے ساتھ ساتھ مجھے اکیلے پن کے احساس نے توڑ دیا ہے۔" انیق کا گلہ اس کی زبان پر آ ہی گیا۔

میں کچھ دیر خاموش رہا۔

"ٹھیک ہے تمہارا شکوہ بجا۔ لیکن اگر میں تم سے دور رہا تو تم نے کبھی مجھے میرے رویے کا احساس کیوں نہیں دلایا۔ تم کیوں نہیں میرے قریب آئے۔" انیق نے سر جھکا لیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

"ارے ارے جوان آدمی روتے نہیں اگر تم روؤ گے تو مجھ داڑھی والے بڈھے کو بھی رونا آ جائے گا اور نہ جانے کیوں یہ کہتے ہوئے میری آواز بھی رندھ گئی۔ تبھی عاتکہ فائل لے کر آ گئی ہم دونوں نے بمشکل بھیگی آنکھیں اس سے چھپائیں "چلو بھئی عاتکہ! اس کے کپڑے بدلواؤ میں اس کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جا رہا ہوں۔"

"نہیں نہیں بھائی جان! میں کل چلا جاؤں گا آپ کو [illegible]۔"

"ابے نکو کیا تمہیں تکلیف لگی ہے جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" میرے لہجے میں خود بخود تایا جی والا جلال در آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

میں اور انیق گاڑی میں بیٹھے ڈاکٹر کی طرف جا رہے تھے۔ انیق نقاہت کے باوجود اپنی جاب کے چھوٹ جانے کی تفصیل علی کی خودسری۔ بزنس میں دھوکے بچیوں کی شادیاں اور نہ جانے کن کن موضوعات پر بات کر رہا تھا۔ میں گاڑی چلاتے ہوئے اس کی باتیں بھی سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ تایا جی کی روح میری اس تبدیلی پر یقیناً" مسکرا رہی ہو گی۔ اور آج مجھے اسلام میں میانہ روی کا اصول بھی سمجھ میں آیا۔ تایا جی اگر ایک انتہا پر مجھے محسوس ہوتے تھے تو میں ان کی ضد میں بالکل ہی دوسری انتہا پر جا کھڑا ہوا تھا۔

لیکن آج مجھے احساس ہوا کہ میرا ایسا رویہ کتنا غلط تھا اور اس کی وجہ سے میرے اپنوں کو کتنی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ انیق مسلسل بول رہا تھا۔ یہ اس کے سینے میں دبی ہوئی بھی ہوئی باتیں تھیں جو شاید برسوں سے وہ میرے ساتھ کرنا چاہتا تھا۔ مجھے بتانا چاہتا تھا میرے ساتھ شیئر کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میرے اس بے جا اصول کہ میں کبھی اپنے چھوٹے بھائی کی زندگی میں مداخلت نہیں کروں گا کے باعث اس کے اندر ہی جمع ہوتی گئیں اور آج میری ذرا سی محبت نے اس کی باتوں کے آگے بندھے ہوئے سارے بند توڑ دیے۔

"انیق زیادہ مت بولو۔ تمہارے لیے اچھا نہیں ہے۔ میں اب آتا جاتا رہوں گا۔" اس نے تشکر اور یقین بھرے انداز سے مجھے دیکھا اور سکون سے گاڑی کی پشت کے ساتھ سر ٹیک دیا۔

اس وقت وہ مجھے وہ چھوٹا سا نکو لگا جسے بچپن میں میرے یقین دلانے پر کہ یہ مذاق ہے "اس کا چہرہ ایسے ہی تشکر اور یقین سے بھر جاتا تھا اور اب مجھے اس کا یہ یقین ہمیشہ قائم رکھنا تھا۔

☆

آمنہ مُفتی

سردیوں کی اس دھندلی صبح آتو لے کی جھاڑیوں پر کہر لوٹ رہا تھا اور بختی کبری دودھ کے ہالے ہے' سر اور کولہے پر مٹکے پگڈنڈی پر چلتی شہر کی طرف جا رہی تھی' جہاں بستے کا ملک کلیکشن سینٹر تھا۔ اوس آلودہ گھاس پر اس کے قدموں کے نشان یوں لگ رہے تھے کہ گویا کوئی سانپ مستانے کے ادھر سے نکل گیا ہو۔

بچھی نے بڑی وٹ پر کھڑے ہو کر بستی کو دھیرے میں گم ہوتے دیکھا اور پھر اپنا کٹرا اور خالی ٹوکری زمین پر رکھ کر خود بھی مرطوب گھاس پر بیٹھ گئی۔

"کتنے کانٹے چبھ گئے ہیں۔" اس نے اپنے کھردرے پڑتے ہوئے ہاتھ آنکھوں کے آگے پھیلائے۔ لمبی لمبی انگلیوں والے خوب صورت ہاتھ گلاب کے کانٹوں سے چھلنی ہو گئے تھے۔ ٹوکری میں اب بھی کتنی ہی پتیاں اور کانٹے پڑے تھے اور ایک لمبی ڈنڈی والا گلاب سب سے زیادہ سرخ سب سے زیادہ حسین۔

اس نے یہ گلاب بڑی احتیاط سے اٹھایا اور گیلی گیلی اوس کے لمبے سے ہرے پتے میں لپیٹ لیا۔ وہ تصور ہی تصور دیکھ رہی تھی کہ جب وہ یہ پھول حسین شاہ کی میز پر سجائے گی تو ان بھوری خوب صورت دل کھینچ لینے والی آنکھوں میں کتنی ممنونیت ہو گی۔

"ارے بشریٰ بی! تم کیوں اس قدر تکلیف کرتی ہو ہمارے لیے؟"

شہزادوں جیسے حسین و جمیل حسین شاہ نئے نئے فارم ہاؤس میں منتقل ہوئے تھے۔

سارے خاندان کا مرغیوں اور ڈیریوں کا کاروبار تھا۔ انار کلی سے پھیلتے پھیلتے فیروز پور روڈ اور اب ڈیفنس تک تھے ہی آؤٹ لیٹ کھل چکے تھے۔ چھوٹے دونوں بھائی روپے بنانے کی مشین تھے مگر حسین شاہ کو خدا نے نا جانے کیوں ان کے ہاں پیدا کر دیا تھا۔ بے حد مرنجان مرنج، ملین مشین اور رومانٹک سے حسین شاہ کو دیکھ کر آصف رضا میر اور "دھوپ کنارے" کے دور کا ابتدا بھی یاد آ جاتا تھا۔ نا جانے اب تک کیوں اکیلے بیٹھے تھے۔ چھوٹے بھائی کے بچے کالج میں پہنچ چکے تھے مگر یہ ابھی تک یوسف بے کارواں بنے اکیلے ہوا ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔

خدا نے حسین شاہ کو جی بھر کے حسن سے نوازا تھا۔ سوئی سوئی سی آنکھیں' بھورے بال' صندل کی کلی جیسی پیشانی جسے بس دیکھتے ہی رہنے کو جی چاہے اور آواز ایسی کہ آنکھیں بند کر کے سنتے جاؤ سنتے ہی جاؤ اور بس۔ اس کے آگے زمان و مکان کی سب وسعتیں سمٹ آئیں اور وقت کے ایک ایسے فریم آف ریفرنس میں چلے جائیں' جہاں دن اور رات کی تخصیص نہ ہو اور تھمے ہوئے وقت کے بجرے سے بیٹھے پہ حسین شاہ کی آواز کے موتی برسا کریں۔

یہ راتیں' یہ موسم' یہ ہنسنا ہنسانا
ہمیں بھول جانا' انہیں نہ بھلانا

اور بشریٰ کہیں سے گھومتی گھماتی اس فریم آف ریفرنس میں نکل آئی تھی۔ نہایت شستہ مزاج رکھنے والی بے چاری بشریٰ ایک ایسی زرخیز ماں کی اولاد تھی' جہاں

نام رکھنے کے بعد بھی چھٹے دیدوں اور دراز رہے
والی مزید پانچ بیٹیاں آن وارد ہوئی تھیں اور محض
ابا کرشن نگر کی گلیوں میں ریڑھی پر کھلے چاٹ سٹر
اور پاپڑ نمک کی چلیبیں بیچتے بیچتے آتو ہو گئے تھے مگر
دادا حضور کے بیٹے کا ورثہ کسی طرح نہ بکھرتا تھا۔
دادی کو چپکے سوچتے "کاش مونگ کے پھلے ہوں
خوب سارا ہی اور املی سونٹھ کی چٹنی ہائیں تو خالی
ماتوں سے کھا جاؤں۔"
اور ٹھنڈے پانی سے وہیں میں نمک مرچ ڈال کر روٹی
لے بیٹھتی تو پیٹ منہ سے چٹخارے بھرتی۔
غربت کو دادی پر ترس آتا اور ابا پر بھی۔ اپنی دونوں
شادی شدہ بہنوں پر بھی اور چھوٹیوں پر بھی جو
بے حد بدزبان اور جھگڑالو تھیں اور آئے دن گلی میں
جا کر گندی گندی گالیاں دیا کرتی تھیں مگر اماں پر
نہیں۔
اماں ترس کھانے والی چیز ہی نہیں تھی۔ وہ نفیس اور
ٹاؤن میں رشتے کرانے والی اماں پے ترس کھانے
والا خود ہی کسی بینائی کا شکار ہوگا۔ ریشمی سوٹ
کر کلے میں پان دبائے۔ سلیپر سرچ اتی وہ سالم
تانگے پر اکیلی جان سوار ہو کر گلبرگ ٹاؤن سے ماڈل
ٹاؤن اور ماڈل ٹاؤن سے ٹاؤن شپ اور جوہر ٹاؤن کے
بیان اشراف اہل زبان پرانے وضع دار لوگوں کے
بچیوں کے رشتے کرانے کے لیے گھوما کرتی تھی۔
لوگ جن کے ہاں آپس کی رشتے داریوں میں
... تھیں اور بے میل جوڑ والے رشتوں کے
بیچ میں فٹ نہیں بیٹھتے تھے ان کے لیے اماں کتو
کی ذات ایک نعمت غیر مترقبہ تھی جس گھر جاتی
ہاتھوں ہاتھ لی جاتی۔ یہ اور بات کہ اس کے کرائے
ہوئے رشتے ہی پروان چڑھتے تھے' ورنہ ہاں
... کے سبب اماں کتو کے دکھائے ہوئے سبز باغوں
میں گھومتے گھومتے جب حقیقت کے صحرا میں نکلتے
تو حیرت سے آنکھیں پھیلائے ورود پیٹ پیٹ
کے دور بھاگتے تھے۔ کوئی مستقل ہو کر ٹوٹ جاتی اور
رشتہ مزید آگر ختم ہو جاتا لیکن پروا کرتی تھی اماں
کتو کی ہوتی۔
نسبے نرم نرم صوفوں والے خصوصی طور پر سجائے
گئے ڈرائنگ روموں میں دھنس دھنس کر بیٹھنے کا موقع
ملتا تھا اور خاص طور پر سنواری کی مرغن غذاؤں سے پر
چائے کی ٹرالیاں چکھنے کی آزادی حاصل تھی۔ ارمان
بھرے چہروں والی لڑکیوں کے شیمپو کیے ہوئے چمکیلے
بال' ہاتھ پھیرنے کے بہانے بکھرانے کی امنگ بھی ہوتی
تھی کبھی کبھار پوری ہو جاتی۔ گھونٹنے کا شوق پورا ہو جاتا تھا۔
کہیں کہیں سے بچے ہوئے جوڑا بھی مل جایا کرتا تھا جو وہ
فوراً سلوا کر پہنتی تھی اور دادی چٹخارے لے کر رہ جاتی۔
"ہائے رانڈ! خود پہن لیا۔ کسی لڑکی کے لیے رکھ دیتی
مگر خود بوری کی بوری کیسے بچتی اگر یہ نیا جوڑا نہ
چلتی۔"
یہ اگر اس کام میں اتنا ہوتا تو ساری دنیا نہ رشتے
کرانا شروع کر دیتی؟ یہ تو ایک نشہ تھا۔ پی آر کا نشہ جن
گھروں کے دروازوں سے اس جیسی عورتیں دھتکار
دی جاتی تھیں' ان گھروں میں وہ بلائی جاتی تھی کیا یہ بات کم
تھی؟
پچھلے ہی دنوں اس نے ایک سابق وزیر اعلیٰ کے
پاگل بھانجے کا رشتہ ایک بے حد حسین اپنے ہی جیسے
غریب بلند شہر والوں کی لڑکی سے کرایا تھا۔ پہلے تو سب
بہت برا بھلا کہہ رہے تھے مگر جہیز کے عیش دیکھ کر
سب کو چپ ہو گئی۔ دادی بھی بیٹھے بیٹھے اسے
کچھ کہتی ہیں۔
"ایسی شیطان خالہ ہے۔ بیٹی ہو اس پیچھی لگو دی کا
ہی رشتہ لگا دیا۔ وہ 'پتلی ہے' تو اس کی ماں
کے کہے سے تھے 'انکار کر دی ہے ان کی بہو۔"
اماں کو بھی دکھ ہوتا اور وہ دادی کے کوسنے چپ
کر کے سن لیتی۔ رہی پیچھی تو وہ بھی خدا کی "خدائی
تقسیم" کا شکار بھی اپنے مقدر پر
compartment l ization of life"
"Wrong
کہہ کر یخت ہوتی ہیں مگر اس کے شکار لوگوں ہی کو
معلوم ہے کہ یہ سوالی کے برابر زخم کیسا دکھتا ہے اور

میں جان لے کے بھی نہیں نکلتا۔
حسین شاہ کی بھانجی اماں کتو کی کلائنٹ تھی۔ لڑکی
والے حسین شاہ کے گھرانے کا نام سن کر ایکسائٹڈ
تھے۔ بات نہیں بنتی تھی۔ حسین شاہ پہلے دو بیویوں کو
ٹھکانے لگا بیٹھے تھے اب تو آنکھوں دیکھی مکھی کون
نگلتا۔ اماں کتو نے آس لگائی کہ کب حسین شاہ اپنے
معیار سے نیچے کی طرف دیکھیں اور کب وہ ان کو
پھانسیں۔
کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ایک دن جب حسین شاہ کی بھانجی
ان کے مستقبل سے بالکل مایوس ہو چکی تھیں اور اماں
کتو انہیں بہلا رہی تھی تو خدا نے ایک انہونا خیال
زاہدہ کے دل میں ڈالا۔
"ارے اماں کتو! دفع کرو یہ رشتے وشتے۔ تم ہمیں
ایک ہاؤس کیپر تو رکھوا دو۔ تمیزدار ذرا پڑھی لکھی ہو۔
جب ہم جا رہے ہیں تو ہمیں انٹرٹین تو کر سکے حسین بھائی
سے اب کون شادی کرے گا؟"
ایک لمحے کو تو اماں کتو کا دل بڑے زور سے کانپا مگر یہ
لمحہ Do or die کا فیصلہ کرنے کا لمحہ تھا جس لمحے میں
ان کی اگلی نسل کی تاریخ لکھی جانی تھی اور وہ تھی
ایک کھاگ 'زمانہ ساز' عورت ذرا رک کر بولی۔
"اچھو زاہدہ بی بی! آپ کا میرا گھر الگ الگ تھوڑا
ہی ہے۔ اب کسی اور کی ضمانت میں کیا دوں' میری اپنی
بچی ہے نا۔ جب تک تم لوگوں کا کوئی انتظام نہیں
ہوتا۔ میں پیچھی کو بھیج دوں گی۔ ذرا اماں کو مشکل ہوگی
مگر خیر ہے۔ آخر اپنے ہی اپنوں کے کام آتے ہیں۔ اپنا
ہی گھر ہے۔ حسین شاہ بڑے بھائی کی طرح ہے۔"
لو جی آگے کوئی کیا بولے سمندر کو کوزے میں
سمیٹنا اسے کہتے ہیں۔
پیچھی کے دن پھر گئے۔ تنخواہ رسمی طور پر تو نہیں دی
جاتی تھی مگر اندر خانے اماں کتو کے پورے کنبے پر
زندگی آسان ہو گئی۔ سال کی گندم فارم ہاؤس سے مل
گئی۔ سبزیاں بھی کبھی کبھار دودھ اور مکھن اور دیسی
انڈے اور بھی۔ دادی مرتی مرتی جی اٹھی۔ انڈوں کا
خاگینہ بنا کر تر تراتے ہوئے تو ترقی اور پیچھی کا نصیبہ
کھلنے کی دعا کرتی۔
دنوں تو پیچھی کئی ایکڑ پر پھیلے اس فارم ہاؤس میں
قدرتی کی پری بھی۔ وہ ساری زندگی چند مرلے کے مکان
میں رہنے والی لڑکی' جہاں مکانوں کی بالکونیاں دوسرے
گھر سے چند فٹ کی دوری پر تھیں اور سورج کی کرنوں
تک کا گزر نہیں تھا۔ اس نے کہاں ایسی چمکتی
جھیلیں دیکھی تھیں جن میں بڑی بڑی سرخ کلغیوں
والے چید مرغ کلیجے پھلا پھلا کر باتیں دیتے تھے۔ وفادار
ملازم دودھ کی بالٹیاں کی بالٹیاں اٹھاتے چلے آتے
تھے۔ پھولوں کی دکانوں کو سپلائی کیے جانے والے
ہزاروں کٹ فلاور ایکڑوں کے حساب سے پھیلے ہوئے
تھے اور وکٹورین طرز پر سجے ہوئے مین ہاؤس کے صحن
میں بنی آبشار سے بھاپ اڑاتا پانی ترل ترل کرتا بہتا
تھا۔
گھر سے آتے ہوئے دیدار کی شکل کی شکوہ اسے چڑا
رہی تھی۔
"ہائے پیچھی! تو تو کرائی بن کر جا رہی ہے۔ وہاں
گاؤں میں خدا جانے باتھ روم بھی ہوں گے یا تم کھیت
ہی میں فارغ ہو گی۔"
اور یہاں کے ... جھجکتا ہوئے ہچکو ذرا
اور اٹالین باتھ روم تو شکوہ کے دماغ کی گرفت ہی میں نہ
آسکیں۔
پیچھی گھر کے بعد ہی نئی اور اس کے بھائی کا انتظار
شروع کر دیتی تھی۔ دونوں آتے یہ دودھ سپلائی کرتے
تھے۔
نئی بڑی خوش لڑکی تھی۔ دودھ کے پورے ناپ ناپ
کر پتیلے میں ڈالے جاتی تھی اور ساتھ ہی ساتھ گاؤں
کی ہزاروں مزے مزے کی باتیں سنا جاتی۔ گاؤں فارم
ہاؤس سے قریبا ایک سوا میل دور تھا۔
بقایا دودھ نصیلے ملک کولیکشن سینٹر جاتا جہاں
دودھ کا حساب کرنے والا لڑکا نئی کا دوست بن گیا تھا اور
اسے کیمرے والا موبائل دلانے کا پکا وعدہ کر چکا تھا۔
زندگی سکون میں تھی' پیچھی کے گھر کی طرف سے

دور تک ایکڑوں تک پھیلے کٹ فلاور روز تھے۔ تاحد نظر سرخ گلاب اور گلیڈی اولس، نرگس اور وائٹ لش فلرز کھڑکی سے خوشبو سے لدی ہوا میں آتیں اور بچھی خدائے رحمٰن کی عظمت اور مہربانی کے احساس سے گنگ ہی رہ جاتی۔ مظاہر پرست بھی شاید اسی احساس کے اسیر ہوتے ہیں۔

مگر بچھی کے اس گوشۂ تنہائی کا تو راز اور اب ہوا' جب حسین شاہ یہاں مستقل منتقل ہو گئے۔ اب اس کا یہاں رہنا تو "قطعاً" بے جواز اور معیوب ہو گیا۔ حسین شاہ کے دوست احباب ہر وقت ایک ہلڑ مچا رہتا تھا اور یہ سب دوست "شرابی کبابی اور دیگر" "ی" وغیرہ تھے۔ ایسی صورت میں بچھی کا فارم ہاؤس میں رہنا شہد کے چھتے کو پتھر مارنے کے برابر تھا۔ سات آٹھ مہینے یہاں رہ کر اب بچھی سے کرشن نگر کی گلیوں میں نہیں رہا جاتا تھا۔ تب اس نے ایک عجیب و غریب فیصلہ کیا' بنتی کے ہاں بطور پے انگ گیسٹ رہنے کا فیصلہ۔ دادی بہت چیخی چلائیں۔ آپا بھی بہت چیخیں۔ جیسی ہوئے مگر اس کی دلیل مضبوط تھی۔ وہ کرشن نگر واپس جا کر دوبارہ عورت والوں کا پالا اپنے اور اپنے گھر والوں کے سر پر نہیں تان سکتی تھی۔

اور رہی بنتی.... تو اس کا کردار کیسا بھی کیوں نہ ہو' بچھی کے لیے وہ ایک ڈھال بھی اور یہاں رہ کر وہ فارم ہاؤس کی ہاؤس کیپنگ بھی کر سکتی تھی اور ڈیڑھ سو روپے دیہاڑی کے حساب سے پھولوں کے کھیتوں میں مزدوری بھی کر سکتی تھی۔ آج کل سیزن زوروں پہ تھا۔ پودے پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ شہر کے قریب ہونے کی وجہ سے لیبر مہنگی اور نایاب تھی۔ یہ چند دن ہی کمائی کے ہوتے ہیں عشقی دو سو روپے تک دینے پر تیار تھا۔ اس طرح ایک مہینے میں چھ ہزار آرام سے کمائے جا سکتے تھے۔

معاشی ضرورتیں انسان کو بہت بڑے بڑے سمجھوتے کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں اور یہ تو کوئی ایسا کام نہ تھا۔ بنتی کا دو کمروں کا گھر گاؤں کے سرے پر تھا۔ ایک کمرے میں بھائی اور بھابھی اور دوسرے میں بنتی اور بشریٰ۔

تہجد کے وقت کٹائی شروع ہوتی تھی۔ اوس میں بھیگے پھولوں کو کٹر سے ایک خاص لمبائی پر کاٹنا اور پھر پیکنگ۔ بس باقی پورا دن آپ کا اپنا۔

اور یہ دن تو بشریٰ کو لگتا تھا بس ویوے میں بھاگے ہیں۔ یوں شام ہو جاتی تھی اور حسین شاہ کی مخمور آنکھوں کا تصور لیے وہ اپنی کچی کوٹھری میں آ پڑتی تھی۔ خیر حسن و عشق کے ان قدیم قصوں میں ایسا ہونا کوئی انوکھی بات نہیں۔ رانجھا بھی تو بھینسوں کا سوا ساگو بر سمیٹتا ہوگا۔ یہ تو پھر بڑا لطیف اور شاعرانہ کام تھا۔

"بنتی.... بنتی.... میں اس دل کا کیا کروں؟" آسمان کا رنگ مدھم پڑ چکا تھا اور آس پاس کی زمین نم تھی۔ ان سے کچھ فاصلے پر تین اور لڑکیاں اور ایک بوڑھا جس کی ایک آنکھ 71ء کی جنگ میں ضائع ہو چکی تھی۔ اپنے کام میں مشغول تھے۔

"اے بچھی! ہوش کر جا۔ میں تجھے بتا رہی ہوں یہ عشق محبت کے چکر میں لوگ مارے جاتے ہیں۔ آرام سے کام کر اور جہیز بنا۔ پھر میں تیری شادی بھی اپنے بھائی سے کرا دوں گی۔ وکیل ہے۔" اپنی موٹر سائیکل ہے اور دھلے میں اپنا ذاتی فلیٹ۔" بنتی بے حد پریکٹیکل لڑکی تھی مگر آج کل بچھی کا پیٹ بھرا تھا سو اس کے چاچے لکھوتے اور ہو رہے تھے۔

"مگر اس دل کی ویرانی۔" بچھی نے آہ بھری اور تین خوب صورت لمبی ڈنڈی والے سرخ گلاب کٹر سے کٹ کر اکٹھے ٹوکری میں ڈالے بنتی نے غور سے اس میلوڈرامیٹک لڑکی کو دیکھا اور دانت کچکچا کر بولی۔

"وہ بچھی! اپنا ہے حسین شاہ کتنا امیر ہے۔ اپنے جہاز ہیں پانی کے بھی اور ہوائی بھی تو مرے گی۔"

اور بشریٰ مرا ہی تو گئی جب نیکن کے کنارے ترپتے ترپتے حسین شاہ نے اچانک اسے پرپوز کیا۔ وہ یوری سونی ہی انگلی میں گاڑ بیٹھی۔

"بشریٰ جی! ہماری زندگی میں بڑا خلا اتنہائی ہے۔ آپ

کے آنے سے بڑی دہراہٹ ہوگئی تھی۔ اب آپ کی والدہ سے سنا کہ آپ کی شادی ہو رہی ہے تو لگا کوئی عزیز بچھڑ رہا ہو۔"

تو سمجھے آپ یہ اماں کو لگایا ہوا snore trophy تھا۔ خرگوش نے گاجر کی مہک پالی تھی اور پھندے میں آچکا تھا اب بس اس کے کھنچنے کی دیر تھی۔

اور پھر ان دونوں کی شادی ہوگئی اور سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔

اصولاً "تو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا مگر ہوا یہ کہ جب جلتی بجھتی شکو نے بشریٰ کو رخصت کیا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے اور رات کے سوا دو بجے بشریٰ جی کو سوتے سے جگا کر چیخ چیخ کر بے حال ہوتے حسین شاہ کو کمرے میں کسی گلگلی چیز کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔

"کیا چیز شاہ صاحب...!" اس نے خوف سے لرزتے ہوئے پوچھا۔

"بہت ہی گلگلی اور جالی سی چیز۔" شاہ صاحب صوفے کی پشت پر اکڑوں بیٹھے چلا رہے تھے۔

"کوئی نام تو ہوگا اس کا۔"

"ہاہا... ہا... ایسی چیزوں کے نام نہیں پوچھتے۔" شاہ صاحب نے ایک دلدوز چیخ ماری اور فجر کے وقت تک ماسی زناں اور اوپر کے کام والا لڑکا جیدا "گلگلی چیز" کو ڈھونڈتے رہے۔ دریں اثنا شاہ صاحب قطعاً "اپنا آسن چھوڑنے کو تیار نہیں تھے کیونکہ ان کے خیال میں کام چور ملازم اس "چیز" کو کمرے میں ہی چھوڑ دیں گے۔

آخر کار یہ چھپکلی برابر چھپکلی کا بونگا کسی کونے سے برآمد کیا گیا اور جان خلاصی ہوئی۔

وہ ایک دن کے بعد ایک شام حسین شاہ اچھلتے کودتے کمرے سے برآمد ہوئے "وہاں کوئی لمبے بالوں والی نرم چیز تھی۔"

"کیا چیز شاہ صاحب؟"

"شٹ اپ کہا ہے نا ان چیزوں کے نام نہیں پوچھتے۔ جسٹ فالو انسٹرکشنز۔"

اور پھر کئی گھنٹے سرچ اینڈ کِل آپریشن جاری رہا اور ایک ننھی سی چوہیا پکڑی گئی اس کی مونچھوں کو دیکھ کر حسین شاہ مطمئن ہوگئے کہ یہ لمبے بالوں والی نرم نرم چیز ہے۔

بس اب تو زندگی کا یہی طور تھا۔ چونچ والی چیز، پروں والی پھڑپھڑاتی ہوئی چیز، رینگنے والی چیز وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں ایک آدھ دن چھوڑ کر نا جانے کہاں سے حسین شاہ کے کمرے میں گھس آتی تھیں اور پھر گھنٹوں وہ صوفے کی پشت پر چڑھے کے لیے بھاشن دیتے تھے۔

"یہاں ہوگی، او نہیں ادھر دیکھو۔ ارے ادھر تو دیکھا ہی نہیں ہے۔"

بشریٰ بالکل چڑ کر رہ گئی۔ دن رات کا آرام، کھانا پینا سب الغط ہوا۔ زاہدہ سے ذکر کیا تو ایک دم اور ان سے تو راں ہو گئیں اور لہجے میں گلیشیر کی سردی لا کر بولیں۔

"سوئٹ! ایک چھوٹا سا فوبیا ہے۔ پلیز بش... اب اتنا بھو نہیں۔ اتنے ڈیشنگ آدمی کی بیوی بن کر دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔"

دادی سن کر غرائیں۔ "بچھی ناشکری نہ کر، یہ پوری لائن تجھی سے پیچھے بھاگنے والی۔ خبردار جو گلہ ان کی کی۔"

شکو کی ہنسی ہی نہیں رک رہی تھی اور بلی کے سر سے مارے ڈر کے دودھ کے پتیلے جا پڑے اور سارا دودھ بڑی [illegible] میں جذب ہو گیا۔

بشریٰ سر سر روتی جا رہی تھی اور شکو کا بھانجا اپنی موٹر سائیکل پر دھڑلے کو اڑا جا رہا تھا۔ ہاں شکو نے ساتھ بڑی دردمندی سے بیٹی کو سمجھایا۔ "ان لوگوں کے لیے طلاق اور شادی کوئی مسئلہ نہیں۔ پچھلی مصیبتیں یاد کر اور آج کی تکلیف کا سوچ۔"

کس پر بشریٰ کو سردیوں کی وہ شامیں یاد آئیں جب دوسروں کو پھلنالین ڈبے رنگین بنانے کے لیے وہ کیسے اپنی انگلیاں فگار کرتی تھی اور اب وہ مزے سے پانچ سو کا فون کارڈ گھنٹوں میں اڑا دیا کرتی تھی۔ "بس فوراً" تائب ہوئی اور گھر لوٹ آئی۔ حسین شاہ بھی دن تو نارمل رہے، پھر وہی مختلف النوع کی مخلوقات کا نزول شروع ہو گیا۔

بشریٰ نے دیکھا کہ حسین شاہ کے گھر والوں کو ان سے کچھ غرض نہ تھی بلکہ وہاں تو کسی کو کسی سے غرض نہ تھی۔ سب "تنہا تھے" اکیلے۔ یہ ان کا خاندانی وصف تھا۔ ہر شخص اپنی بات کرتا تھا۔ اپنے بارے میں سوچتا تھا اور اپنی ذات میں محصور تھا۔ حسین شاہ بھی ایسے ہی انٹروورٹ تھے۔ سوائے اس وقت کے جب ان کے کمرے میں کچھ گھس آتا تھا۔

ماسی زناں کا کہنا تھا کہ جب تک شادی نہیں ہوئی تھی۔ حسین شاہ نارمل تھے اور جتنے دن وہ میکے رہتی تھی اتنے دن وہ بالکل ٹھیک رہتے تھے پھر یہ کیا تھا۔ اس کو ستانے کا کوئی انداز، کوئی نفسیاتی گرہ یا کل پرزہ۔ سائیکاٹرسٹ کا نام لے کر بشریٰ کو زاہدہ کے ہاتھوں اپنی درگت بنوانا منظور نہیں تھا۔ ذہنی دباؤ بڑھتا گیا۔

☆ ☆ ☆

"اٹھو، جاگو۔ دیکھو یہاں کوئی چیز ہے۔" تاریکی میں ایک لرزتی ہوئی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"کیسی چیز؟"

"رینگنے والی، پنجوں والی چیز۔"

"شی۔ چپ شاہ صاحب... بولیں مت۔"

"کیوں؟" حسین شاہ کی آواز میں خوف کی جگہ تشویش در آئی۔

"غور سے سنیں۔" بشریٰ کی آواز میں خوف تھا۔ اسے کچھ سنائی دے رہا تھا۔ کسی چیز کے رینگنے کی آواز، پنجوں کی کرچ کرچ، ایک لجلجاتی ہوئی جھیڑ پر کسی چیز کے پھسلنے اور اس کے خارجی استخوان کے ٹوٹنے کی کڑکڑاہٹ۔ سب سنائی دے رہا تھا۔ خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور سارا بدن پسینے میں نہا گیا۔ یہ نیچے اور یہ بھوکی جھیڑ اور یہ ننھی ننھی چمکدار آنکھیں یقیناً تھیں اس کمرے میں۔ ایک دو ہوں گی، ان چاہی موجودگی۔ اپنی غرض کو شکار ڈھونڈتی ہوئی ایک مخلوق کی موجودگی۔

خوف کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ خدشات کی کوئی تھاہ نہیں تھی۔ اپنے ذاتی گھر کے اندر اپنے کمرے کے بند دروازوں کے پیچھے وہ محفوظ نہیں تھی۔ پختہ دیواریں، فرش، بھاری دروازے سب بے کار تھے۔ ایک رینگنے والی حقیر چیز کے آگے بے بس جو کسی بھی وقت بغیر بتائے اس کے کمرے میں گھس سکتی تھی اور گھسی ہوئی تھی اور اگر اس کے دائرہ اختیار میں ہوتا تو وہ اسے بھی اپنی برق سی لپکتی زبان سے چٹ کر جاتی اور کیا ایسا ممکن نہیں تھا۔ قبل از تاریخ اس کے آباؤ یہ سب کرتے رہے تھے اور جب ہم اپنے آباء کے محیر العقول واقعات سے نشاۃ ثانیہ کی نوید لیتے ہیں تو کیا چھپکلیوں کی نشاۃ ثانیہ ممکن نہیں۔ Period۔

Going back to Jurassic

یہ سب اس نے انشاء کر دیا۔ حرف بہ حرف حسین شاہ سے کہہ دیا۔

"ہاں بچی! بالکل درست۔ یہی خوف مجھے بھی ہے۔ ممکنات کی تو کوئی حد ہی نہیں۔" اب ان کی آواز میں اطمینان تھا۔ سکون۔ وہ سائیڈ ٹیبل یا صوفے پر چڑھنے کی بجائے بستر پر بیٹھے تھے۔

"ڈھونڈیں اسے پلیز شاہ صاحب...!"

حسین شاہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر چپ ہو گئے۔ شاید اپنے سابقہ سرچ پروگرام یاد آ گئے۔

"سلو بش۔" وہ کھنکھارے اور ذرا پست آواز میں بولے۔ "ہم ہیں اور وہ تنہا۔ خود ہی بھاگ جائے گی۔ lets sleep۔"

"ہاں ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔" بشریٰ بھی کتھارسس کے بعد کچھ مطمئن تھی پھر ان دخل در معقولات کرنے والی مخلوقات کی بدتمیزیوں پر تبصرے کرتے کرتے وہ دونوں نا جانے کب سو گئے اور پنجوں والی چیز رینگتی ہوئی نہیں نہ جانے کہاں گئی اور اسٹڈی میں "مسور شوبناز" کی جلد کے اوپر "آئیے وہم کا علاج کریں" رکھی تھی۔

عمرہ بخاری

شادی کی ڈیٹ فکس ہوتے ہی اس نے سب سے پہلا فون انجی کو کیا تھا۔

"بہت مبارک ہو بھئی۔ اب تو تم بھی میرے شہر آجاؤ گی اور مزے کی بات یہ ہے کہ تم جو ہر ٹاؤن میں اور میں ٹاؤن شپ میں یعنی بالکل قریب قریب ورنہ لاہور جیسا شہر اتنا پھیلا ہوا جیسے شیطان کی آنت ایک شہر میں رہنے کے باوجود ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"یہ ہماری پکی لگن ہی تھی انجی! جو ہمیں ایک بار پھر قریب لے آئی ہے۔" شفق نے ایک جذب کے عالم میں کہا تھا۔

"تو اور کیا ایک سال ہونے والا ہے ہمیں ملے ہوئے ورنہ کہاں وہ وقت تھا۔ ہم دن میں دو تین بار

مکمل ناول

کرتے تھے۔" انجی نے بھی آہ بھر کر گزرے وقت کو یاد کیا۔

"انجی! میں سوچتی ہوں' کہیں مجھے بھی شادی کے بعد تمہارے جیسی سسرال اور شوہر نہ مل جائیں جو میکے آنے ہی نہ دیں اب دیکھو نا شادی کا تمہارا یہ تیسرا سال ہے۔ پہلے دو سال تو میکے آتی رہیں مگر اب وہ اپنا اصل روپ دکھانے لگے ہیں تمہیں۔ میکے بھیجتے ہی نہیں۔"

"بس شوہر تو ایسے ہی ہوتے ہیں لیکن میرے ساتھ اس سال کچھ مجبوریاں بھی رہیں۔ پہلے ساس بہت بیمار رہیں پھر ان کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے اظہر بہت اپ سیٹ رہے' بچے بھی دادی کی کمی محسوس کرتے تھے۔ بڑی مشکل سے دوبارہ سے سب معمول پر آیا۔ اب تو میری حالت ہی دوسری ہے۔ ڈاکٹر نے سفر سے منع کر رکھا ہے۔"

"کیا؟" وہ زور سے چلائی۔ "ڈاکٹر نے تمہیں سفر سے منع کر رکھا ہے یعنی تم میری شادی پر نہیں آسکو گی؟"

"نہیں شفق! اگر تم اداس نہ ہو میں ادھر لاہور میں تو تمہارے ولیمے کے فنکشن کو اٹینڈ کر لوں گی۔"

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ تمہارے ساتھ ایسی پرابلم تھی تو میں ڈیٹ آگے بڑھوا لیتی مگر اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ تم مجھے بتاؤ۔ کب تک فارغ ہو جاؤ گی۔ میں امی سے بات کرتی ہوں۔ تم میری شادی میں شریک نہ ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے انجی!"

"پاگل مت ہو شفق! اتنی اتنی سی بات پر بھی ڈیٹ تبدیل نہیں کرتے ہیں۔"

"میں ضد کروں گی بھلا تمہارے بغیر خاک مزہ آئے گا انجی میری سب سے بہترین دوست ہی شادی میں شریک نہ ہو ایسا تو میں سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"میں تمہاری محبت کو سمجھتی ہوں شفق! مگر تم بہت بھولی ہو اصل میں ابھی عملی زندگی میں قدم نہیں رکھا۔ اس لیے ایسی نزاکتوں کو نہیں سمجھ رہیں مجھے بھی تمہاری شادی اٹینڈ نہ کر سکنے کا افسوس ہے مگر کیا کر سکتی ہوں۔ ولیمہ کے فنکشن میں بھرپور شرکت کروں گی۔"

"ولیمہ کے فنکشن میں بھرپور شرکت کا کیا سوال! نہ مایوں نہ مہندی نہ ہی بارات ساری رونق تو انہی دنوں میں ہوتی ہے اور وہ آخری دن تو بس سب کھانا کھاتے ہیں اور اپنی اپنی راہ لیتے ہیں' بس میں کچھ نہیں جانتی امی سے بات تو ضرور کروں گی۔"

جس وقت وہ اپنی والدہ کے کمرے میں آئی۔ بھائی بھی وہیں موجود تھے اور امی سے کسی بات پر مشورہ چاہ رہی تھیں۔

"امی! پہلے میری بات تو سن لیں۔"

"کتنی بار کہا ہے' شفق! جب بڑے بات کر رہے ہوں۔ درمیان میں مت بولا کرو۔ اب تو تمہاری شادی ہونے والی ہے' ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا خود خیال کیا کرو۔" امی نے اچھا خاصا ڈانٹ دیا۔

"یہی تو میں کہنے والی ہوں۔ مجھے ابھی شادی نہیں کرنا۔ آپ ڈیٹ آگے بڑھوا دیں۔"

"ہیں ہائیں! دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تمہارا۔" امی تو اپنی جگہ سے اچھل ہی پڑیں مارے حیرت کے بھائی کا منہ بھی کھل گیا۔

"وہ ابھی میں نے انجی کو فون کیا تھا۔ ان دنوں ڈاکٹر نے اسے سفر سے منع کیا ہے۔ وہ شریک نہیں ہو سکے گی۔ میری اتنی پیاری اکلوتی دوست اس کے بغیر میں شادی کروا لوں۔ ایسی بے وفا نہیں ہوں۔"

"دیکھو ذرا اس لڑکی کو' پتا نہیں کب اسے عقل آئے گی۔ ارے یہ کہاں لکھا ہے کہ سہیلی شامل نہ ہو تو نکاح نہیں ہو سکتا۔"

"بس امی! میں نے کہہ دیا ہے۔ جب تک انجی کو سفر کی اجازت نہیں مل جاتی۔ میں شادی نہیں کروں گی۔" بڑے آرام سے فیصلہ سنایا تھا۔

"یہ بات کرو ذرا اپنے ابا اور بھائی کے سامنے' جس طرح بتائیں گے وہ تمہیں۔ غضب خدا کا' سارے

خاندان میں بات پھیل چکی اور لڑکے کے بھائی نے شادی میں شرکت کے لیے دبئی اپنے آفس میں چھٹی کی درخواست بھی دے دی اور ادھر دلہن صاحبہ اس لیے ڈیٹ تبدیل کروانا چاہ رہی ہیں کہ وہ انجی صاحبہ تشریف نہیں لا سکتیں۔"

"آپ کو تو شروع سے ہی میری دوست سخت ناپسند ہے۔"

"اس میں پسند کرنے والی بات ہی کون سی ہے؟" بھائی نے ناک چڑھا کر اپنی ناپسندیدگی کا بھی اظہار کیا۔

"ہاں آپ کی اور امی کی رائے ہمیشہ اس کے لیے ایسی ہی رہی ہے اور کیوں نہ ہو' آخر آپ امی کی بھتیجی جو ہو میں اور وہ باجی وہ بھی آپ دونوں کی ہی سگی ہیں۔ اکلوتی بہن کو بھی کسی قابل نہیں سمجھا۔"

وہ روہانسی ہو رہی تھی اور اس کی باتیں امی کا پارہ مزید چڑھا رہی تھیں۔

"سنو' سنو ذرا اس کی باتیں۔ کل کو شادی ہونا ہے ہاں کی اور بجائے اپنی غلطی ماننے کے یہ ہم سب کو غلط قرار دے رہی ہے۔ بتاؤ مجھے تمہاری ساس سے کیا کہوں۔ ہم شادی کی ڈیٹ کس لیے آگے بڑھوا رہے ہیں۔ تمہارے ابا اور بھائی سے کیا کہوں۔ رشتہ داروں سے کون سا بہانہ بناؤں اور انجی کم بخت! شکر کیا تھا چار سال پہلے جب اس کی شادی ہوئی تھی کہ چلو اب تمہارے سر سے اس کا بھوت اتر جائے گا۔ کیا معلوم تھا تمہارا پیار بھی اسی شہر ہو جائے گا۔"

"آپ لوگوں کو ہمیشہ اس بے چاری سے خدا واسطے کا بیر رہا ہے حالانکہ وہ میرے ساتھ کتنی مخلص ہے اور بھیا کی شادی پر اس نے ہم سب کا کتنا ساتھ دیا تھا۔ کیسی رونق لگائی تھی۔ باجی کو تو ان دنوں بخار آ رہا تھا۔ بستر سے اٹھنا تک محال تھا۔ یہ انجی ہی تھی جو میرے ساتھ ساتھ تھی۔"

اس کی بات پر بھائی کو بھی وہ سب یاد آ رہا تھا جو وہ بھولی بھی نہیں تھیں۔ انجی کے قہقہے' اس کی مذاق بازی حد سے بڑھی ہوئی بے تکلفی اور خود دلہن کی بھائی پر بظاہر بے ضرر سے اعتراضات بھائی کو شادی کے دوسرے روز ہی اس لڑکی سے بے زاری ہونے لگی تھی جو سننے میں آ رہا تھا۔ ایک ہفتے سے ادھر ڈیرا ڈالے ہوئے تھی اور اس کی چھوٹی نند شفق کی تو گویا اس میں جان تھی۔ ہاں اپنی پھوپھو یعنی ساس اور بڑی نند کی آنکھوں میں انہیں انجی کے لیے محبت یا اپنائیت کا کوئی رنگ دکھائی نہیں دیا۔ بڑی نند تو شادی کے چوتھے روز اپنے گھر اسلام آباد چلی گئی اب گھر میں شفق' پھپھو اور پھپھا جان ہوتے تھے یا پھر یہ دونوں نئے نویلے تو دولہا دلہن تھے اور وہ دیکھ رہی تھی انجی صرف شفق کی ہی دوست نہیں اس کے میاں وہاب سے بھی بہت بے تکلف ہے' وہاب بھی اس کے رکھ رکھاؤ اور ذہانت کے معترف ہیں وہ اکثر ارم کو مشورہ دیتی۔

"ارے بھابی! آپ نے اس سوٹ کے ساتھ وہ پرل کا سیٹ پہننا تھا نا۔ کتنا خوب صورت لگتا۔" یا پھر

"آپ یہ نہیں وہ والی ساڑھی پہنیے دیکھیے گا میاں جی کتنی تعریف کریں گے پھر آپ میرا شکریہ ادا کرنا نہ بھولیے گا۔"

اور یہ سارے مشورے وہ وہاب کی موجودگی میں دیتی اور ارم کو غصہ اس پر آتا کہ وہاب بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔

ارم نے محسوس کیا کہ اسے خود کو نمایاں کرنے اور دوسروں کو کم تر ثابت کرنے میں مزہ آتا ہے۔ شادی پر شفق نے جتنے بھی کپڑے بنائے تھے وہ سب انجی کے مشوروں اور اس کی پسند سے بنوائے گئے تھے' بری میں بھی مرضی اس کی چلتی جو ارم کی بڑی نند اور دوست صائقہ ساری تیاری پنڈی اسلام آباد سے نہ کر لیتیں۔ صائقہ اور ارم ہم عمر تھیں پھر آپس میں رشتہ داری بھی تھی تو ایک دوسرے کے ہاں پہلے سے آنے جانے کی وجہ سے وہ ارم کی پسند سے اچھی طرح واقف تھی۔ اسی لیے بری اس نے بنوائی تھی۔

انجی شفق سے پورے چھ سال بڑی تقریباً ارم ہی کی ہم عمر تھی اور ارم کو ان دونوں کی دوستی پر حیرت تھی

اور اس کا اظہار اس نے پھپھو کے سامنے بھی کر دیا تھا۔

"ارے یہ شفق ہے ہی بے وقوف۔ تمہیں پتہ ہی ہے۔ صائقہ کی شادی ہم نے بہت جلدی کر دی تھی۔ شفق چھوٹی تھی۔ بہن کی کمی بہت محسوس کرتی تھی یہ لوگ ابھی نئے نئے ہمارے محلے میں شفٹ ہوئے تھے۔ بھائی کوئی نہیں ہے یہ پانچ بہنیں ہیں۔ شفق پہلے تو اس کی سب سے چھوٹی بہن کی دوست بنی تھی۔ وہ شفق کے ہی اسکول میں پڑھتی تھی۔ اسی کے لیے یہ ان لوگوں کے گھر جاتی تھی اور پتہ نہیں پھر کس طرح اس کی دوستی انجی سے ہو گئی اور یہ دوستی اتنی بڑھی کہ اب مجھے اس کی فضول کی محبت پر بے زاری ہونے لگتی ہے۔ میں تو اسی لیے ان کے ہاں جانے سے منع نہیں کرتی تھی کہ گھر میں کوئی لڑکا تو ہے نہیں۔ لڑکیوں والا گھر ہے گھر میں اس کا جی نہیں لگتا تو ادھر چلی جاتی ہے۔ مگر یہ پتہ نہیں تھا یہ تو انجی کو جان کا روگ بنا لے گی۔ دن میں کئی کئی چکر اس کے گھر کے لگتے ہیں اور وہ بھی نہ دن دیکھتی ہے نہ رات جب جی چاہتا ہے اٹھائے چلی آتی ہے اب باپ سے کہہ کر شفق پر میں نے کچھ سختی کروائی ہے کہ ان کے گھر کا ماحول اب پہلے کا سا نہیں رہا۔ بڑی بہن نے بی اے کیا ہے وہ اکاؤنٹس کی جاب کرتی ہے۔ دوسری کسی آفس میں لگ گئی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے دونوں بہت ماڈرن دکھائی دینے لگی ہیں۔ یہ انجی پہلے بالکل سادہ سی ہوتی تھی بہنوں کی دیکھا دیکھی اس کے بھی رنگ ڈھنگ بدل رہے ہیں اور شفق اس کا بہت اثر لیتی ہے بس اسی لیے اب میں کچھ ڈر سی گئی ہوں۔"

اور آنے والے دنوں میں ارم نے دیکھا۔ پھپھو کا ڈر بے جا نہیں انجی واقعی بڑی آزاد سی لڑکی تھی اور شفق کو اپنے ساتھ ساتھ لگائے رکھتی تھی۔ ہاں ارم نے جو رویہ اس کے ساتھ اپنایا۔ اس کے بعد اس نے ارم کے ساتھ زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کی۔

ارم کی شادی کے دو ماہ بعد ہی انجی کی دوسرے نمبر والی بہن کی بھی اچانک شادی ٹھہری اور شفق نے گھر کے کام تو کروائے بازاروں کے بھی اس کے ساتھ خوب چکر لگائے یہاں تک کہ مہندی کے روز اسے تھکن سے بخار ہو گیا مگر انجی پھر بھی اسے اپنے ساتھ گھسیٹتی رہی۔

پھر ارم کی شادی کے ایک سال بعد جب انجی کی بات لاہور ٹھہری تو ارم اور پھپھو دونوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اب تو شفق کی عقل بالکل سلب ہو چکی تھی وہ صرف انجی کے اشاروں پر ہی چلا کرتی تھی۔ شادی میں شفق نے کام بھی خوب کیا اور بار بار اس کے گلے لگ کے روئی بھی بہت اور جب انجی کے دولہا کو شادی کے روز دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا۔ کتنا سنجیدہ سا ہے۔ انجی بے چاری کیسے گزارہ کرے گی؟ سب لوگ اس کے دولہا کو سراہ رہے تھے۔ کچھ تو زبان میں کہہ رہے تھے۔

"انجی ایسے اچھے لڑکے کے قابل نہیں۔" لیکن شفق دوسرے انداز میں سوچتی اور کڑھتی رہی۔

اور شادی کے تیسرے روز جب شفق اس کی جدائی میں رو رو کر پاگل ہو رہی تھی وہ ہنستی مسکراتی خوشبوؤں میں بسی اپنے دولہا کے ساتھ میکے آئی تھی۔ شفق کو اس کی آمد کی اطلاع ملی تو اڑ کر اس کے گھر پہنچی اور بے ساختہ اس کے گلے لگ گئی۔

"ہائے شفو! کیا حال بنا لیا ہے میرے بغیر۔" انجی ہنسی پھر اپنے میاں سے بولی۔

"یہی وہ شفق ہے جس کے بارے میں میں نے بتایا تھا کہ میری محبت میں پاگل ہے۔"

"اچھا اچھا!" اس کے میاں نے دلچسپی سے دیکھا اور پھر بولا۔

"یہ بہت چھوٹی سی معصوم سی لڑکی ہے۔"

پتہ نہیں کیوں انجی کو پیاری سہیلی کے بارے میں میاں کی رائے کچھ پسند نہیں آئی بولی۔

"نہیں اتنی بھی چھوٹی نہیں۔ بس قد میں ہی مجھ سے

چھوٹی ہے اور کچھ ہے یہ احمق سی' اسی لیے ایسی لگتی ہے۔"

شفق نے انجی کی بات پر کچھ زیادہ غور نہیں کیا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ چاہ رہی تھی جادو کے زور سے اس کے میاں کو تو کہیں غائب کر دے پھر وہ ہو اور انجی ہو اور وہ اسے بتائے کہ اس کے بغیر یہ تین دن شفق نے کیسے گزارے ہیں۔ مگر انجی کہہ رہی تھی۔

"شفو! اس وقت تم اپنے گھر جاؤ۔ میں خود تم سے ملنے آجاؤں گی۔"

"ہاں ابھی یہ دونوں ذرا گھومنے پھرنے جا رہے تھے۔ انجی اظہر بھائی کو اپنا شہر بھی دکھانا چاہتی ہے نا!" انجی کی چھوٹی بہن نے بتایا۔

"میں بھی چلوں؟" وہ پرجوش ہوئی کہ انجی اس کے بغیر کہاں جایا کرتی تھی۔

"نہیں۔ وہ میں اظہر کے ساتھ جا رہی ہوں نا۔ سمجھا کرو۔" اس نے میاں کو دیکھا پھر شفق کے کان کے قریب جھک کر بولی۔

"میں آؤں گی تمہاری طرف بہت سی باتیں بتانا ہیں' بے چین ہوں تم سے ملنے کو۔ ابھی تم جاؤ۔"

اس کے انداز پر شفق مسکرائی اک فخر سا محسوس ہوا لاڈلی سہیلی پر' بات مجھ سے ہی تو شیئر کرے گی اور گھر آگئی۔

"بڑی جلدی واپسی ہو گئی؟" ارم سامنے ہی بیٹھی میگزین دیکھ رہی تھی اتنی جلدی اس کی واپسی پر حیرت ہوئی۔

"انجی اپنے میاں کے ساتھ کہیں جا رہی تھی کہہ رہی تھی شام کو آئے گی تمہاری طرف بہت سی باتیں بھی تو بتانی ہیں۔" شفق نے انجی کے انداز میں ہی بھابی کے سامنے دہرا کر انہیں چونکا دیا۔ شفق ان دنوں تھرڈ ایئر میں تھی۔ معصوم سادہ سی لڑکی جو انجی کی آنکھوں سے دیکھتی اس کے دماغ سے سوچتی آئی تھی مگر اب انجی بیاہتا تھی نئی نئی دلہن جس نے اپنے تجربات مزے

لے لے کر کسی سے بیان کرنے تھے۔

"نہیں' ایسا نہیں ہونا چاہیے۔" ارم نے سوچا اور ایک لمحے میں فیصلہ بھی کر لیا۔

پھر جب انجی ان کے ہاں آئی تو اس نے دونوں کو اکیلے بیٹھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اس پر دونوں ہی جز بز ہو رہی تھیں یہاں تک کہ جب انجی نے شفق سے کہا۔

"آؤ تمہارے کمرے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔" تب بھی ارم ان کے ساتھ کمرے میں چلی آئی بد مزہ سی ہو کر انجی جلد ہی اجازت لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "کھانے پر روک لیتیں۔" اس کے جانے کے بعد پھپھو نے کہا تھا۔

تب اس نے آہستہ آہستہ سب کچھ پھپھو کے سامنے کہہ ڈالا واقعی۔ انجی سے ایسی نزاکتوں کے احساس کا خیال ہی فضول تھا۔ ارم نے جس عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔

"اب وہ آئے گی تو آپ اسے صاف لفظوں میں سمجھا دیجیے گا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹا! میں ضرور اس سے بات کر لوں گی۔"

پھر دوبارہ انجی ان کے ہاں تب آئی جب شفق کے بے حد اصرار پر امی کو اسے اور اس کے میاں کو کھانے پر بلانا پڑا۔ میاں کے سامنے وہ بڑھ چڑھ کے بولنے والی بڑھ بڑھ کر مشورے دینے والی انجی خاصی سنبھل کر بیٹھی رہی۔ اگلے روز ہی ان کی واپسی ہو گئی اور شفق نے ایک بار پھر اسے آنسوؤں کی دھند میں رخصت کیا۔

اس کے بعد انجی شادی کے تین ماہ بعد آئی وہ

دوسرے جی سے تھی اور حال سے بے حال ہو رہی تھی۔ اس کا کسی سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ ان دنوں ارم کا چھوٹو بیمار ہوا تو اس نے شفق کو اپنے پاس اسلام آباد بلا لیا کہ چھوٹے سے بیمار بچے کے ساتھ گھر بار دیکھنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

گزرے تین سالوں میں وہ بہت کم رابطے میں رہیں مگر شفق ان لوگوں میں سے تھی جو محبت کرتے ہیں تو آخری سانس تک نبھاتے ہیں۔ وہ بھی انجی کو بھلا نہیں سکی اور شہریار کا رشتہ آنے پر جب اسے پتہ چلا یہ لوگ لاہور سے آئے ہیں تو وہ چونک گئی اور پھر اس نے اس رشتے کے حق میں کتنی ہی دعائیں کر ڈالیں صرف اس لیے کہ یہ رشتہ سہیلی کے شہر سے آیا تھا وہ اسی شہر چلی جاتی تو ایک بار پھر ملنے کی امید پیدا ہو جاتی۔

امی ابا بھیا ارم بھابی سب ہی کو یہ رشتہ پسند آیا تھا۔ مختصر فیملی تھی۔ شہریار اس کی والدہ اور بڑا بھائی جو سعودیہ میں مقیم تھا پھر شہریار کی جاب بھی اچھی تھی اور بھیا بتاتے تھے وہ پڑھا لکھا اور خوش اخلاق لڑکا ہے۔

"ہماری شفق ابھی لاابالی مزاج کی مالک ہے۔ اس کے لیے ایسا ہی شوہر مناسب رہے گا جو خوش مزاج اور باتوں کو نظر انداز کر دینے والے مزاج کا مالک ہو۔"

"مجھے تو شہریار کی والدہ بہت اچھی لگی ہیں۔ نرم لہجے میں بات کرتی ہیں۔ پڑھی لکھی اور روشن خیال ہیں۔" یہ رائے ارم نے دی تھی۔

"ہاں واقعی بے حد معقول خاتون ہیں۔" امی بہو کے خیالات سے متفق تھیں وہ چپ چاپ سب سنے جاتی۔

پھر زیادہ دن نہیں گزرے رشتے کے لیے ہاں کر دی گئی۔ اس نے سب سے پہلے انجی کو فون کیا اور آج پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ فون اظہر نے اٹھایا۔

"مجھے انجی سے بات کرنا ہے۔" سلام دعا کے بعد اس نے کہا تھا۔

"انجی آپ کا مطلب انجم صاحبہ!" بڑی سنجیدگی سے وضاحت چاہی گئی۔

"اف کتنی روکھی پھیکی بات کرتا ہے یہ شخص حالانکہ میں نے بتایا بھی ہے شفق بات کر رہی ہوں۔ یقیناً" جانتا ہے شفق ان کی بیگم انجم صاحبہ کی قریبی دوست ہے مگر مجال ہے جو حال احوال ہی پوچھ لیں۔" انجی لائن پر آ چکی تھی۔ اس نے جوش کے عالم میں تازہ خبر سنائی ساتھ ہی اس کے میاں کی شکایت بھی لگا دی۔

"ارے یہ شوہر لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اب تو تم خود خیر سے بیگم بننے جا رہی ہو تمہیں پتہ چل جائے گا۔"

"اللہ نہ کرے جو وہ ایسے روکھے سڑے مزاج کے مالک ہوں۔"

"بس شفو! یہ تو مقدروں کے کھیل ہیں ورنہ تمہیں پتہ ہے۔ میں کتنی زندہ دل پُرشور سیر سپاٹے کی شوقین ہوا کرتی تھی جب تک سارے بازار کا راؤنڈ نہ لگا لوں۔ بالوں کا کلپ تک نہیں خریدتی تھی اب یہ حال ہے۔ ایک اسٹور پہ جا کر کھڑا کر دیتے ہیں اور آرڈر ہوتا ہے۔ آدھے گھنٹے میں شاپنگ مکمل کر کے آؤ میں ادھر پیچھے کے پاس گاڑی میں بیٹھا ہوں۔"

"ہائے پھر تم کیا کرتی ہو؟" اسے بھی انجی کی عادت کا پتہ تھا۔ اس ظلم پر پریشان ہو کر چلا اٹھی۔

"ماننا ہی پڑتا ہے۔" انجی نے آہ بھری۔

"اتنی فرمانبردار ہو گئی ہو۔"

"ارے نہیں بھئی۔ اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ان کے ساتھ تو مہینے میں ایک بار ہی جانا ہوتا ہے۔ ویسے اکیلی تو میں ہفتے میں دو تین چکر بازار کے لگا لیتی ہوں۔" انجی نے قہقہہ لگایا اس کی بھی جان میں جان آئی۔

"انجم! میں چائے کا انتظار کر رہا ہوں۔" وہ اظہر کی آواز بیل پر بخوبی سن رہی تھی۔

"چائے ہی ہے نا کوئی دوا تو نہیں کہ ٹائم آگے پیچھے ہو گیا تو جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ بنا دیتی ہوں۔" انجی نے زمانے بھر کی بے زاری لہجے میں سمو کر میاں جی کو جواب دیا پھر بولی۔

"اچھا شفو جی! تو تمہیں چھوڑ رہا ہے مگر یہ ازدواجی زندگی کے مسئلے جب تک چائے نہیں حلق سے اترے گی انہیں سکون کہاں آئے گا۔ بند کرتی ہوں پھر فرصت سے بات کریں گے۔"

"بے چاری انجی یہ اظہر تو پہلے دن سے ہی سب کو اکھڑ اور خشک مزاج لگا تھا۔ شکر ہے نبھا رہی ہیں۔

شہریار بہت خوش اخلاق ہے۔" مگر شہریار کے با اخلاق ہونے کی اتنی خوشی نہیں تھی جتنا اظہر کی بد اخلاقی پر رنج تھا۔ وہ رات جب تک سو نہیں گئی۔ انجی کی ویران ناکام ازدواجی زندگی کے بارے میں سوچتی رہی۔

☆ ☆ ☆

اس کی بات پکی ہوئی تو کچھ ہی دنوں کے بعد شادی کی ڈیٹ کا تقاضا بھی ہونے لگا۔ اصل میں شہریار کی والدہ کو اپنے بڑے بیٹے کے پاس جانا تھا۔ ان کا ارادہ تقریباً" چھ ماہ وہیں رہنے کا تھا اور جانے سے پہلے وہ شہریار کا گھر بسانا چاہتی تھیں۔

امی ابا نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس روز وہ بھابی اور امی سے ادھر ادھر کی بہت سی باتیں بڑی اپنائیت اور بے تکلفی سے کرتی رہیں۔ انہوں نے بھابی کو شہریار کی پسند ناپسند کے بارے میں بتایا اور بری کے لیے شفق کی رائے معلوم کرنا چاہی۔

"آنٹی! آپ جو بھی بنائیں گی۔ ہمیں پسند ہوگا۔" امی نے کہہ دیا۔ وہ جانتی تھیں [illegible] اپنا بھی نہیں پہلے انجی کی رائے چلتی تھی۔ اب وہ بھابی کے ساتھ جا کر انہی کے مشورے سے خریداری کیا کرتی تھی۔

"اتنی بھی کیا جلدی ہے۔" ان کے جانے کے بعد شفق نے اعتراض کیا۔

"تمہیں اپنے گھر جانا ہے بیٹا! جتنی جلدی ہو جائے اچھا ہے۔"

"اچھا تو پھر میں ریڈ کلر کا غرارہ بنواؤں گی۔" جھٹ سے ضد چھوڑ کر فرمائش کر دی۔

"ریڈ کلر شہریار کو پسند نہیں ہے ابھی ابھی آنٹی بتا کر گئی ہیں۔" ارم نے بتایا۔

"میں ریڈ غرارہ ان کے لیے نہیں اپنے لیے بنوا رہی ہوں۔" انداز اطلاع دینے کا سا تھا ارم کو ہنسی آ گئی جبکہ امی کچھ حیران ہو کر اس کی صورت دیکھنے لگیں پھر بھابی سے بولیں۔

"سمجھاؤ اسے اور یہ بات اچھی طرح اس کے دماغ میں ڈال دو۔ جو کچھ شہریار کو پسند نہیں وہ جہیز میں شامل نہیں ہوگا۔"

"اچھا اور جو وہ صاحب فرمادیں مجھے شفق پسند نہیں تو کیا مجھے بھی کٹ کر دیا جائے گا۔"

"اوہو! احمق لڑکی! اب اس گھر میں تھوڑے دن کی مہمان ہو۔ میں تمہیں سخت سست سنانا نہیں چاہتی مگر تم ہو کہ برابر میرا بلڈ پریشر ہائی کر رہی ہو۔ عقل کے ناخن لو۔ اب تمہیں ایک گھر سنبھالنا ہے۔"

"ہاں تو سنبھال لوں گی۔ یہ کوئی مشکل تھوڑا ہی ہے۔ کون سا گھر سر پر اٹھا کر رکھنا ہے۔" اس نے شانے اچکائے امی سر جھٹک کر کچن میں چلی گئیں۔

"پلیز بھابی! آپ کو پتہ ہے۔ مجھے ریڈ کلر اچھا لگتا ہے اور دلہن تو سجتی ہی ریڈ کلر میں ہے بس آپ امی کو سمجھا دیں۔ بنوا دیں مجھے ریڈ غرارہ۔"

"شفق! دلہن اپنے دولہا کے لیے ہی سجتی سنورتی ہے نا۔ تو اگر دولہا کو ہی ریڈ پسند نہ ہو تو کیا فائدہ۔"

"کیوں نہ بھائے دیکھئے گا کتنا اچھا لگے گا مجھ پر یہ [illegible]"

"دولہا کو اگر یہ کلر پسند ہی نہیں ہے۔ پہلی ہی اسٹیج پر اس کی بات رد کرو گی۔ وہ کیا سوچے گا۔"

"ہاں بس آپ تو چاہتی ہیں میں ساری عمر اس کے اشاروں پر ناچتی رہوں مگر یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ آخر میں بھی انسان ہوں میری اپنی بھی تو کوئی سوچ ہے۔ یوں ذرا ذرا سی بات پر پابندی مجھے نہیں۔ مجھے انجی نہیں بننا۔"

"یہ انجی کا ذکر کہاں سے آ گیا اور کیا ہوا ہے تمہاری انجی کے ساتھ۔ میں نے تو اسے شادی کے بعد خوش باش ہی دیکھا ہے۔"

"بہ ظاہر خوش باش اس ڈکٹیٹر ٹائپ مزاج کے ساتھ یہ تو حوصلہ ہے میری پیاری انجی کا جو ماں باپ کی عزت کی خاطر سب کچھ چپ چاپ سہے جا رہی ہے۔" اس

نے آہ بھری۔

"اچھا! اگر انجی جیسی لڑکی خود کو بدل سکتی ہے اپنے گھر کو بچانے کے لیے شوہر کی مرضی کے مطابق ڈھل سکتی ہے تو پھر تم کیوں انکاری ہو رہی ہو؟"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟ انجی جیسی لڑکی! میری دوست کوئی ایسی ویسی نہیں ہے۔"

"ہاں ہاں سرخاب کے پر لگے ہیں اس کی دوستی میں۔ تم بھی کس کے ساتھ سر کھپا رہی ہو ارم! ساری دنیا میں خرابی ہو سکتی ہے مگر انجی میں نہیں پتہ نہیں کیا گھول کر پلا دیا ہے اور میری بات کان کھول کر سن لو۔ ایک شہر میں رہنے کا یہ مطلب بالکل نہیں کہ تم وقت بے وقت انجی کے گھر میں گھسی رہو یا اسے اپنے ہاں آنے کی دعوتیں دیتی رہو۔ اگر شہریار یا اس کی والدہ نے مجھ سے اس سلسلے میں شکایت کی تو یاد رکھنا۔ میں بالکل لحاظ نہیں کروں گی تمہارا کھل کر ان کا ساتھ دوں گی۔"

"آپ تو ایسے ہی کہیں تب بھی مجھے پتہ ہے ساری دنیا کی مائیں بیٹیوں کی سائیڈ لیتی ہیں اور آپ۔" وہ سر جھٹک کر سوچنے لگی۔

"ارم! تمہیں اس کے ساتھ سر کھپانے کی بالکل ضرورت نہیں بس جہیز کے کپڑوں میں ایک بھی ریڈ کلر کا جوڑا نہیں بنے گا۔ ہاں بعد میں میاں کو راضی کر کے چاہے بیسیوں بناتی رہنا۔"

امی ہدایات جاری کر کے پھر کچن میں چلی گئیں۔ وہ پیر پٹختی اپنے کمرے میں آ گئی۔ ایک دو روز اس بات کا سوگ منایا پھر عادت کے مطابق بھول گئی۔

☆ ☆ ☆

اور جب شادی کی تاریخ رکھی گئی۔ سب سے پہلا فون انجی کو کیا۔ اس کا جواب سن کر سخت مایوسی ہوئی۔

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا آج کل اس حالت میں ہو؟"

"پہلے کوئی سیریس بات نہیں تھی۔ یہ تو ابھی ڈاکٹر نے سفر سے منع کیا ہے۔"

"ہائے میرے اللہ! کیا کوئی خطرے کی بات ہے؟"

وہ تو دہل گئی۔

"یہ تو مہینے خطرے کے ہی تو ہوتے ہیں۔ اب تم خود شادی شدہ ہونے جا رہی ہو۔ جب اس کنڈیشن سے گزرو گی تب پتہ چلے گا۔"

"ابھی میں نے تو سوچا تھا۔ تمہیں پہلے ہی آنے کا کہوں گی۔ شادی کی ساری شاپنگ تمہاری پسند سے کروں گی مگر ہائے قسمت!"

"تو اور کیا مجھے بھی تمہاری شادی کا بڑا انتظار تھا مگر سب کچھ اپنے اختیار میں کب ہوا کرتا ہے۔" انجی نے بھی آہ بھری۔

پھر اس کے جہیز کی ساری تیاری امی اور بھابی نے کی درمیان میں صائقہ نے بھی اسلام آباد سے ایک دو چکر لگائے اور ان کی مدد کی۔ شفق کی رائے ان تینوں میں سے کسی کے لیے کچھ خاص معتبر نہ تھی اور یوں بھی وہ لباس کے معاملے میں ہمیشہ دوسروں کی پسند پر ہی انحصار کرتی آئی تھی۔

شادی کی تقریب انجی کے بغیر کس قدر پھیکی اور ادھوری لگی یہ صرف شفق ہی جانتی تھی۔ مہندی کی شام بھی انجی کا فون آیا تو وہ بیوٹی پارلر کے خوب صورت ماحول میں بیٹھی تھی تب بھی انجی نے اسے یاد کیا مگر امی نے خود ہی کال ریسیو کی اور اسے بات بھی نہیں کرنے دی۔

بارات میں زیادہ لوگ نہیں تھے اور جب وہ دلہن بن کر اپنے گھر میں آئی تو یہاں بھی سکون کا احساس تھا۔ اس کا کمرہ بڑی سادگی کے ساتھ سیٹ کیا گیا تھا۔

"تو بھلا لگتا ہے یہ کسی دلہن کا کمرہ ہے۔ نہ کچھ تو چمک دمک نہ کوئی ہار پھول کچھ بھی نہیں سجایا گیا اسے بھاری پردے، دبیز قالین، قیمتی شو پیس متاثر نہیں کر سکے وہ اپنے محلے میں ہر لڑکے کی شادی پر جو اس کی دلہن کے لیے کاغذی پھولوں، چمک دمک والی جھنڈیوں سے جو مسہری تیار کی جاتی تھی وہ اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جب وہ دلہن بن کر سسرال میں اترے گی تو ایسا کچھ بھی نہیں ہو گا۔

"ٹی پنک غرارہ سیٹ میں وہ بہت اچھی لگ رہی

ہے۔" سب نے کہا تھا مگر دل سے ریڈ غرارہ نہ پہن سکنے کا دکھ کم نہیں ہو سکا تھا۔ یہ تو امی کی وجہ سے میں ضد نہیں کر سکی مگر اب پوچھوں گی شہریار صاحب سے وہ دل میں تہیہ کر کے آئی تھی۔ مگر شہریار اتنی پیاری بچوں والا اور اتنا اچھا ہو گا یہ اس نے نہیں سوچا تھا بات پکی ہونے کے بعد ایک دو بار فون پر بات تو ہوئی تھی مگر تب اس نے حال احوال پوچھا اور بس مگر یہ جو روبرو تھا اس نے منٹوں میں شفق کو اسیر کر لیا تھا۔

صبح وہ موتیوں کے کام والا نیلا سوٹ پہنے بڑی مطمئن اور مسرور بیٹھی چائے کے گھونٹ لے رہی تھی۔

"ناشتا بھی تو کرو نا یہ اتنا کچھ تمہارے اعزاز میں ہی بنا ہے ورنہ میں تو ناشتے میں ایک گلاس دودھ، سلائس اور فرائی انڈہ لینے کا عادی ہوں۔"

"کیا آپ ایسا سڑا ہوا ناشتا کرتے ہیں اور پلیز اب مجھے مجبور نہ کیجیے گا کہ میں بھی ایسا ناشتا کروں۔"

"نہیں بھئی میں بیگم صاحبہ کو بھلا کس طرح مجبور کر سکتا ہوں۔ آپ کا جو جی چاہے ناشتے میں لیں۔ حکم ہو تو ایک ہی ٹائم پر ایک بار سے حلوہ پوری، اور سے نان چھولے منگوا کر تمہاری پر اتھایا جائے اور سری پائے، نہاری جو چاہو۔"

"بس بس رہنے دیں۔ یہ آپ شوہر حضرات صرف باتیں ہی کرتے ہیں ورنہ اپنی مرضی کے بغیر بیوی کا سانس بھی لینا پسند نہیں کرتے۔"

"اوہ میرے خدا! کس قدر غلط فہمیاں پال رکھی ہیں دل میں کس قسم کے شوہر حضرات کو دیکھتی رہی ہو اور کہاں ملیں ایسی بیویاں جن کی سانسوں کی آمد و رفت پر بھی پابندی تھی۔"

"اب آپ اپنی مثال ہی لیجیے۔" ترچھی نظروں سے شہریار کو دیکھا وہ تو اچھل پڑا۔

"میری مثال ایک رات کی دلہن اور یہ کیا کہہ رہی ہے۔"

"مجھے کتنا شوق تھا۔ شادی کے روز ریڈ غرارہ پہنوں مگر آپ نے پابندی لگا دی۔"

"اوہ!" اس نے ہونٹ سکیڑے۔

"بہت زور دیا میں نے مگر امی اور بھابی نہیں مانیں۔ کہنے لگیں، جب شہریار کو ہی یہ کلر پسند نہیں تو پھر تم کیوں پہنو گی یعنی کہ یہی مطلب ہوا نا کہ اب میری پسند ناپسند ختم ہو چکی ہے جیسا آپ چاہیں گے ویسا ہی ہو گا۔"

"اوہ ہو! مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ ریڈ آپ کا فیورٹ کلر ہے اصل میں بچپن میں چاچیوں، تائیوں کو اسی کلر کو پہنے عجیب سا میک اپ کیے دلہن بنے ناک ناک صورت حال میں دیکھا ہے۔ وہ صورتیں میرے ذہن پر نقش ہو چکی ہیں' نہیں چاہتا تھا کہ میری بیوی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی بن جائے۔ یار! دنیا میں اتنے خوب صورت کلرز ہیں پھر یہ چھچھوڑا سا کلر ہی کیوں؟ اب کل تم ٹی پنک پہنے اتنی خوب صورت لگ رہی تھیں کہ نظریں ہٹانا مشکل تھا۔ ہر لمحہ تمہیں سراہ رہا تھا اور میں خود کو خوش نصیب تصور کر رہا تھا کہ تم میری شریک حیات ہو گئی ہو۔" شہریار نے کچھ یوں سراہا کہ وہ اپنا گلہ اور دکھ بھول ہی گئی۔

"مجھے لگتا ہے ابھی تک بچپنا بہت ہے تم میں۔"

جب وہ اس موضوع کو بھول کر اور بچ ہنس لینے کی تیاری کر رہی تھی شہریار نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"ہاں تو ماں کے آنگن سے اٹھ کر ادھر آئی ہوں۔ بی اے کے پیپر دیے کہ ابھی کمر سیدھی کرنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ رشتہ طے ہو گیا۔ اپنے گھر کی سب سے چھوٹی بیٹی، پہلے لاڈ اٹھانے کو امی اور باجی تھیں پھر بھابی بھی آ گئیں تو میں کہاں سے سوبر ہوتی اور ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔"

"اچھا اس کا مطلب ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ چانسز ہیں۔" وہ شرارت سے مسکرا کر بولا۔

"اچھا میں ذرا انجی کو فون کر لوں۔"

"انجی یہ کیا نام ہے اور پتہ بھی نہیں چل رہا محترمہ ہیں کہ محترم۔"

"انجم نام ہے۔" انجی کا مذاق اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ سنجیدگی سے وضاحت کی۔

"چلو نام بتا کر تو معاملہ اور بھی گمبھیر کر دیا ہے۔"

"او ہو دوست ہے میری' اسی شہر میں بیاہی ہوئی ہے۔"

"اچھا کمال ہے اس شہر میں۔" اس نے آنکھیں پٹپٹا کر حیرت کا اظہار کیا کہ اسے شفق کا ایک دم سے خفا ہو جانا مزہ دے گیا تھا۔

اس نے شہریار کے انداز کو دیکھا ضرور مگر اس وقت انجی یاد آ رہی تھی دوسری کوئی بات کیے بغیر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی' آنے والی ملازمہ تھی اور شہریار کی والدہ کا پیغام لائی تھی وہ ان دونوں کو بلا رہی تھیں۔

"کچھ مہمان آئے ہیں جی۔ اصل میں اسی لیے بلایا ہے۔" وہ وضاحت کر رہی تھی۔ شہریار نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ساتھ لے کر چل پڑا۔

"انجی کو فون" وہ بس سوچ کر رہ گئی۔ پارلر جاتے ہوئے اس کی جٹھانی نے ہی ضروری سامان ساتھ رکھا اور اس میں اس کا سیل فون نہیں تھا۔

تیار ہو کر وہ میرج ہال پہنچی۔ اس کے میکے سے ارم' بھائی' بھیا اور باجی کچھ ہی دیر پہلے فیصل آباد سے سیدھے ادھر ہی پہنچے تھے۔ اس کی ساس نے انہیں فریش ہونے کو کہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی۔ انجی کیوں نہیں آئی؟ اسے تو اب تک ضرور پہنچ جانا چاہیے کہتی تو کیا تھی۔ ٹاؤن شپ' جوہر ٹاؤن کے بالکل برابر میں ہے پھر اتنی دیر' "ابھی بھائی یا باجی ادھر آتی ہیں تو کہتی ہوں انجی سے رابطہ کرنے کی کوشش کریں۔" وہ سوچ ہی رہی تھی کہ شہریار آکر اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

"تمہیں پتا ہے تم کتنی خوب صورت لگ رہی ہو اور ساتھ ہی کسی گہری سوچ میں گم' یقیناً "میرے بارے میں ہی سوچ رہی تھیں نا!"

"نہیں وہ انجی ابھی تک نہیں آئی۔"

"او ہو' کون ہیں یہ محترمہ جو میرے حق پر ڈاکہ ڈال رہی ہیں۔ یاد رکھو مسز! اب تمہاری سوچوں پر صرف ہمارا قبضہ ہونا چاہیے۔"

"مگر اس وقت مجھے انجی کی فکر ہو رہی ہے اس کی طبیعت بھی اچھی نہیں ہے نا۔"

شہریار کے کچھ کہنے سے پہلے مہمان اسٹیج کی طرف آنے اور ان دونوں سے ملنے لگے۔ اس کی نگاہیں ساری تقریب میں انجی کو ڈھونڈتی رہیں مگر وہ نہیں آئی اور اسے اب کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ خدا خیر کرے۔ اس کے ساتھ کہیں کوئی مسئلہ تو نہیں ہو گیا۔

میرج ہال سے گھر آتے اسے رات کے دو بج گئے۔ میکے والے وہیں سے رخصت ہوئے شہریار سے یہ وعدہ لے کر کہ وہ دونوں کل فیصل آباد آئیں گے۔

"صبح پہلے میں انجی کی طرف جاؤں گی۔ اس نے اپنا ایڈریس تو لکھوایا تھا اگر ایڈریس ادھر ادھر بھی ہو گیا ہے تو فون کر کے دوبارہ پوچھ لوں گی۔"

وہ یہ ارادہ کر کے لیٹی تھی مگر ابھی صبح کے سات ہی بجے تھے کہ اس کی ساس نے دروازہ بجا کر جگا دیا۔

"بیٹا! تمہاری امی طبیعت ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے کل لاہور نہیں آسکیں' ان کی وجہ سے تمہارے ابا کو بھی فیصل آباد رکنا پڑا۔ وہ منتظر ہوں گے۔ آپ دونوں جلدی سے ناشتا کر کے نکلنے کی تیاری کریں۔"

اور اسے [illegible] انجی وہ نہیں آئی اور میں نے اس کے نہ آنے کا نوٹس ہی نہیں لیا۔ وہ سیل تلاش کرنے لگی۔ مجھے کم از کم اسے فون تو کر لینا چاہیے۔ سیل پتہ نہیں کدھر تھا اس نے پی ٹی سی ایل کو استعمال میں لاتے ہوئے سوچا مگر بیل ہوتی رہی۔ کسی نے اٹھایا نہیں' ابھی شاید وہ سو رہے ہوں گے۔ مایوس ہو کر ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

☼ ☼ ☼

فیصل آباد وہ ایک دن ہی ٹھہرے کہ شہریار کے بھائی اور بھابی کو واپس سعودیہ جانا تھا۔ شہریار نے ابا سے وعدہ کیا۔ "ہم جلد ہی دوبارہ آئیں گے اور پھر بہت سے دن رہیں گے۔"

"میں اتنے ڈھیر سارے کپڑے لے کر آئی تھی۔ آپ نے پہلے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ ہمیں ایک ہی روز ٹھہر کر واپس آنا ہے۔"

"تم نے اس بارے میں مجھ سے کچھ پوچھا ہی کب تھا۔"

"شکر جانا تو آپ کا فرض تھا ویسے بھی یہ پروگرام آپ نے اور آپ کی امی نے بنایا تھا مجھے تو بس یہی کہا گیا تیار ہو جاؤ اور میں تیار ہو گئی۔ اتنے شوق سے میں یہ سارے کپڑے لے کر آئی تھی۔"

"یہ سب وہاں بھی تو پہنا جا سکتا ہے۔" اب کہ شہریار خاصا سنجیدہ ہو رہا تھا۔

"وہاں پہن کر کسے دکھاؤں گی۔ یہاں تو میری اتنی ساری سہیلیاں ہیں۔ باجی بھی ابھی یہیں موجود ہیں بھالی اور امی ہیں۔"

شہریار نے گہری سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا اور کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ پھر باقی کا جو ایک گھنٹہ وہ یہاں ٹھہرے خاموش ہی رہا اور راستے میں بھی اس نے کوئی بات نہیں کی۔ شفق بہت تھکی ہوئی تھی۔ اس کی خاموشی کو محسوس نہیں کیا کچھ ہی دیر بعد سیٹ کی بیک سے سر ٹکا کر سو گئی۔ آنکھ جب ہی کھلی جب وہ گھر کے پورچ میں گاڑی لانے کے بعد اس کا شانہ ہلا رہا تھا۔

"اوفوہ! اتنی جلدی لاہور آ بھی گیا۔"

"جی اب باقی کی نیند بستر پر پوری کر لیجیے گا۔"

وہ دروازہ کھولے منتظر تھا اسے اترنا پڑا۔ اسی طرح نیند میں جھومتی جھامتی اپنے کمرے تک آئی اور شہریار کی آمد سے پہلے ہی بستر پر گر کر پھر سونے کی تیاری کرنے لگی۔ وہ بیگ لے کر اندر آیا اسے بیڈ پر دراز پا کر ٹھٹکا۔

"شفق! امی اپنے کمرے میں ہماری منتظر ہیں۔ انہیں سلام تو کر لو۔"

"اوہ!" اسے جھٹکا لگا۔

"ہائے وہ کنوار پنے کا زمانہ اپنی مرضی کے دن اور راتیں۔" بگڑے بگڑے موڈ کے ساتھ وہ اٹھ بیٹھی۔ امی واقعی منتظر تھیں اور ظاہر ہے سلام کر کے فوراً تو اپنے کمرے کو روانہ نہیں ہوا جا سکتا تھا انہیں وہاں کچھ دیر بیٹھنا ہی تھا۔

☼ ☼ ☼

صبح ناشتے کے بعد اس نے ایک بار پھر انجی سے رابطہ کیا تھا اور اس کا یہ کہنا میں اس وقت فیصل آباد میں ہوں اس کے لیے کسی جھٹکے سے کم نہیں تھا۔

"کب گئیں تم فیصل آباد؟"

"میں تو رات ہی وہاں سے آ رہی ہوں اور آج صبح پانچ بجے پہنچی ہوں۔"

"مگر کیوں انجی! میں نے ولیمہ کے روز بھی تمہارا اتنا انتظار کیا پھر بعد میں بھی تمہیں فون کرتی رہی۔ تمہارا کوئی جواب مجھے موصول نہیں ہوا۔ آخر بات کیا ہے؟"

"کیا بتاؤں شفق! بہت پریشان ہوں ڈاکٹر نے سیزیرین کا کہا ہے۔ امی کو پتہ چلا تو فیصل آباد لے آئیں کہ لاہور میں پھر میری دیکھ بھال کون کرتا۔ بس دعا کرنا میرے لیے۔"

"اللہ تمہیں صحت دے انجی! میرے حصے کی خوشیاں بھی تمہیں مل جائیں۔"

اس نے پورے خلوص سے کہا تھا۔ اخبار دیکھتے شہریار نے اس دعا پر سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر سر جھٹک کر دوبارہ اخبار دیکھنے لگا۔

"تم ادھر لاہور ہی میں رہتیں میں جو آ گئی ہوں۔ میں تمہاری خدمت کرتی۔"

"ارے نہیں شہریار بھلا کیوں منع کرتے وہ ایسے تنگ دل نہیں ہیں۔"

"بالکل میں ان دو تین روز میں ہی ان کو جان گئی ہوں۔" شہریار کو ہنسی آ گئی جسے چھپانے کو اخبار چہرے کے آگے کر لیا۔

انجی پتہ نہیں کیا کیا بتاتی رہی فکرمندی سے اس کے چہرے کے زاویے بنتے اور بگڑتے رہے۔

"بس کرو اب ورنہ تمہارا چہرہ بالکل ہی بگڑ جائے گا۔" اس نے احساس دلایا تو وہ گھور کر رہ گئی۔

"انجی فیصل آباد چلی گئی ہے۔" رابطہ منقطع کر کے اس نے اپنی جانب سے بڑی اہم اطلاع دی تھی۔

"تو کوئی بات نہیں۔ فیصل آباد کوئی یورپ میں تھوڑا ہی ہے جب تمہارا جی چاہے گا جا کر مل لینا۔"

"پتہ نہیں کیا لکھا ہے ہماری قسمت میں۔ میں فیصل آباد تھی تو وہ لاہور میں لاہور آئی ہوں تو وہ ادھر۔"

"اب اگر آپ مناسب سمجھیں تو کہیں آؤٹنگ کا پروگرام بنایا جائے۔"

"پلیز اس وقت جی نہیں چاہ رہا۔" مگر جب یہی بات شہریار کی والدہ نے بھی ان دونوں سے کہی تو اسے تیار ہونا پڑا۔

☼ ☼ ☼

ہنی مون پیریڈ پھر شہریار کی والدہ کی سعودیہ روانگی جب وہ انجی سے ملی تب اس کی شادی کو پورے دو ماہ ہو رہے تھے اور انجی کا دوسرا بچہ بھی دو ہی ماہ کا ہو رہا تھا۔ شفق نے اس ننھی گڑیا کے لیے خوب شاپنگ کی تھی۔

انجی کے ہاں جانے کے لیے وہ [illegible] تھی اور خوشی اس کے ہر انداز سے چھلک رہی تھی۔

"بہت بچپنا ہے تم میں۔" یہ بات اکثر شہریار کہتا تھا اور آج بھی کہہ رہا تھا۔

"اس میں بچپنے والی کیا بات ہے؟" اس نے شانے اچکائے۔

"تو اور کیا بات ہے بھئی۔ کبھی تم میرے لیے تو اس طرح تیار نہیں ہوئیں۔"

"آپ کا اور میرا ساتھ دو ماہ کا ہے جبکہ انجی کی اور میری دوستی بہت پرانی ہے۔"

"یعنی جب میرا اور تمہارا ساتھ بھی اتنا ہی پرانا ہو جائے گا تب تم میرے لیے بھی یونہی تیار ہوا کرو گی۔"

"یہ تو اس وقت کے تعلقات پر منحصر ہو گا۔" وہ ہنسی۔

"ویسے تب کتنا عجیب سا لگے گا نا جوان بچوں کی اماں اور ایسی تیاری۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ وہ جھینپ گئی۔ سر جھٹک کر گجرے پہننے لگی۔

"ویسے یار! مجھے میک اپ میں لت پت شوخ شوخ رنگوں میں لپٹی خواتین کچھ زیادہ اچھی نہیں لگتیں اور تمہیں تو ان چیزوں کی حاجت بھی نہیں۔ سادہ ہی بہت پیاری لگتی ہو۔"

"مگر مجھے میک اپ کرنا کھلے کھلے شوخ رنگ پہننا بہت بہت اچھا لگتا ہے۔"

"اوہ خدایا! شفق تم تو گولڈ کا یہ اتنا بھاری سیٹ پہن کر تو مت جاؤ۔"

"تو کیا میں نے یہ لاکر میں رکھنے کے لیے بنوائے ہیں۔ یہ پہننے کے لیے ہی ہوتے ہیں جناب!"

وہ بس گہری سانس لے کر رہ گیا کہ جانتا تھا۔ یہ وہ معاملات ہیں جن میں شفق اس کی بالکل نہیں چلنے دے گی۔

انجی کی رہائش ان کے گھر سے دور نہیں تھی ایڈریس بھی مشکل نہیں تھا جب وہ دونوں اس کے ہاں پہنچے۔ وہ چھوٹی بچی کو سلانے کے بعد اپنے بڑے والے بیٹے کو تیار کر کے فارغ ہوئی تھی۔ اسمارٹ سانولی سلونی بڑی بڑی کالی آنکھوں والی انجی جس کے سیاہ چمک دار بال بے حد لمبے تھے۔ وہ شاید کچھ دیر پہلے نہائی تھی۔ بالوں کو ڈھیلی سی چوٹی کی صورت دے کر کمر پر گرا لیا تھا ہونٹوں پر لپ اسٹک شاید آنکھوں میں کاجل ڈالا تھا یا اس کی آنکھیں ویسے ہی اتنی کالی تھیں۔ اس نے ایپل گرین سوٹ پہن رکھا تھا جس پر ہم رنگ موتیوں اور دھاگے کا انتہائی نفیس کام تھا۔ گلے میں ہلکا سا گولڈ کا لاکٹ کانوں میں خوب صورت ذرا ان کے چھوٹے چھوٹے ٹاپس بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں ایک انگوٹھی اور بازو میں نازک سی چار چوڑیاں۔

وہ تو انجی کی گردان سے اس سے ملے بغیر ہی اکتا گیا تھا مگر اسے دیکھ کر خوشگوار حیرت کا احساس ہوا وہ بالکل یہ توقع نہیں رکھتا تھا۔ شفق جیسی کچھ کچھ بے وقوف اور جذباتی سی لڑکی کی دوست اس سے بالکل ہی مختلف اور اتنی پروقار شخصیت کی مالک ہو گی۔ شفق جاتے ہی خوشی سے چیخ کر اس کے گلے لگ گئی تھی۔

اس نے مسکرا کر شفق کے گال پر بوسہ دیا اور شادی کی مبارک باد دی تھی۔

"ہائے انجی! تم کتنی کمزور ہو رہی ہو بھئی مجھے لگتا ہے کسی نے بھی تمہاری ٹھیک طرح سے کیئر نہیں کی خوامخواہ ہی ادھر چلی گئیں سسرال میں ہوتی تو تمہاری دن رات خدمت کرتی۔"

شفق بولتی رہی اس کے بیٹے کو گود میں بٹھا کر بار بار اس کا منہ چومتی رہی جبکہ انجی شاید شہریار کی وجہ سے جھجک رہی تھی۔

"تمہارے وہ سڑیل میاں دکھائی نہیں دے رہے؟"

شفق نے آگے کو جھک کر کچھ دھیمے لہجے میں پوچھا۔ شہریار کو اس کا یوں کہنا اچھا نہیں لگا مگر فی الحال وہ کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا۔

"تمہیں پتہ ہے۔ بزنس مین ہیں اور بزنس مین کو اپنے بزنس کے آگے کچھ بھی عزیز نہیں ہوتا۔ شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔"

"اوہ تم نے بتایا نہیں۔ میں تمہاری عزیز ترین سہیلی شادی کے بعد پہلی بار اپنے میاں کے ساتھ آ رہی ہوں۔"

"بتایا تھا شفو مگر میں ان پر دباؤ تو نہیں ڈال سکتی نا!" اس نے رسان سے کہا۔

"واہ کیوں نہیں ڈال سکتیں اب تم میرے گھر آ رہی ہو اور یہ میرے صاحب آفس جانے کا موڈ بنائے بیٹھے ہوں میں تو قیامت اٹھا دوں کبھی نہ جانے دوں کیوں شہریار؟"

"خواہ رائے بھی لی تو کس بات پر۔" شہریار نے انجی کی طرف دیکھا اس نے بھی نگاہ اٹھائی۔ دونوں ہی مسکرا دیے یقیناً شفق کے بچپنے پر یا اس کی سادگی پر۔

"اپنی گڑیا تو دکھاؤ۔ میں تو اس کے لیے اتنی ساری شاپنگ کر کے آئی ہوں بھئی جب پتہ چلا کہ تمہارے ہاں بیٹی ہوئی ہے انجی! تو میں بتا نہیں سکتی مجھے کتنی خوشی ہوئی' یہ بتاؤ بچی ہے کس پر تم جیسی ہے یا تمہارے سڑے ہوئے میاں جیسی۔"

انجی نے پھر شہریار کی جانب دیکھا اور اسے متوجہ پا کر شرمندہ ہو گئی۔

"آؤ تمہیں اس کے پاس لے چلتی ہوں۔ سو رہی ہے نا ابھی۔" اس نے دھیرے سے کہا اور شفق کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ٹھہرو نا یہ سب تو اٹھا لوں آخر بے بی کے لیے ہی لائی ہوں۔" ہاتھ چھڑا کر وہ پیکٹس سمیٹنے لگی۔

ڈرائنگ روم سے دونوں بیڈ روم میں آ گئیں۔ لگتا تھا آج انجی کی کام والی ماسی نہیں آئی تھی۔ ڈرائنگ روم تو صاف تھا مگر کمرے کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔

خیر اس نے توجہ نہیں دی جا کر بچی کے کاٹ پر جھک گئی۔ "آرام سے اسے جگانا مت بیٹا۔ جاگتی ہے تو بہت شور مچاتی ہے اور مجھے یہ بتاؤ کیسا ہے یہ تمہارا میاں دیکھنے میں تو بہت اچھا لگ رہا ہے تم نے بتایا تھا اسے سنجیدہ مزاج' ذمے دار خاموش طبع لوگ اچھے لگتے ہیں جانا نا۔ اس کے اپنے مزاج میں تو مجھے اظہر والی سنجیدگی محسوس نہیں ہوتی۔"

"شکر ہے خدا کا اظہر بھائی سے بالکل مختلف مزاج ہے۔ اب میں تمہیں دیکھ رہی ہوں۔ کتنی شوخ زندہ دل ہوا کرتی تھیں اور اب کیسی سنجیدہ سی دکھائی دے رہی ہو۔ وہ زیور' لباس کا کلر سینس اب تب مجھے دیکھو تو شہریار کو یہ سب پسند نہیں مگر مجھے منع بھی نہیں کرتے۔ دیکھ لو کتنی تیاری سے آئی ہوں۔" اس نے اپنے شاکنگ پنک کلر کے سوٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"تمہارا یہ سوٹ مجھے بہت اچھا لگا بنوایا ہے یا خریدا ہے؟"

"باجی اسلام آباد سے لائی تھیں۔ تمہیں پسند آیا۔ تم لے لو۔"

"ہاں میرے سسرال میں ایک شادی ہے' اظہر کو تو تم جانتی ہو۔ کنجوس مکھی چوس جتنی قیمت تمہارا یہ سوٹ لگ رہا ہے خریدنا تو دور کی بات وہ تو قیمت سن کر ہی بے ہوش ہو جائیں گے پھر یہ کلر بھی انہیں پسند نہیں آئے گا اس میں تم سے لے کر پہن لوں گی پھر واپس کر

دوں گی۔"

"میرے جہیز اور بری میں ایک سے بڑھ کر ایک جوڑے ہیں تم میری طرف آؤ گی تو سب دکھاؤں گی بس پھر جو بھی پسند آئے لے لینا۔"

"چلو یہ ٹھیک رہے گا اور یہ بتاؤ میاں کو زیادہ سر تو نہیں چڑھا لیا میری طرح۔"

"ارے انجی! شہریار تو خود ہی اتنی سویٹ نیچر کے مالک ہیں کبھی رعب ڈال کر بات کرتے ہی نہیں اور میری ہر بات ماننا تو جیسے اپنا فرض سمجھتے ہیں۔"

"زیادہ خوش ہونے کی بات نہیں بے وقوف شادی کے شروع دنوں میں اسی فیصد مرد ایسے ہی ہوا کرتے ہیں مگر سال گزرتا نہیں اپنا اصلی روپ دکھانا شروع کر دیتے ہیں۔"

"میرا نہیں خیال شہریار ایسے ہو سکتے ہیں۔"

ان میں باتیں ہو رہی تھیں کہ انجی کی کام والی ماسی آ گئی۔

"رکھی! تم صفائی رہنے دو ویسے بھی فرش تو صاف ہی ہیں۔ بس آج کچن کا کام سمیٹ دو۔"

"ٹھیک ہے بی بی جیسے آپ کی مرضی۔" اسے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا ویسے بھی کچن کا کام کرنے کی صورت میں اسے بھی کچھ نہ کچھ حصہ ملنے کی امید تھی۔

"میں نے بازار سے حلیم' چکن کڑاہی اور بریانی منگوائی ہے۔ کھیر بھی لا کر فریج میں رکھ دی ہے۔ تم سلاد اور رائتہ بنا لو۔ اس کے بعد منی کو بھی دیکھ لینا۔ بہت تنگ کرتا ہے۔ ضد پر آتا ہے تو بہلانا مشکل ہو جاتا ہے اسے یہاں قریبی دوکان سے چاکلیٹس اور ٹافیاں دلوا دو۔ آرام سے بیٹھ جائے گا۔ میں اپنے مہمانوں کو اٹینڈ کر لوں۔" انجی نے بیڈ روم کی بکھری چیزوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ لپ اسٹک دوبارہ لگائی پھر مڑ کر رکھی سے بولی۔

"پہلے کولڈ ڈرنک اور پھر چائے تو ڈرائنگ روم میں رکھ جاؤ۔ لو باتوں میں مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ ہائے شفو کیا سوچتا ہو گا تمہارا میاں۔"

وہ جلدی سے رکھی کو ایک بار پھر ہدایت کر کے ڈرائنگ روم کی جانب بڑھی اندر کا منظر کچھ زیادہ خوشگوار نہیں تھا۔ ان لوگوں کا لایا فروٹ کمرے میں بکھرا ہوا تھا اور اس کا بیٹا موسمی اور سیب ہوا میں اچھال کر کھیل رہا تھا۔

"اوہ منی!" اس کی آواز بہت اونچی ہونے لگی تھی پھر شہریار کا بروقت خیال آنے پر رہ گئی۔

"میں نے تو آپ کے صاحب زادے کو بہت منع کیا ہے مگر یہ مانتا ہی نہیں ہے۔" شہریار اس کی سرگرمیوں کو یقیناً انجوائے نہیں کر رہا تھا۔

اتنی دیر میں سیب ایک شوپیس پر لگا اور وہ گر کر کرچیوں میں تبدیل ہو گیا۔ انجی نے بند ہونٹوں سے بچے کو بہت کچھ کہا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر دھکیلنے لگی۔ بچے نے پوری آواز سے رونا اور چلانا شروع کر دیا۔ وہ بری طرح ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا اور انجی کے قابو سے باہر ہو رہا تھا مگر اس نے بھی ہمت نہیں ہاری۔ اسے باہر لے جانے میں کامیاب ہو گئی۔

کھانا کچھ زیادہ پر لطف نہیں تھا مگر انجی کی باتیں اور اس کی توجہ اس کی کمی کو پورا کر رہی تھیں۔ وہ حقیقی محبت سے ایک ایک ڈش پیش کر رہی تھی اور پھر اس کی باتیں شہریار بار بار چونک جاتا تھا۔ آج کے دور میں شوہر کے رنگ میں رنگ جانے والی' اس کی آنکھ کے اشارے سے مزاج کا اندازہ لگانے والی عورتیں بھی ہیں۔ دل سے اصرار کیا تھا اور انجی نے وعدہ کیا تھا وہ ضرور آئے گی۔

"تمہاری دوست سے مل کر مجھے بہت حیرت ہوئی ہے۔" واپسی پر وہ کہہ کر شفق کو حیران کر رہا تھا۔

"کیوں حیرت کیوں ہوئی ہے۔ اتنی اچھی تو ہے بے چاری چھوٹے بچوں کی وجہ سے زیادہ اہتمام نہیں کر سکی مگر وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہے۔ آج بے چاری کی کام والی بھی اتنی دیر سے آئی۔ پتہ نہیں اس نے یہ سب کس طرح کیا ہو گا۔"

"اوہو! میرا یہ مطلب تھوڑی تھا۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ وہ طبیعت میں' عادات میں تم سے بالکل مختلف

ہے بہت ذمہ دار اور سمجھ دار محسوس ہوئی ہے مجھے۔"

"ہائے سچ! مجھے تو پہلے ہی پتہ تھا۔ انجی سے مل کر آپ بھی اس کے گرویدہ ہو جائیں گے۔"

"بچے نے بے چاری کو اچھا خاصا شرمندہ کر دیا میں آپ سے اسے منع کر رہا تھا مگر یہ سن ہی نہیں رہا تھا۔"

"چھوڑیں، بچے تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ انجی بتا رہی تھی۔ باپ کا بہت لاڈلا ہے بہت سر چڑھا رکھا ہے۔ ہوا ہے کسی بات پر ٹوکتے ہیں نہ انجی کو زیادہ روک ٹوک کرنے دیتے ہیں۔"

"یہ رویہ تو بہت غلط ہے۔" وہ دونوں انجی کی باتیں کرتے ہی گھر تک آئے اور گھر آ کر بھی کئی روز تک ان کے درمیان انجی کا ذکر رہا۔

"تم بھی انجی کی طرح لائٹ کلر پہنا کرو نا اور جیولری بھی ویسی ہی خرید لو۔" ایک روز شہریار نے کہا تو اسے انجی کی بات یاد آ گئی۔ شوہر کی ہر بات مان کر اسے سر پر چڑھا لیتا۔ جب یہ بات یاد آئی تو اس نے جھٹ نفی میں سر ہلا دیا اور بولی۔

"ہر کسی کی اپنی پسند ہوتی ہے اور پھر یہ لائٹ کلر یہ سادہ سا روپ یہ انجی کی اپنی پسند تھوڑی ہے۔ یہ تو اس کے میاں کی ضد ہے۔"

"ضد تو تم کہہ رہی ہو ناں انجی نے تو اپنی ازدواجی زندگی کے سکھ کی خاطر اسے خوشی سے اپنا لیا ہے۔"

"ہونہہ خوشی! اپنا آپ مار کر بھی بھلا کسی کو خوشی ملی ہے۔" اس نے لپ اسٹک ڈریسنگ ٹیبل پر پٹخی شہریار خاموش ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

انہوں نے انجی کو اپنے ہاں انوائٹ کیا۔ "کھانا ہم کسی اچھے ریسٹورنٹ میں جا کر کھائیں گے۔" شہریار نے رائے دی۔

"لو یہ کیا بات ہوئی گھر بلائیں پھر یہاں سے کھانا کھلانے کسی دوسری جگہ لے جائیں۔ میں خود سب پکا کر گھر میں بناؤں گی۔"

"چلو ٹھیک ہے پھر مجھے لسٹ بنا کر دے دو۔ ابھی جا کر سب لے آتا ہوں۔"

"آپ اکیلے کیوں میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔"

"تم جا کر کیا کرو گی اتنے سیر سپاٹوں کے بعد بھی تمہارا جی نہیں بھرا۔"

"نہیں مجھے اچھا لگتا ہے بس میں کسی اچھے سے اسٹور سے خود یہ سب خریدوں گی۔"

"اچھا بابا! چلو لیکن اب کوئی کام والا سوٹ پہن کر شوخ سی لپ اسٹک مت لگا لینا۔"

"توبہ ہے۔ آپ کو کبھی تاسا ہر بات پر اعتراض کی عادت ہوتی جا رہی ہے۔ اب میری نئی نئی شادی ہے کپڑے تو میرے پاس ایسے ہی ہوں گے نا کچھ ہلکے کام والے کچھ بھاری کام والے۔"

"پھر تم نئے لے لو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کسی روز انجی کے ساتھ جا کر شاپنگ کر لوں گی۔" "یہ بات" شہریار نے اطمینان سے سر ہلایا کہ یقیناً انجی اس کی بہتر راہنمائی کر سکتی تھی۔

تین گھنٹے میں سامان خرید کر باہر سے کھانا کھا کر وہ دونوں گھر آئے تو شہریار سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا جبکہ وہ سیل لے کر لاؤنج میں بیٹھ گئی اور انجی سے باتیں کرنے لگی۔ اپنے اور شہریار کے درمیان کپڑوں پر ہونے والی باتیں بھی بتائیں اور یہ بھی کہ اب وہ انجی کے ساتھ بازار جا کر کچھ سادہ سے کپڑے خریدنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

"تم نے خواہ مخواہ گھر پر سب ارینج کر لیا کہیں باہر ہی کھانا کھا لیتے اب تم پکانے میں ہی لگی رہو گی۔"

"تم بھی میرے پاس کچن میں ہی آ جانا اور یہ دونوں میاں صاحبان اور بچے لاؤنج میں بیٹھیں گے۔"

"ہاں مگر تم پہلے مجھ سے پوچھ تو لیتیں۔"

"اچھا چلو اب تو میں سب پوچھ لے آتی ہوں۔"

"کیا کیا لائی ہو؟" انجی نے پوچھا۔

"دال، چکن، بیف، کولڈ ڈرنکس۔" وہ ایک ایک کر کے سب گنوانے لگی۔

"اتنا کچھ تم کیسے پکاؤ گی؟"

"ارے انجی! میری جان! تم میری فکر نہ کرو۔ تم تو چار سال پہلے بیاہ کر چلی گئی تھیں۔ تمہیں نہیں پتہ اس عرصے میں میں تو کھانا بنانے میں ماہر ہو چکی ہوں۔ میرے لیے کچھ بھی مشکل نہیں۔ تم کھاؤ گی تو داد دو گی۔ ہاں بس ایک بات کا دکھ ہے۔ شہریار کو ہوٹلنگ کا بہت شوق ہے۔ وہ گھر کے کھانے کچھ خاص رغبت سے نہیں کھاتے حالانکہ میرے پکائے کھانوں کی ہر کوئی تعریف کرتا ہے۔"

"اس روز میرے گھر کا کھانا تو انہیں اچھا لگا تھا؟" انجی کو وہ سب بتا تو چکی تھی پھر بھی وہ دوبارہ پوچھ رہی تھی۔

"ہاں ہاں تیز مرچ مسالے انہیں پسند ہیں۔"

اور انجی نے سوچا اسے کہتے ہیں قسمت۔ مجھے گھومنے پھرنے کا باہر کھانا کھانے کا کتنا شوق ہے مگر میرے میاں کے نزدیک گھر کی پرسکون لائف چھوڑ کر باہر کے ہنگاموں میں پیسہ بہانا وقت اور پیسے دونوں کا ضیاع ہیں۔

"شادی کے شروع دنوں میں کبھی کھانا باہر کھایا تھا اب تو ترس ہی گئی ہوں۔ اب موقع مل رہا تھا تو اس شفق کی بچی نے مجھ سے پوچھے بغیر فیصلہ کر کے ضائع کر دیا۔ آج ایک چکر پارلر کا لگا لینا چاہیے۔ اسکن کچھ رف ہو رہی ہے۔ نئے جوتے بھی لینے چاہئیں ساتھ میچنگ بیگ اور نیل پالش کا لائٹ مگر خوب صورت سا کلر اور جاتے ہوئے پھولوں کا خوب صورت سا گلدستہ لے جاؤں گی۔ باقاعدہ گفٹ لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یوں بھی ان کی شادی کو ابھی عرصہ ہی کتنا ہوا ہے سب کچھ تو ہو گا ان کے پاس۔"

ابھی وہ یہ سب سوچ ہی رہی تھی کہ ڈور بیل بجنے لگی۔

"او ہو! کون آ گیا؟" دروازہ کھولا تو برابر میں رہنے والے احسان صاحب کھڑے تھے۔

"السلام علیکم بھابی!" چہرے پر مسکراہٹ انداز میں بے تکلفی تھی۔

"ارے احسان بھائی! کیسے ہیں آپ؟" بڑے دنوں کے بعد شکل دکھائی۔

"آیئے نا! باہر ہی کیوں کھڑے ہیں۔ پلیز اندر آ جائیں۔"

"وہ بھابی! آپ کو تو پتہ ہے میری بیوی کا۔" وہ کھسیا کر ہنسے اور انجی کے چہرے پر ایک دم سے ہمدردی کا تاثر لہرانے لگا۔

"میں دراصل یہ پوچھنے آیا تھا۔ دو انڈے ہوں گے۔ وہ آج بیگم نے جو کچھ بنایا ہے نا۔ حلق سے اترنا مشکل ہو رہا ہے۔"

"اوہ!" انجی نے افسوس میں ہونٹ سکیڑے پھر بولی۔ "خوش نصیب ہیں روحانہ بھابی کہ شوہر کو پسند کا کھانا نہ ملا تو پڑوس سے انڈا لینے چلے آئے۔ کبھی اگر میرے میاں جیسے ہوں نا۔" سر جھٹکا ایک بار پھر افسوس میں اوہ کیا اور بات ادھوری چھوڑ کر کچن میں چلی گئی واپس آئی تو انڈے ہاتھ میں تھے اور وہ کہہ رہی تھی۔

"آیئے نا احسان بھائی! میں آپ کو کھانا بنا دیتی ہوں۔"

"جی تو چاہتا ہے بھابھی مگر میری بیگم!" عجیب بے چارگی کا احساس دلاتا لہجہ تھا کسی ناپسندیدہ ہستی کا ذکر اور مظلومیت کی انتہا۔

"چلیے ادھار رہا۔ ویسے مجھے بہت ترس آ رہا ہے آپ پر۔ آپ اس وقت بھی آملیٹ لیں گے۔ اتفاق سے آج میں نے سالن نہیں بنایا ورنہ آپ کو ضرور دیتی۔"

احسان مشکور سا چلا گیا یہ سوچتا ہوا کس قدر خوش نصیب ہے اس عورت کا شوہر۔ یہ خیال نہیں آیا پوچھ ہی لے۔ شوہر گھر آنے والا ہو گا۔ ابھی تک سالن نہیں بنایا اسے کیا خالی روٹی پیش کرے گی۔

☆ ☆ ☆

شفق نے انجی کے لیے بھرپور تیاری کی تھی وہ دو

دن پہلے سے ہی کچن میں مصروف ہو گئی تھی اور شہریار بھی پوری دلچسپی لے رہا تھا اور اس شام اسکائی بلیو ساڑھی جس پر سلور ستاروں کا ہلکا سا کام تھا سلور جیولری پہنے وہ تین سالہ بچی کے ساتھ شوہر کے بغیر ہی چلی آئی تو دونوں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

"اظہر بھائی نہیں آئے؟" شفق نے پوچھ ڈالا۔ جواب میں پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر دوڑ گئی۔

"ہر شخص شہریار نہیں ہوا کرتا۔ میری جان! کہ تم نے کہیں چلنے کو کہا اور تیار ہو گیا۔ قدر کرنا سیکھو اس کی۔"

"اوہو، آج تو انہیں آنا چاہیے تھا۔ تم اصرار کرتیں۔" شفق نے اس کی بات نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"تم کچھ سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہر بات میں ضد کیوں شروع کر دیتی ہو۔ ہماری دوست آ گئیں۔ کیا یہ کافی نہیں ہے۔" شہریار نے شفق سے زیادہ انجی کو تسلی دی تھی جو یوں اکیلے چلے آنے پر رنجیدہ بھی (تھیں)

"ممّا! آپ تو کہتی تھیں۔ چاکلیٹ لے کر دوں گی۔" اس کے بیٹے کا موڈ بگڑنے لگا۔

"آپ اندر چلیے۔" شہریار کو خیال آیا۔ وہ ابھی تک گیٹ پر ہی کھڑے تھے۔ کتنی بری بات ہے مہمان کو اندر بٹھانے کے بجائے یہیں کھڑے کھڑے سوال و جواب شروع کر دیے جائیں۔ یہ شفق بھی نا بس پوری احمق ہے۔

"ممّا! چاکلیٹ!" اس کا بیٹا اب پیر پٹخنے لگا۔

"ہو تو نا آنٹی لا رہی ہیں تمہیں چاکلیٹ۔" شفق نے بڑھ کر اس عام سی صورت والے سڑیل مزاج بچے کو گود میں بھر لیا اور لگاتار کئی بوسے بھی دے ڈالے۔

"بڑی والی چاہیے۔" اس کی فرمائش ہوئی۔

"وہ بھی ملے گی۔ پتا ہے مجھے بھی چاکلیٹ کا بڑا شوق ہے اور یہ تمہارے انکل بالکل نہیں کھاتے۔ میں بھی تمہاری طرح ضد کر کے لیتی ہوں۔" وہ بچے کو گود میں اٹھا کر کچن کی جانب بڑھتے ہوئے جا رہی تھی۔

"پتا نہیں کب سدھرے گی۔ یہ شفقو۔" اس کی باتوں پر شرمندہ انجی ہو رہی تھی۔

"آیئے۔" شہریار اسے لے کر ڈرائنگ روم کی جانب بڑھا اور بولا۔ "آپ جیسی دوست کی محبت اسے نہیں بدل سکی تو آپ کیا بدلے گی۔ پتہ ہے کبھی کبھی تو میں اس کی بچکانہ فرمائشوں پر حیران ہو جاتا ہوں۔"

"دراصل گھر میں چھوٹی ہے نا اور سب ہی خوب لاڈ پیار بھی کرتے تھے اور جہاں تک میرا تعلق ہے تو جناب ہم تو زمانے کی ٹھوکروں میں پل کر جوان ہوئے ہیں اور آج تک اچھے دنوں کی امید پر ہی جی رہے ہیں۔"

"آپ اتنی مایوس کیوں ہیں انجی! ان شاء اللہ آپ بہت اچھا وقت بھی دیکھیں گی۔"

"میں مایوس نہیں ہوں شہریار صاحب! اور اب اپنی دوست کو خوش دیکھ کر تو میں سب بھول ہی گئی ہوں۔"

"انجی! بچی کو کیوں نہیں لائیں۔ کس کے پاس چھوڑ آئی ہو؟" شفق بھی بیٹے کو لیے اندر چلی آئی تھی اور اس وقت بچے کے ہاتھ میں چاکلیٹ کا پیکٹ تھا۔

"وہ ہماری ایک رشتے کی خالہ آئی ہوئی ہیں۔ ان ہی کے پاس چھوڑ آئی ہوں۔ یہ ایک شیطان کیا کم ہے توبہ شہریار صاحب! کیا بتاؤں آپ کو صبح سے شام ہو جاتی ہے۔ میرے کام ختم ہونے میں نہیں آتے۔ بس میری عادت ہے۔ ہر چیز کو ہر وقت درست چمکتا دیکھنا چاہتی ہوں جب تک گھر کا کونہ کونہ چمکا نہ لوں۔ بچوں کی ہر شے ٹھکانے پر نہ رکھ لوں۔ مجھے چین ہی نہیں آتا۔"

اور شہریار کو یاد آ گیا آج صبح شفق نے اس کی تین شرٹیں پریس کر کے اسٹینڈ پر ہی چھوڑ دی تھیں اور اس کے ٹوکنے پر کہا تھا۔

"اوہو آپ ہر بات کو سر پر کیوں سوار کر لیتے ہیں۔ دودھ بوائل کرنے کے لیے رکھا تھا۔ پہلے یہ کام کر لوں دودھ خراب ہوا تو زیادہ نقصان ہو گا اور کچن میں چلی گئی

تھی۔

"ارے انجی! تمہاری صحت بھی ٹھیک نہیں۔ تم پہلے پوری طرح صحت یاب تو ہو جاؤ گھر کے کاموں کا کیا ہے یہ تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ یوں خود کو ہلکان مت کیا کرو۔" شفق نے ہمدردی سے کہا تھا۔

"تمہیں نہیں پتہ جن لوگوں کے مزاج میں نفاست ہو انہیں ہر چیز کو جگہ پر رکھے بغیر چین نہیں آتا۔ میرا تو اتنا مزاج ہی ہے مگر یہ جو تم ہو نا۔" اس نے شفق کی جانب انگلی سے اشارہ کیا وہ ہنس پڑی اور بولی۔

"میں خود بھی کوئی پھوہڑ عورت نہیں ہوں جناب تو آپ کو چونکہ بیٹھے بیٹھے حکم دینا ہوتا ہے اس لیے حد کر دیتے ہیں۔"

"اب کل ہی کی لے لو۔ رات کو مجھے اخبار میں ایک اداریہ دیکھنا تھا اور وہ اخبار جو اسی روز کا تھا ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملا۔"

"میں نے کہا تو تھا وہ ملازمہ کا بیٹا ملازمت کی تلاش میں ہے کبھی کبھی وہ اس کے لیے اخبار لے جاتی ہے شاید وہی لے گئی ہوگی۔"

"شاید! ارے بولو یہ شفقو تمہیں یہ پتہ ہی نہیں کہ تمہاری ملازمہ تمہارے گھر سے کیا کیا لے کر جا رہی ہے۔ تو یہ حد ہوتی ہے لاپروائی کی۔ پتہ ہے عورت اپنے شوہر کے گھر کی امین ہوتی ہے۔ ایک ایک چیز کی نگران۔ تم ملازمہ پر نظر رکھا کرو ان لوگوں کو ذرا سی ڈھیل ملنے کی دیر ہے۔ بس چلے تو پورے گھر کا صفایا کر کے چلتے بنتے ہیں۔"

"اللہ نہ کرے اور یوں بھی یہ تو بڑی ہی بھلی مانس بھولی بھالی غریب سی عورت ہے۔" انجی نے [illegible] شہریار کی جانب دیکھا اور بولی۔

"دیکھا وہی بات یہ جتنی بھولی ہوتی ہیں اتنا ہی خود کو مظلوم بنا کر پیش کرتی ہیں اور میں تو ملازمہ رکھنے کے سرے سے خلاف ہوں یہ تو آج کل صحت اجازت نہیں دیتی اس لیے مجبوری ہے۔"

"ماما اور چاکلیٹ چاہیے۔" اتنی دیر میں اس کا بیٹا ایک پیکٹ ختم کر چکا تھا۔

"بری بات بیٹا!" انجی نے پیار سے بیٹے کو سمجھایا مگر بچے پر اس پیار کا الٹا اثر ہوا نیچے لیٹ کر ٹانگیں چلانے اور چیخنے لگا۔

"اچھا اچھا میں ابھی اور لا دیتی ہوں۔" شفق نے اٹھ کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور ایک بار پھر اسے لے کر باہر نکل گئی ساتھ میں انجی کو بھی آنے کو کہا۔

"کیا کچھ بنا لیا ہے لاؤ میں کچھ ہیلپ کروں تم نے خوامخواہ گھر پر یہ سب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ آرام سے کسی اچھے ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے۔"

"تمہارے لیے یہ سب کر کے مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے انجی! دیکھو ذرا میں نے کیا کیا بنا لیا ہے۔"

"شہریار کو تم سے بہت شکایتیں ہیں؟" راز داری سے پوچھا۔

"نہیں بالکل بھی نہیں۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو شکایتیں تو نہیں کہنا چاہیے بس انہیں سنجیدہ مزاج بیوی کی آرزو تھی حالانکہ خود یہ خاصے خوش مزاج ہیں مگر چاہتے تھے بیگم گھریلو قسم کی ہو۔ اسے شاپنگ کا کریز نہ ہو۔ بجنے سنورنے میں بھی اعتدال سے کام لے وغیرہ جبکہ مجھے گھومنا پھرنا رات کو دیر تک جاگ کر باتیں کرنا دن میں دو دو بار لباس تبدیل کرنا ساتھ میں میچنگ جیولری استعمال کرنا اچھا لگتا ہے کہ یہی تو دن ہیں میرے۔ میں جانتی ہوں میری زندگی کے یہ دن لوٹ کر تو نہیں آئیں گے۔"

"بالکل ٹھیک کر رہی ہو تم۔ یہ مرد تو ہر بات میں اپنی ہی چلانا چاہتے ہیں۔" انجی نے اسے سمجھایا پھر ڈشز چیک کرنے لگی۔

پھر شفق کے بہت منع کرنے کے باوجود ٹیبل انجی نے سیٹ کی۔ اس کے اصرار پر بولی۔

"تم بس میرا بیٹا سنبھال لو میرے لیے یہی بہت ہے۔ بچی صبح سے دو بچوں کے ساتھ لگی ہوں تو شام ہو جاتی ہے۔"

"چلو پھر ٹھیک ہے اسے میں دیکھ لیتی ہوں شفقو آنٹی کے ساتھ دوستی کرو گے نا!" وہ بچے سے باتیں کرنے لگی۔

اسے اکیلے ٹیبل سیٹ کرتے دیکھ کر شہریار نے ہیلپ کی کوشش کی مگر اس نے منع کر دیا۔

"مجھے اس کی عادت نہیں اظہر بھی ایسے کسی کام کو کرتے جو نہیں ہیں اب آپ ہاتھ بٹائیں گے۔ مجھے بڑا عجیب سا لگے گا۔"

اس نے ٹیبل سیٹ کر کے دونوں کو آواز دی۔ پھر دونوں کو کھانا بھی خود ہی پلیٹوں میں نکال کر دیا بلکہ شہریار کو کھانے کے دوران بھی بار بار پوچھتی رہی۔ مختلف ڈشز اس کی جانب بڑھاتی رہی' جب اس نے پانی کے گلاس کی جانب ہاتھ بڑھایا تو جھٹ پانی انڈیل کر دیا۔

"یہ کباب تو اور لیں نا۔ اچھا چاول نہیں تو یہ روٹی لے لیں۔" وہ کتنی توجہ دے رہی تھی۔ شفق نے بھی ایسا نہیں کیا تھا اس وقت بھی وہ بچے کو کھانا کھلانے میں مصروف تھی۔ شہریار کی طرف تو خیر اس طرح کا دھیان اس نے کبھی نہیں دیا تھا۔ آج تو اس کی اپنی پلیٹ بھی ٹھنڈی ہو رہی تھی۔

شفق اچھا کھانا بناتی تھی مگر شہریار کو آج کھانے پر جو بہت مزہ آیا اس کی وجہ اس کا اچھا کھانا بنانا نہیں۔ انجی کا توجہ سے سب کچھ پیش کرنا تھا۔

"بہت خوش نصیب ہے انجی کا میاں ہاں!"

اور جب رات کے ساڑھے دس بجے وہ دونوں اپنی گاڑی پر انجی اور اس کے بچے کو ڈراپ کرنے گئے تھے اظہر صاحب گھر آ چکے تھے۔ بچی کو دودھ کا فیڈر بنا کر پلانے کے بعد اب وہ دو روز پہلے بنائے گئے دال چاول فریج سے نکال کر گرم کرنے کے بعد کھانے بیٹھے تھے۔

"اظہر بھائی! ہم نے تو آپ دونوں کو انوائٹ کیا تھا پھر آپ کیوں نہیں آئے؟" شفق پوچھ رہی تھی جبکہ شہریار کو یہ سانولا قدرے فربہ سنجیدہ سے چہرے والا مرد بالکل اچھا نہیں لگا تھا انجی کے ساتھ تو بالکل سوٹ نہیں کرتا۔

"بس کچھ کام تھا اس لیے آ نہیں سکا۔ میری طرف سے بہت بہت معذرت ویسے بھی جہاں انجی چلی جائیں میری ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اکیلی ہی کافی ہوتی ہیں۔"

پتہ نہیں یہ تعریف تھی یا کیا تھا شفق نے تائید میں سر ہلایا جبکہ انجی گھر آتے ہی بہت سنجیدہ ہو گئی تھی اور لب بھینچے کھڑی تھی۔ اس نے ان دونوں کو اندر آنے کو بھی نہیں کہا۔ یہاں تک کہ شفق نے جانے کی اجازت چاہی بچے کو انجی کی گود میں دیا کہ وہ گاڑی میں ہی سو گیا تھا اور خدا حافظ کہہ کر گاڑی میں آ بیٹھی۔

"عجیب سا ہے انجی کا شوہر!" شہریار نے تبصرہ کیا۔

"ہے نا' میں تو خود بھی کہتی ہوں وہ انجی کے قابل ہی نہیں۔ بس انجی کے گھر والوں نے ایک بوجھ کی طرح اسے سر سے اتار پھینکا کہ اوپر تلے یہ پانچ بہنیں ہیں بھائی کوئی ہے نہیں۔ جو رشتہ آیا ہاں کر دی' یہ نہیں دیکھا' انجی کتنی اونچی سوچ رکھنے والی' کتنی خوب صورت اور منفرد سی لڑکی ہے اور یہ اظہر مجھے تو شادی کے روز بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ انجی کی قسمت کی خرابی پر میں تو بہت روئی تھی مگر انجی میں بہت صبر ہے' اپنے دکھ کسی سے نہیں کہتی' ادھر میرے میکے میں تو سب ہی سمجھتے ہیں کہ انجی بہت خوش قسمت ہے۔"

بات ہو انجی کی تو شفق گھنٹوں بول سکتی تھی اور یہاں تو سننے والا بھی پوری طرح متوجہ اور اس سے متفق تھا۔

☆ ☆ ☆

اگلے روز دن کے گیارہ بجے کے قریب جب شفق چھوٹے موٹے سب کام نمٹا کر وارڈ روب سیٹ کرنے کے خیال سے اٹھی تھی کہ انجی کا فون آ گیا وہ کہہ رہی تھی ابھی ابھی سو کر اٹھی ہوں اور پہلا کام یہی کر رہی ہوں۔

"ارے انجی لیٹ گیارہ بج رہے ہیں۔"

"ہاں بس وہ اصل میں بچے بھی لیٹ اٹھتے ہیں تو میں سوتی بھی ہوں یہی وقت ہے پھر تو سارا دن گھر سیدھا کرنے کا بھی موقع نہیں ملتا۔ بتاؤ میاں جی گھر پر ہیں چلے گئے۔ لو وہ تو صبح آٹھ بجے ہی نکل کھڑے ہوتے ہیں۔"

"اچھا یہ بتاؤ ناشتہ تو تم ہی بنا کر دیتی ہوگی۔"

"ظاہر ہے انجی! میں تو صبح چھ بجے بستر چھوڑ دیتی ہوں۔"

"ہاں ہاں یہ سب تو کرنا پڑتا ہے یہ بتاؤ۔ کل میرے جانے کے بعد کیا باتیں ہوئیں۔ کچھ میرا ذکر بھی ہوا کہ نہیں۔" اس کے انداز میں بلا کا تجسس تھا۔ اسی وقت ڈور بیل ہونے لگی۔ شفق کا دھیان بٹ گیا تو لی۔

"کچھ خاص نہیں ہم لوگ اصل میں تھکے ہوئے تھے تو جلدی سو گئے۔"

"شہریار کو میری تمہاری دوستی پر اعتراض تو نہیں ہے؟" انجی نے پھر بات نکالی۔

"وہ انجی باہر گیٹ پر کوئی ہے۔ میں پھر بات کروں گی۔"

☆ ☆ ☆

کچھ دنوں کے بعد میکے جانے کا اتفاق ہوا شہریار کو تو ایک دن رہنا تھا اسے چھوڑ کر اگلی صبح واپس آ جانا تھا جبکہ اس کا ارادہ تھا۔ چار روز ٹھہرنے کا تھا کہ قریبی عزیزوں میں شادی تھی میکے آتے ہی وہ مہمان بن کر بیٹھنے کے بجائے بھابھی کے پاس کچن میں آ گئی۔

"لایئے بھابھی! میں کچھ ہیلپ کرواتی ہوں۔"

"ارے نہیں شفق! کام کوئی اتنا زیادہ نہیں ہے ہاں تم بتاؤ کیسی گزر رہی ہے؟ میرا خیال ہے شہریار تو بہت اچھے مزاج کا ہے۔ تمہارا بہت خیال بھی رکھتا ہو گا۔"

"بس بھابی! سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ بیوی کی ہر بات میں مین میخ نکالنے والے۔" اسے انجی کی بات یاد آئی اور اسی کے انداز میں دہرا بھی دی۔

"ابھی تمہاری شادی کو عرصہ ہی کتنا ہوا ہے۔ ہر شخص کا اپنا مزاج ہوتا ہے ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھنے اور اس میں ڈھلنے میں وقت تو لگتا ہے۔"

"بڑی مشکل سے منایا ہے انہیں کہ مجھے تین چار دن کے لیے فیصل آباد چھوڑ دیں۔"

"یہ تو اس کی محبت ہوئی نا۔ تمہارے بغیر رہ نہیں سکتا۔"

"کہاں بھابھی! مرد بڑے مطلبی ہوتے ہیں۔" اسے انجی کے پڑھائے سبق یاد تھے۔

"کون تمہیں اپنی دوست انجی کی طرف؟" بھابی نے اسے سمجھانے کا کام پھر کسی وقت پر اٹھاتے ہوئے موضوع بدلا۔

"ارے لو ایک بار قریب ہی تو رہتی ہے ابھی کل بھی آئی تھی۔ اسے ایک شادی میں جانا تھا۔ میرے کچھ ڈریسز لے کر گئی ہے۔"

"تمہارے؟ مگر کیوں اس کے پاس کمی ہے کیا اور تمہارے بالکل نئے والے تو لے نہیں گئی جو تم نے ابھی پہنے بھی نہیں ہوں۔"

"ہاں وہی تو مگر پھر کیا ہوا وہ میری دوست ہے۔"

"شہریار کو پتا ہے؟" ارم نے پوچھا۔

"لو اس میں انہیں بتانے والی کیا بات ہے اور اگر پتہ چل بھی جاتا ہے تو وہ کیا برا مانیں گے۔ وہ تو خود انجی سے اتنے متاثر ہیں۔" چچی ارم کے ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے بھیجا۔

"شہریار کے ساتھ جاتی ہو اس کے گھر' جتنی دیر وہاں رہتی ہو وہ بھی ادھر ہی رہتا ہے یا تمہیں ڈراپ کر کے آ جاتا ہے؟"

"اب تو شہریار کی بھی بہت دوستی ہو گئی ہے۔ اصل میں متاثر تو وہ پہلی ملاقات میں ہی ہو گئے تھے۔ اب تو جتنی باتیں مجھ سے ہوتی ہیں اتنی ہی ان سے ہوتی ہیں۔"

"اور اس کا میاں کیا۔ اس سے بھی شہریار کی دوستی ہو گئی ہے؟"

"وہ گھر ہوتا ہی کہاں ہے آپ کو نہیں پتا بھابی! انجی بہت دکھی عورت ہے اس کی گھریلو زندگی بہت ڈسٹرب ہے' مجال ہے جو اس کا میاں گھر کو ذرا سا بھی وقت دے' پتہ نہیں کہاں کہاں پھرتا رہتا ہے۔ اگر بڑا بزنس مین ہوتا تو گھر میں بھی خوش حالی دکھائی تو دیتی مگر وہاں پرانے سے برتن' اڑے رنگوں کی بیڈ شیٹس۔ بس ہر شے میلی میلی۔ یہ تو انجی کی ہمت ہے چپ چاپ لب

"انجی جیسی بیوی اور تمہارے بارے میں کیا کہتے ہیں شہریار؟" ارم بہت سنجیدہ دکھائی دے رہی تھی۔

"میرے بارے میں" وہ زور سے ہنسی "کہتے ہیں بہت پچھتاتا ہے تم ابھی لاپروا ہو اور بچوں کی طرح ضد بھی کرتی ہو۔"

"تعریف بھی تو کرتے ہوں گے۔" ارم ہنسی وہ اس کا ساتھ نہیں دے سکی۔

"پتا ہے انہیں میرا کام والے کپڑے پہننا برائٹ کلر کی لپ اسٹک استعمال کرنا بالکل پسند نہیں اور آئی شیڈو سے تو جیسے انہیں الرجی ہے۔ کہتے ہیں انجی سے ہی سبق سیکھو علیقہ نہیں آتا۔ تم لوگ اتنی پرانی دوست ہو تمہارے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔"

"انجی تو ہمیشہ شوخ کلر استعمال کرتی تھی بلکہ ضرورت سے زیادہ بھڑکیلے کپڑے پہنتی تھی۔"

"ہاں میں تو خود حیران ہوئی جب وہ ایک بدلے ہوئے روپ میں سامنے آئی۔"

"اس نے ملنے سے پہلے تم سے پوچھا تھا کہ شہریار کو کیا اچھا لگتا ہے اور کیا پسند نہیں؟"

"اس نے کیا پوچھنا تھا۔ میں نے خود ہی سب کچھ بتایا تھا۔ آپ کو پتہ ہے انجی سے میں بھلا کچھ چھپا تھوڑی سکتی ہوں۔"

"پھپھو ٹھیک، میں جانتی ہوں۔ تمہارے دل میں جو محبت انجی کے لیے ہے وہ میرے لیے نہیں ہے مگر تم میری پھپھو زاد بہن بھی ہو اور نند بھی میں تمہارے لیے کبھی برا نہیں سوچ سکتی۔ تم سے جو بھی کہوں گی۔ غور سے اور ٹھنڈے دل سے سننا۔ کچھ عورتوں کو نمایاں رہنے اور دوسروں پر چھا جانے کا شوق ہوا کرتا ہے۔ میں نے آج سے بہت سال پہلے ذہن میں بیاہ کر

بھیا نے اچانک اطلاع دی۔

"بس سب کچھ تیار ہے۔" بھابی جلدی جلدی بولیں اور اسے برتن ٹیبل پر رکھنے کو کہا۔

پھر مصروفیت میں یہ بات نقل کرنے کا اس روز موقع نہیں ملا۔

اگلے روز کچھ مہمان چلے آئے۔ پھر شادی کا فنکشن ارم جو بات کہنا چاہتی تھیں موقع نہیں مل رہا تھا مگر یہ بات دل سے نکل نہیں رہی تھی۔

جب وہ شہریار کے ساتھ واپسی کے لیے تیار تھی تو بس ارم اتنا ہی کہہ سکی۔

"انجی کی طرف کم جایا کرو۔ اپنے گھر کی جانب اور شوہر کی جانب توجہ دو۔"

اور بھلا اتنی سی بات کا انجی کی دیوانگی پر کیا اثر ہو سکتا تھا جبکہ وہ یہ بھی جانتی تھی ارم بھابی شروع سے ہی انجی کو ناپسند کرتی ہیں۔

لاہور پہنچتے ہی اس نے انجی کو اپنی واپسی کی اطلاع دی۔

"میری طرف آؤ ناں بلکہ میں آج دوپہر کو آجاؤں گی کھانا بھی مل کر کھائیں گے۔"

"سچ انجی میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی کیا بات ہو سکتی ہے۔ آجاؤ بہت سی باتیں کرنا ہیں۔"

"وہ شہریار کو تو اعتراض نہ ہو گا کہ اتنے دنوں کے بعد بیگم آئی اور سہیلی بھی آ پہنچی ہے۔"

"ارے وہ کوئی گھر میں تھوڑی بیٹھے ہیں۔ آفس گئے ہیں۔"

"آفس یعنی آج بھی آفس ہے انہیں تمہارے آنے کی کوئی خوشی نہیں ہے۔"

"خوشی تو ہے مگر جاب بھی تو ضروری ہے ناں انجی!"

[illegible]

سے بکھرا گھر سمیٹنا تھا لاہور آئی تھی مگر صرف جھاڑو پوچا لگائی تھی یہ بالی ڈسٹنگ بھی کرنا تھی۔ شہریار کے بہت سے میلے کپڑے بھی رکھے تھے۔ استری کے لیے بھی اس نے نکالے تھے۔ سب سے ابتر حال میں کچن تھا۔ وہ جلدی جلدی سب سمیٹ رہی تھی۔ جب انجی آئی۔ کچن سمٹ چکا تھا مگر وہ رف سے حلیے میں تھی اسے نہانے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔

"ہائے شفو! کتنا انتظار کیا میں نے تمہیں۔" وہ بچی کو گود میں لیے بیٹے کی انگلی تھامے اس کے سامنے تھی۔ "ذرا ٹیکسی والے کو فارغ کرو اور تمہارے کپڑے بھی واپس لے آئی ہوں ٹیکسی میں کالا بیگ ہے۔ اس میں رکھے ہیں۔ وہ بیگ بھی اٹھا لانا۔"

"مما! بسکٹ چاہئیں۔" بچہ ضد کر رہا تھا وہ ٹیکسی والے کی جانب لپکی۔

اس سے فارغ ہو کر آئی۔ بچہ مسلسل شور کر رہا تھا وہ اس کے لیے بسکٹ نکال لے۔ انجی کو بتانے کے لیے بہت سے قصے تھے انجی نے بھی تو فنکشن اٹینڈ کیا تھا اور وہ بھی بہت کچھ بتانے کے لیے بے چین تھی۔ اس کے قصے شفق سے کہیں زیادہ سنسنی خیز تھے۔

"پتہ ہے وہاں ڈیک منیجر صاحب تو مجھ پر عاشق ہی ہو گئے۔ بس جھٹ سے میں اوھر آئی منیجر صاحب یہ جو تم سے ڈریس لے کر گئی تھی۔ میں بتا نہیں سکتی مجھ پر کتنے اچھے لگے۔ کئی خواتین نے تو مجھ سے اس بوتیک کا نام پوچھنا چاہا۔ میں نے کہہ دیا۔ رہنے دیں ضروری نہیں جو مجھ پر سچ رہا ہے وہ آپ پر بھی سجے۔ بس شفو! کیا بتاؤں اس جواب پر کیسے منہ بن گئے تھے ان کے مزہ آ گیا۔"

"اظہر بھائی نے بھی تعریف کی؟" اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

جواب میں انجی نے منہ بنایا اور بولی۔

[illegible] ایسے حیرت ہوتی ہے۔

"جو ہر وقت تعریف ہی کرے پھر اس کی بات کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ تمہاری ابھی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گی۔ بس تم ذرا ان منیجر صاحب کی تو سنو ہائے بس شفو! یہ مرد بھی ناں ہوں گے چالیس کے قریب۔ بیوی بھی اسمارٹ سی کیوٹ سے بچے مگر جہاں میں وہاں وہاں ان کی پیاسی نگاہیں۔ سچی تم ہوتیں تو دیکھتیں بڑا مزہ رہا۔"

"اظہر بھائی بھی تو وہیں ہوں گے انہوں نے منیجر صاحب کی تم پر نگاہ کو محسوس نہیں کیا مرد تو اس معاملے میں بڑے حساس ہوتے ہیں۔ مرنے مارنے پر بھی اتر آتے ہیں؟"

"کیا شہریار نے ایسا کچھ کیا؟" وہ اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے پوچھنے لگی۔

"ہاں جب ہم لوگ ہنی مون کے لیے کاغان گئے تھے تو کئی بار بس میری وجہ سے ان کا جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اچھا تم بیٹھو میں تمہارے لیے چائے بنا لاؤں۔"

"صرف چائے نہیں پگلی لڑکی! تمہیں بتایا تو تھا۔ ہم لوگ دیر سے سو کر اٹھتے ہیں چھوٹی کو تو فیڈر بنا دیا تھا۔ بیٹے کو تو بھوکا ہی لے آئی تھی۔ اسی لیے تو اب بسکٹ کے لیے ضد کر رہا تھا۔"

"ہائے انجی کیسی ظالم ماں ہو تم!" اس نے بچے کے گال پر بوسہ دیا۔

"مجھے پتا تھا اپنی خالہ کی طرف جا رہا ہے۔ اس لیے ناشتا نو پرابلم۔"

"ہاں میں لنچ میں اچھا سا تیار کر لوں گی۔"

"پھر تمہارے میاں صاحب بھی ہوں گے۔"

"ہاں بھی ظاہر ہے وہ تو ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے پھر لنچ ہم باہر ہی جا کر لیں گے۔"

"نہیں نہیں انجی اتنے دنوں کے بعد تو گھر آئی ہوں

شہریار سے کہا تھا آج کوفتے بناؤں گی تو اب مجھے اچھا نہیں لگتا کہ وہ گھر آئیں اور میں کہوں کچھ بنایا ہی نہیں۔ پھر کبھی چل کر کھائیں گے۔"

"میں تو مہمان ہوں میزبان تم آپ تم جو بھی جہاں بھی کھلاؤ گی چپ کر کے کھالوں گی۔"

انجی کی باتوں کے دوران ہی اس نے وارڈ روب سیٹ کی۔ شہریار اپنی نفاست پسندی کا ڈھنڈورا ابھی تو خوب پیٹتا تھا۔ مگر اتنے دن میں مجال ہے جو کچھ بھی ٹھکانے پر رہا ہو۔

انجی قصے سناتی رہی۔ وہ کمرہ سیٹ کرتی رہی بیڈ شیٹ تبدیل کر کے جب وہ لاؤنج میں آئی۔ انجی بھی ادھر آ گئی۔ لاؤنج وہ انجی کی آمد سے پہلے سیٹ کر چکی تھی مگر بیٹھنے کا اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ اسے ایک بھرپور لنچ کی تیاری کرنا تھی۔ بہت کچھ تو بازار سے منگوانے والا تھا۔ اس کے لیے انجی نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔

"بچوں کو تم دیکھو میں بس یوں گئی اور یوں آئی۔" انجی جھٹ کھڑی بھی ہو گئی۔ اس نے لسٹ تھمادی۔

واقعی انجی نے بڑی پھرتی دکھائی۔ ایک گھنٹے میں لدی پھندی واپس آ گئی۔

"اتنا کچھ؟" وہ ٹھٹکی اس نے یہ سب نہیں منگوایا تھا۔ شاید وہ اپنی شاپنگ بھی ساتھ ہی کر آئی ہے۔ یہی سوچ کر اس نے سوال نہیں کیا۔

"لو بھئی شفو! میں نے تو تمام پیسے جو تم نے دیئے تھے خرچ کر ڈالے۔ یہ سوچ کر کہ روز روز تمہیں پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔" اس نے سب سے پہلے دو تین طرح کے بسکٹس کے پیکٹ اور پھر چاکلیٹ کے پیکٹ نکالے۔ پھر آئس کریم پیک کی باری آئی۔ موسمی فروٹ اور آخر میں اس کی مطلوبہ چند اشیاء۔ بیٹے کو چاکلیٹ اور اس کی پسند پوچھ کر بسکٹ پکڑا کے خود فروٹ لے کر بیٹھ گئی۔

"لو ناں تم بھی۔ بہت میٹھی ہے۔" اس نے موسمی کا مزہ لیتے ہوئے اسے بھی دعوت دی مگر اس کے پاس وقت نہیں تھا۔

وہ کوفتوں کا مسالہ بنا چکی تھی مگر ابھی ٹیبل رائس چکن کڑاہی کے مسالے کی تیاری ابھی باقی تھی۔ شامی کباب کا قیمہ بھی ابھی ابھی چولہے پر رکھا تھا۔ دو تین طرح کے سلاد بھی بنانا تھے میٹھے میں تو چلو انجی جو آئس کریم لائی ہے وہی چل جائے گی۔

اس کا خیال تھا سلاد کے لیے وہ انجی سے کہہ دے گی مگر اس کی بچی نے نیند سے جاگ کر رونا شروع کیا تو پھر انجی کو سوائے اسے سنبھالنے کے کچھ بھی دھیان نہیں رہا۔

"یہ میرے دونوں بچے بھی ناک میں دم کیے رکھتے ہیں۔ غصے سے خوب چیختے چلاتے ہیں۔" انجی بچی کو کاندھے سے لگا کر تھپکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"اور اظہر بھائی کیا وہ غصے میں شور نہیں ڈالتے؟"

"ارے وہ پورا گھنّا آدمی ہے۔ مجال ہے جو بھی اپنے جذبات کا اظہار کرے۔ بس چپ چاپ جو کہوں گی مانتا چلا جائے گا اور یار! میرے خیال میں شوہروں کی رائے کو زیادہ اہمیت دینا ہی نہیں چاہیے۔ ابھی مجھ سے فرما رہے تھے۔ آج مٹر پلاؤ کھانے کو جی چاہ رہا ہے میں نے کہا۔ میں تو اپنی دوست کی جانب جا رہی ہوں بازار میں بہترین کھانے ملتے ہیں جو کھانے کو جی چاہے کھا لیا کریں۔ بس شفو! تمہیں تو پتا ہے گھر میں مجھ سے بڑی دو بڑی بہنیں تھیں اور دونوں ہی کوکنگ کی شوقین۔ ایسے میں میرے لیے کہاں گنجائش رہ جاتی تھی پھر میری امی خود بھی کھانا پکانے اور گھریلو کاموں میں مصروف رہنے کو ترجیح دیتی تھیں مجھے تو بس گھومنے پھرنے کا شوق رہا ہے۔ خواہش بھی جیون ساتھی بھی ایسا ملے گا۔ اسے تو اپنے بزنس سے ہی فرصت نہیں اور بزنس بھی کیسا؟ آمدن گزارے لائق اور خواری ہر وقت کی۔ میں تو کہتی ہوں یہ کام چھوڑ کر کوئی دوسرا شروع کرو اور نہیں تو اسپیئر پارٹس کی دکان ہی کھول لو کہ بزنس بھی وہ اسی کا کرتے ہیں مگر فرماتے ہیں۔ یہ سب اتنا آسان نہیں۔ بھاڑ میں جاؤ۔ جہنم میں جھونکو مجھے کیا۔" انجی شاید تصور میں شوہر کو سامنے پا رہی تھی

اسی لیے تنگ ہو رہی تھی۔

"اچھا تم اپنا موڈ مت خراب کرو۔ یوں جل کڑھ کر تو اپنی صحت برباد کر لو گی۔ پلیز انجی! میری خاطر اور اپنے ان معصوم بچوں کی خاطر آخر انہیں تم کو ہی دیکھنا ہے۔ اپنی صحت اچھی نہیں ہو گی تو ان کی دیکھ بھال کیسے کر پاؤ گی۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔"

بچی سو چکی تھی وہ اسے لٹانے کے لیے اندر چلی آئی واپس آ کر فریج سے جوس کا پیکٹ نکالا اور گلاس میں ڈال کر پینے لگی۔

"ماما! مجھے بھی دو۔" اس کا بیٹا کچن کے سامنے لاؤنج میں ہی بیٹھا پرانے میگزین سے کھیل رہا تھا جوس دیکھ کر فوراً ادھر آیا۔

"اوہو ایک تو تم بھی نایاب کی طرح مجھے کھاتا پیتا نہیں دیکھ سکتے۔ اتنی کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔ اس لیے پینے بیٹھ گئی تھی نہیں پیتی۔ تم پی لو ہو جاؤ خوش۔" انجی نے گلاس اس کے قریب پٹخ دیا۔

"انجی! انجی! ایسے کیوں کرتی ہو تم اور پی لو نا۔" اس نے منانا چاہا۔

"کیسے کرتی ہوں۔ تم بھی کیا سوچو گی؟"

شفو نے آگے بڑھ کر فریج کھولا اور دوسرا گلاس بھر کر اسے تھمانے کے بعد پھر کام میں مصروف ہو گئی۔ انجی جوس پینے کے دوران بھی اسے اپنی زندگی کے دکھوں کے بارے میں بتاتی رہی وہ سن سن کر افسردہ ہوتی رہی۔

شہریار گھر آیا۔ اس کے سامنے کچن میں دو خواتین موجود تھیں ایک اس کی بیوی جس کے بال بکھرے تھے کپڑے ملگجے اور پاؤں میں باتھ روم سلیپر تھے اور دوسری بہترین تراش خراش کا فٹنگ والا اسٹائلش سوٹ پہنے لائٹ میک اپ کیے ہوئے سامنے تھی اور اس کے پیروں میں جوتی بھی بہت اچھی تھی۔ اس کے چہرے پر نرم مسکراہٹ تھی اور شہریار کی گاڑی کی آواز سنتے ہی وہ سلاد بنانے کی تیاری میں بہت کچھ اپنے آگے رکھے چھری ہاتھ میں لیے بیٹھی گاجر چھیل رہی تھی جبکہ شفق اس کی کہانی سن سن کر افسردہ سے چہرے کے ساتھ سامنے تھی۔

"کیسی ہیں آپ؟ کب آئیں؟" شہریار نے بہت اخلاق سے پوچھا۔

"میں اچھی ہوں بس آج آپ لوگوں سے ملنے کو جی چاہا تو چلی آئی حالانکہ جانتی تھی یہ کتنے برسوں کے بعد میکے سے آئی ہے۔ آپ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارنا پسند کریں گے مگر پھر بھی بس رہا نہیں گیا۔"

"کیسی بات کرتی ہیں آپ۔ یہ آپ کا اپنا گھر ہے اور ہمیں تو خوشی ہوتی ہے جب آپ ہمارے گھر آتی ہیں۔"

"تو اور کیا مگر یہ مسلسل ایسی ہی باتیں کر کر کے مجھے غصہ دلاتی ہے۔"

"غصے میں آنے والی بات نہیں ہے شفق! یہ تو تمہارا رویہ ہے جو اس گھر سے ان کی اجنبیت کے احساس کو ختم کر سکتا ہے۔" اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا اور شفق اثبات میں سر ہلانے لگی۔

انجی کا بیٹا تو لاؤنج میں ٹی وی پر کچھ دیکھنے جبکہ چینل سرچ کرنے میں مصروف تھا کمرے میں آیا تو اس کی بیٹی بیڈ پر سو رہی تھی۔ فیڈر قریب ہی اوندھا پڑا تھا اور دودھ نپل سے ٹپک کر تکیہ چادر بھگو رہا تھا تکیے کے پاس پیمپر کا پیکٹ جبکہ بیڈ پر ہی اس کا بیگ ادھ کھلا رکھا تھا سائیڈ ٹیبل پر بھی کچھ اشیاء دھری تھیں۔ اس نے بے اختیار شفق کو آواز دے ڈالی۔

وہ آئی تو بولا "یہ کیا پھیلاوا ہے؟ تم یہ سب سمیٹ کر ایک طرف رکھو۔ انجی تو مہمان ہے تم اسے یہ سب رکھنے کی جگہ بتاؤ اور پلیز بچی اٹھ جائے تو بیڈ شیٹ چینج کر دینا۔ یہ دیکھو فیڈر سے دودھ ٹپک گیا ہے۔"

اگرچہ دودھ بہت معمولی مقدار میں گرا تھا مگر شہریار کی نفاست پسند طبیعت پر گراں گزر رہا تھا۔

"آپ تو معمولی سی بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں جہاں چھوٹے بچے ہوتے ہیں وہاں یہ سب تو ہوتا ہی ہے۔"

وہ ابھی ابھی انجی کی مظلومیت کے قصے سن کر آئی تو

آ رہی تھی اسی لیے شہریار کا یہ سب کہنا اسے انجی کی ذات پر تنقید لگا تھا اور چپ نہیں رہ سکی تھی۔

"میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے صرف بیڈ شیٹ چینج کرنے کی درخواست ہی تو کی ہے نا!" ایک تو تھکن دوسرا شفق کا میلا کچیلا حلیہ تیسرا انجی کا اس کا منہ پھلا کر بولنا جس پر وہ ہمیشہ اسے ٹوکتا تھا آج غصہ دلا گیا۔

"آپ کو اچھا ہی نہیں لگتا کہ میری دوست یہاں آئے۔ وہ بے چاری تو پہلے ہی اتنی دکھی ہے۔" شفق کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"فضول کے اندازے مت لگایا کرو، وہ بہت نفیس لڑکی ہے۔ ایسے لوگوں کو میں ذاتی طور پر بھی پسند کرتا ہوں آئندہ یہ بات مت کرنا کہ مجھے اس کا یہاں آنا پسند نہیں۔"

وہ سیل فون بستر پر اچھال کر واش روم کی جانب بڑھ گیا۔

شفق گہری سی سانس لے کر باہر آ گئی۔ سب کچھ تقریباً تیار تھا صبح سے باتیں بنا بنا کر انجی اب سلاد بنانے بیٹھ گئی تھی مگر وہ پھر انجی کی باتوں میں کچھ شہریار کے رویے میں ایسی الجھی کہ اسے چینج کرنے اور ہلکا پھلکا سا تیار ہو جانے کا خیال ہی نہیں آیا اور انجی نے بھی اسے یہ احساس نہیں دلایا جب وہ دوبارہ کچن میں آئی۔ انجی بڑی مستی سے سبزی کاٹ رہی تھی اسے دوسری چھری اٹھانا پڑی۔

"کیا کہہ رہے تھے شہریار؟" یہ سوال ایسا تھا جس کی توقع شفق بہرحال نہیں کر سکتی تھی اور اب تو جو کچھ شہریار نے کہا تھا۔ وہ انجی سے کہنے والا تھا ہی نہیں۔ ابھی وہ خاموش ہی تھی کہ انجی بولی۔

"بہت دنوں کے بعد ملے ہو نا، بے تاب تو ہو گا تمہارے لیے۔" یہ سب کہتے ہوئے اس کے چہرے پر عجیب سا تاثر اور لہجے میں گہری ٹھنڈک تھی جسے شفق نے اس لیے محسوس نہیں کیا کہ انجی کا یہ کہنا اسے شدت سے احساس دلا رہا تھا۔ شہریار نے جو کہا بہت غلط کہا۔ وہ اتنے دنوں کے بعد ملے ہیں آج اکٹھے لنچ کر رہے ہیں مگر شہریار نے اس بات کو بالکل بھی دھیان میں نہیں رکھا۔ اسے میں ہمیشہ احمق لاپروا اور غیر سنجیدہ دکھائی دیتی ہوں وہ چپ چاپ سلاد کے لیے چیزیں بناتی رہی۔ انجی بھی اسی کام میں مصروف کن انکھیوں سے اس کا چہرہ پڑھتی رہی۔

اس روز وہ شہریار کے ساتھ پہلے سے زیادہ بے تکلف تھی۔ اس کے مشاغل، کالج لائف کی باتیں، اس کی پسند ناپسند سب براہ راست ڈسکس کرتی رہی۔ کھانے کی میز پر پہلے ہی کی طرح اس نے دونوں کو خود کھانا سرو کیا۔

اس کے لیے وہ کچن میں شفق کی پیشانی پر بوسہ دے کر کہہ چکی تھی۔

"میں جانتی ہوں میری جان تم بہت تھک گئی ہو۔ بس کھانا کھاتے ہی ریسٹ کرو اور ہر الٹی سیدھی سوچ کو ذہن سے نکال دو۔"

آخری بات پر شفق نے چونک کر سر اٹھایا تھا تو اس کی الجھن کو بھانپ کر اس کی درد آشنا بات کے بغیر ہی سمجھ گئی تھی۔ وہ انجی سے لپٹ گئی انجی اس کی پشت پر تھپکی اور اب وہ [illegible] بار بار [illegible] نکال دیتی رہی تھی اور بہت اصرار سے کھلا رہی تھی۔

شفق بہت تھک گئی تھی۔ پھر اسے انجی کی بات نے یہ احساس دلایا تھا کہ آج اتنے دن کے بعد ملنے کی وجہ سے شہریار کا انداز اس کے لیے بے تابی لیے ہوئے ہونا چاہیے تھا وہ چپ چپ سی تھی اور اس کی یہ چپ شہریار کو غصہ دلا رہی تھی۔ شرمندہ بھی کر رہی تھی کیسی الٹ مزاج لڑکی ہے اسے احساس نہیں انجی مہمان ہے اور اس کی خاطر اس کا فرض ہے تاکہ وہ بے چاری ہمیں ایک ایک ڈش اٹھا کر پیش کرتی رہے بکھرے بال، صبح کا دھلا ہوا چہرہ، رات کو پہنے کپڑے اسے اور بھی غصہ دلا رہے تھے کھانے کے بعد شفق برتن سمیٹ کر کچن میں چلی گئی اور وہ دونوں باتیں کرتے رہے پھر اس کا بیٹا کسی بات پر ضد کرنے لگا شفق اسے اٹھا کر لان میں لے آئی۔ اس کے ساتھ کھیلتی رہی۔ وہ دونوں باتیں کرتے رہے۔ اس کا خیال تھا انجی کھانا کھا کر چلی جائے گی مگر وہ ایسے خیال میں دکھائی

نہیں دیتی تھی۔ شفق نے کپڑے نکالے اور نہانے کے ارادے سے باتھ روم میں گھس گئی کہ انجی کو شہریار کمپنی دے رہا تھا نا۔

نہا کر نکلی تو شہریار اس کو اپنی اسکول اور کالج کے زمانے کی تصاویر دکھا رہا تھا دونوں خوب انجوائے کر رہے تھے ڈارک پرپل سوٹ جس پر ملٹی کلر سے کڑھائی کی گئی تھی پرپل کا شیڈ دیتی ہی لپ اسٹک لگائے جب سامنے آئی دونوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔

"اوں ہوں یہ کون سا کلر پہن لیا ہے تم نے پلیز اتنے بھی ڈارک کلر مت پہنا کرو۔"

وہ بلاشبہ اپنی گوری رنگت میں اس کلر کے ساتھ بہت نمایاں ہو رہی تھی شہریار کی نظروں میں ستائش ابھری ہی تھی کہ انجی کے جملے نے اس کی بھی سوچ بدل دی۔

"واقعی میرا خیال ہے انجی ٹھیک کہتی ہے یہ کلر کچھ عجیب سا ہے۔"

"میں تبدیل کر کے آتی ہوں۔" وہ فوراً شرمندہ ہو جانے والی تھی۔

"ارے [illegible] پہلے [illegible] بتا رہا [illegible] نہیں ٹھنڈا لگا کر گئی ہو تو اب چینج کرنے چل پڑو مجھے تم ہر رنگ میں اچھی ہی لگتی ہو۔ میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ وہ سرے نہیں میری نظر سے تھوڑی کھلتے ہیں۔ لباس شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے اور یہ وہ کلر ہے جو کنواروں میں خوب پہنا اور پسند کیا جاتا ہے۔"

"وہ انجی میں نے تو۔۔۔" شہریار کے لبوں پر انجی کی بات سن کر آنے والی مسکراہٹ نے اسے روہانسا کر دیا وہ وضاحت میں کیا کہنا چاہ رہی تھی اسے بھول ہی گیا۔

"اچھا۔ اب اچھی سی چائے تو بناؤ۔ ہم تمہارے انتظار میں بیٹھے تھے ورنہ میں اس وقت چائے لے لیتی ہوں۔"

وہ اثبات میں سر ہلا کر کچن میں چلی آئی۔

"چلو آج چائے کہیں باہر چل کر پیتے ہیں۔" وہ کچن میں گئی تھی کہ انجی کو خیال آیا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" شہریار نے اثبات میں سر ہلایا۔

انجی شفو کو آوازیں دینے لگی۔

"چائے رہنے دو۔ ہم کہیں باہر چل کر پیتے ہیں۔"

وہ ہمیشہ شام کی چائے اپنے بیڈ پر بیٹھ کر پورے سکون کے ساتھ پینا پسند کرتی تھی مگر انجی کی خواہش کو رد نہیں کر سکی اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تم میرے بیٹے کے کپڑے چینج کرو۔ میں بیٹی کو دیکھ لوں۔" انجی اس کے بیڈ روم کی جانب بڑھ گئی وہ بچے کے کپڑے لینے اندر آئی تو انجی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے میک اپ میں مصروف تھی۔ تیار ہو کر پورے آدھے گھنٹے میں باہر آئی۔

☆ ☆ ☆

وہ پہلے بھی ایک دوسرے سے جھڑپ کے بعد روٹھے نہیں تھے بات ہوتی اور ختم ہو جاتی اور آج ایسا کچھ خاص ہوا بھی تو نہیں تھا مگر اس کا جی اچاٹ سا تھا اور شہریار بھی بے گانگی برت رہا تھا۔ انجی کو فون پر بتایا تو بولی۔

"مردوں کو نخرے دکھانے کی عادت ہوتی ہے ایک دو روز گزرنے دو خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ ویسے تم روٹھ جاؤ تو منانا نہیں مجھے لا کر بھی کھانا کھا کر۔"

"میں کبھی روٹھی ہی نہیں ہاں گلے تو وہ ویسے بھی مجھے دیکھ کر گاتے رہتے ہیں اور نخرے بھی سہے آتے ہیں۔"

"اچھا! تم اسے بہت اچھی لگتی ہو؟" چند ہی دنوں میں ان کی ازدواجی زندگی کو اتنا کریدتی کیوں تھی اور شفق نے کبھی بھی اس سے کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔

شہریار کی خفگی نے اسے نڈھال کر دیا تھا وہ زیادہ دن سہہ نہیں سکی اور اسے بخار ہو گیا۔

"اچھا ہے مر جاؤں جب انہیں پروا نہیں میری تو میں جی کر کیا کروں۔ جب مر جاؤں گی پھر تو یاد کریں گے پھر مجھے پکاریں گے مگر تب میں کہیں نہیں ہوں گی تب تک انہیں اپنی زیادتی کا احساس انہیں پچھتاوے لگائے گا۔" وہ کیا کیا سوچتی اور روتی رہی شہریار گھر آیا اس نے اپنی طبیعت کی خرابی کے بارے میں نہیں

بتایا۔ معمول کے مطابق کھانا تیار کرتی رہی۔ جھیل پر لگتے تے اسے چکر آیا۔ ڈش تو ٹیبل پر رکھ دی مگر توازن برقرار نہیں رکھ سکی اور خود فرش پر آ گری۔

"شفق!" شہریار تیزی سے اس کی جانب لپکا۔ ہاتھ لگایا تو اس کا جسم انگارے کی مانند لگا۔

"کیا کروں؟" اس نے اپنے بازوؤں میں بے ہوش شفق کو پریشانی سے دیکھتے ہوئے سوچا۔ پھر ذہن میں سب سے پہلے انجی کا خیال آیا۔ اس کو کال کیا۔ شفق کی حالت بتائی۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ابھی آ رہی ہوں اور یہیں قریب ہی ناہید کلینک ہے۔ آپ اسے لے کر وہیں پہنچیں میں ابھی ادھر آؤں گی۔" اور ڈیڑھ گھنٹے بعد جب وہ دوبارہ گھر آئے تو انجی ان کے ساتھ تھی اور شفق ہوش میں تھی۔

"یہ کیا حماقت ہے شفو! تمہیں بخار تھا تو تم نے شہریار کو بتایا کیوں نہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر اتنی شدید ناراضی" ارے جہاں محبت ہوتی ہے وہاں تو بڑی سے بڑی بات نظر انداز کر دی جاتی ہے۔ تم ایک فضول سی بات کو دل سے لگا کر بیٹھی رہیں۔ قدر کرو اپنے میاں کی ایسے اچھے انسان تو چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔"

"انجی! بچے کہاں ہیں اور اظہر بھائی نے تمہارے یوں آجانے پر برا تو نہیں مانا؟"

"اظہر پشاور گئے ہیں ان کی واپسی اب ایک ہفتے سے پہلے تو مشکل ہی ہوگی بچوں کی فکر نہ کرو۔ وہ ہیں نا ہماری ایک رشتہ دار۔ بے چاری بیوہ اور لاچار سی ہیں۔ وہ آئی ہوئی ہیں بچے انہی کے پاس ہیں۔ وہ بہت اچھی طرح سنبھال لیتی ہیں۔ تم بس اپنی فکر کرو۔"

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔" اسے نقاہت بہت تھی۔ بولنا مشکل ہو رہا تھا۔

گھر آ کر شہریار نے اسے سہارا دے کر گاڑی سے اتارا اور بیڈ روم میں لے گیا۔ اسے لاؤنج میں رک جانا چاہیے تھا مگر وہ پیچھے چلی آئی تھی اور شہریار نے اس کی موجودگی کے باوجود شفق کا بوسہ لے کر اسے اپنی بے تابی اور پریشانی کے بارے میں بتایا تھا پھر انجی سے بولا۔

"آپ پلیز اس کے لیے سوپ اور دلیہ وغیرہ بنا دیں۔"

"نہیں، نہیں انجی تم تکلیف مت کرو۔ ابھی بخار کم ہو گا تو میں خود بھی بنا لوں گی۔"

"او ہو! دوست ہے تمہاری۔" شہریار نے اسے تکلف برتنے پر سمجھایا۔

انجی کو کچن میں آنا پڑا اور کچن کے کاموں سے اس کی ہمیشہ جان جاتی تھی وہ اکثر کھانا بازار سے منگواتی یا ملازمہ سے پکواتی۔ انہیں وہی غنیمت لگتا اور پھر یہ وہ خاتون جن کی عمر پچاس پچپن کے قریب تھی اظہر کی رشتہ دار تھیں جب وہ آ جاتیں۔ اسے بڑی سہولت ہو جاتی۔ کھانا بنانے سے تو بالکل ہی جان چھوٹ جاتی اور بچوں کو بھی گھروالی دیکھتیں۔

"پتہ نہیں کس طرح کا سوپ بنانا چاہیے۔" اس نے کچھ دیر سوچا پھر فریج سے چکن نکال کر ڈھیر سارے پانی میں نمک اور کالی مرچ کے ساتھ ڈال کر چولہے پر چڑھا دیا۔

"اب چائے بھی چاہیے [illegible] بار بار سے جوس کے لیے بھی ملازمہ [illegible] پتہ نہیں پتی کدھر ہے؟"

کوفت کے عالم میں چائے تیار کی۔ شہریار خود چلا آیا تھا۔ ٹرے اس نے ہی سیٹ کی اور اندر لے گیا۔ انجی اب بھی اس کے پیچھے تھی۔ چائے کے ساتھ شفق نے دو بسکٹس لیے، دوائی اور تھوڑی دیر میں سو گئی۔

اس روز بھی چند روز پہلے کی طرح انہوں نے ڈھیروں باتیں کر ڈالیں اور پتہ نہیں کب آپ سے وہ دونوں تم پر آ گئے۔ ایک صوفے پر برابر میں بیٹھ کر وہ دیکھتے اور تبصرے کرتے رہے۔ شفو کی آنکھ کھلی بخار ہلکا تھا شہریار اور شفق دونوں انجی کے شکر گزار تھے اور شہریار اسے ڈراپ کرنے جا رہا تھا۔

"پتہ نہیں رات میں کچھ کھانے کو ہے بھی یا نہیں؟" شفق نے نقاہت کے ساتھ کروٹ بدلتے ہوئے سوچا تھا پھر دوسرا خیال یہ آیا۔ انجی کے ہاں کھانا کھا کر ہی آئے گا یا شاید نہ بھی کھائے کہ مجھے بخار ہے اور گھر

میں اکیلی ہوں شاید انجی ساتھ ہی کھانا بھی کر دے۔ مگر شہریار بہت جلدی آ گیا اور کھانا اس کے ساتھ نہیں تھا۔

"وہ فریج میں دیکھیں۔ میرا خیال ہے دوپہر میں جو بنایا تھا موجود ہی ہو گا۔"

"نہیں وہ تو میں نے اور انجی نے کھایا تھا۔ خیر تم فکر نہ کرو۔ میں سینڈوچ بنا لیتا ہوں۔"

شہریار اس کے پاس بیٹھا وہ انجی پلائی کھانا بھی کھلایا مگر کچھ کمی سی تھی۔ یا شاید اس کی توقعات ہی زیادہ تھیں۔

☆ ☆ ☆

اگلے روز انجی شام کو ان کے ہاں آئی تھی اور شہریار یقیناً پہلے سے اس کی آمد کے بارے میں جانتا تھا منتظر تھا اور خاصا اہتمام بھی کر رکھا تھا۔ شفو کو بخار ابھی باقی تھا۔ انجی آئی اور اس نے خوب انصاف کیا۔ اس نے شفق کو کمرے میں جا کر آرام کرنے کو بھی کہا مگر شفق تیار نہیں ہوئی۔

[illegible] میں اور وہ بس ایک جانب بیٹھی مسکرا رہی تھی۔

"تم شہریار کا خیال نہیں رکھتیں، شفق اتنے دنوں کے لیے میکے جا کر بیٹھ گئیں اب آئی ہو تو ذرا سی بات کو دل سے لگایا اور بیمار پڑ گئیں۔ دیکھو بے چارہ کتنا کمزور ہو رہا ہے۔"

"ایسی باتوں کو یہ نہیں سمجھتی۔" شہریار نے شکوہ کیا۔

وہ چونک کر اس کی صورت دیکھنے لگی "آخر کیوں یہ بدگمان ہوا جاتا ہے میری محبت میں بھی کبھی کمی تھی" اس کا دل گھبرانے لگا۔

شہریار کی انجی سے کی گئی چھوٹی سی شکایت اس کی دل کی دنیا میں ہلچل مچا رہی تھی شاید وہ ابھی کہہ دے گا میں تو مذاق کر رہا تھا شفق کی محبت کو ناپنے کا تو کوئی پیمانہ ابھی تک ایجاد ہی نہیں ہوا مگر ایسا نہیں کہا۔ وہ چپ چاپ پیچھے منظر میں موجود ہونے کے باوجود منظر سے غائب ہوتی چلی گئی۔

اس کا بخار صبح تک اتر گیا اس نے اٹھ کر ناشتا بنایا کچھ ادھورے کام سمیٹے۔ شہریار تیار ہو کر ٹیبل پر آیا تو اس کی پسند کا ناشتا پڑا تھا اور آملیٹ اس کے سامنے رکھا مگر پتہ نہیں وہ کس سوچ میں گم تھا۔ توجہ ہی نہیں دی۔ چپ چاپ ناشتا کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"دوپہر میں کیا بناؤں؟" اس نے پوچھا تھا۔

"او ہاں یاد آیا آج دوپہر میں میرے لیے کچھ نہ بنانا۔ میں لیٹ آؤں گا۔ او کے جان! آج شام کی چائے پر ملاقات ہو گی اور دیکھو تم کاموں میں مت لگی رہنا۔ اپنا خیال رکھنا۔ کہیں پھر بخار نہ چڑھ جائے۔"

اس نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

شہریار کے جانے کے بعد ابھی وہ ناشتے کے برتن سمیٹ رہی تھی کہ شہریار کی امی کا فون آ گیا۔ وہ بتا رہی تھیں۔

"ٹھیک ایک ہفتے کے بعد پاکستان آ رہی ہوں پورا ایک ماہ اپنی بیٹی کے پاس رہوں گی۔ ابھی تو میں نے تمہارے چاؤ بھی نہیں پورے کیے۔"

شہریار کی والدہ بہت سویٹ نیچر کی مالک تھیں اس لیے ان کی آمد کا سن کر اسے خوشی ہوئی تھی۔

ہر وہ خبر جو اس کے لیے اہم تھی اسے انجی کے ساتھ شیئر کرنا وہ اپنا فرض سمجھتی تھی مگر آج کل انجی کی نجانے کیا مصروفیات تھیں جب بھی فون کرتی جواب موصول نہیں ہوتا تھا۔ میسج کیا تو بھی ابھی تک انجی نے بات نہیں کی تھی۔ شاید اس کے میاں آج کل گھر پر ہوتے ہوں گے مگر یہ بھی کوئی ایسا مسئلہ نہیں کہ کال ہی ریسیو نہ کی جائے۔

شام کو شہریار آیا تو اس نے انجی کی طرف چلنے کا کہا۔

"کیوں خیریت؟" وہ پوچھنے لگا۔

"اتنے دن ہو گئے اس سے ملے ہوئے۔"

"تم میں اور انجی میں کوئی قدر بھی تو مشترک نہیں میری سمجھ میں نہیں آیا پھر تم اس سے ملنے کو بے چین کیوں رہتی ہو؟"

"وہ میری دوست ہے۔" اس نے کچھ احتجاج کے رنگ میں یاد دلایا۔

"بہرحال آج نہیں، تمہیں پتہ ہے لیٹ آ رہا ہوں۔ تھکا ہوا ہوں۔"

"اچھا ٹھیک ہے پھر کل چلیں گے۔" وہ جھٹ مان گئی۔

کل آ کے کی تو دیکھیں گے۔ وہ کمپیوٹر کے سامنے جا بیٹھا اب تو اس سے کچھ کہنا ہی فضول تھا۔

☼ ☼ ☼

شہریار کی والدہ کی آمد پر شفق کے میکے والے بھی ملنے آئے تھے۔ رات کو کھانا کھا کر بھیا اور شہریار لاؤنج میں بیٹھ گئے تھے جبکہ شہریار کی والدہ شفق کی امی اور بھابھی ارم شہریار کی والدہ کے بیڈ روم میں آ گئے تھے۔

"ہائے کیا تھا آج انجی بھی ہوتی تو۔" اس نے بڑی حسرت سے ذکر کیا تھا۔

"کیا وہ یہاں آتی رہتی ہے؟" ارم نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں ہاں اکثر۔ پتہ ہے شہریار بھی اسے بہت پسند کرتے ہیں بلکہ اب تو کہتے ہیں۔ اس کی پسند ناپسند تم سے زیادہ مجھ سے ملتی جلتی ہے۔"

وہ بہت جوش کے ساتھ ارم کو بتا رہی تھی اسی وقت نبیلہ بیگم (شہریار کی والدہ) نے اس کی امی سے بات کرتے ہوئے ان دونوں کی طرف یونہی دیکھا تھا مگر شفق کے جوش اور جواب میں ارم کی سنجیدگی نے حیران سا کیا۔ ارم کرید کرید کر کسی انجی کے بارے میں پوچھ رہی تھی اور شفق اپنے مخصوص الفاظ سے بتائے چلی جا رہی تھی۔

"کون ہے یہ انجی؟" انہیں بھی تجسس ہوا۔

"وہاں فیصل آباد میں ہمارے محلے میں رہتی تھی۔" ارم نے کہا۔ شفق نے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں بھابھی آپ! وہ صرف ہماری محلے دار نہیں۔ میری بہت اچھی دوست ہے۔ بس کی یک جان دو قالب والا حساب ہے۔"

"تم بھی جاتی ہو اس کے ہاں؟" ارم نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

"آں ہاں بالکل تو۔"

"اکیلی جاتی ہو؟"

"نہیں اکیلی کیوں شہریار کے ساتھ۔"

"اچھا انہیں کیوں اعتراض نہیں ہوتا تمہاری سہیلی کے ہاں جانے پر۔"

"میں نے کہا نا۔ اب وہ صرف میری سہیلی ہی نہیں ہے۔ شہریار بھی اسے بہت پسند کرتے ہیں اور سچ! وہ ہے بھی اتنا پیار کرنے والی کہ کبھی کبھی تو میں اس کی محبتوں پر شرمندہ سی ہو جاتی ہوں۔"

نبیلہ بیگم کو دونوں کے رویوں پر حیرت تو ہوئی مگر انہوں نے دخل نہیں دیا۔ ایک بار پھر اس کی امی سے باتیں کرنے لگیں۔

"ہم سب چلیں گے کل انجی کے ہاں۔ کتنی حیران ہو گی نا۔" وہ سب کو دیکھ کر شفق خیالوں میں ہی اس کی حیرت پر مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"نہیں ہم ... ملنے آئے ہیں۔" ارم نے صاف انکار کر دیا۔

"اچھا پھر میں اسے یہاں بلا لیتی ہوں۔ کل کھانے پر کہتی ہوں آ جائے۔"

"دیکھ لو بلا کر۔ میرا خیال ہے وہ نہیں آئے گی۔"

"وہ کیوں بھلا۔ وہ کیوں نہیں آئے گی میں ابھی فون کرتی ہوں اور سب کی آمد کے بارے میں بتاتی ہوں۔"

"کسے فون ہو رہا ہے؟" اب کے شفق کی امی نے پوچھا۔

"امی! انجی کو بلانے لگی ہوں۔" وہ نمبر ملاتے ہوئے اک جوش کے ساتھ بولی۔

"انجی! یہ ابھی تک تمہارے سر سے انجی کا بھوت نہیں اترا۔" اس کی امی کے انداز میں بھی کچھ کچھ ارم والا ہی تاثر تھا۔

اس نے جواب نہیں دیا۔ انجی سے بات کرنے لگی۔ وہ اسے ان سب کی آمد کے بارے میں بتا رہی تھی اور کل آنے کو کہہ رہی تھی۔

"ہائے دیکھو۔ انجی! ابھا بھی تو پہلے ہی کہہ رہی تھیں کہ نہیں آؤ گی مگر میں نے پورے وثوق سے کہا تھا تم آؤ گی۔"

"او ہو اچھا چلو ٹھیک ہے کل شام یہ سب تو چلے جائیں گے شہریار کی امی تو یہیں ہیں نا۔ تم ان سے ملنے آ جانا۔ بہت خوش ہوں گی تم ان سے مل کر۔ بہت اچھی نفیس خاتون ہیں جیسی خواتین شہریار کو اچھی لگتی ہیں نا جیسی تم ہو تاں بالکل ویسی۔"

اس بات پر ارم پھر چونکی تھی اور اس نے کچھ افسوس کے ساتھ شفق کو دیکھا تھا۔

"وہ کل تو اس کے میاں کے کچھ دوست انوائٹڈ ہیں۔ وہ نہیں آ سکے گی۔"

"اچھا پھر اس سے کہنا تھا ہم سب ابھی آ رہے ہیں۔" ارم کا انداز استہزائیہ تھا۔

☼ ☼ ☼

ان لوگوں کی واپسی کے اگلے دن انجی آ رہی تھی اور شفق بہت جوش سے کچن میں تھی اس کے لیے بنانے کیا کیا تیاریاں کر رہی تھی۔ شہریار کو اس نے ایک بڑی لسٹ تھمائی تھی اور اس نے بغیر ناک بھوں چڑھائے سب سامان لا دیا تھا۔

انجی آئی تو ارم کی باتوں کی روشنی میں نبیلہ بیگم نے بہت گہری نظر سے اسے دیکھا تھا۔ سانولی سلونی پرکشش نقوش والی اور بہت لمبے بالوں والی عورت سے لڑکی نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی طراری اور چہرے کے نقوش میں بھی ... تمام کو نہیں تھا اس کے مقابلے میں شفق کی بچی ... میں اس سے کم بہت چھوٹی سی لڑکی تھی جس کی آنکھوں میں روشنی اور سچائی کا تاثر تھا اور جو محبتیں بانٹنے کی عادی دکھائی دیتی تھی۔

انجی اگر نبیلہ بیگم سے بہت ہی محبت اور عقیدت سے ملی تھی۔

"مجھے بہت اشتیاق تھا آپ سے ملنے کا بہت تعریفیں سنی تھیں میں نے آپ کی۔"

اس دوران وہ نبیلہ بیگم کے تاثرات کا بھی جائزہ لے رہی تھی اور اسے لگا اس کے الفاظ اور انداز نے انہیں کچھ خاص متاثر نہیں کیا۔

"اچھا کس سے سنی تھیں تعریفیں؟" انجی کو اس سوال کی توقع نہیں تھی کہ خوشامد وہ چیز ہے کہ جس کی کی جائے پھر اسے اس طرح کے سوالوں کا ہوش نہیں رہتا۔ وہ اس سلسلے میں شفق کا نام لینے کی غلطی نہیں کر سکتی تھی بولی۔

"شہریار صاحب نے اور بھلا کون آپ کی تعریفیں کر سکتا ہے؟" شفق اس کے بچے میں مگن تھی اور انجی نے دھیرے سے کہا تھا۔

"اچھا شہریار سے بھی بے تکلفی ہو چلی ہے۔" وہ ارم کے چہرے کے تاثرات کو ذہن میں لا کر یہ سوال کر گئی تھیں۔

"جی جی آپ کے بیٹے آپ ہی کی طرح بہت اچھے انسان ہیں آنٹی اور آنٹی! آپ نے کلر بہت خوب صورت پہن رکھا ہے بہت سوٹ کر رہا ہے آپ پر۔"

نبیلہ بیگم دس سال ایک اسکول کی پرنسپل رہی تھیں۔ اس دوران مختلف مزاج کے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہتا تھا خوشامد کرنے والوں کا تو ایک باقاعدہ گروہ تھا تو وہ انجی کو کیسے نہ پہچانتیں۔ وہ یہ سوچ رہی تھیں کیا اس کی عادت ہی ایسی ہے یا یہ صرف میرے ساتھ ایسا کر رہی ہے مگر کیوں اسے مجھ سے کیا مفاد ہو سکتا ہے۔

"کیسی لگیں میری والدہ؟" شہریار ٹرے میں کوک کے گلاس رکھے چلا آیا تھا سب سے پہلے انجی کو پیش کرتے ہوئے پوچھا تھا اور اس کی امی ایک بار پھر چونکی تھیں شہریار کبھی کسی کا کہنا شادی سے پہلے مانتا تھا نہ اب ان دو تین روز میں انہوں نے ایسا دیکھا تھا۔

"آپ کیوں لے آئے۔ میں لا رہی تھی۔" شفق نے شرمندہ ہو کر کہا تھا۔

"تمہیں اتنا ہوش ہی کہاں ہے؟"

یقیناً" شہریار کا انداز قابل گرفت تھا نبیلہ بیگم تو جیسے آئی تھیں بظاہر اتنا اپنائیت دکھانے والی اس لڑکی

"وہ انجی کی طرف آج شام نہیں اصل میں اس سے پوچھ کر ہی پروگرام بنانا پڑتا ہے کیا پتہ اس کا شوہر آج شام گھر پر ہی ہو۔"

"کیا مطلب شہریار تمہارا؟ کیا تم اس کے شوہر کی موجودگی میں اس کے گھر نہیں جاتے۔"

"دراصل میں آنٹی وہ انجی کا جو شوہر ہے ناں وہ کچھ دوسرے مزاج کا بندہ ہے۔ اسے نہیں پسند کہ انجی زیادہ میل جول رکھے۔"

"تو انجی کو اپنے شوہر کی پسند ناپسند کا خیال رکھنا چاہیے۔ اب اگر شہریار کو یہ سب ناپسند ہو تا تو تم ایسا کرتیں؟ نہیں کبھی نہیں۔" انہوں نے پورے یقین سے کہا تھا۔

شفق نے انجی کو فون کیا اور آنٹی کے آنے کے بارے میں بتایا تو وہ بولی۔

"تم آنٹی کو فون دو۔ میں خود بات کروں گی۔" اور ان سے بولی "بھلا بیٹی کے گھر آتے ہوئے ماں کو اجازت کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ آپ ضرور آئیں۔ میں منتظر رہوں گی۔"

"میں ای! آپ بھی نا بس ابھی کل ہی تو ملاقات ہوئی ہے انجی سے۔ آج آپ اس کے ہاں جانے کو تیار ہو گئیں۔ وہ بھی کھانے کے ٹائم پر اس بے چاری کو کتنی محنت کرنا پڑے گی۔" شہریار پھر کوفت کے عالم میں کہہ رہا تھا۔

"تو کیا ہوا۔ کل شفق نے بھی تو اس کے لیے سارا دن برباد کیا تھا۔" انہوں نے یاد دلایا۔

"اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔" ماں کی بات اسے اچھی نہیں لگی۔

"اور اس کے گھر ایک عورت ہے جو بچے بھی سنبھالتی ہے کھانا بھی بناتی ہے۔"

"آپ سے کس نے کہا سارا کام وہ خود ہی کرتی ہے؟ لگتا ہے بہت آنا جانا رہتا ہے تمہارا؟"

ماں کے انداز پر وہ چونکا کچھ کہنا چاہتا تھا کہ وہ بولیں۔

"اس کا شوہر پسند نہیں کرتا تو تم لوگ آنا جانا کم کر دو۔"

اور وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔

انجی ان کے ہاں آ کر ڈرائنگ روم تک تو کبھی محدود نہیں رہتی تھی۔ سیدھی لاؤنج میں آتی بیڈ روم میں بھی جھانکتی، کچن کے بھی چکر لگتے مگر جب بھی اس کے ہاں جاتے انہیں ڈرائنگ روم میں ہی بٹھاتی۔ ہاں شفق اس کے پیچھے آتی ضرور مگر شروع شروع میں اب وہ اسے ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھنے کو کہتی تھی۔

آج بھی ایسا ہی تھا وہ لوگ جا کر بیٹھے ہی تھے کہ انجی کے ہاں رہنے والی خاتون چلی آئیں۔

"ارے شفق! آج بڑے دنوں کے بعد چکر لگایا۔ شہریار صاحب جب بھی آتے ہیں۔ میں آپ کا ضرور پوچھتی ہوں۔"

نبیلہ نے چونک کر شفق کو دیکھا اور اسی وقت انجی تیزی سے شفق کو کوئی بات سنانے لگی اس کا انداز ایسا تھا کہ نبیلہ بیگم کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کر سکتی تھیں۔ کیا شفق نے خاتون کی بات سنی ہی نہیں۔

"اچھا بھابھی جی! اب میں چلتا ہوں۔" ایک جوان مرد جس کے چہرے سے تھکن ٹپک رہی تھی۔ آ کر انجی سے اجازت طلب کر رہا تھا۔

"ہائے ابھی سے چلے گئے بڑا ہی افسوس ہوتا ہے آپ کی کولولا کف پر آپ جیسے مرد تو چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔ کیسی عورت ہے جس نے آپ کی قدر نہیں کی۔ ہیٹ کھانے میں رہنے کی۔"

پتہ نہیں کس کی بات ہو رہی تھی اور اس مرد سے بہت گہری ہمدردی جتائی جا رہی تھی۔

"ذرا ٹھہریے میں اندر آ رہی ہوں۔" انجی اسے لے کر اندر گئی نبیلہ بیگم بھی اٹھ کر پیچھے آ گئیں۔

"یہ گاجر کا حلوہ ہے بڑی محنت سے بنایا ہے میں نے لے جائیے کھائیے گا آپ کی صحت دن بدن گرتی جا رہی ہے پتہ نہیں یہ کیسی بیوی ہوتی ہے جنہیں اپنے شوہر کی صحت کی بالکل فکر نہیں ہوتی۔ میں تو انہیں روزانہ دودھ کے ساتھ حلوہ گرم کر کے دیتی ہوں۔"

"بھابی! بہت شکریہ بڑی مہربانی۔" حلوہ اس نے

ہوا ہے۔ گرم دودھ کے ساتھ روزانہ دیسی گھی دیتی ہے ۔ آپ بے فکر رہیے۔" وہ بہت شکر گزار ہوتا چلا گیا۔

"کون تھا یہ؟" نبیلہ بیگم نے پوچھا۔

"رشتے میں دیور ہوتے ہیں۔" اب اس کے انداز میں اس مرد کے لیے لاپروائی سی اتر آئی تھی۔ وہ شفق کا دیا گاجر کے حلوے کا ڈونگا واپس فریج میں رکھ رہی تھی اور نبیلہ اس کے کچن کی ابتر حالت کو دیکھ رہی تھیں۔ اس نام نہاد دیور سے جو گفتگو اس نے کی تھی اور اس کے جانے کے بعد جو انداز اس کے لیے اپنایا تھا اس نے نبیلہ پر بہت کچھ عیاں کر دیا تھا۔ وہ واپس ڈرائنگ روم میں آئیں اور شہریار اور شفق کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

"تم نے انجی کا باقی گھر بھی دیکھ رکھا ہے؟" وہ شہریار سے مخاطب تھیں۔

"نہیں میں ڈرائنگ روم تک ہی آتا ہوں۔"

"تو آج دیکھو اور اللہ کا شکر ادا کرو۔ تمہیں شفق جیسی سگھڑ، سلیقہ شعار بیوی ملی ہے۔"

وہ جواب میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ابھی ابھی خاتون نے جس طرح اس کا بھانڈا پھوڑا تھا اسے کچھ کہنا نامناسب لگا۔ ویسے انجی کے لیے ماں کا یہ انداز اسے اچھا نہیں لگا۔

"ارے آپ لوگ ادھر کیوں آ گئے؟ چلیے ناں اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔"

انجی انہیں کچن میں کھڑے دیکھ کر بوکھلا سی گئی تھی کہ یہاں ہر طرف کچھ نہ کچھ بکھرا ہوا تھا۔ وہ خاتون تیزی سے آگے بڑھ کر چیزیں سمیٹنے لگیں۔ نبیلہ نے منع کر دیا، بولیں۔

"رہنے دو ہم اندر ہی بیٹھ جاتے ہیں۔"

وہ واپس آ کر بیٹھے تو انجی کا بیٹا شہریار سے بولا۔

"چاچو! آج پھر آئس کریم کھانے جائیں گے کل مزہ آیا تھا۔" نبیلہ تو چونکیں، حیران کے ساتھ ساتھ اس بات نے شفق کو بھی حیران کر دیا۔ شہریار نے بچے کو جواب میں کچھ نہیں کہا۔ خود کو اخبار میں گم کر لیا۔ شفق کچھ سوچ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کچن میں آئی تو انجی کچھ چیزوں کی لسٹ بنا رہی تھی۔

"کل میرے گھر سے آپ لوگ کس وقت واپس آئے تھے؟ کیا راستے میں دیر ہو گئی تھی؟"

"نہیں نہیں تمہیں تو پتا ہے دس پندرہ منٹ کی ڈرائیو ہے۔ ہم سیدھے گھر ہی آ گئے تھے۔ وہ شہریار کو ہمیں ڈراپ کرنے کے بعد کوئی مل گیا ہو گا ناں۔ اس لیے دیر ہو گئی ہو گی۔"

وہ خوامخواہ کی وضاحتیں دے رہی تھی اور ادھر نبیلہ بچے کو اس کے ساتھ کھیلنے کے بہانے ڈرائنگ روم سے باہر لے آئی تھیں اور پوچھ رہی تھیں۔ وہ آئس کریم کھانے کہاں گیا تھا۔ کیا وہ پہلے بھی انکل کے ساتھ ریسٹورنٹ جاتے رہتے ہیں۔

"ہاں مگر کبھی کبھی جب میں بہت زیادہ ضد کروں تب ورنہ تو ماما مجھے اور گڑیا کو پھوپھو کے پاس چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔"

انجی نے اکثر چیزیں بازار سے ریڈی میڈ منگوائیں اور لسٹ شہریار کو تھمائی۔ ان سے کہنے لگی۔

"محلے کے کسی لڑکے کو بھیجوں گی تو اپنا اپنا بل بنائے گا۔ یہ سب کچھ ذمہ داری سے لے آتے ہیں۔"

"تو پہلے بھی منگواتی رہتی ہو؟"

"ارے نہیں نہیں آنٹی! آپ پوچھ لیں شفو سے۔ یہ ساتھ ہی تو آئی ہے۔ ابھی بھیجا ہے میں نے آپ کے بیٹے کو بازار۔"

کچن میں اس کے رشتے کی خدمت کام نمٹا رہی تھی۔ وہ ان دونوں کے پاس بیٹھی شہریار میں ڈوبی گفتگو سے متاثر کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر دیکھ رہی تھی ساس بہو دونوں ہی بہت چپ چپ ہیں اور اس کی بات کو زیادہ دھیان سے نہیں سن رہیں پھر یہی ہوا کہ نبیلہ نے اس کی بات کاٹ کر شفق کو کوئی قصہ سنانا شروع کر دیا۔

آج ٹیبل پر پہلے سے زیادہ آئٹمز رکھے گئے تھے۔ یقیناً یہ اہتمام نبیلہ کے لیے تھا مگر انہوں نے صرف گھر کے بنے ویجی ٹیبل رائس تھوڑے رائتے کے ساتھ لیے۔

"انجی یہ فش بھی لیں ناں۔ اس علاقے میں ادھر اس دکان کی فش بہت مزے کی ہوتی ہے۔"

شہریار نے کہا اور انہوں نے سر اٹھا کر بیٹے کو دیکھا۔

"تم آتے رہتے ہو ادھر یہ فش کی دعوت اڑانے؟" انداز ایسا تھا کہ انجی اور وہ دونوں گھبرا گئے۔ انجی پہلے سنبھلی اور بولی۔

"ارے شفق! تم کچھ لے ہی نہیں رہیں۔ میری جان اتنا اہتمام میں نے تم ہی لوگوں کے لیے تو کیا ہے۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" شفق نے بے حد رکھائی سے کہا تھا۔

"اچھا پھر کچھ میٹھا ڈال دوں؟"

"میں نے کہا ناں بھوک نہیں ہے۔ تم یہ تکلف مت کرو۔"

اب کے اس کا انداز شہریار کو بہت برا لگا۔ کڑے تیوروں کے ساتھ اس کی جانب دیکھا مگر وہ متوجہ کب تھی۔ تھوڑا سا کھا کر نبیلہ نے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔

"[illegible]"

"نہیں بازار کی چیزیں اپنا نہیں کھاتی۔ پہلے میں خود اپنے ہاتھ سے پکاتی تھی۔ اب اللہ نے دونوں بہوئیں بھی گھر گرہستی کو سنبھالنے والی دی ہیں۔"

انجی اٹھ کر بیٹے کی فرمائش پر اندر سے کچھ لینے گئی تو شہریار بولا۔

"اس نے اتنا سب کچھ آپ ہی لوگوں کے لیے منگوایا ہے مگر پتا نہیں آپ دونوں اتنے نخرے کیوں کر رہی ہیں۔"

"تم تو کیا رہتے ہو تو تم ہی کھاتے جاؤ اور جھوم جھوم کے اس کی تعریفیں کرتے جاؤ۔"

نبیلہ نے بنا کسی لحاظ کے بری طرح ڈانٹ دیا تھا۔ شفق اب بھی سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ بہت سی باتیں بہت سے منظر واضح ہو رہے تھے۔

کمال ہے وہ یہ سب کچھ اب تک کس طرح نظر انداز کرتی آئی تھی مجھ سے بے وقوف عورت بھی زمانے میں کوئی نہیں ہو گی۔

"چلیں آنٹی!" آخر حوصلہ جواب دے گیا۔

"ہاں ہاں چلو۔" وہ بھی جھٹ سے بولیں۔

"وہ چاول کے بہانے گئی ہے۔" شہریار نے یاد دلایا۔

"پتہ نہیں بنانے گئی ہے یا بازار سے منگوانے گئی ہے۔" انہوں نے تمسخر اڑایا پھر بولیں۔

"ایسی کام چور عورتیں ان ہی مہمانوں کو پسند کرتی ہیں جو بنا کچھ کھائے پیے ہی اٹھ جائیں۔ میرا نہیں خیال وہ زیادہ اصرار کرے گی۔"

اور واقعی ایسا ہی ہوا۔

"مجھے حیرت ہے شفق! تم جیسی سلجھی ہوئی لڑکی کی دوستی انجی جیسی عورت سے کیسے ہو گئی؟" واپسی پر گاڑی میں بیٹھی وہ یہ صرف شہریار کو سنانے کے لیے کہہ رہی تھیں۔

"کسی کے بارے میں اتنی جلدی رائے قائم نہیں کر لینی چاہیے۔" وہ چپ نہیں رہ سکا۔

"میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ اسکول میں جاب کی ہے دن میں سینکڑوں لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا اور اس کے علاوہ بھی یہاں تک پہنچتے پہنچتے نہیں کتنے چہروں کو دیکھا اور پڑھا ہے مجھے تم نے انجی کو پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی۔"

اس دوران شفق بالکل خاموش اور بے حد تھکی تھکی سی تھی۔ اس نے بحث میں کوئی حصہ نہیں لیا لیکن جس طرح شہریار کھل کر انجی کی طرف داری کر رہا تھا اس کا دل لہولہو ہو رہا تھا۔

"غلطی میری ہی ہے۔ میں نے ہمیشہ اس کے سامنے انجی کی شخصیت کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ وہ میری دوست تھی۔ مجھے اچھی لگتی تھی مگر میں نے شہریار کے دل تک اس کا راستہ بنانے کی حماقت کیوں کی اور میں اب تک ناسمجھ بنی کیوں بیٹھی رہی۔" آنکھیں بند کرتے ہی دونوں پر اختیار نہیں رہا۔ وہ اس کے ساتھ اکیلی آؤٹنگ پر جاتی ہے۔ شہریار اکثر اس کے گھر بھی جاتا رہتا ہے۔ دل میں چور ہے۔ اسی لیے تو کبھی مجھ سے ذکر نہیں کیا۔"

"اترو بیٹا گھر آ گیا ہے۔" وہ اتنی الجھی ہوئی تھی کہ

اسے بتایا نہیں جا سکا۔ نبیلہ کی آواز پر وہ گہری سانس لے کر تھکے تھکے انداز میں گاڑی سے اتر آئی۔ اس کے انداز کو شہریار نے حیرت سے دیکھا۔

"کیا ہوا؟ جب تم انجی کے ہاں گئی تھیں بالکل ٹھیک تھیں۔ شاید انجی کی باتوں نے تمہیں ہرٹ کیا ہے۔ پتہ نہیں وہ ایسا کیوں کر گئی ہیں حالانکہ ہمیشہ انہیں ہر ایک کے ساتھ کھلے دل، کھلی بانہوں سے ملتے دیکھا ہے مگر انجی کے لیے ان کا رویہ میرے لیے بھی حیران کن ہے۔"

جواب میں وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ آنٹی کی رائے سے بالکل متفق ہے انہوں نے انجی کے بارے میں جو کہا ہے اسے دل سے مانتی ہے مگر دکھ کا بوجھ اتنا تھا کہ اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ سامنے کھڑا یہ شخص اسے خود سے بڑھ کر پیارا تھا۔ بہت مان تھا اس پر اور اس نے کیا کیا اس پر ایک دوسری عورت کو ترجیح دے کر اسے اپنی نظروں میں دو کوڑی کا کر دیا۔

شہریار بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بستر سے اٹھی اور باہر آ گئی۔ شاید آنٹی جاگ رہی ہوں۔ وہ ان کے کمرے میں آئی وہ واقعی جاگ رہی تھیں اور بستر پر لیٹنے کے بجائے صوفے پر بیٹھی کسی سوچ میں گم تھیں۔

"میں آ جاؤں آنٹی!"

"آؤ بیٹا! تم ابھی تک سوئیں کیوں نہیں؟" وہ ان کے پیروں کے قریب کارپٹ پر بیٹھ گئی۔ سر ان کی گود میں رکھا اور ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔

"نہیں بیٹا! روتے نہیں ہیں۔ زندگی میں بہت سے ایسے مقام آتے ہیں جب لگتا ہے زندگی بہت بوجھل ہو رہی ہے۔ ہم اس کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہیں مگر پھر یہ وقت گزر جاتا ہے۔ زندگی پھر سے رواں دواں ہو جاتی ہے بس بیٹا ذرا عقل سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے اور تم بہت سمجھدار۔ تم اکیلی نہیں ہو میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"مگر میرا سب کچھ ختم ہو گیا۔ شہریار نے ایک دوسری عورت کو مجھ پر ترجیح دے کر مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا ہے۔"

"تم ایسا کیوں سوچتی ہو؟ ہیرے کی قدر تو جوہری کو ہوا کرتی ہے۔ تم جانتی ہو کہ اس کی نگاہ جوہر شناس ہے ہی نہیں مگر ہم اسے کیچڑ میں ہاتھ بھی نہیں ڈالنے دیں گے۔"

"کیا میں شہریار پر اپنے شک کا اظہار کروں؟"

"نہیں، اس طرح اسے تو جھجک ہے وہ بھی جاتی رہے گی۔ میں اس وقت بستر پر لیٹ کر سونے کے بجائے تمہارے ہی بارے میں سوچ رہی تھی۔"

"کیا انجی اپنے میاں سے طلاق لے کر شہریار سے شادی..." اس سے آگے سے بولا نہیں گیا۔

"میرا نہیں خیال۔ اس طرح کی عورتیں صرف اور صرف مردوں کو اپنی طرف متوجہ رکھنے کی مشتاق ہوتی ہیں۔ یہ بات تو وہ خود بھی جانتی ہے۔ شہریار اس کے بچوں کو بھی نہیں اپنا سکتا اور وہ اپنے بچے تو کسی طرح نہیں چھوڑ سکتی۔"

"وہ شہریار کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔ مجھ سے یہ بھی برداشت نہیں ہو رہا۔"

"میں نے کہا نا بیٹا! بہت عقل سے کام لینا ہو گا میرا خیال ہے۔ ہمیں انجی پر بھی یہ ظاہر نہیں کرنا چاہیے کہ ہم اس کی سیاہ شکل دیکھ چکے ہیں۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

* * *

صبح شہریار کے آفس جانے کے بعد انہوں نے شفق کے میکے فون کیا۔ کچھ دیر اس کی امی سے بات کرنے کے بعد ارم سے بات کروانے کو کہا اور حال احوال دریافت کرنے کے بعد انجی کے بارے میں پوچھنے لگیں۔

"کیا ہوا آنٹی آپ اس کے بارے میں مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں؟"

"بہت دخل بڑھ گیا ہے اس کا میرے گھر میں۔ یہاں تک کہ اب تو شفق بھی کھٹکنے لگی ہے۔"

"شہریار بھائی بھی اس کا دم بھرنے لگے ہیں کیا؟"

"ہاں کچھ بات تو پریشانی کی ہے۔"

"آنٹی! انجی وہ کبھی بھی اچھی نہیں تھی۔ جب میں بیاہ کر اس گھر میں آئی تو وہ میرے میاں سے تو بے تکلف تھی ہی۔ ان کے سامنے مجھے کوئی بہت ہی خود کو عقل کل ثابت کرنے کے چکروں میں رہتی تھی اور آپ تو جانتی ہیں مرد ایسی عورتوں سے اگر وہ بیوی نہ ہو تو بہت متاثر ہو جاتے ہیں مگر میں بے وقوف نہیں تھی، وہ مجھ سے کہتی ارے بھابی یہ کیا اسٹائل بنا رکھا ہے آپ نے۔ اور میں پورے اعتماد سے کہتی دل پہ کالے کلوٹے لوگوں پر لگتا ہے۔ مجھ پر تو ہر کلر جچتا ہے۔ ہاں تم کبھی بھول کر بھی نہ پہننا۔ کبھی میرے بنائے کسی کھانے پر اعتراض کرتی آپ بھی ایسا ہی جواب دیتی اور آخر اس نے میرے سامنے آنا ہی کم کر دیا۔ مگر شفق بہت نادان ہے اور پھر وہ اس کی دوستی پر ایمان بھی لا چکی ہے۔"

"تمہاری باتوں سے مجھے ایک تسلی تو ہوئی ہے کہ وہ جو کچھ کر رہی ہے صرف اپنی فطرت سے مجبور ہو کر رہی ہے۔ شہریار میں اس کی دلچسپی دوسری طرح کی نہیں ہے۔"

"پھر بھی آنٹی! آپ نگاہ رکھیے۔"

واقعی ارم کا مشورہ معقول تھا اور پھر شہریار کا دل بھی تو اس کی جانب مائل محسوس ہو رہا تھا۔

* * *

شفق دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی جب انجی کا فون آ گیا۔ وہی بے تکلف اور پیار بھرے انداز۔ شفق نے اسپیکر آن کیا اور سیل فون لے کر نبیلہ کے پاس آ بیٹھی۔

"ہائے شفق! تمہاری ساس تو مجھے بہت ہی تیز عورت لگتی ہے۔"

نبیلہ کے اشارے پر اس نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"اس سے ذرا دور رہا کرو اور زیادہ خدمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ جتنی جلدی واپس چلی جائے اچھا ہے۔ ویسے گھر جا کر میرے بارے میں کوئی بات تو نہیں ہوئی۔"

"نہیں وہ جلدی سو گئی تھیں۔ اچھا انجی میں کھانا بنا رہی تھی۔ شہریار آنے والے ہوں گے۔"

"کیا بنا رہی ہو؟"

"قیمہ مٹر۔"

"ہوں میری فیورٹ ڈش۔" کوئی اور وقت ہوتا تو شفق جھٹ اپنے ہاں آنے کی دعوت دے ڈالتی مگر آج اس نے ایسا نہیں کیا۔

"اچھا شفق! ادھر کچن دیکھوں میں ابھی آتی ہوں۔" وہ فون سے فارغ ہوئی نبیلہ کے ذہن میں نجانے کیا آئی۔ اٹھ کھڑی ہوئیں اور آدھے گھنٹے کے بعد وہ انجی کے بیٹے کے ساتھ موجود تھیں۔

"آپ انجی کی طرف گئی تھیں۔ کیا وہ آپ کے ساتھ آئی ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں صرف اس کا بیٹا! خاصا ضدی اور بدتمیز بچہ ہے خیر اس کی یہی عادتیں ہمارے لیے سود مند رہیں گی۔"

شفق سمجھی نہیں مگر اتنا بھروسہ تھا وہ کوئی غلط نہیں ہو گا اور جب شہریار گھر میں داخل ہوا بچہ دھاڑیں مار کر رو رہا تھا اور چاکلیٹ کی فرمائش کر رہا تھا۔

"کیا انجی آئی ہیں؟" اس کے بیٹے پر نظر پڑتے ہی وہ پوچھنے لگا۔

"نہیں میں اس کی طرف گئی تھی۔ بچے نے رو رو کر گھر سر پر اٹھا رکھا تھا۔ یہی ضد پر ضد کیے جا رہا تھا اسے میں لے آئی۔"

"یہ بہت ضدی بچہ ہے۔ اسے کیوں لے آئیں۔ میں دوپہر میں بہت تھکا ہارا ہوتا ہوں اور یہ اپنے باپ کی کاپی۔" شہریار کے انداز میں بچے کے لیے بیزاری ہی بیزاری تھی اور اسے نبیلہ نے پہلی کامیابی سمجھا تھا۔

"پلیز اسے خاموش تو کروائیں۔ شفق سے کہیں وہ اسے بہت اچھی طرح ہینڈل کرتی ہے۔"

وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھا تھا اسی وقت نشوا تے ہوئے انجی لاؤنج میں آگئی تھی۔
"ارے یہ انجی ہے یا اس کا بھوت۔" وہ ٹھٹھکا۔
"بیٹا ادھر آؤ میرے پاس۔ فون کیا ہے میں نے تمہارے پپا کو۔ ابھی آ رہے ہیں پھر ہم اپنے گھر چلیں گے راستے میں تم جو کہو گے۔ تمہارے پپا تمہیں دلا دیں گے۔"
وہ شہریار کی طرف دیکھے بغیر بہت سپاٹ انداز میں شاید اسے ہی سنانے کو بچے سے کہہ رہی تھی۔
"انجی تم بھی آئی ہو میں سمجھا بچے ہی ہیں اور یہ تمہیں ہوا کیا طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟" انجی نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں شفق سے بولی۔
"بچی کو مجھے دو اور آنٹی کے کمرے میں رکھا میرا بیگ بھی لے آنا۔ ان کے پپا آتے ہی ہوں گے۔"
"ابھی تم لوگ کھانا کھا کر جانا۔"
"نہیں آنٹی شکریہ۔ اس کے پپا سے کہا ہے میں نے گویا زار سے لیتے آئیں گے پھر ہم نے اپنے بیٹے کو اس کی پسند کے کھلونے بھی دلوانے ہیں۔"
"اچھا تو بچوں سے پیار کرتا ہے تمہارا میاں چلو یہ بھی غنیمت ہے۔ میں سمجھی جیسے تم پر توجہ نہیں دیتا ایسے ہی شاید بچوں کو بھی اگنور کرتا ہے۔"
"نہیں نہیں آنٹی! اپنے بچوں میں تو جان ہے ان کی کوئی ان کے سامنے ان کے بچوں کو کچھ کہہ کر تو دیکھے اور میرا بھی بہت خیال رکھتے ہیں۔ اب تو میں نے بھی سوچ لیا ہے۔ انہیں بھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی بس میں میرے بچے اور ہمارے سر کا سائبان اظہر۔" یقیناً اس نے یہ سب شہریار کو سنایا تھا۔
کچھ ہی دیر کے بعد اظہر آ گیا۔ شہریار نے آج پہلی بار اسے دیکھا۔ اچھا خاصا معقول شخص تھا کم از کم اس سے تو بالکل مختلف جو کچھ انجی جتاتی رہی تھی۔ آتے ہی بچی کو پیار کیا پھر بیٹے کو گود میں لے لیا۔
"چلیے گھر چلتے ہیں۔" انجی اس کے بے حد قریب کھڑی تھی اور یہ عام سی بات بھی بڑے خاص انداز میں شاید شہریار کو کچھ جتانے کے لیے کہہ رہی تھی۔
"کھانا کھا کر جاتے آپ لوگ۔" نبیلہ نے کہا مگر انجی کسی طور تیار نہیں تھی۔
"لو اتنے بھلے مانس شوہر کے لیے یہ عورت کیسے کیسے الفاظ استعمال کرتی رہتی ہے۔" نبیلہ نے ان کے جانے کے بعد کہا تھا۔
"جی آنٹی! انجی کو ہمدردی سمیٹنے کی ہمیشہ سے عادت ہے۔" آج شفق بھی چپ نہیں رہ سکی تھی۔
"گھر میں کیسا سکون ہو گیا ہے۔ بچے تو گھر کی رونق ہوا کرتے ہیں مگر اس کے بچے تو آفت ہیں۔" یہ نبیلہ تھیں۔
شہریار نے شفق سے دوا کے لیے کہا اور پھر سے کمرے میں چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

شہریار کو فلو ہوا پھر بخار نے آ لیا تین دن تک وہ آفس نہیں جا سکا اور ان تین دنوں میں ان دونوں نے اسے کمرے میں اکیلا نہیں چھوڑا۔ ایک کام کے لیے اٹھتی تو دوسری آ بیٹھتی۔ وہ اسے انجی کو کال کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھیں اور شہریار ایسے موقعے کی تلاش میں تھا بھی نہیں۔ ان تین دنوں میں صرف پہلے روز ہی اس نے انجی کے بارے میں سوچا تھا۔ "کیا میں بچوں سمیت اسے قبول کر سکتا تھا؟ یہ میں کسی طلسم میں گرفتار ہو رہا تھا۔ میں جو ہمیشہ خود کو بہت سمجھدار سمجھتا رہا مجھے کیا ہو رہا تھا؟" وہ خود پر حیران تھا اور بس۔

تیسرے دن وہ آفس گیا اور وقت پر واپس آیا۔ شام میں ان دونوں سے کہیں باہر لنچ کے لیے کہہ رہا تھا اور انہوں نے انکار نہیں کیا۔
بہت دن گزر گئے۔ انجی کا فون بھی نہیں آیا اور شفق خود سے کال کرتی۔ اب تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔
اور جس روز ڈاکٹر نے شفق کو امید سے ہونے کی خوش خبری دی تھی وہ بے اختیار رو پڑی تھی۔
"شفق! کیا ہوا بھئی کیا تم خوشی سے رو رہی ہو؟"

"نہیں آنٹی! میں شہریار کے بارے میں سوچ رہی تھی اگر آپ نہ آتیں اور یہ مسئلہ حل نہ کرتیں تو آج یہ تجربہ۔ عورت کتنی بے امان ہے۔"
وہ جواب میں کچھ نہیں کر سکیں بس اس کا سر سینے سے لگا کر تھپکنے لگیں۔ پھر اسے خود سے الگ کیا اور بولیں۔
"بیٹا حدیث ہے کہ عورت اپنے مرد کے سامنے دوسری عورت کی تعریف نہ کرے لیکن دوسری بہت سی باتوں کی طرح ہم نے کبھی اس بات پر بھی غور نہیں کیا۔ اس کی حکمت سے ناواقف ہی رہے۔ میں مانتی ہوں بہت زیادہ قصور شہریار کا ہے مگر کیا کریں بیٹا کہ یہ معاشرہ مرد کا معاشرہ ہے عورت کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہے ورنہ آنسو اور پچھتاوے ہی رہ جاتے ہیں۔"

☆ ☆ ☆

جب ان کے ہاں پہلی بیٹی ہوئی تو شہریار نے بہت [illegible] "کیسی ہے وہ؟" فطری اشتیاق کے ساتھ پوچھا تھا۔
"بہت پیاری بالکل شفق جیسی۔" اور جہاں ماں مطمئن ہوئی تو وہیں ایک آسودہ سی مسکراہٹ شفق کے ہونٹوں پر بھی سج گئی۔
تقریباً ڈیڑھ سال بعد ہی وہ پوتی کو دیکھنے پاکستان آ گئی تھیں۔ وہ گاڑی میں ہی انہیں بتا رہا تھا۔
"بہت ضدی ہو گئی ہے اور تمیز دار بھی۔"
"اچھا! انجی کے بچوں کی طرح تو چیزیں پھاڑ کر تو نہیں رولتی؟" وہ پوچھ رہی تھیں۔
"نہیں نہیں امی! وہ میری اور شفق کی بیٹی ہے بھلا ایسی کیسے ہو سکتی ہے؟"
"چلو شکر ہے تمہیں ہیرے کی قدر تو ہوئی۔"
"کیا مطلب امی؟" اس نے ان کی جانب دیکھا اور جواب مل گیا۔
"میں بھٹک گیا تھا امی اور مجھے آج تک حیرت ہے کیا تھا اس عام سی عورت میں۔"
"بیٹا! میں نے آج تمہیں اس لیے یہ یاد دلایا ہے کہ اب تم بھی ایک بیٹی کے باپ ہو۔"
"امی! میں یہ غلطی کبھی دہرانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ شکر ہے کہ شفق اس بات سے ناواقف ہے۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔
وہ بات خود دو سال سے شہریار پر ظاہر نہیں کی گئی جسے شفق چپکے سے برداشت کر گئی ہے۔ کیا شہریار کو بتا دوں۔

انہوں نے کچھ دیر سوچا پھر فیصلہ کیا نہیں شہریار کو بتایا تو پھر وہ اپنی محبتوں کے اظہار میں جھجک کا شکار ہو جائے گا اسے اسی غلط فہمی میں رہنے دو کہ شفق کچھ نہیں جانتی۔ وہ تمہاری بے وفائی سے ناواقف ہے۔
اسی میں شفق کی بھلائی ہے۔ گھر قریب آ چلا تھا۔
"امی! شفق نے گھر کو بالکل بدل کر رکھ دیا ہے۔ تمام فرنیچر نیا ڈلوایا ہے۔ بہت اچھا لگ رہا ہے۔ آپ دیکھیں گی تو خوش ہو جائیں گی۔"
انہیں وہ شفق یاد آ گئی تھی جس کی دنیا بس لٹنے کو ہی تھی اور شوہر مل جانے کے بعد بھی وہ اس کی واپسی پر بے یقین تھی۔

اس وقت وہ اسے محض ان کی جذباتیت سمجھے تھے مگر آنے والے دنوں میں برسوں میں انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنے قول میں کس قدر سچی تھیں۔ تبسم نے ہر طرح کے حالات میں ان کا ساتھ دیا تھا۔ "شاہ پیلس" سے بے دخل ہونے کے بعد انہوں نے اپنے سسر کی مدد لینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کے عزیز از جان بھائی اثبات احمد نے ان کی ماں جی کے علم میں لائے بغیر ان کے لیے انگلینڈ جانے کا انتظام کیا تھا۔ وہاں پر دونوں نے جان توڑ محنت کی۔ اولاد کوئی تھی نہیں اس لیے گزارا باآسانی ہو گیا۔ بارہ سالوں میں بھی اثبات احمد کا "شاہ پیلس" سے رابطہ اگرچہ کم ہو گیا مگر رہا ضرور تھا۔ چھ سال پہلے وہ پاکستان آئے تو اثبات احمد کے کہنے پر یہیں کاروبار وغیرہ شروع کرنے کا ارادہ بنا لیا۔ تبسم ان کے ساتھ تھیں۔

ملتشاہ گو کہ تیار نہ تھی مگر تبسم نے اسے قائل کر ہی لیا۔ "شاہ پیلس" کے رہن سہن کا وہ لوگوں کو بھی ادراک تھا اس لیے پہلی بار وہ اسے دانستہ ساتھ نہیں لائے تھے۔ تبسم کو گھٹے گھٹے ماحول کے باوجود یہاں کی محبتوں کی فضا اچھی لگی تھی۔ ڈبل اسٹوری پورشن میں اثبات احمد اور وہاب احمد خاندان رہائش پذیر تھے۔

وہاب احمد، حیات احمد سے آٹھ برس چھوٹے تھے۔ ان سے چھوٹی فائقہ شادی کے بعد شوہر کے ساتھ قطر چلی گئی تھیں۔ ماں جی کی طبیعت کی خرابی پر وہ اور تبسم "شاہ پیلس" آئے تھے اور انہیں منا کر ہی دم لیا تھا۔ تبسم کے متعلق جو ان کے خیالات تھے، وہ ان سے قطعی مختلف ثابت ہوئیں لیکن یہ ان کی بدقسمتی ہی تھی کہ صرف دو ہفتوں بعد ماں جی داعی اجل کو لبیک کہہ گئیں۔

اثبات احمد کی پانچ اولادیں تھیں۔ سمیعہ اور نازش کی ماں جی کی وفات سے دو ماہ پہلے اکٹھے ہی شادی ہوئی تھی۔ یہ دونوں بیاہ کر خالاؤں کے گھر گئی تھیں۔ ان سے چھوٹے ازرار شاہ جو ایم بی اے کے بعد ذاتی فیکٹری سے منسلک ہو گئے تھے پھر ہدیہ تھی۔ ایم اے اسلامیات کی اسٹوڈنٹ۔ اس سے چھوٹا نوفل جو بی ای کر رہا تھا۔ وہاب احمد کے دو جڑواں بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ جنید اور حیدر اس کے ایج فیلو ہی نہیں، کلاس فیلو بھی تھے۔ چھوٹی لائبہ میٹرک کی اسٹوڈنٹ تھی۔

وہ "شاہ پیلس" میں پہلی بار ہی آئی تھی۔ اس کے انداز میں نہ تجسس تھا اور نہ گرم جوشی۔ دو دن تک تو اس کا موڈ آف ہی رہا تھا مگر پھر ہمارے کزنز کی موجودگی میں اس کا خود ساختہ خول ٹوٹ ہی گیا۔ اس کی عادات اور مزاج تبسم جیسا ہی تھا اور حیات احمد جیسا بھی۔ جذباتی حیات احمد کی طرح تھی تو خوش اخلاق اور زندہ دل تبسم کی طرح۔

ازرار شاہ نام کے "ہوّے" سے اسے پہلے دن ہی سے ڈرانے کی کوشش کی گئی تھی۔

"بھائی یہ پسند نہیں کرتے وہ پسند نہیں کرتے۔"

وہ بور ہو گئی تھی اس قسم کے شکوے سن سن کر اور ان سے ملاقات تیسرے روز ان کی سالگرہ پر ہوئی تھی اور ان سے مل کر وہ مزید مایوس ہوئی تھی۔

"یہ ان کے چہرے پر ایک ہی تاثر کیوں فکس رہتا ہے؟" دوسرے دن ہی اس نے معصومیت سے آنکھیں جھپکاتے ہوئے پوچھا تھا۔ وہ ان سے کچھ فاصلے پر ہی تو فائلز دیکھنے میں مگن تھے۔ ہدیہ کا کھلا منہ بند نہیں ہو سکا تھا۔

"ریلیکس... میں تو ان کا ایک ہی پوز دیکھ دیکھ کر بور ہو گئی ہوں۔ انسان میں کچھ تو تحمل ہونا چاہیے۔ یہ کیا کہ ایک ہی کام کیا اور سو گئے کسی بات کے۔ ہو نہ ہو رنگ لانا [illegible] اٹھا کر [illegible] لیپ ٹاپ اٹھاتے ہوئے وہاں [illegible] کرنے کا [illegible]

"آپ کا کیا خیال ہے [illegible] ہے [illegible] جا کر کریں۔ میں اس وقت کام کر رہا ہوں۔" یہ وقت انہوں نے اپنے بیٹے کو تاکید میں رکھا تھا۔

"مجھے بھی نظر آ رہا ہے، اندھی نہیں ہوں میں۔" وہ منہ چڑا کر اٹھ گئی۔ اسے خوامخواہ میں رعب جھاڑنے والے مرد بالکل پسند نہیں تھے۔

ابھی ایک ہفتہ ہی ہوا تھا اسے یہاں آئے کہ حیات احمد، سسر کی طبیعت کی خرابی کا سن کر تبسم کے ساتھ انگلینڈ چلے گئے تھے۔ وہ بھی بہت مچلی تھی ان کے ساتھ جانے کے لیے مگر انہوں نے دانستہ اسے "شاہ پیلس" میں چھوڑا تھا اور اب دو ہفتوں سے وہ یہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

"ہیلو گائز..." دھپ سے صوفے پر گرتے ہوئے اس نے ریڈیو سننے میں مصروف نوفل اور حیدر سے کہا تھا۔ کچھ دیر قبل ہی سو کر اٹھی تھی۔

"ہائے سنگ لیڈی۔" حیدر خوشگواری سے بولا۔

"ہدیہ اپیلیز... اسٹرانگ چائے۔" [illegible] ہاتھوں میں فیال چلاتے ہوئے اس نے وہیں سے ہانک لگائی تھی۔

"ہائے میں مر گیا۔ کوئی میرے [illegible]... تو کیا ہو جائے 'مرگ عشق'۔" اچانک جنید آ دھمکا تھا، ان تینوں کو ہی چونکا دیا تھا۔

اسے لنگڑاتا دیکھ کر ہدیہ کچن سے بھاگی آئی۔

"کیا ہوا جنید!"

"ایکسیڈنٹ..."

"کس سے؟"

"وہ انور سیٹھ جو ذرا مشہور نہیں کی... انہی کے سالے کی بائیک آتی تھی۔ نحوست سے میں نے کہا کہ پہلے چلائی تو بولے تیرے آنے کی سڑک ہے جو چپکے کی طرح ٹکرا آ جاتا ہے۔ اس پر پہلے پہلے دانت نکال کر رہا۔"

"ہائے جی، اس کی بریکیں کہاں تھیں؟ ہائے میری ٹانگ..." وہ کشن پر ڈھیر ہو گیا۔

"ہائے ہدیہ اپیا! گلوکوز تو لے کر آؤ۔ مجھ میں تو دعا دینے کی بھی سکت نہیں ہے۔"

"بے بات... بے چپ کر کے بیٹھو۔" نوفل نے ڈانٹا۔

"کیا تمہارا درد ہو رہا ہے؟" ملتشاہ آنکھیں پٹپٹا کر اس کی [illegible]

"نہیں، میرا تو جھگڑا تا رہنے کا موڈ ہو رہا ہے۔" وہ جل کر بولا۔ "امی کہاں ہیں؟"

"چچی اور امی تو بازار گئی ہیں۔" ہدیہ سچ مچ گلوکوز لے آئی۔

"ہائے میری ماں بھی اس وقت گھر پر نہیں۔ میرا دکھ کون سمجھے گا۔"

"چپ... اب اگر تم نے بکواس کی تو میں تیر لگا دوں گا۔" نوفل نے ڈپٹا تو وہ

بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے

گنگناتا کمرے میں چلا گیا۔ ہدیہ فرسٹ ایڈ باکس لیے اس کے پیچھے ہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"ہیر امیگو کس نے اٹھایا ہے لاؤنج سے؟" اس نے لاؤنج سے آدھا پیچھے نکلتے ہوئے پوچھا تھا۔ سب لوگ لاؤنج میں مصروف تھے۔

"کو بیٹا ادھر آجاؤ۔" اثبات احمد نے محبت سے کہا تو وہ پیچھے آ گئی۔

"کیا کر رہی تھیں؟" وہاب احمد بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"کچھ نہیں چاچو۔ اخبار دیکھ رہی تھی۔ ہدیہ کہاں ہے؟"

"ہم جہاں ہیں جناب۔" ہدیہ ٹرے سمیت کچن سے برآمد ہوئی۔

"اوہ گڈ، میرا ابھی چائے کا موڈ ہو رہا تھا۔"

"مگر یہ چائے تمہارے لیے نہیں ہے، بڑوں کے لیے ہے۔ تم پہلے کھانا کھاؤ اس کے بعد دودھ...."

"اوہ... نو... میں دودھ نہیں پیتی۔"

"پھر بھی آپ گوری ہیں۔" لائبہ کو حیرت ہوئی تو وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"تائی اماں! آپ جو بریل سوٹ لے کر آئی تھیں، وہ میں نے ہدیہ کو دے دیا ہے۔ اس پر مست سوٹ کرے گا۔" جان بوجھ کر اس نے یہ قصہ چھیڑا تھا۔

"کیوں بیٹی تمہارے لیے نہیں تھا؟"

"تائی تو تھیں مگر کیا ہے کہ آج تک میں اس طرح کے ڈریسز میں ان ایزی فیل کرتی ہوں۔ ہو تو میں خود کو بہت اوور محسوس کرتی ہوں اس طرح کے لباس پہن کر۔ آپ میرے لیے اسپیشلی لائی تھیں، مجھے بہت اچھا لگا۔ بٹ سوری اٹس ناٹ مائی چوائس۔" [illegible] بولی بھالی گرین آنکھوں سے ازرار شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

"اوکے بیٹا! کوئی بات نہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

"اور ظلم یہ چچی... آپ کے ٹراؤزر شرٹ لاجواب ہیں۔ وہیں پہن لوں گی۔" گویا احسان کیا تھا۔

"بیٹا شلوار قمیص ہمارا اسلامی ہی نہیں، قومی لباس بھی ہے اور پھر لڑکیوں پر تو شلوار سوٹ ہی اچھا لگتا ہے۔" اثبات احمد نے رسانیت سے کہا تھا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں تایا ابو لیکن اب تو پاکستان میں بھی جینز شرٹ بہت عام ہے۔ یہ بھی تو اسلامی مملکت ہے۔"

"اپنی مشرقی روایات و اقدار کو چھوڑ کر ہم مغربی اطوار اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں تو یہ ہمارا احساس کمتری ہے کہ ہم اپنی چیز کو کمتر اور دوسروں کی چیزوں کو برتر سمجھتے

ہیں۔ وہ مردوں کی نقالی کرنے سے ہم ترقی یافتہ نہیں کہلائے جائیں گے۔"
"یہ تو آپ کہہ رہے ہیں نا ابا کہ لوگوں کو اپنے ملک کی ہر چیز میں خرابیاں نظر آتی ہیں۔ برٹش نیشنلٹی اتنی بھی قابل فخر بات نہیں ہے کہ آپ ہر وقت اس کا حوالہ دیتے رہیں۔" ازرار شاہ کے سرد لہجے نے اس کا خوش گوار موڈ خراب کر دیا۔
"اگر آپ کا اشارہ میری طرف ہے تو مائنڈ اٹ مسٹر ازرار شاہ میں نے کبھی اپنی برٹش نیشنلٹی کو ایکسپوز کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ آپ کی اپنی سوچ ہے۔"
"نہیں نہیں بیٹا! ازرار۔ کا اشارہ تمہاری طرف نہیں ہے۔" فائزہ نے جلدی سے بات سنبھالی۔
"میں ان کے اشاروں کو خوب سمجھتی ہوں۔" وہ جذباتی انداز میں یہ بات کہہ کر اٹھ گئی تھی مگر پیچھے سب کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔
"دیکھا ازرار میاں! فشاء بیٹی کتنا سمجھنے لگی ہے آپ کے اشاروں کو۔"
"چاچو! آپ بھی بس۔" وہ ان کی معنی خیز مسکراہٹ پر جھینپ سا گیا۔
"بھائیاں!" ہدیہ کی پکار پر وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا تو وہ اسٹور میں گھسی ہوئی تھی۔
"کیا بات ہے؟"
"فشاء کا میگزین نہیں مل رہا آپ نے تو نہیں دیکھا؟"
"کون سا تھا وہ میگزین؟" اس کا ماتھا پر شکن ہو گیا۔
"وہ... فشاء ہی لائی تھی شام کو۔"
"تم لوگ کے ایف سی گئے تھے۔"
"ہاں گئے تھے پھر۔" وہ سینے پر بازو لپیٹے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔
"میں تم سے بات نہیں کر رہا۔" لیکن نائٹی میں وہ زیادہ ہی بے باک لگی تھی۔
"مگر میں آپ ہی سے بات کر رہی ہوں۔ میرا میگزین۔" اس نے ہاتھ پھیلایا۔ کچھ دیر خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ فشاء کا دل بے ساختہ دھڑکا تھا۔
"یہ رہا تمہارا میگزین۔ اٹھا لو اسے۔ آئندہ اس قسم کے فضول اور بے ہودہ میگزین اگر تم اس گھر میں لائیں تو میں بہت بری طرح پیش آؤں گا۔" ٹیبل پر رکھا شمارہ اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ غضب ناک انداز میں کہہ رہا تھا اور وہ... وہ تو آنکھیں پھاڑے اپنے ان گنت ٹکڑوں میں بٹے اس فلمی میگ کو دیکھ رہی تھی جسے اس نے ابھی فرصت سے دیکھا بھی نہیں تھا۔
"یہ گھر ہے کوئی فلمی اسٹوڈیو نہیں یہاں اس قسم کی خرافات لانے سے قبل آئندہ سو مرتبہ سوچنا۔" وہ کہہ کر باہر نکل گیا۔
"یہ شخص اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ بڑا آیا مولوی کہیں کا۔" بے حد اشتعال کے عالم میں اس نے شمارہ کمرے کے وسط میں الٹ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بھائی پلیز۔" ہدیہ لپک کر اس کے سامنے آئی تھی جو اس کے کمرے کی طرف ہی آ رہا تھا۔ اپنا کارنامہ کچھ دیر پہلے ہی اس نے اس کے گوش گزار کیا تھا اور اب مزے سے واک مین سن رہی تھی۔ ازرار شاہ نے کبھی کسی کی اس حد تک بدتمیزی برداشت نہیں کی تھی۔ اپنے کمرے کا حشر دیکھ کر اس کا پارہ آسمان کو چھونے لگا تھا پورے کمرے میں یہاں سے وہاں فلمی میگ کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ازرار شاہ کے کمرے کا حلیہ [illegible] کے لیے باہر [illegible]
"تم تو سامنے سے ہٹو یہ لڑکی خود کو سمجھتی کیا ہے۔ لاڈلی ہو گی اپنے ماں باپ کی۔ اتنی بدتمیزی! اتنی خود سری۔" اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں تب ہی وہ کمرے سے باہر آئی۔
"کیا ہوا؟" وہ انجان بن پوچھ رہی تھی۔
"تم..." اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس کا کیا حشر کر دے۔
"فشاء تم اندر جاؤ۔" ہدیہ نے اسے دھکیل کر اندر کیا اور باہر سے دروازہ لاک کر دیا۔
"ہدیہ! دروازہ کھولو۔ میں ڈرتی نہیں ہوں تمہارے اس ہٹلر بھائی سے۔" وہ دروازہ بجانے لگی۔
"کیا ہوا ہدیہ!" فائزہ جو چھت پر تھیں پریشان ہو کر نیچے آ گئیں۔
"کچھ نہیں امی۔ آؤ بس بس۔" ازرار شاہ کو واپس پلٹتے دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ ازرار شاہ کا غصہ پورے خاندان میں مشہور تھا۔ فشاء خیالات جانے کیوں

اس سے وہ مقابلے پر اتر آتی تھی۔ یہی بات اس نے فائزہ سے کہی تو وہ مسکرا دیں۔
"تمہیں ... تمہارے ابو اور چاچو سوچ رہے ہیں نا تو ایسے میں ازرار کے لیے فشاء جیسی لڑکی ہی سوٹ کرے گی۔ ازرار کا مزاج بہت کڑوا ہے اسے اپنی منوانے کی عادت ہے۔ کوئی عام سی لڑکی آئی تو تمہارے بھائی کا غصہ اور نخرا سہہ کر ختم ہو جائے گی۔ یہ مزاج تمہاری دادی پر گیا ہے۔ وہ بھی ایسی ہی تھیں۔ اپنے بیٹے سے تیس سال دوری برداشت کرتی رہیں۔ آخر وقت میں ہی ان کا مزاج بدلا۔ ازرار پیدا ہوا تو اس وقت میری گود میں سمیعہ تھی۔ جازن بھی چھوٹی ہی تھی اس لیے ازرار کو تمہاری دادی نے ہی پالا۔ میں تو مطمئن ہوں کہ کوئی تو میرے بیٹے کو احساس دلانے والی آئی۔ وہ میرا بیٹا ہے مگر مجھے اس کی خامیوں کا احساس ہے۔"
"ایک سیر تو وہ سوا سیر ہے۔ امی مجھے تو مشکل ہی لگ رہا ہے۔" ہدیہ امی سے کہہ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"نوفل! تمہاری دوست کی مس کال ہے۔" اس کا [illegible] نوفل کو پکار کر [illegible]
"جانا ضروری ہے۔ میں نے کہا اوپر سے ہی گزر جانا تھا ابھی بڑی پسلی بریک ہو جاتی تو۔" سیل فون جھپٹ کر نمبر ملانے لگا۔
"تو تم انسانوں کی طرح سیڑھیاں استعمال نہیں کر سکتے۔ نقل تو خیر کیا لوں عادتیں بھی بندروں جیسی ہیں۔"
"یہ دوست تمہاری ہے یا تمہارا ہے؟" جنید بائیک کی دھلائی موقوف کر کے ان کی طرف دیکھا تھا۔
"تمہارا ہی ہے یہ... فشاء تو بس..."
"اچھا... لڑکے کا نام ہے... مجھے تو نہیں پتہ تھا۔" وہ معصومیت سے بولی تو نوفل کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگا۔
"خدا کا واسطہ ہے آہستہ بولو ورنہ بھائیاں ابھی حشر اٹھا دیں گے۔" اس نے لان چیئر پر احسان صبح کے باسی اخبار میں کھوئے ازرار شاہ کو دیکھا۔
"ہونہہ... اپنے بھائی کے ڈراوے مت دیا کرو تم مجھے۔ کیا خیال ہے کرکٹ کے بارے میں؟"
"بڑا نیک خیال ہے۔ لیکن بھائیاں سے تم نہیں ڈرتی ہو گی مگر ہمیں تو اپنی عزت پیاری ہے نا!"
"ہاں ہاں پتا ہے مجھے۔ کتنی عزت ہے تمہاری۔ چلو جنید! تم مجھے باہر کی سیر کراؤ۔ ویسے تم نے کہا تھا کہ تم مجھے ذرا گھومنے لے جاؤ گے۔ کب گھماؤ گے۔ سچ میں بور ہو رہی ہوں۔ ڈیڈی اور مام بھی آنے کا نام ہی نہیں لے رہے۔"
"کیا ہوا تمہارا دل نہیں لگ رہا یہاں؟"
"بالکل نہیں۔ جیل جیسی زندگی ہے یہاں پر۔"
"اگر ساری عمر یہیں رہنا پڑ گیا تو کیا کرو گی؟" نوفل کے معنی خیز انداز نے اسے چونکا دیا۔
"توبہ کرو میں اور ساری عمر یہاں؟ اس ایسا نہیں ہے۔ ہاں اگر تمہارے بھائی صاحب ادھر ادھر ہو گئے تو سوچا جا سکتا ہے۔ تم لوگوں کے ساتھ مزہ آتا ہے۔ میں نے تو ابھی تک پورا کراچی ہی نہیں دیکھا۔"
"تو ہم نے کون سا پورا کراچی دیکھ رکھا ہے۔" جنید نے منہ بسورا۔
"کیوں؟ تم تو گھر کے ہو!"
"صبح یونیورسٹی اور کالج۔ شام کو ٹیوشن۔ رات کو گھر میں۔ دس بجے کے بعد باہر جانے کی اجازت بھی نہیں ہے۔"
"اوکے۔ اس وقت چھ بجے ہیں۔ ٹھیک ساڑھے سات بجے ہم سب... یعنی تم، جنید، لائبہ اور ہدیہ۔ اگر آنٹی اور عینی جانا چاہیں تو وہ بھی "کو مکٹ" پر چل رہے ہیں اور رات بارہ ایک سے پہلے واپسی نہیں ہو گی۔"
"مگر..."
"نو مور آرگیومنٹس۔ کب کیسے اور کس طرح جانا ہے۔ یہ تم مجھ پر چھوڑو اور جا کر اچھی طرح ڈریس اپ ہو جاؤ۔"
"ایک گاڑی تو ابو کے پاس ہے اور دوسری بھائیاں۔"
"ہم سوک پر جائیں گے۔" اس نے پورچ کی طرف نگاہ اٹھائی۔ نوفل اور جنید ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

☼ ☼ ☼

گہری براؤن نشیلی آنکھوں میں گہرے لینس لگائے اس نے سیاہ گھنگھریالے بالوں میں ہیر برش پھیرتے ہوئے

"جی نہیں، مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔ کباب میں ہڈی بننے کا۔" وہ مسکرائی۔

"ارے نہیں یار! یہاں کوئی کباب نہیں ہے۔ میرا ابھی موڈ ہو رہا ہے آؤٹنگ کا۔"

"تو پھر چلی جاؤ مونس کے ساتھ۔ ممی جانے کب ایگزیبیشن سے واپس آئیں۔ اچھی بات ہے تم جب تک چینج کر لو۔"

"چینج کروں یا ایسے ہی ٹھیک ہے؟" وہ سامنے لگے قدِ آدم آئینے میں خود کو دیکھنے لگی۔ وائٹ اسکرٹ اور لائٹ پنک شرٹ اس نے پہنا ہوا تھا۔

"اس ڈریس میں بھی اچھی ہی لگ رہی ہو۔ اگر چینج کرنے کا موڈ ہے تو کر لو۔" نائمہ تنقیدی نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہنے لگی۔ کچھ سوچ کر وہ چینج کرنے اس کے بیڈروم میں چلی گئی۔

بلیک جینز پہ میرون کرتا پہن کر پہنچی تو مونس اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"چلیے۔ میں تیار ہوں۔" اس کی ستائشی نظریں خود پر محسوس کر کے اسے کہنا پڑا۔

"ہاں چلو۔" وہ سیل فون ٹیبل سے اٹھاتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

پی سی میں پُرتکلف ڈنر کے بعد وہ کافی سے لطف اندوز ہو رہی تھی جب اس نے فارمل ڈریسنگ میں ازرار شاہ کو ہال میں آتے دیکھا۔ وہ کسی شخص سے باتوں میں مگن تھا۔ پہلے سے ریزرو ٹیبل کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے اچٹتی ہوئی نگاہ ٹیبل پر انگلیاں پھنسائے ایک ینگ مین سے لڑکے کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف فشاء حیات پر ڈالی تھی اور جانے کیوں نظریں اس کی سیاہ لٹوں میں الجھ کر رہ گئی تھیں۔ وہ اسے کافی حد تک آزاد خیال سمجھتا تھا مگر وہ اس حد تک لبرل ہوگی یہ یقیناً ازرار شاہ جیسے شخص کے لیے باعثِ ندامت تھا۔ اس کے پورے خاندان میں کوئی لڑکی اتنی آزادی سے جینز پہنے ہوٹلنگ کرتی کبھی دکھائی نہیں دی تھی۔ ایک پل کو اس کا دل چاہا کہ وہ اسے دو تھپڑ لگا کر کھینچتا ہوا لے جائے۔

اس کی رگوں میں جس خاندان کا لہو دوڑ رہا تھا، اس خاندان کی کوئی عورت آج تک بنا حجاب کے باہر نہیں نکلی تھی اور یہ فشاء حیات... اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کر ڈالے۔ تب ہی اس لڑکے نے بے تکلفی سے اس کا ہاتھ تھام کر کچھ کہا تھا اور ازرار شاہ کو وہاں پل بھر ٹھہرنا دشوار ہو گیا۔ وہ اپنے کولیگ سے معذرت کر کے وہاں سے فوراً اٹھ گیا تھا۔

شاید کچھ دیر مزید رکتا تو خود پر قابو نہ رکھ پاتا۔

☆ ☆ ☆

"کون تھا وہ لڑکا؟" وہ صبح یونیورسٹی جانے کے لیے کھلکھلاتی ہوئی لان سے گزر رہی تھی کہ معاً گیراج سے نکلتے ازرار شاہ نے اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے ریلنگ کی طرف دھکیلا تھا۔

"ڈونٹ بی نان سینس۔" اس کے مسکراتے لب بھنچ گئے۔ "یہ کوئی طریقہ ہے کسی سے سوال کرنے کا؟"

"تم مجھے زیادہ طور طریقے مت سکھاؤ۔ سیدھی طرح جواب دو کہ وہ لڑکا کون تھا؟" سرخ نظروں سے اسے گھورتے ہوئے وہ اصولاً بھی ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔

"ویسے تو میں آپ کو جواب دینے کی پابند نہیں ہوں لیکن پھر بھی بتا دیتی ہوں کہ وہ مونس تھا۔ میرا کزن۔" [illegible] اس نے حتی الامکان نارمل رکھا تھا۔ وہ سب لاؤنج میں بیٹھے تھے۔

"کزن؟ [illegible]"

"آپ کو اس سے کیا، کوئی بھی ہو؟"

"اس کے خاندان کا تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا مگر تمہاری رگوں میں جس خاندان کا لہو دوڑ رہا ہے وہاں تو اس بے حیائی کی اجازت ہے اور نہ آئی..."

"جسٹ شٹ اپ مسٹر ازرار شاہ! خبردار جو آپ نے میری ممی کے خاندان کے متعلق ایک لفظ بھی مزید کہا۔" بے حد برہمی سے انگلی اٹھاتے ہوئے اس نے گویا وارننگ دی تھی۔

"اگر تم مجھے دوبارہ اس فلرٹ کے ساتھ نظر آئیں تو..." اس پر اس کی وارننگ کا کوئی اثر نہ ہوا۔

"ناؤ ڈیئر... آپ کون ہوتے ہیں مجھ پر پابندی لگانے والے... میں جہاں..."

"فشاء..." فائزہ کی پکار پر اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔

"ہونہہ..." وہ نخوت سے سر جھٹکتے ہوئے پلٹی تو اس نے دوبارہ کلائی کھینچی۔

"ایک بات یاد رکھنا فشاء! میں اپنی بات دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔"

"میں بھی کسی کو اپنی لائف میں انٹرفیئر کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ یہ بات آپ یاد رکھیے گا۔"

ایک جھٹکے سے اپنی کلائی چھڑا کر وہ سرعت سے مڑ گئی۔ وہ لب بھینچے اسے دیکھتا رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

نائمہ ممانی کے سرد رویے کی وجہ سے وہ "سعید ولا" دوبارہ نہیں جانا چاہتی تھی مگر ازرار شاہ کی باتوں نے اس کے من و دل میں آگ لگا دی تھی۔ اسے جلانے کی خاطر ہی وہ اکثر شامیں مونس کے ساتھ گزارنے لگی تھی۔ مونس جہاں اس کے التفات پر بے پناہ خوش تھا، وہیں ممانی اور نائمہ اسے نظرانداز کرنے لگی تھیں۔ ممانی اسے خطرہ سمجھتی تھیں کیونکہ کافی سال پہلے ہی وہ اپنی ڈاکٹر بھانجی کا رشتہ مونس کے لیے طلب کر چکی تھیں۔ اس بات کو مونس نے قطعی اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ ایک کھونٹے سے بندھ کر رہنے والا تھا بھی نہیں مگر فشاء حیات سے دوستی کے بعد وہ اپنی گزشتہ تمام دوستیاں فراموش کر چکا تھا۔ وہ فشاء میں غیر معمولی دلچسپی لے رہا تھا اور یہی بات ان کو ناگوار گزر رہی تھی۔ ماموں تو سعید [illegible] اپنے والد [illegible] بہت وہ اپنی بھانجی سے کافی بے تکلف تھے۔

اس وقت بھی وہ ساحلِ سمندر پہ مونس کے سنگ چہل قدمی کر رہی تھی۔

"ڈوبتے سورج کا نظارہ کتنا رومینٹک ہوتا ہے نا! ماحول میں سحر سا طاری ہو جاتا ہے۔ مجھے تو یہ شامیں بہت اچھی لگتی ہیں مونس! یہاں آ کر میں اپنا ہر غم بھول جاتی ہوں۔ میرے قدموں سے ٹکراتی لہریں میری ساری کثافت دھو دیتی ہیں۔" پاس سے گزرتے کپل کو اس نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ سیاہ شلوار قمیص میں ملبوس اس بھٹکے ہوئے سے والی لڑکی کی لو دیتی آنکھوں میں بے پناہ حزن تھا۔

"یہ لڑکی ضرور کوئی محروم کلاس قسم کی افسانہ نگار ہے۔" مونس نے سرگوشی کی۔

"شٹ اپ۔" اسے ہنسی آ گئی۔ وہ دونوں اب کافی دور نکل گئے تھے۔

"پتہ نہیں کیوں یہ اداس چہرے والی لڑکی مجھے بہت اچھی لگ رہی ہے۔" وہ اب بھی گردن موڑے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم اب اسے گھورنا بند کرو، وہ لڑکا خواہ مخواہ میں خوش فہمی میں مبتلا ہو جائے گا کہ اتنی خوب صورت لڑکی مجھے مڑ مڑ کر دیکھ رہی ہے۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھا۔

"ہر کوئی تمہاری طرح نہیں ہوتا۔"

"ویسے فشاء! تم اس روز نائمہ سے کہہ رہی تھیں کہ تمہیں..."

"مجھے معلوم تھا تم مجھ سے یہ سوال ضرور پوچھو گے۔" وہ اس کی بات کاٹ کر مسکرائی۔ "مجھے واقعی ذاتی طور پر نہ ہوٹلنگ پسند ہے نہ گھومنا پھرنا۔ تم یہ مت سمجھنا کہ میں تمہارے لیے ایموشنل فیلنگز رکھتی ہوں۔ میرا ایک الگ لائف اسٹائل ہے۔ درحقیقت میں جیو اور جینے دو کی پالیسی پہ عمل کرتی ہوں۔ مجھے دوسروں پر بلاوجہ رعب جھاڑنے اور ہر بات میں اپنی رائے ٹھونسنے والے لوگ زہر لگتے ہیں۔ میں لبرل ضرور ہوں مگر ایک حد تک۔ یہ چیپ حرکتیں مجھے خود بھی پسند نہیں جو آج کل میں کر رہی ہوں۔ تم کیا، میں میل فرینڈشپ کی قائل تو ہوں مگر اس میں بھی کچھ حدود ہونی چاہئیں۔ اسلام آباد میں میرے بہت سے فرینڈز ہیں لیکن ہم سب ہمیشہ گروپ کی صورت میں آؤٹنگ اور ہوٹلنگ کرتے ہیں۔ تم پلیز کوئی غلط خیال مت کرنا۔ اس سب کی ایک وجہ ہے جو میں تمہیں وقت آنے پر بتاؤں گی۔ سوری اگر جسٹ فرینڈز اوکے۔"

"یہ تو تمہاری تھنکنگ ہے۔ ضروری تو نہیں کہ میں بھی تم سے ایگری کروں۔"

"یو آر آل ریڈی انگیجڈ مونس! وجاہت سے میں سن چکی ہوں۔ شی از ویری نائس گرل۔ پلیز اگر تم کچھ اور سوچ رہے ہو تو اس کو کینسل کر دو۔"

"یہ انگیجمنٹ ممانی چاہتی ہیں۔"

"دیکھو مونس! میں صاف بات کرنے کی عادی ہوں۔ مجھے یہ پسند نہیں کہ کوئی میری مسکراہٹ کا غلط مطلب لے۔" وہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔

"ارے کم! ایسا نہیں چاہتیں تو نہ سہی۔" وہ اس کا موڈ بگڑنے کے ڈر سے فوراً بولا تھا۔

"ڈنر کے لیے اب چلیں۔"

"چلو۔" اس کے انداز میں سابقہ گرم جوشی مفقود تھی۔

☆ ☆ ☆

"عموماً" وہ اسے باہر سے ہی اتار دیتا تھا مگر آج اس کے کہنے پر اس نے گاڑی پورچ میں لے آیا تھا۔

"جلدی تیار رہنا تم جانے کے لیے۔ تمہاری ممبر شپ بھی بنوا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں چھ بجے تمہیں تیار ملوں گی۔ بائے ارزلان۔" بے حد سرسری نگاہ لان میں کیبن کی چھتری پر نیم دراز ارزلان شاہ پر ڈالتے ہوئے مسکرا کر کہہ رہی تھی۔

"اب اندر تک آ ہی گئے ہو تو کافی..."

"نہیں... پھر کبھی پی لوں گا۔ اوکے بائے۔" وہ گاڑی ریورس کرنے لگا۔

"بائے..." وہ گاگلز بالوں میں پھنسائی لان میں چلی آئی۔ ارزلان شاہ بے حد چبھتی نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا جو جینز اور بلیک ٹی شرٹ میں ہوشربا کی طرح جاذب نظر لگ رہی تھی۔ کیسے نیلی سے بڑی خوابناک آنکھیں مسکراتے انداز میں اس پر اٹھی تھیں۔ وہ ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔

"امیزنگ۔ تمہیں تو وہ شاعر اور بے شرمی میں ایوارڈ ملنا چاہیے —" وہ سلگتے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"ہونہہ۔ اسے کہتے ہیں انگور کھٹے ہیں۔" وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ ارزلان شاہ نے بے دردی سے اس کی کلائی موڑ دی۔

"یہ جو شخص ابھی شاہ پیلس میں آیا تھا اس کی اتنی اوقات نہیں ہے کہ تم اسے پورچ تک لے کر آؤ۔ آئندہ اس سے ملاقات کا شوق باہر طے کر لینا۔ یہ بات تم اسے سمجھا دو تو زیادہ اچھا ہے ورنہ میری زبان سے تم واقف ہی ہو۔"

"کلائی چھوڑیں میری۔ آپ خود کو سمجھتے کیا ہیں۔ میں آپ کی بکواس اتنی خاموشی سے سن لیتی ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ جو بھی بکتے..."

"تمیز سے شٹ اپ۔" وہ دھاڑا۔

"آپ کس رشتے پر مجھ پر اتنا حکم چلاتے ہیں۔ لگتے کیا ہیں آپ میرے؟" وہ جواباً چیخی۔

"منشاء... ارزلان کیا ہوا ہے؟" طیبہ ان کی تکرار سن کر کچن سے بھاگی آئی تھیں۔

"اپنی بھتیجی کو اچھی طرح سمجھا دیں کہ آزاد فضاؤں میں اڑنے کی خواہش میں اتنی بلندی پر نہ چلی جائے کہ ہمیں مجبوراً اس کے پر کاٹنا پڑیں۔" اسے ان کی طرف دھکیل

مڑنے سے پہلے ایک نظر ارزلان پر ڈال کر گیا تھا۔

"چچی! یہ شخص کوئی ذہنی مریض لگتا ہے۔ آپ لوگ اس کا علاج کیوں نہیں کرواتے۔ میرے پیچھے تو ایسے روک ٹوک کرتے ہیں جیسے میں کیا بچی ہوں کیا کر لی ہوں۔ کمال ہے بھائی ہوں تو یہ کہاں کے خدائی فوجدار ہیں۔ مجھ سے کتنے بھی ہیں یہ بڑے ہیں گے۔ ہونہہ پڑھے لکھے جاہل۔ ہدیہ لوگوں کو دیکھا ہے آپ نے کیا زندگی ہے ان کی۔ جیسے دیہاتی ڈبے اور ڈھکے ہوئے ماحول میں رہتی ہیں وہ لوگ۔ عورتیں بھی ہر وقت دس گز کا حجاب لے کر گھومتی ہیں۔ صرف ان کی بیک ورڈ ذہنیت کی وجہ سے۔"

"تمہیں اپنا لائف اسٹائل ناپسند نہیں ہے منشاء! ہمایاں ہمارے آئیڈیل ہیں۔ ان میں کوئی اخلاقی برائی نہیں ہے۔ وہ لڑکیوں کا باہر جانا بہرحال معیوب خیال کرتے ہیں۔ مانتا ہوں کہ تم اتنی ماڈرن جینز اور شرٹ پہن کر جانے کیسے اتنے مردوں کے سامنے آزادی سے گھوم پھر لیتی ہو۔" ہدیہ بھی طیبہ کے پیچھے چلی آئی تھی۔

"اُف۔ اکیسویں صدی میں اتنی دقیانوسی باتیں۔" وہ طنزیہ مسکرائی۔

"اکیسویں صدی ہے تو کیا ہوا۔ اسلام تو وہی چودہ سو سال پرانا ہی ہے۔ یہ تو نہیں بدلا۔ اسلام میں عورت کو حجاب میں رہنے اور اپنی زینت چھپانے کی تاکید کی گئی ہے تو ہم بھائیاں کو کیوں الزام دیں۔ زندگی کو مختلف انداز سے گزارنے کی قدر ہی تو نہیں کیا جاسکتا۔ صرف بھائیاں کے سخت رویے کی تلافی کے طور پر تم ہمارا ساتھ دینے لگتے ہیں منشاء ورنہ سچ تو یہ ہے کہ ہم ایک آئیڈیل زندگی گزار رہے ہیں۔ ہمارے گھر میں اللہ کی ہر نعمت موجود ہے اور ہم ان سب کے بغیر بھی بہت آسودہ زندگی گزار رہے ہیں۔"

ہدیہ بھی آج اپنے بھائی کی محبت سے مجبور ہو کر سب کہہ گئی تھی۔

"ہم سب بہن بھائی اعلا تعلیم یافتہ ہیں لیکن صرف دنیوی تعلیم کافی نہیں ہوتی۔ میں نے عالمہ کا کورس بھی کر رکھا ہے۔ لاعلمی الگ بات ہے مگر جان بوجھ کر گناہ کرنا تو..."

"او گاڈ... تم کیا ثواب گناہ کی باتیں لے کر بیٹھ گئی ہو۔ بہت فالتو کی بکواس سن لی ہے یہاں آکر۔" وہ تاسف سے سر ہلاتی اندر چلی گئی۔

"بہت مشکل ہے منشاء حیات کو راہ راست پر لانا۔ بھائیاں کی کوششیں بے کار ہی جائیں گی۔" وہ گہرا سانس لیتے ہوئے لان کی گھاس پر ہی بیٹھ گئی۔

"تمہارے بھائی کا انداز غلط ہے۔ اس طرح زبردستی کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ منشاء مزاج کی تیز ہے۔ اس کے حکم چلانے پر چڑ جاتی ہے۔" طیبہ بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

"ہاں! بھائیاں کو بھی اپنے مزاج میں نرمی لانی ہوگی۔ ویسے منشاء ہے بہت کیوٹ۔ بھائیاں کے ساتھ بہت سوٹ کرے گی۔ دونوں ساتھ کھڑے اچھے لگتے ہیں نا!"

"جب بھی ساتھ کھڑے ہوتے ہیں لڑتے جھگڑتے ہی ہیں۔ حسرت ہی ہے کہ کوئی اچھی بات بھی کر لیں۔"

"وقت آنے پر کر لیں گے چچی! اتنی جلدی کیا ہے؟" وہ ہنس کر بولی تو طیبہ بھی مسکرا دیں۔

☆ ☆ ☆

کشن پر نیم دراز وہ اپنا گلابی ہاتھ اشیا پر پھیلائے بہت نفاست سے نیل پالش لگا رہی تھی۔ قدرے فاصلے پر ہدیہ نماز عصر ادا کر رہی تھی۔ ناخنوں پر پھونک مارتے ہوئے اس نے سفید دوپٹے کے ہالے میں مقید اس کے چہرے پر سجی مسکراہٹ اور ہلتے لبوں کو مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ بہت دیر سے ہتھیلیاں پھیلائے دعا مانگ رہی تھی۔

"کیا مانگ رہی تھیں؟" وہ چہرے پر ہاتھ پھیر کر جائے نماز اٹھانے لگی تو منشاء نے شرارت سے پوچھا۔

"وہی جس کی طلب ہے۔ صبر، استقامت، ہدایت اور بخشش۔" وہ اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

"تم اتنی دیر سے نماز پڑھ رہی ہو، تھکتی نہیں ہو؟"

"تم اتنی دیر سے نیل پالش لگا رہی ہو، تھکتی نہیں؟"

"نہیں۔"

"تو جب تم اس بے کار سے مشغلے میں تھکن محسوس نہیں ہوتی تو پھر میں تو فرض کی ادائیگی کر رہی تھی۔"

"ابھی سے اتنی لمبی لمبی عبادتیں کرتی ہو؟"

"ابھی سے کیا مطلب؟"

"مطلب کہ ابھی تو بہت وقت پڑا ہے اللہ اللہ کرنے کے لیے۔"

"تم جانتی ہو کہ تمہاری زندگی کتنی ہے؟!"

"نہیں۔"

"تو پھر تم وقت کا حساب کس طرح لگا سکتی ہو۔ نماز سات برس کی عمر سے فرض ہے۔"

"مگر مجھے تو نماز نہیں آتی۔ میں نے کبھی پڑھی ہی نہیں۔"

"کتنے افسوس کی بات ہے منشاء! تم نے بچپن میں ہر وہ کام سیکھا ہوگا جس کی تمہاری ٹیچر نے ہدایت کی ہوگی۔ نہیں سیکھی تو ایک نماز۔ اصل تعلیم سے اس قدر غفلت اور دنیوی علم کو کتنا سیریس لیتی ہو۔ یہ لمبی چوڑی ڈگریاں تو آخرت میں کام نہیں آئیں گی۔"

"تمہیں دیکھ کر میرا بھی دل چاہ رہا ہے نماز پڑھنے کو۔ کیا تم مجھے نماز سکھاؤ گی؟"

"شیور۔ کیوں نہیں۔" ہدیہ بے ساختہ خوش ہوئی تھی۔ "لیکن اس کے لیے تمہیں شلوار قمیص پہننا ہوگی۔"

"پہن لوں گی۔" وہ دل سے کہہ رہی تھی۔ منشاء حیات کو سدھارنا اتنا مشکل بھی نہیں تھا۔ ہدیہ کو یہ جان کر خوشی ہوئی تھی۔

"لیکن تم ابھی کسی کو بتانا مت۔"

"ارے نہیں۔ مجھے کیا ضرورت ہے۔ یہ نیل کلر لگا کر بھی نماز نہیں ہوتی۔" اس نے اس کا ہاتھ تھاما۔

"اس کی وجہ سے ناخن گیلے نہیں ہوتے یعنی کہ وضو مکمل نہیں ہوتا۔"

"تم پہلے مجھے نماز سکھاؤ پھر میں یہ اتار دوں گی۔"

"کمرے میں آجاؤ۔ میں تمہیں ایک کتاب دیتی ہوں، اس میں پوری نماز لکھی ہوئی ہے۔ تمہیں یاد کرنے میں آسانی رہے گی۔" ہدیہ اٹھی تو وہ بھی ساتھ ہی کھڑی ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

"مما پلیز! اتنے دن ہو گئے ہیں آج کل آج کل کرتے۔ پورے چار ہفتے گزر گئے۔ نانو کا بائی پاس بھی ہو چکا ہے اب تو۔ کیا کر رہے ہیں آپ لوگ وہاں پر۔ رئیلی میں بہت مس کر رہی ہوں۔ ڈیڈ کہاں ہیں بات کروائیں ان سے میری۔" عظمیٰ سے بات کرتے ہوئے وہ اداس ہونے لگی تھی۔

"ہاں! میں تو ٹھیک ہوں، مجھے کیا ہونا ہے۔ ویسی ہی ہوں جیسی آپ چھوڑ کر گئی تھیں۔ یہاں سب لوگ بہت

اچھے ہیں۔ بہت کیئرنگ اور لونگ۔ تایا ابو' چاچو' فائزہ تائی' طیبہ چچی' نوفل' حیدر' جنید اور لائبہ۔ سب ہی سے بہت انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی ہے۔ ہدیہ تو سب سے زیادہ اچھی ہے۔ بہت دوستی ہو گئی ہے میری اس سے۔"

وہ بات کرتے ہوئے ٹیرس تک آ گئی تھی۔ اپنے کمرے کے پردے برابر کرتے ازدار شاہ کو اس کی ہلکی سی جھلک ہی دکھائی دی تھی۔ غیر ارادی طور پر وہ اپنے بارے میں اس کے ریمارکس سننے کے لیے متوجہ ہوا تھا۔

"ہونہہ۔ ان صاحب کی تو بات ہی مت کریں ممی۔ بہت توپ چیز سمجھتے ہیں خود کو۔ آپ کو پتہ نہیں کہاں سے اچھے لگتے ہیں۔ سچ کہہ رہی ہوں ممّا! ایک ان ہی سے میرے ستارے نہیں ملتے ورنہ باقی سب تو بہت سوئیٹ نیچر ہیں۔ لگتا ہے صبح ہی صبح اٹھ کر مرچیں چباتے ہیں۔ اچھا آپ مجھے کنفرم بتائیں آنے کا۔" وہ ریلنگ پر جھک گئی۔

"کیا۔۔۔ بقر عید تک۔۔۔ نہیں ممّا! بقر عید میں تو تین چار ہفتے ہیں ابھی۔ نہیں دل تو لگتا ہے یہاں پر آپ لوگ۔۔۔ آپ کی کمی کوئی پوری کر سکتا ہے ممّا؟ کمال کرتی ہیں آپ۔ ڈیڈ نہیں باہر گئے ہیں؟ اوکے پھر میں رات میں فون کروں گی۔ نانو اور ماموں کو سلام کہیے گا۔ اوکے گڈ بائے۔" سیل آف کر کے وہ پلٹی اور سامنے کھڑکی میں سنجیدہ صورت لیے ازدار شاہ کو دیکھ کر پل بھر کو ٹھٹکی تھی پھر سر جھٹکتے ہوئے سیڑھیاں اتر گئی۔

"ہو گئی بات۔" ہدیہ کچن میں کٹلس بنا رہی تھی وہ وہیں چلی آئی۔

"ہاں۔" وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"کیا کہہ رہی تھیں بیگم چچی؟"

"ابھی کنفرم نہیں بتایا آنے کا۔ بقر عید تک کہہ رہی تھیں۔ اس میں تو ابھی کافی ٹائم ہے۔"

"بہت مس کر رہی ہو؟" ہدیہ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھری۔

"ظاہری بات ہے۔ فرسٹ ٹائم ان سے اتنا دور ہوئی ہوں۔"

"پیا دیس بھی تو سدھارو گی نا۔ وہاں کیسے رہو گی ان کے بغیر۔"

"فی الحال تو اس میں بہت ٹائم ہے۔ دیکھا جائے گا۔"

"شکر ہے تم نے یہ نہیں کہا کہ مجھے شادی ہی نہیں کرنی۔"

"میں حقیقت پسند لڑکی ہوں۔ شادی تو ظاہر ہے ہونی ہی ہے۔"

"آئیڈیلزم پہ یقین رکھتی ہو؟"

"نہیں۔"

"صحیح کرتی ہو۔ آئیڈیل کون سا حقیقت میں مل جاتے ہیں۔ لان میں چلو وہیں چائے پیتے ہیں۔" اس نے ٹرے میں کپ رکھے۔

"تم چلو میں کچھ دیر میں آتی ہوں۔" وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

مونس کی شادی اچانک ہی طے پا گئی تھی۔ اس روز وہ "سعید ولا" میں آئی تو نائمہ ممانی نے بتاتے ہوئے کہا تھا کہ دو ہفتے بعد کی تاریخ رکھ دی گئی ہے۔

"ارے واؤ۔۔۔ یہ تو زبردست نیوز ہے۔ کہاں ہے مونس۔۔۔ مجھے بتایا تک نہیں بچوں نے۔" وہ خوش دلی سے بولی تھی۔ نائمہ کتنی ہی دیر اس کے چہرے کے تاثرات جانچتی رہی تھیں۔

"وہ اور حرا شاپنگ کے لیے گئے ہیں۔"

"ہم آ گئے ہیں۔" شانی' حرا اور مونس بہت سے پیکٹ لیے اندر داخل ہوئے تھے۔

"ہیلو عشنا! ڈارلنگ کیسی ہو؟" حرا اسے دیکھ کر خوش گوار حیرت سے بولی۔

"ایک دم فرسٹ کلاس۔ کتنے تیز ہو تم لوگ۔ ہوا بھی نہیں لگنے دی اور شادی کے کارڈ تک چھپوا لیے۔ مونس اتنا بدتمیز ہے۔ روز تم سے ملتے ہیں اور ایک بار بھی نہیں بتایا۔" وہ حرا سے گلے ملتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"میں سرپرائز دینے کے موڈ میں تھا۔ کارڈ پسند آیا تمہیں؟ میں نے خود چوائس کیا ہے۔" مونس سائیڈ ٹیبل سے کارڈ اٹھا کر اسے دکھانے لگا۔

"بہت خوب صورت ہے۔ کارڈز تم دونوں خود لے کر آنا۔" شانی بولی۔ "میں نہیں لے کر جا رہی۔"

"لے آئیں گے۔ تم بلاؤ تو سہی۔" حرا فوراً تیار ہو گئی۔

"کل تک۔ آج تو میں خود آئی ہوئی ہوں۔"

"تم لوگ چائے لو گے یا کافی؟" نائمہ ممانی کی غلط فہمی

اس کے متعلق دور ہوئی تھی' اس لیے آج ان کا موڈ خاصا بہتر تھا۔

"چائے ہی لے آئیں۔"

"تم کب پور کے لڈو کھلا رہی ہو؟" حرا چیزیں سمیٹتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"وقت آنے پر کھلاؤں گی۔"

"ویسے تمہارے کزن کو میں نے نادیہ کی شادی پر دیکھا تھا۔ اچھا خاصا ہینڈسم شخص ہے۔ بہت ریزرو سا لگ رہا تھا۔ تمہیں تو چانس ہے۔"

"ارے نہیں یار! اس سے شادی کرنے سے بہتر ہے کہ میں شادی ہی نہ کروں۔ اتنا بورنگ شخص ہے قسم سے۔"

"مجھے سنائی تو زبردست ہے۔"

"کس کی بات کر رہی ہوں میں۔"

"ہاں اس کا تو تمہیں ہی علم ہو گا۔" اس نے کندھے اچکائے۔

☆ ☆ ☆

"ہدیہ۔۔۔" وہ ہاتھوں میں شرٹ لیے اس کے کمرے تک آیا تھا مگر وہ شاید کچن میں تھی۔

"کیا ہوا بیٹا!" فائزہ اپنے کمرے سے ہی بولی تھیں۔

"وہ ہدیہ سے کام تھا۔" وہ کمرے میں ہی چلا آیا۔

"کیا کام؟" فائزہ بستر پر نیم دراز چائے سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

"یہ بٹن لگوانا تھا۔ آپ اتنی جلدی لیٹ گئیں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" وہ کرسی کھینچ کر ان کے مقابل بیٹھ گیا۔

"یوں ہی ہلکا سا تھکن سا محسوس ہو رہا ہے۔"

"تو ڈاکٹر کو دکھا دیں آپ۔ بلکہ ابھی تو نو ہی بجے ہیں۔ میں لے چلتا ہوں۔" وہ ان کی کلائی تھام کر پریشانی سے بولا تو وہ شفقت سے مسکرا دیں۔

"اب اتنی بھی طبیعت خراب نہیں ہے کہ میں اپنے بیٹے کو پریشان کروں۔"

"پریشانی کیسی امی! طبیعت خراب ہے تو ڈاکٹر۔۔۔"

"ارے نہیں بیٹا! ڈسپرین لی ہے ابھی چائے کے ساتھ۔ اس سے ان شاء اللہ ٹھیک ہو جاؤں گی۔ یہ شرٹ مجھے دو میں ہدیہ سے کہہ دیتی ہوں۔"

"میں خود ہی کہہ دیتا ہوں۔ آپ آرام کریں۔ ابو سو گئے ہیں؟" وہ جانے کے لیے اٹھا۔

"ہاں کچھ دیر پہلے ہی سو گئے ہیں۔ نوفل آیا نہیں ابھی تک؟"

"آ گیا ہے۔ ابھی آواز آئی تھی مجھے اس کی۔"

"عشنا اپنے کمرے میں ہے؟" اس بار انہوں نے پوچھا تھا۔

"آئی ڈونٹ نو۔ کمرے میں نظر تو نہیں آئی۔ ویسے موصوفہ کب تک یہاں رہیں گی؟"

"کیوں! تمہیں اس کا یہاں رہنا پسند نہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

"نہیں! مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ویسے چاچو نے اپنی صاحبزادی کو حد سے زیادہ آزادی دے رکھی ہے۔ مجھے اس کا لائف اسٹائل بالکل پسند نہیں۔"

"انگلینڈ جیسے ملک میں بارہ سال گزارے ہیں انہوں نے۔ اب وہاں رہ کر تو لائف اسٹائل ایسا ہی ہونا تھا۔"

"پاکستان آئے بھی چھ سات سال ہو چکے ہیں انہیں۔ یہاں آ کر تو وہ چینج ہو سکتے ہیں۔ اسپیشلی لباس۔ وہ کہیں سے ہماری فیملی کی لڑکی نہیں لگتی۔"

"تمہیں تو کچھ زیادہ ہی شکایتیں ہیں اس سے۔ اس کا شوہر خود ہی سدھار لے گا اسے۔" وہ قدرے تیزی سے کہہ رہی تھیں۔ ازدار نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"بے چارہ سر پکڑ کر ہی رو دے گا جس کے بھی پلے پڑیں گی محترمہ۔ دیکھیے گا وہ بدلنے والی چیز ہی نہیں۔"

کہنے کے ساتھ ہی وہ باہر نکل آیا۔ کامن روم کے ساتھ بنے اسٹڈی روم جو کہ زیادہ تر ہدیہ کے استعمال میں ہی رہتا تھا کی لائٹ آن تھی۔

"اس کا مطلب ہے ہدیہ اسٹڈی میں ہو گی۔" وہ نیم وا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو وہ جائے نماز پر دو زانو بیٹھی دعا مانگنے میں مصروف تھی۔ اس کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیلی تھی۔ وہ خاموشی سے دیوار پر لگا کیلنڈر دیکھنے لگا۔ وہ کچھ دیر بعد وہ جائے نماز سمیٹ کر اٹھی تب وہ بولا تھا۔

"ڈیئر ہدیہ آنٹی۔۔۔" وہ شرارت سے کچھ کہنے لگا تھا مگر گلابی پرنٹڈ لباس اور ہم رنگ دوپٹے میں اس گلابی چہرے پر نگاہ پڑتے ہی ٹھٹک گیا۔ ہدیہ کے گرد ہالہ کیے ہوئے وہ تقدس و حیا تھی جو اسے کچھ لمحے کو مبہوت کر گئی تھی اور اب دوپٹہ چہرے

کے گرد سے ہٹا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی تھی۔ جبکہ ازرار شاہ... اس کی نظروں نے اس کے کھینچے چہرے پر سے ہٹنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا جو شلوار قمیص دوپٹے میں اس قدر مقدس اور پاکیزہ لگ رہی تھی کہ وہ اس کی ساری خطائیں بھولتا چلا گیا۔

"مجھے باہر جانا ہے۔" کچھ دیر بعد اس کی نگاہوں سے بزل ہو کر وہ جانے کے لیے رستہ مانگ رہی تھی۔ وہ ایک دم حواس میں آیا تھا۔

"اوہ سوری... میں سمجھا کہ ہدیہ..." وہ ایک طرف ہوا تھا اور وہ ہوا کے جھونکے کی مانند پاس سے گزرتی چلی گئی لیکن تمام تنہیں کمرے کی دہلیز پر ساکت کھڑے ازرار شاہ کا دل بھی اس کے ساتھ ہی ڈولتا چلا گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

محبت خواب کی صورت
نگاہوں میں اترتی ہے کسی مہتاب کی صورت

صرف ایک ساحر لمحے کا فسوں تھا اور ازرار شاہ کے من کی دنیا بدل گئی تھی۔ وہ جو مشتاء حیات کو سخت ناپسند کرتا تھا، کل کی پوری رات اسے سوچتے ہوئے گزری تھی۔ ایک کمزور ساعت کی گرفت میں آ کر وہ اپنا دل گنوا بیٹھا تھا۔

پتا نہیں مشتاء حیات اصل میں وہ تھی جو نظر آتی تھی یا وہ جس کی ایک جھلک نے اس کے وجود میں ہلچل مچا دی تھی۔ شام و سحر میں بے حساب سوال الجھی تھیں۔

"کیا اس شخص سے محبت ہو سکتی ہے جسے آپ سخت ناپسند کرتے ہوں۔" اس نے بے چینی سے سوچا۔

"ہاں یہ محبت... محبت ایسے ہی تو ہوتی ہے۔ بہت اچانک، بے خبری میں ہی دل پر وار کرتی ہے۔" دل جواز دینے لگا۔

وہ محبت کے وجود سے منحرف نہیں تھا مگر کیا یہ ضروری تھا کہ یہ لڑکی مشتاء حیات ہی ہوتی۔ کسی سے بھی محبت ہو سکتی تھی مگر مشتاء سے ہی کیوں؟ مشتاء حقیقت میں ایسی ہی تھی یا "مشتاء" کیوں بن رہی تھی؟

بے چارہ سر پکڑ کر ہی رو دے گا جس کے بھی گلے پڑیں گی محترمہ کیونکہ بدلنے والی چیز تو ہیں نہیں۔" کچھ دیر پہلے ہی تو اس نے فائزہ سے کہا تھا اور کچھ دیر بعد خود اپنا دل ہی بدل گیا تھا۔

"اوہ گاڈ... جو بھی ہوا، بہت غلط ہوا ہے۔" اس نے سر ہاتھوں پہ گرا لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

کف کے بٹن بند کرتا وہ فریش موڈ میں نیچے آیا تو لاؤنج میں خوش گپیوں میں مصروف مونس پر نظر پڑتے ہی اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا تھا۔ یہ شخص اسے زہر لگتا تھا۔ یوں لگتا تھا اس کا ادراک بھی ابھی ہی ہوا تھا۔ مشتاء حسب معمول ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس اس کی کسی بات پر بے ساختہ کھلکھلا رہی تھی۔ نوفل اور حیدر بھی وہیں موجود تھے اور تو اور طیبہ پھپھی بھی۔ ان کے ساتھ باتوں میں مصروف وہ لڑکی شاید اس کی بہن تھی۔ وہ اتنا بدتہذیب تو نہیں تھا کہ بنا سلام دعا کے گزر جاتا مگر مونس اور مشتاء کے قہقہوں نے اس کا موڈ غارت کر دیا تھا۔ وہ ان کی سمت دیکھے بغیر لاؤنج پار کر گیا۔

"یہ غالباً ازرار شاہ تھے۔" مونس اس کی شاندار پرسنالٹی سے مرعوب ہوا تھا۔ مشتاء کو اس کا یوں پاس سے گزر جانا بہت کھلا تھا۔ وہ نوفل کی طرف دیکھنے لگی جو خجالت سے سر کھجا رہا تھا۔

"جی ہاں یہ پرنس آف ویلز بلکہ نہیں پرنس آف شاہ پیلس۔ ہمارے بڑے بھیا۔" [illegible]

"واقعی نہیں [illegible] بے غیرت [illegible]" میں سر ہلایا۔

"لوگ بھی بہت دیر ہو گئی۔ ہم اب چلتے ہیں۔ آپ لوگ پلیز ضرور آیئے گا۔" مونس جانے کے لیے اٹھ گیا۔

"ابھی بیٹھو نا، ڈنر کر کے جانا۔" طیبہ نے کہا تو مشتاء نے بھی تائید کی۔

"ہاں ابھی کچھ دیر ہی تو ہوئی ہے، تمہیں آئے ہوئے۔"

"نہیں یار ڈنر میں تو کافی ٹائم ہے۔ ابھی مجھے ذرا کسی فرینڈ کے گھر بھی جانا ہے۔ نوفل، حیدر ضرور آنا تم لوگ۔ اچھی گپ شپ رہی تمہارے ساتھ۔"

"میں خود کھینچ کر لاؤں گی سب کو تمہاری شادی میں۔ تم فکر مت کرو۔"

وہ ان دونوں کو سی آف کر کے سیدھی کچن میں چلی آئی۔ جہاں ہدیہ برتن دھونے میں مصروف تھی۔

"یہ تمہارے بھائی میں اخلاقیات نام کی کوئی چیز ہے کہ نہیں۔"

"اف..." ہدیہ نے تاسف سے سر ہلایا۔ "اب میرے معصوم بھائیوں سے کیا جرم سرزد ہو گیا۔"

"مجھ سے تو چڑ انہیں پر خاش ہے ہی۔ شاید پچھلے جنم میں میں ان کا قرض لے کر بھاگی تھی مگر میرے گیسٹ کے ساتھ اتنی بدتمیزی... سلام کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔ اگر ہیلو ہائے کرتے وقت زبان گل جاتی ہے تو پیچھے ہی آتے۔ ایسی انسلٹ فیل کی میں نے۔"

"حیرت ہے وہ ایسے..."

"اب تم بھی کچھ کہو گی۔ وہ ایسے ہیں تو ہیں۔" وہ منہ بگاڑ کر بولی تو ہدیہ کی ہنسی چھوٹ گئی جسے اس نے فوراً کنٹرول کیا تھا۔ مشتاء اسے گھورتے ہوئے باہر نکل گئی۔

پھر دیر تک اس کا موڈ آف ہی رہا تھا۔

کھانے کے بعد وہ کسی کام سے اپنے کمرے کی طرف آئی تو ازرار شاہ راستے میں ہی ٹکرا گیا۔

"یہ تمہارے کزن صاحب آج پھر تشریف لائے تھے۔"

"ہاں لائے تھے پھر؟" اس کو تو پہلے ہی اس پر غصہ آ رہا تھا۔

"شاید تم بھول گئی ہو میں نے اس روز..." [illegible] اپنی زبان یاد کروں۔"

"مجھے خود ہی موصوف سے بات کرنا ہو گی۔"

"شوق سے کیجیے، میرا دماغ کیوں کھا رہے ہیں۔"

"تمہارے پاس دماغ ہے؟"

"اب ہر کوئی آپ کی طرح بنا دماغ کے تو نہیں پھرتا۔" وہ تیز ہوئی۔

"تم..." اسے غصہ آیا تھا مگر لب بھینچ کر قابو پا گیا۔ اور "ہونہہ" کہتی کمرے میں گئی پھر فوراً ہی واپس بھی آ گئی۔

"اخلاقیات تو آپ کو چھو کر نہیں گزریں مگر غلط فہمیاں پالنے کا بہت شوق ہے۔ میرا کزن آپ کو صرف یہ کارڈ دینے آیا تھا۔" اس کے ہاتھ میں میرون رنگ کا نفیس سا شادی کا کارڈ تھما کر وہ سیڑھیاں اتر گئی تھی۔

"شادی کا کارڈ..." اس نے الجھے ہوئے انداز میں کارڈ کھولا۔

"ارے... یہ تو مونس کی شادی کا کارڈ ہے۔" اسے خوشی ہوئی اور حیرت ہوئی تھی اور پھر اپنی غلط فہمی پر وہ زیر لب مسکرا دیا۔ من ایک دم ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

سمیعہ آپا، ہدیہ کے لیے دیور کے کسی رشتے کا پروپوزل لائی تھیں اور جب سے آئی تھیں، اس کی تعریف میں رطب اللسان تھیں۔

"مجال ہے جو آج کل کے لڑکوں کی طرح کوئی اخلاقی برائی بھی ہو اس میں، انتہائی شریف..."

"بابو شریف کا رشتہ دار تو نہیں ہے۔" نوفل نے لقمہ دیا تھا۔ انہوں نے محض گھورنے پر اکتفا کیا۔

"آپ یقین کریں امی ایسا بر تو چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے۔"

"یہ آؤٹ آف فیشن محاورہ ہے آپا! آج کل چراغ کہاں ہوتے ہیں۔"

"نوفل! میں امی سے بات کر رہی ہوں، تم سے نہیں۔" وہ چڑ گئیں۔

"آپا آپ جانتی ہیں میں زیادہ دیر خاموش بیٹھوں تو میری زبان اکڑ جاتی ہے۔ اس لیے پلیز مجھے بھی اپنی اس کور کانفرنس میں اپنے نادر خیالات کے اظہار کا موقع عنایت فرمائیں۔ بندہ تاحیات ممنون و مشکور رہے گا۔"

"تم اپنے نادر خیالات پھر کبھی بتانا۔ ابھی اس کو لے جاؤ، کب سے آئس کریم مانگ رہا ہے بے چارہ۔"

"یہ ہمیپنی ڈمپٹی بے چارہ کہاں سے ہو گیا۔ ریکلی آپا! اس جونیئر عدنان نے کھینچ کھانچ کر میری ہڈیاں بد حال کر دی ہیں۔" اس نے نانی کی گود میں دبکے فاران کو دیکھ کر دہائی دی۔ جو کچھ زیادہ ہی صحت مند تھا۔

"امی! دیکھیں اس نوفل کے بچے کو، میرے بیٹے کو نظر لگا رہا ہے۔"

"یہ تو میری نظروں میں پورا ہی نہیں آتا، بھلا میں خاک اسے نظر لگاؤں گا۔"

"توبہ... کتنے برے ماموں ہو تم۔"

"کچھ دیر میں لے جاؤں گا آپا! ابھی مجھے ذرا ادھر کو کمر سیدھی کر لینے دیں۔"

"تم کون سے ہل جوت کے آ رہے ہو؟"

"یونیورسٹی سے آ رہا ہوں آپا! سر زیدی کی کلاس کسی ہل جوتنے سے کم نہیں ہوتی۔"

"ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ حسن ہر لحاظ سے پرفیکٹ

ہے۔ میں تو بہت پہلے سے ہی یہ چاہ رہی تھی مگر کل جب نادرہ آنٹی نے مجھ سے خود ہدیہ کے لیے کہا تھا تو مت پوچھیں۔"

"نہیں پوچھتے۔" اس سے رہا نہیں گیا۔

"میں تو کل سے ہی بے چین ہوں۔ ایم بی اے کر رکھا ہے، کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں بہت اچھی پوسٹ پر ہے۔ فیملی بھی مختصر سی ہے، دو بھائی ہیں اور ایک بہن۔"

"رشتہ تو اچھا ہی ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اپنی بہن کے لیے ڈالی ہو گی مگر میں نے ٹال دیا کہ سوچتی ہوں، تمہارے ابو اور ازرار سے ذکر کروں گی۔ ناز بھی آ جاتی تمہارے ساتھ۔"

"بجو تو مجھ سے بھی زیادہ بے چین ہیں۔ آج عاطف بھائی اور وہ کہیں ڈنر پر انوائیٹڈ تھے، اس لیے وہ دونوں اُدھر چلے گئے۔ ویسے تو میں فون پر بھی ذکر کر سکتی تھی مگر مجھے پتہ تھا آپ زیادہ امپورٹنس نہیں دیں گی۔ آپ کا دل تو خالہ جی کے صاحب کی طرف ہے کہ وہ بھی اچھا ہے مگر حسن کی تو بات ہی الگ ہے۔"

"سچ ہی کہہ رہی ہوں گی اپا! بہت مشکلوں سے یہ کسی کی تعریف کرتی ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ پچھلے ایک گھنٹے سے میں حسن میاں کی اتنی تعریفیں سن چکا ہوں کہ میرا اپنا دل مچلا گیا ہے ان سے شادی کرنے کو۔"

"بدتمیز۔" فائزہ ہنسنے لگیں۔

"ویسے اپا! آپ کو اپنے بھائیوں کے سر پر سہرا سجانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ دوسروں کی بہنیں کتنی اچھی ہوتی ہیں۔ انہیں "ویر" کو گھوڑی پہ چڑھانے کا کتنا شوق ہوتا ہے۔ ایک آپ اور بجو ہیں، کبھی ہماری شادی کا ذکر نہیں کرتیں۔ میں نے اتنے جملے ترتیب دیے کہ اپا جب مجھ سے میری شادی کی بات کریں گی تو میں یہ کہوں گا، وہ کہوں گا مگر ہائے نصیب۔"

"شاباش ہے تم پر۔ بڑے بھائی نے کبھی منہ سے بھاپ نہیں نکالی اور چھوٹے بھائی کا حال دیکھ لو۔" ان کو تو پتنگے لگ گئے۔

"میں ان کا بھی تو ذکر خیر ساتھ ہی کر رہا ہوں۔ وہ تو خود منہ سے کہیں گے نہیں۔"

"پہلے کوئی ڈھنگ کی نوکری تو کر لو، چھوکری بھی تب ہی ملے گی۔"

"رزلٹ آنے کی دیر ہے، نوکری تو پکی ہی لی۔ بھائیوں کی فیکٹری کس مرض کی دوا ہے۔"

"تم تو مکینیکل انجینئرنگ کر رہے ہو نا؟"

"تو کیا ہے، جب تک من پسند جاب نہیں ملتی، تب تک تو بھائیوں کے ساتھ ہی رہوں گا۔" اس نے ساری پلاننگ کر رکھی تھی۔

"ویسے امی! ازرار کے متعلق کیا سوچا ہے آپ نے؟"

"میں نے کیا سوچنا، تمہارے ابو اور چاچو طے کر چکے ہیں اس کی اور منشاء کی بات۔"

"کیا؟ منشاء کی... ازرار سے پوچھا آپ نے؟"

"تمہارے ابو ہی پوچھیں گے۔ میں نے تو نہیں پوچھا۔"

"منشاء بہت اچھی لڑکی ہے مگر ازرار کے مزاج سے میل نہیں کھاتی۔ میرا نہیں خیال کہ ازرار اس پر آمادہ ہوگا۔"

"اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کرے گا۔ ہم سب کو تو منشاء بہت پسند ہے۔"

"ہاں، پسند تو مجھے بھی ہے مگر ازرار تو بہت موڈی اور اکھڑ سا ہے۔ توکل سے بھی تو دو سال چھوٹی ہی ہے وہ آپ....."

"ارے بابا! [illegible] غضب مت کیجیے۔"

"بھائی! اس [illegible]"

"برائی منشاء میں نہیں ہے مگر میں کسی اور سے کمٹمنٹ....." اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

"کیا..... خبیث انسان..... تم تو زیادہ ہی پر تولنے لگے۔" انہوں نے اس کا کان پکڑ لیا۔

"امی کو بتا رکھا ہے میں نے..... کیوں امی....." اس نے کان چھڑایا۔

"ہاں ذکر کیا تھا اس نے۔ اس کے دوست کی بہن ہے۔ فصیحہ نام ہے نا۔"

"جی... اپا! آپ کو ملواؤں گا۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔ پسند آئے گی آپ کو۔"

"بہت اچھی لڑکی ہے۔" انہوں نے نقل اتاری۔

"کیسے کھینچ کھینچ کر رکھتا ہے ازرار تم لوگوں کو۔ اتنی بھی ڈھیل دے تو تم تو آسمان پہ جا پہنچو گے۔"

"چلیے اپا! کان تو چھوڑیں۔ اپنا جلا رستہ ہاتھ سے نکل جائے گا ورنہ....."

"میرے بیٹے کو آئس کریم دلوا کر نہیں لائے نا، بے چارہ ایسے ہی سو گیا۔"

"پھر بے چارہ....."

"ارے ہم تو یہاں ہے۔"

"ہو ہی رہا ہوں۔" وہ دانت نکالتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆ ☆ ☆

"میری بہنا بنے گی دلہنیا، بھیا راجہ بجائے گا باجہ۔"

دوسرے روز ہی نادرہ آنٹی باقاعدہ پروپوزل لے کر آئی تھیں اور ان کے رخصت ہوتے ہی حیدر اور جنید ٹیبل بجا بجا کر بے سرے راگ الاپ رہے تھے۔

"بھائی! اس سے آگے بھی تو گائیں نا۔" نائیہ اشتیاق سے کہہ رہی تھی۔

"آتا ہو گا تو گائیں گے نا۔ یہ تو ہم نے عاطف بھائی کے کزن کی شادی میں سنا تھا۔"

"میری بہنا بنے گی دلہنیا....." حیدر نے پھر تان اٹھائی۔

"بھیا راجہ بجائے گا باجہ....." جنید سر دھن رہا تھا۔

"قسم سے حیدر! تیری تو آواز بڑی زبردست ہے۔ کم از کم آج کل کے پاپ سنگرز سے تو اچھی ہی ہے۔"

"اچھا واقعی... مجھے تو خود آج پتہ چلا ہے۔ تجھے کیسے [illegible]... کیسے پتا چلا ہے....." جوش میں اس نے ٹریک بدلا۔

"میں بتاتا ہوں صاحبزادے آپ کو کیسے پتہ ہے....." ثابت احمد نے بالکل اچانک آ کر اس کی گردن پر ہاتھ رکھا تھا۔

"ارے تایا ابو....." جنید اچھلا۔

"کیا ہو رہا ہے یہ....." وہ مصنوعی غصے سے کہتے ان کے سامنے ہی بیٹھ گئے۔

ہدیہ جو ان کی طرف سے نظر انداز کیے کونے میں کپڑا بچھا کر استری کر رہی تھی، خاموشی سے اٹھ کر اوپر چلی آئی۔ منشاء بیڈ پر اوندھی لیٹی اس کی کسی کتاب کے مطالعے میں مگن تھی۔

"کیا پڑھ رہی ہو؟" اس نے کپڑے وارڈروب میں لٹکائے۔

"اسلام میں مزاح کا تصور۔ تمہارے ریک سے ہی لی ہے۔ ٹاپک انٹرسٹنگ تھا اس لیے اٹھا لی۔ تمہارے کزن چلے گئے؟"

"ہاں، تم باہر کیوں نہیں آ گئیں؟"

"بس ایسے ہی، موڈ نہیں بنا۔"

"صدقے جاؤں میں تمہارے موڈ کے۔ کبھی سے بات بھی موڈ کے مطابق ہو۔" ہدیہ ہنستے ہوئے اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

"کیسے لگے تمہیں وہ لوگ؟"

"اتنی جلدی میں کیا رائے دے سکتی ہوں۔ اچھی کیند فیملی ہے۔ فضول سوال جواب نہیں پوچھے۔ رائمہ کی نیچر کافی فرینڈلی ہے۔"

"اور اس کے بھائی کی....." اس نے شرارت سے لب دبا کر پوچھا۔

"مجھے کیا پتہ، میں کون سا ملی ہوں اس سے۔"

"کیا ملنے کی خواہش تو ہے۔"

"کومت۔" وہ جھینپ گئی۔

"کوئی تصویر وغیرہ نہیں لائیں وہ....."

"کون؟"

"تمہاری نند صاحبہ....."

"منشاء..... بہت بدتمیز ہو تم۔"

"بھئی ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔ جتنی کوالیفائیڈ اپیا گنوا چکی ہیں، اس حساب سے تو یہ پروپوزل فائنل ہی سمجھو۔"

"پھر بھی ابھی کیا پتہ۔ ویسے تصویر تو وہ لوگ لائے تھے۔"

"کہاں ہے؟"

"جنید اور حیدر ڈسکشن کر رہے تھے، وہیں ٹیبل پر پڑی ہو گی۔"

"میں دیکھ کر آتی ہوں بلکہ میں اٹھا لاتی ہوں۔ تم نے تکیے کے نیچے رکھی ہو گی۔" سرعت سے اٹھ کر اس نے کتاب ٹیبل پر رکھی۔ ہدیہ نے تکیہ ہی اسے کھینچ مارا تھا۔ بے ساختہ ہنستے ہوئے وہ گھنگھریالے بالوں کو کیچر میں جکڑتی اس کے دوسرے وار سے قبل باہر سیڑھیوں کی طرف لپکی تھی۔

"آ..... آ..... ارے.....!" بے حد مشکلوں سے اس نے عجلت میں اوپر آتے ازرار شاہ سے ٹکرانے سے بچاؤ کے لیے دونوں ہاتھ آگے کیے تھے، وہ بھی فوراً سائیڈ پہ ہوا تھا۔ نتیجتاً وہ سیڑھیوں پہ توازن کھو گئی اور نیچے لڑھکتی چلی گئی۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ ازرار شاہ اسے سہارا

بھی نہ دے سکا۔
"منشاء۔۔۔" وہ چلایا۔ بدحواسی میں سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے اس کے ہاتھ سے سیل فون بھی گر گیا۔
"ممی۔۔۔" تکلیف کی اذیت سے وہ بے اختیار چلائی تھی۔ سیڑھیوں کا کونا اس کے ماتھے پر لگا تھا۔
"کیا ہوا۔۔۔ کیا ہوا؟" سب اس کی چیخ سن کر سیڑھیوں کی طرف بھاگے آئے۔
"منشاء۔۔۔ منشاء۔۔۔" ازرار آخری سیڑھی پر اوندھی گری منشاء پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے ماتھے سے نکلتا خون فرش کو داغ دار کر رہا تھا۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر اس کے ماتھے پر رکھا۔
"کیا ہوا منشاء کو؟" ہدیہ گھبرا کر کمرے سے نکلی اور اسے بے ہوش دیکھ کر اس کے حواس جھنجھنا گئے۔
"خون بہت بہہ رہا ہے۔ اس کا سر اونچا کرو۔ حیدر بینڈیج لے کر آؤ جلدی سے۔" اس نے ششدر و حیران کھڑے چہروں سے جھنجلا کر کہا تھا۔ سب جیسے یک دم ہی ہوش میں آ گئے۔
"امی۔۔۔ امی۔۔۔" ہدیہ چیختی ہوئی نیچے اتری۔ آنسو بے اختیار گالوں پر پھسلتے چلے گئے تھے۔ طیبہ اور فائزہ دونوں کچھ دیر پہلے ہی محلے میں کسی کے گھر گئی تھیں۔
"بھائیاں۔۔۔ ڈاکٹر اسفر کے کلینک لے جائیں منشاء کو۔۔۔" چھوٹے کہا تو ازرار نے اس کے ماتھے پر ہدیہ کا دیا ہوا دوپٹہ باندھ کر اسے ہدیہ کی مدد سے اپنی سوک میں ڈالا۔ حیدر بھی ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ ازرار تیزی سے گاڑی بھگا لے گیا۔
"یہ شور کیسا ہے۔" واش روم میں شاور لیتے اثبات احمد ان کا شور سن کر جلدی سے الٹے سیدھے کپڑے پہن کر باہر نکلے۔
"ابو۔۔۔ وہ منشاء۔۔۔" ہدیہ کو سیڑھیوں سے بہتے خون کو دیکھ کر شدت سے رونا آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

آدھے گھنٹے بعد ان کی واپسی ہوئی تھی۔
تمام جملہ افراد لاؤنج میں بیٹھے بے چینی سے ان کی آمد کے منتظر تھے۔
"بھائیاں آ گئے۔" گاڑی کی آواز سب سے پہلے ہدیہ کو ہی سنائی دی تھی۔ وہ باہر نکلی تو ازرار پورچ میں سوک پارک کر رہا تھا۔ منشاء اگلی سیٹ پر اس کے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔ اس کے ماتھے پر سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔ بازو اور ٹانگ پر بھی چند خراشیں آئی تھیں۔
"منشاء۔۔۔ میری جان۔۔۔" فائزہ سب سے پہلے اس کی طرف بڑھیں۔
"امی۔۔۔" وہ ان کا سہارا پا کر ان کے گلے لگ کر بے اختیار رونے لگی تھی۔ وہ لوگ ایک بار پھر حیران رہ گئے تھے۔ ازرار کے اندر کی طرف بڑھتے قدم وہیں ساکت ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھوں پر وہ نرم لمس پل بھر کو سرسرایا۔
"بیٹا! سیڑھیوں سے کیسے گر گئیں تم؟"
"آپ کے بیٹے نے مجھے جان بوجھ کر گرایا۔" اس نے روتے ہوئے بتایا۔
"کیا۔۔۔؟" اس کے منہ سے بھی بے ساختہ نکلا۔ سب اسے متاسف نظروں سے دیکھنے لگے۔
"ازرار! مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی بیٹا! تمہاری ناپسندیدگی کا ہم سب کو علم ہے مگر تم۔۔۔"
"ابو۔۔۔" وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر حیرانی کے باعث الفاظ گنگ ہو گئے۔
"بچے نہیں ہو تم اٹھائیس سال کے میچور شخص ہو۔ تم سے ایسی بچکانہ حرکت کی امید نہیں تھی۔" وہاب صاحب بھی اس کو لتاڑنے لگے۔ تائی بھی چچا کے ہم نوا تھیں اور وہ اس آفت کی پرکالہ سے ہمدردی بھلا کر ایڑھیوں کے بل پلٹا۔
"تم۔۔۔ تم ثابت کیا کرنا چاہتی ہو؟ میں نے گرایا ہے تمہیں؟ مجھے کیا ضرورت تھی ایسا کرنے کی۔" اس نے فائزہ کے ساتھ لگ کے آنسو بہاتی منشاء کی کلائی ایک جھٹکے سے کھینچی تھی۔
"ہاں۔ آپ نے گرایا ہے مجھے۔" اس نے اپنی بڑی بڑی سمندر آنکھیں اس پر جما دیں۔ "آپ کو پتا تھا میں گرنے لگی ہوں پھر بھی آپ جان بوجھ کر سامنے سے ہٹ گئے۔" سب کے سپاٹ چہروں پر پل بھر کو مسکراہٹ آئی تھی مگر وہ ان کی طرف متوجہ ہی کب تھی۔
"کیا آپ مجھے گرنے سے بچا نہیں سکتے تھے؟ اب کیسے بھاگ کر کلائی پکڑی ہے۔ اس وقت نہیں پکڑ سکتے تھے؟" اس نے کلائی چھڑائی۔
"واٹ۔۔۔ کیسے مزے سے سارا قصور میرے سر منڈھ دیا۔ تم خود اندھوں کی طرح بھاگی آ رہی تھیں۔"
"میں اندھوں کی طرح بھاگی آ رہی تھی مگر آپ کی تو دید لائٹس آن تھیں۔ میرا اتنا خون ضائع کروا دیا۔"
"میں نے کروایا ہے؟ غلطی تمہاری تھی۔۔۔"
"ہاں بس۔" وہاب احمد نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "بہت ہو گیا، اب اندر چلو۔ طیبہ! منشاء کے لیے اچھی سی شیک بنواؤ۔"
"جی اچھا۔" طیبہ اثبات میں سر ہلا کر اندر پلٹ گئیں۔
"چاچو! ان سے کہیں کہ مجھ سے ایکسکیوز کریں۔" سب کی ہمدردیاں اپنے ساتھ دیکھ کر وہ مچلنے لگی۔
"واٹ۔۔۔ سوری میں اور وہ بھی تم سے کروں۔" وہ اچھلا۔
"جی آپ۔۔۔ سوری کریں وہ بھی مجھ سے۔ چاچو کہیں نا ان سے۔"
"چلو ازرار! سوری کرو منشاء سے۔"
"چاچو! آئی سویر غلطی۔۔۔"
"غلطی جس کی بھی تھی، خون تو میرا ضائع ہوا ہے نا۔"
"خون ضائع ہونے کا اتنا غم ہے تو ہدرڈوں جیسی حرکتیں بھی مت کیا کریں۔"
"دیکھیں تایا ابو! انہوں نے مجھے ہدرڈ بنایا۔ آپ میری سائیڈ کیوں نہیں لے رہے۔"
"ازرار۔۔۔ سوری کرو بیٹا!" اثبات احمد نے مسکراہٹ چھپائی۔
"سوری!" لٹھ مار انداز میں کہا گیا۔
"اونہہ۔۔۔" وہ اسے منہ چڑا کر پلٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی سب اندر چلے گئے اور وہ وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔
جانے کتنے روپ تھے اس لڑکی کے۔ کبھی انتہائی سنجیدہ اور مدبر نظر آتی اور کبھی بالکل بچی بن جاتی۔ کبھی جینز شرٹ پہن کر ہوٹلنگ کرتی اور کبھی نیک پاک بیبیوں کی طرح دوپٹہ اوڑھے دعا مانگتی نظر آتی۔
اس کا ہر روپ حیران کن تھا تو اس سے محبت بھی حیرت ہی تھی اس کے لیے۔
ہارنا اس کی فطرت نہیں تھی مگر اسے لگ رہا تھا کہ اس کی محبت اسے ضرور ہرا دے گی۔ اسے ایک بار پھر خود پر غصہ آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

صرف تین دن ہی وہ ڈاکٹر اسفر کے پاس بینڈیج کے لیے گئی تھی اور اس کے اگلے دو دن بعد ڈاکٹر اسفر خود ہی بینڈیج کے لیے آ گیا۔ ڈاکٹر اسفر محلے دار ہونے کے ساتھ ساتھ ازرار شاہ کے اچھے دوست بھی تھے۔
وہ ٹریک سوٹ میں ملبوس حیدر، جنید، نوفل اور ہدیہ کے ساتھ کرکٹ کا شوق فرما رہی تھی جب ڈاکٹر اسفر اپنی والدہ اور بہن سمیت "منشاء ولاز" میں تشریف لائے۔
"ارے واہ۔۔۔ آپ تو بہت نائس ڈاکٹر ہیں۔ پیشنٹ کے گھر عیادت کے لیے آئے ہیں۔ میرا زخم تو ٹھیک ہو گیا ہے۔ ہاں نشان ابھی باقی ہے۔" اس نے ماتھے پر ہاتھ پھیرا جہاں سنی پلاسٹ کی بینڈیج حیدر نے ہی کی تھی۔
سفید کرولا سے انہیں نکلتے دیکھ کر ہی وہ فیلڈنگ چھوڑ کر بھاگی آئی تھی۔
(آپ کا زخم تو ٹھیک ہو چکا ہے مگر میرے دل پر جو چوٹ لگ گئی ہے وہ) [illegible] وہ گہری نظروں سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگے۔
"یہ تو بہت خوشی کی بات ہے کہ آپ ٹھیک ہو گئی ہیں۔"
"ہاں۔" وہ دلکشی سے ہنسی۔ "آپ لوگ آئیں نا۔ السلام علیکم آنٹی! [illegible]۔" وہ اب ان کے عقب میں کھڑی مسز شیرازی اور نادیہ کی طرف متوجہ ہوئی۔
"وعلیکم السلام۔ جیتی رہو۔" وہ خواتین توصیفی نظروں سے دیکھ رہی تھیں، مسکرا کے آگے بڑھیں۔
"ہائے۔" نادیہ نے بھی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ حیدر اور جنید ڈاکٹر اسفر سے مل رہے تھے۔ انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر طیبہ چچی کو ان کے پاس بھیجا اور خود کچن میں چلی آئی۔
"مجھے تو کوئی گڑبڑ لگ رہی ہے۔" ہدیہ نے چھوٹتے ہی کہا۔
"کیا مطلب؟ یہ ہمارے گھر میں [illegible] رکھنے آئے ہیں۔"
"میں سیریس ہوں۔"
"وہ تو تم ہر وقت رہتی ہو۔ اب میں ہر وقت تمہاری طرح سنجیدہ بابا تو نہیں رہ سکتی۔"
"پتا ہے تمہیں تم کب سدھرو گی؟"
"کوئی سدھارنے والا ملے گا تو۔۔۔" وہ فریج کا جائزہ لینے لگی۔
"بھائیاں کے بارے میں کیا خیال ہے۔ اچھی طرح

دنیا یا اس کی باتوں کا خوف لاحق نہیں ہوا۔ ہم نے ہمیشہ وہی کیا جو ہمیں کرنا چاہیے تھا وہی جو ایک سچے مسلمان کو کرنا چاہیے۔"

"یار! تم تو بہت الجھا دیتی ہو۔ اب میرا موڈ بھی ختم ہو گیا ہے مایوں پر جانے کا۔" اس نے ٹشو سے لپ اسٹک رگڑ دی۔

"ارے نہیں، تم جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ۔ میری وجہ سے۔"

"نہیں! اب موڈ نہیں رہا۔ میں مونس سے ایکسکیوز کر لیتی ہوں۔" وہ سیل فون اٹھا کر باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

"کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ اپنے جاہل اور پینیڈو کزنز کے بیچ آکر تم بھی ان کی طرح ہو گئی ہو۔ کیا تو اب یہ کن چکروں میں پڑ گئی ہو۔ مجھے تو شروع سے ہی ان سے اختلاف رہا کہ انہوں نے محبت کی تو ایک بیک ورڈ اور ٹیپیکل مائنڈ فیملی کے شخص سے اور اب تم بھی ان میں رہ کر ان ہی جیسی ہو گئی ہو۔ میں تم سے اسی لیے کہہ رہا تھا کہ تم ہمارے گھر میں آ جاؤ۔۔۔" مونس کا موڈ بے حد خراب ہو رہا تھا۔ کل مایوں کے فنکشن میں تو اس نے بہانہ بنا لیا تھا مگر آج مہندی میں بھی اس نے آنے سے انکار کر دیا تھا۔

"مونس پلیز! تم جانتے ہو نا کہ میں کتنی موڈی لڑکی ہوں۔ میرا موڈ بالکل نہیں ہے فنکشن اٹینڈ کرنے کا اور ویسے بھی میں وہاں آکر کروں گی کیا۔ نہ مجھے گانے آتے ہیں نہ ڈھولک بجانی۔"

"مجھے اور خدا کو منظور ہی انکار تھا۔"

"تو اب میں تم دونوں کو مہندی لگانے کے لیے اتنی دور آؤں اور وہ بھی۔۔۔"

"کیا پہلے نہیں آتی رہی ہو تم؟"

"ٹھیک ہے نہیں آتی ہوں۔"

"میں جانتا ہوں تم نہیں آؤ گی۔"

"جب جانتے ہو تو اصرار کیوں کر رہے ہو؟"

"او کے بائی۔" اس نے جھنجھلا کر لائن ڈسکنیکٹ کر دی تو ریلنگ پر جھکی مشعاء مسکرا دی۔

"کیا ہوا؟ تم چلی کیوں نہیں رہیں؟" ازرار شاہ نے اپنی حیرت چھپاتے ہوئے پوچھا تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ دونوں اور مہندی کے فنکشن کے لیے اتنی پرجوش ہو رہی تھی۔ اسپیشل ڈریس بھی بنوائے تھے مگر کل بھی دوبارہ کے بعد تبدیلی ہی نظر آئی تھی اور آج بھی جانے کا امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔

"بس میرا دل نہیں چاہ رہا۔" وہ جھٹکے سے سیدھی ہوئی۔

"مونس بیسٹ فرینڈ رہ چکا ہے تمہارا اور تم اس کو۔۔۔" اس کے لہجے میں طنز نہیں تھا مگر مشعاء نے چڑ کر بات کاٹ دی۔

"میری مرضی۔ میں جاؤں یا نہ جاؤں۔ آپ سے مطلب۔" اور دو دو سیڑھیاں پھلانگتی نیچے اتر گئی۔ لاؤنج میں آئی تو حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ سامنے ہی حیات احمد اور تبسم طیبہ وغیرہ سے گلے مل رہی تھیں۔

"مما! آپ۔۔۔ ڈیڈی۔۔۔ اٹس سرپرائز۔۔۔ آپ لوگ۔۔۔" وہ بھاگتی ہوئی تبسم کی باہوں میں جا سمائی۔

"کیسا لگا سرپرائز؟" انہوں نے فرط مسرت سے اس کی پیشانی چومی۔

"سو نائس۔ آئی ایم ریلی سرپرائزڈ۔"

وہ دونوں بالکل اچانک ہی آ گئے تھے اسی لیے "مشعاء [illegible]

"ہدیہ بیٹا! شاندار سے ڈنر کا اہتمام کرنا۔ تم لوگ فریش ہو جاؤ۔" تبسم اور حیات احمد ہدایات جاری کر رہے تھے۔

"مشعاء! آپ یہاں ہیں بیٹا! ہمارا خیال تھا کہ آپ اپنے ماموں کی طرف ہوں گی۔ آج غالباً مونس کی مہندی ہے۔" حیات احمد اسے بازو کے گھیرے میں لیے صوفے کی طرف بڑھے۔

"پہلے ارادہ تھا پھر بدل گیا۔"

"السلام علیکم چاچو!" ازرار بھی ابھی نیچے آیا تھا۔

"کیسے ہو ینگ مین؟" حیات احمد نے اسے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ اپنے سب بھتیجے بھتیجیوں میں انہیں ازرار شاہ سے کچھ زیادہ ہی محبت تھی۔

"الحمدللہ! بالکل خیریت سے ہوں۔ آپ سنائیں۔"

"ہم کیا سنائیں بیٹا! زیادہ وقت تو انکل کے ساتھ گزرا۔"

"اب کیسی طبیعت ہے سعید انکل کی۔" فارہ نے

تبسم سے پوچھا۔

"اللہ کا شکر ہے۔ اب تو بہت بہتر ہیں پہلے سے۔"

"کون کون آیا ہے انگلینڈ سے۔" طیبہ نے سب کو کولڈ ڈرنک سرو کی۔ ہدیہ ٹرالی کھینچے آ رہی تھی۔

"افتخار بھائی اور بچے ہی آئے ہیں۔ بھابھی کی اپنی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اور پاپا بھی ابھی وہیں پر ہیں۔"

"اور ہماری بیٹی کا تاکتنی زیادہ تنگ تو نہیں کیا اس نے آپ کو؟" حیات احمد کے دائیں طرف ازرار شاہ تھا تو بائیں طرف وہ چپکی ہوئی تھی۔

"ڈیڈی۔" وہ ٹھنکی۔

"ارے نہیں بھئی۔ ہماری بیٹی تو بہت پیاری اور سیدھی سادی بچی ہے۔"

"جلیبی کی طرح سیدھی ہیں۔" ازرار شاہ نے سرگوشی کی۔

"اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟" اس نے گھورا۔

"اوہو! ابھی سے لڑتے نہیں ہیں۔" حیات احمد نے ٹوکا۔

"ڈیڈ! میری سب سے بہت بنتی ہے ان کے سوا۔" اس نے ازرار شاہ کی طرف اشارہ کیا۔

"کیوں بھئی؟"

"ان سے بھی بنا لینی چاہیے۔" "ابھی سے نہیں بنتی۔" تو فل نے لقمہ دیا۔

"بس ایسے ہی ڈیڈ! ہم دونوں کے ستارے نہیں ملتے۔" وہ کھلکھلائی۔

"ارے یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔" حیات احمد بھی ہنسنے لگے۔

"میں چینج کر کے آتی ہوں۔" تبسم اٹھیں تو وہ بھی ساتھ ہی اٹھ گئی۔

مشعاء کے گلابی لبوں سے مسکان چپک کر رہ گئی تھی۔ مسکراتے ہوئے اس کے دائیں رخسار میں پڑنے والے بھنور میں ازرار شاہ کو کتنی ہی بار اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

"مشعاء! تم نے (ناخن) نیلز وغیرہ کاٹنے ہیں تو ابھی کاٹ لو کیونکہ کل یقیناً عیدالاضحیٰ کا چاند نظر آ جانے کا امکان ہے۔" وہ دراز سے کٹکس نکال رہی تھی جب ہدیہ نے اندر جھانکا۔

"تو اس کا میرے نیلز سے کیا تعلق؟"

"دس روز تک بال اور ناخن وغیرہ تراشنا جائز نہیں ہے۔"

"اچھا چلو ٹھیک ہے۔"

"مشعاء! تم تیار ہو گئی ہو۔" شیفون کی بلیو ساڑھی میں ملبوس تبسم کہتے ہوئے اندر داخل ہوئیں۔

"آخر کیا تیار ہوں۔ ہدیہ! تم ابھی تک ایسے ہی گھوم رہی ہو۔"

"میں نے بس کپڑے ہی چینج کرنے ہیں۔"

"ہاں تمہاری تیاری کا پتہ ہے مجھے۔"

"مشعاء! یہ آپ ہو میری جان۔۔۔" اس پر نگاہ ڈالتے ہی ان کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔ میرون اور بلیک کیپ شن کے شلوار قمیص میں وہ نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت لگ رہی تھی۔

"اچھی لگ رہی ہوں نا۔" تین گز کا دوپٹہ لہراتے ہوئے وہ کھلکھلائی۔

"آئی کانٹ بلیو اٹ۔ آپ نے فرسٹ ٹائم یہ ڈریسنگ کی ہے۔ آپ کو تو الجھن ہوتی ہے نا ایسٹرن ڈریسز سے۔" وہ بے یقین تھیں۔

"کبھی کبھی ٹرینڈ بدلنا چاہیے۔"

"یہ اتنا خوب صورت ڈریس آپ نے خود چوائس کیا ہے؟"

"نہیں۔" وہ ہدیہ کی طرف دیکھنے لگی جو شرارت سے مسکرانے لگی تھی کیونکہ اسی کے اصرار پر اس نے یہ لباس زیب تن کیا تھا۔

"یہ سیکرٹ ہے مام! پھر کبھی اوپن کروں گی۔ آپ ایئررنگز تو پہن لیں۔"

"مائی بیوٹی فل ڈول۔ بہت کیوٹ لگ رہی ہو۔" بے ساختہ اس کی پیشانی چوم کر وہ اسے جلدی آنے کا کہہ کر باہر نکل گئیں۔

"میں تو اتنی کانفیڈنٹ ہوں۔ آج مما کے سامنے نروس فیل ہو گئی۔ سیدھی طرح بتا دیتی کہ ازرار نے گفٹ کیے ہیں۔" وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو کر پرفیوم اسپرے کرنے لگی۔

"ازرار شاہ۔۔۔" اس کے بے ساختہ کہنے پر ہدیہ جلدی سے دوپٹہ سمیٹ کر باہر نکل آئی۔ سامنے ہی وہ اپنے کمرے سے باہر

ثمینہ عظمت علی
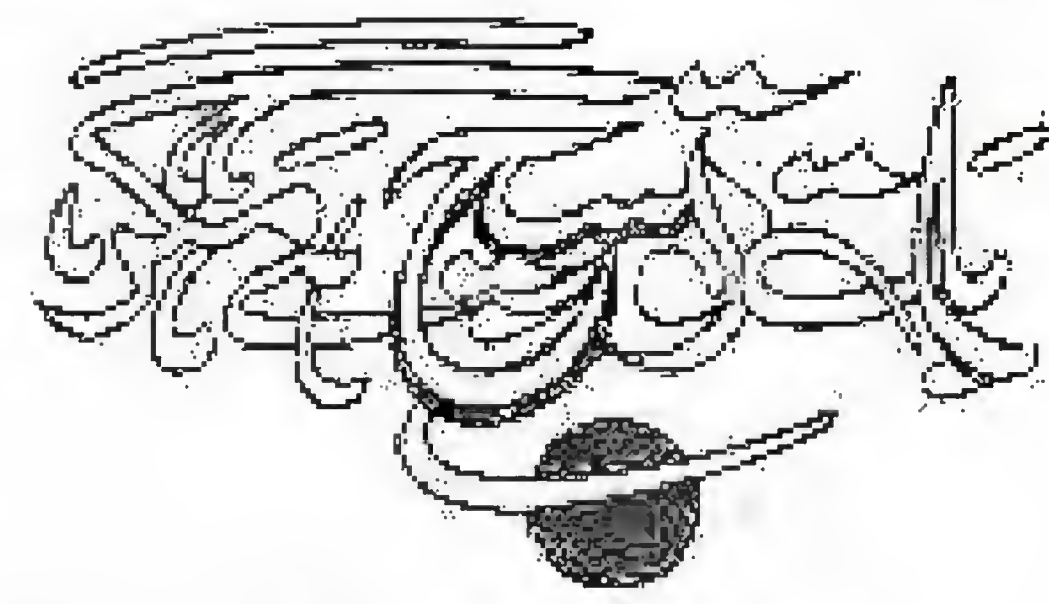
مسز احمد تو ہمیشہ ہی ایسی بات کرتیں کہ مجھے غصہ آجاتا۔ اوپر سے جب عمیرین ان کی ہاں میں ہاں ملاتی تو میں تلملا جاتی۔

"تم کیوں ان کی چمچی بن جاتی ہو۔" مسز احمد کے باہر جانے کے بعد میں نے اسے ٹوکا۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھیں تم تو خواہ مخواہ...." اس نے ان کی حمایت کرنا چاہی، پر میں نے بیچ میں ہی ٹوک دیا۔

"بس کرو، یہ بتاؤ عمار کا ٹیسٹ کیسا ہوا؟" میں نے اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھا جو چھٹی جماعت میں تھا اور عمیرین اس کی کلاس ٹیچر تھی۔

"ابھی میں نے پرچے چیک نہیں کیے۔" اس نے قدرے رکھائی سے کہا تو مجھے اپنے رویے کا احساس ہوا اور پھر نئے سرے سے مسز احمد پر غصہ آنے لگا ان کی باتوں ہی کی وجہ سے میرے اور عمیرین کے درمیان کھٹ پٹ ہو جاتی تھی۔

"اچھا بابا سوری، اب موڈ ٹھیک کرو۔" میں نے کہا تو وہ مسکرا دی۔

☆ ☆ ☆

مسز احمد سے میں سخت نالاں رہتی تھی۔ ذرا سی فرصت ملی اور بیگ سے کتاب نکال لی۔ گویا اور کوئی کام ہی نہ ہو۔ وہ سینئر ٹیچر تھیں اور اسٹاف کی اکثریت سے ان کے تعلقات اچھے تھے لیکن وہ جو بس کتب ریڈنگ کی تبلیغ کیا کرتی تھیں، اس سے مجھے سخت چڑ ہوتی تھی۔ بھلا یہ کیا بات ہے۔ ہر کسی کا اپنا شوق ہے اور آج کل سائنس و ٹیکنالوجی نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ دنیا فنگر ٹپس پر آگئی ہے۔ اب کون کتابیں پڑھتا پھرتا ہے؟ اور چلو ٹیسٹ کی حد تک تو ٹھیک ہے یا اس سے متعلقہ کچھ کتابیں۔ باقی یہ ادب، شعر و شاعری وغیرہ وغیرہ کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ بھاری بھاری فلسفوں والے ناول، بے سروپا شاعری، جھوٹے سچے سفرنامے یا اسی طرح کی چیزیں پڑھتا رہے۔

ہمارے گھر کا ماحول ایسا ہی تھا ہم سب، بہن بھائی، کزنز میوزک، مووی، پکنک، پارٹی، ہلے گلے کے عادی تھے۔ پڑھائی میں اچھے تھے، کلاس میں کوئی نہ کوئی پوزیشن [illegible] تھا لیکن بس کتابوں سے تعلق پڑھائی کی حد تک تھا۔ اسکولنگ ہمیشہ اچھے انگلش میڈیم اسکول میں رہی سو جو کچھ انگلش وغیرہ اسکول میں پڑھا سو پڑھا۔ اردو تو بس واجبی سی تھی۔ کبھی کبھار کوئی میگزین وغیرہ پڑھ لی تھی تو وہ بھی شوبز گوسپ یا فیشن ڈیزائننگ کے لیے لیکن وہ کمی بھی اب میڈیا، انٹرنیٹ اور ورائٹی نے پوری کر دی۔ میری منگنی اپنے کزن اسد سے ہوئی تھی۔ ان کی جاب انگلینڈ میں تھی اس لیے شادی بھی جلدی کر دی گئی۔

چار سال انگلینڈ میں رہنے کے بعد اسد نے دوبارہ کراچی آنے کا فیصلہ کیا تب تک میری ایمن دنیا میں آچکی تھی۔ مجھے اس فیصلے پر کیا اعتراض ہوتا تھا؟ ہمارا لائف اسٹائل تو کراچی میں بھی انگلینڈ والا ہی تھا پھر سارا خاندان یہیں تھا۔ ہم یہیں گھر لے کر سیٹ ہو گئے۔ اب ایمن او لیول کر رہی تھی اور عمار چھٹی جماعت میں تھا۔ ہمارے بچے ہماری طرح پڑھائی میں

اچھے تھے لیکن باقی کی مصروفیات ویسی ہی تھیں جیسی ہماری ہوتی تھیں بلکہ اب تو زمانے نے اور ترقی کر لی تھی۔ کمپیوٹر، نئے گیم اسٹیشنز، موبائل کا روز نیا ماڈل نئے اضافوں کے ساتھ تو آج کے بچوں میں کہاں سے ادبی ذوق پیدا کیا جاتا؟ ان کا کیا قصور تھا؟

اسکول بچوں کی وجہ سے آنا جانا رہتا تھا، سو پرنسپل جو میری پرسنالٹی اور انگلش سے بڑی متاثر تھیں، انہوں نے مجھے جاب آفر کی جو تھوڑا غور و خوض اور اسد سے مشورے کے بعد میں نے قبول کر لی۔ بچوں کے اسکول اور اسد کے آفس جانے کے بعد میں گھر پر اکیلی ہی رہتی تھی۔ کام کاج کا بھی کوئی زیادہ بوجھ نہ تھا۔ چلو یہ تجربہ ہی سہی۔

ٹیچنگ کر کے مجھے بڑا مزا آرہا تھا اور بھی زیادہ آتا اگر وہاں مسز احمد نہ ہوتیں۔

میں اور عمیرین جونیئر سیکشن میں تھیں اور مسز احمد غالباً "سینئر" میں۔ مجھے آئے ہوئے بمشکل ایک مہینہ

ہی ہوا تھا اور ابھی کسی کے بارے میں زیادہ معلومات نہ تھیں۔ عنبرین کو میں پہلے سے ہی جانتی تھی' وہ اسکول میں میری جونیئر ہوا کرتی تھی اور ہماری اچھی ہیلو ہائے تھی۔ باقی مسز احمد سے تو مجھے پہلے دن سے ہی چڑ ہو گئی تھی۔ مجھے ان کے بارے میں جاننے کا زیادہ شوق بھی نہیں تھا۔ حلیے سے بھی لگتا تھا کہ اردو' اسلامیات وغیرہ پڑھاتی ہوں گی۔ سادہ سی' سوبر سی مسز احمد کے سب ہی فین تھے۔ پر مجھے نہ جانے کیوں بس... اب ایسی بھی کیا سادگی! اب اتنی عمر بھی نہ تھی اور آج کل فیشن کے لیے کون سی عمر کی حد ہے۔ خوامخواہ کی دقیانوسیت۔

* * *

میں اسٹاف روم میں بیٹھی تھی' فری پیریڈ تھا اور میں حسب معمول اپنی بہن ارم کے ساتھ ایس ایم ایس' ایس ایم ایس کھیل رہی تھی۔ جب عنبرین نے آکر مجھ سے کسی انگلش ورڈ کی میننگ پوچھی۔ لفظ کچھ عجیب اور یونیک سا تھا۔ میں ذرا پزل ہو گئی۔ مسز احمد بھی وہیں بیٹھی حسب معمول اور حسب عادت کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ انہوں نے بھی عنبرین کی بات سن لی۔ کتاب ایک طرف رکھ کر انہوں نے میز پر رکھی۔ ضخیم ڈکشنری کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ڈکشنری میں دیکھ لیتے ہیں بیٹا!" عنبرین ان کی طرف مڑ گئی۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا اور میں نے کھٹ سے موبائل کی انفو سروس میں ڈکشنری آپشن میں جا کر لفظ لکھا اور سینڈ کر دیا۔ ابھی وہ دونوں صفحات ہی پلٹ رہی تھیں کہ کھٹ سے جواب بھی آگیا۔ میں فاتحانہ انداز میں کھڑی ہو گئی۔

"یہ لو عنبرین!" میں نے موبائل اس کی طرف بڑھایا جو عنبرین نے جلدی سے جھپٹ لیا۔

"زمانہ بہت آگے نکل گیا ہے مسز احمد!" میں نے ذرا طنزیہ انداز میں کہا۔

"آپ کے چار پانچ روپے تو کٹ گئے ہوں گے۔" انہوں نے اپنی اسی سادگی سے کہا تو مجھے ہنسی آگئی۔

"چار پانچ روپے؟" ہمارے اسکول کی سسٹم کی ٹیچرز ہی اچھے خاصے آفیسرز جیسی تھی اور یہاں سب اچھی فیملیز کی خواتین تھیں... ضرورت کی ماری کوئی نہ تھی۔

"ایک اور چیز بھی ہوتی ہے۔" انہوں نے آہستگی سے کہا۔ "جستجو' شوق' تجسس اور کچھ پالینے کی لگن اور اس پانے کے لیے محنت۔۔۔ تھوڑی سی اتنی آسان زندگی بھی کوئی اچھی بات نہیں ہوتی۔"

میں ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ باہر نکل گئی۔

* * *

ہمارا اسکول ویسے تو دو دن یعنی ہفتہ اور اتوار کو بند ہوتا تھا لیکن کبھی کبھی کوئی اسٹاف میٹنگ' سیمینار یا ورکشاپ ہفتے کے دن رکھ لی جاتی تھی۔ اس ہفتے مجھے اور عنبرین کو اسائنمنٹ ملا تھا۔ پریزنٹیشن کے لیے "ٹیچنگ کے جدید طریقے"

"یہ کیا ہے؟" میں نے عنبرین کے ہاتھوں میں تین چار کتابیں دیکھ کر پوچھا۔

"یہ کتابیں ہیں مجھے مسز احمد نے ریفر کی ہیں۔ لائبریری سے لی ہیں اسائنمنٹ کی تیاری کے لیے۔ تم کیا کرو گی؟ مل کر بنائیں؟" اس نے تجویز دی۔

"کون ان موٹی کتابوں میں سر کھپائے۔ ٹیچر ڈاٹ کام زندہ باد۔" میں نے چہک کر کہا۔

"کس دنیا میں ہو ڈیئر
It's just a click away دو منٹ میں نکل آئے گا پرنٹر سے سارا اسائنمنٹ۔" میں تو بچوں کے ہوم ورک کے لیے بھی نیٹ ہی استعمال کرتی تھی۔ اسکول کی طرف سے بچوں کو کمپیوٹر' انٹرنیٹ' انسائیکلوپیڈیا' ہر چیز استعمال کرنے کی اجازت تھی تو کیا ضرورت تھی آدھے گھنٹے کا کام ایک ہفتے میں کرنے کی۔

"وہ تو ٹھیک ہے پر یہ بکس بہت Authentic ہیں۔"

"چھوڑو بھی سو سال پرانی تو ہوں گی۔"

"نہیں نہیں۔ نیا ایڈیشن ہے۔"

"اچھا یعنی Old wine in new bottle! ہاں بھی ہوتا مسز احمد کی جانشین اور کل تم کون سی کتاب پڑھ رہی تھیں؟" میں نے اسے گھورا۔

"تو کیا اور جو ناول۔" اس نے کہا۔

"یہ ڈائجسٹوں کا زمانہ ہے اور یہ جو ناول کیا ہوتا ہے؟"

عنبرین نے کوئی جواب نہیں دیا اور چپ چاپ وہاں سے چلی گئی۔

اور جو کمپیوٹر سے ہی سہی' اسی دن نکال لیتی اسائنمنٹ' تو اچھا ہوتا۔ ایمن کی سالگرہ تھی۔ اسی ہنگامے میں جمعہ آگیا اور جمعہ والے دن جو دوپہر سے بجلی کا بریک ڈاؤن ہوا تو آدھا شہر تو بند ہو گیا۔ انتظار میں رات ہو گئی مگر بجلی کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ یو پی ایس تھا لیکن اس پر صرف پنکھے اور لائٹس تھیں' وہ بھی کم تعداد میں۔ اب کمپیوٹر کہاں سے چلتا؟

گیارہ بجے عنبرین کو فون کیا تو موبائل آف تھا۔ یعنی وہ اچھی بچی کی طرح سو چکی تھی۔ پریزنٹیشن تھی اور اس میں نو بجے پورے اسٹاف کو آنا تھا۔

صبح عنبرین بڑی فریش تھی۔ اس کی تیاری مکمل تھی لیکن میری پریشانی سن کر وہ مجھ سے زیادہ پریشان ہو گئی۔

"او گاڈ! اب کیا ہوگا۔ دیکھو میں نے تم سے کہا تھا بکس لے لیتیں۔"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ بجلی یوں دھوکہ دے گی۔"

"کیوں معلوم نہیں تھا۔ کراچی ہے یہ' کہیں اور رہتی ہو کیا؟"

"لیکن اب کروں کیا؟"

"دیکھو ابھی نو بجے ہیں اور پروگرام گیارہ بجے ہے۔ دو گھنٹے ہیں' ہم لائبریری میں بیٹھ کر تیاری کر لیتے ہیں۔"

"نہیں ہوگا مجھ سے۔ ساری رات سو بھی نہیں سکی۔ سر بھی بھاری ہے۔" میں نے کہا۔

"تو یہ میری اسائنمنٹ لے لو۔"

"پاگل ہو گئی ہو؟" اب میں اتنی خود غرض تھی کیا۔ "یہ بتاؤ کہ پرنسپل سے کیا کہوں؟"

"اچھا... دیکھو۔" وہ سوچ کر بولی۔ "میں مسز احمد سے بات کرتی ہوں۔" پھر اس نے آگے کیا کیا مجھے معلوم نہیں۔ بس پرنسپل نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔

* * *

بچوں کے ایگزامز ختم ہوئے تو ان کی تو چھٹیاں ہو گئیں لیکن اسٹاف کو تو آنا ہوتا تھا۔ کاپیاں چیک کرنا' رزلٹ بنانا وغیرہ۔ سب بے حد مصروف رہتے۔ مسز احمد ایگزامز کی انچارج تھیں اور ان کی کوشش ہوتی کہ درمیان میں کچھ چائے اور کھانے پینے کا سلسلہ بھی جاری رہے تاکہ تھکن اور بوریت نہ ہو۔ پھر بریک ہوتی تو باتیں کہاں سے شروع ہوتیں' کہاں ختم' کچھ پتہ نہ چلتا اور اگر مسز احمد موجود ہوتیں تو بات کیا ہوتی تھی۔ وہی کتاب' کتاب اور کتاب۔

"مسز احمد! اب دور بہت بدل چکا ہے۔ بچوں کے پاس اور بہت سے آپشن ہیں۔" یہ مسز عابد تھیں جن کی بات سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ کوئی تو میرا ہم نوا تھا۔

"لیکن کتاب کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔" مسز احمد نے کہا۔ "اور یہ والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ بچوں کے ذوق کی تعمیر کریں۔ ہم بچوں کو مہنگے مہنگے گفٹس دیتے ہیں' کھلاتے پھراتے ہیں لیکن انہیں کتابیں پڑھنے کی جانب راغب نہیں کرتے۔"

"جو لوگ پہلے کتب بینی کے شوقین تھے' وہ اب بھی ہیں اور جو نہیں تھے' وہ نہیں ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے۔" کسی اور نے کہا۔

"بات تو یہ ہے کہ آج کل کے بچوں میں یہ شوق کیسے پیدا کیا جائے؟ جو لوگ پہلے پڑھتے تھے اور اب بھی پڑھ رہے ہیں تو یہ شوق ایک نسل تک محدود ہو گیا نا۔ اس کے سب لوگ کسی نہ کسی طرح ذمہ دار ہیں۔ پہلے ادیب' اسٹار کی حیثیت رکھتے تھے۔ آج کل اس کا مفہوم بدل گیا ہے۔ اب فلم اسٹار' ٹی وی اسٹار' سنگرز'

پلیز نہیں۔"

"لیکن یہ سب ہمارے ہی چوائز ہیں، ورنہ دوسرے ممالک میں ان سب کے باوجود بکس کی کس قدر زیادہ ٹرینڈ ہے۔" ایک نے کہا۔ "انڈیا ہی کو دیکھ لیں۔"

"ہاں، ابھی پچھلے دنوں میں نے ایک انڈین چینل پر ایک پروگرام دیکھا۔" عنبرین گویا ہوئی۔ "جس کا نام My Passion تھا۔ اس میں ایک اداکارہ آئی جس کا نام مجھے معلوم نہیں اور وہ فلموں میں عام سے گھیرسی رول کرتی ہے لیکن اس نے کہا کہ اس کا Passion بکس پڑھنا ہے۔ رومی تک کو پڑھا ہوا تھا اس نے۔"

اب مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ میں لاکھ ماڈرن تھی یا لائف اسٹائل ویسٹرن تھا یا میں پاکستانی رائٹرز کو نہیں جانتی تھی، پر میری گھٹی میں پاکستانیت اور بھارت سے بیر میں کوئی شک نہیں تھا۔

"جھوٹے، منافق، دوغلے لوگ ہیں۔ اسکرین پر شو کرتے ہیں۔" میں نے غصے سے کہا۔

"لیکن دوسرے ہفتے اس پروگرام میں عاطف اسلم آیا تو اس نے کہا کہ میرا Passion جوتے خریدنا ہے۔" عنبرین نے بتایا۔

"ہاں تو ہم سچے لوگ ہیں۔ خواہ مخواہ کی شو آف کیوں کریں۔" میں نے کہا۔

"مسز اسد۔" مسز احمد مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ "کسی سے جغرافیائی، سیاسی، معاشرتی، سماجی یا مذہبی طور پر کتنے ہی اختلاف ہوں لیکن ماننے والی بات مان لینی چاہیے۔"

"کیوں ہم مان لیں۔" میں بھڑک اٹھی۔ "ہم کسی سے پیچھے نہیں۔ بس لوگوں کو نہ جانے کیوں ہر وقت دوسرے ملکوں کے گن گانے کا شوق ہوتا ہے اور اپنے ملک کی برائیاں کرنے کا۔ کیا فائدہ ایسی کتابیں پڑھنے کا جو ہمیں حب الوطنی بھی نہ سکھا سکیں۔"

میں غصے میں بولتی چلی گئی اور مسز احمد کا سرخ چہرہ اور عنبرین کی تنبیہی نگاہیں نظر انداز کرتے ہوئے باہر چلی گئی۔

"تم نے اچھا نہیں کیا۔" عنبرین میرے پیچھے پیچھے آئی تھی۔

"کیا اچھا نہیں کیا؟ انڈیا کی تعریف نہیں سنی؟ پاکستان کی برائی برداشت نہیں کی؟ یہ اچھا نہیں کیا۔"

"بات انڈیا پاکستان کی نہیں تھی اور اتفاق سے میں نے جو مثال دی اس کا تعلق انڈیا سے تھا لیکن تم خواہ مخواہ بھڑک اٹھیں۔ اس طرح تو میں امریکہ، انگلینڈ کہیں کی مثال دے سکتی ہوں۔ جانتے اور ہم عمر ہونے کی وجہ سے ہم اپنا زیادہ تقابل انڈیا سے ہی کرتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"ہاں انڈیا سے کرتے ہیں اور انڈیا کو سپیریئر ثابت کرتے ہیں اور خود کو کمتر۔ یہ ہے ہمارا Patriotism (حب الوطنی)" میں نے طنزیہ کہا۔

"کس Patriotism کی بات کرتی ہو تم۔" عنبرین کو غصہ آ گیا۔ [illegible] انڈیا سے برداشت نہ کریں، ہم آسٹریلیا، انگلینڈ سے بھی ہار جائیں پر انڈیا سے نہ ہاریں۔ کیوں؟ ہار تو ہار ہوتی ہے۔ ہم رکی پونٹنگ، جیک کیلس، گبل سب کی ہٹنگ انجوائے کریں اور یوراج، سہواگ کو آؤٹ ہونے کی بددعائیں دیں۔ یہ ہے حب الوطنی؟ ہم رانی مکرجی کی ساری فلمیں دیکھیں پھر اس کے کریکٹر پر تنقید کریں۔ ہم گھنٹوں اس موضوع پر بحث کریں کہ ایشوریا نے سلمان خان اور ابھیشک نے پریتی زنٹا سے شادی کیوں نہیں کی؟ ہم شاہد کپور اور کرینہ کپور کے بریک اپ پر غور کریں۔ ہم کئی دن اس ٹینشن میں رہیں کہ VOI میں اشمیت کیوں جیتا اور توچی کیوں نکل گیا؟ یہ ہے حب الوطنی۔ بس ہماری گفتگو صبح سے شام تک ان کے گرد ہی گھومتی رہتی ہے۔ چاہے ہم تنقید ہی کریں۔"

میں کچھ دیر کو چپ ہو گئی پھر اچانک بولی۔

"عنبرین! تم کیا سے کیا ہوتی جا رہی ہو۔ مسز احمد نے تمہیں کیا کر دیا ہے۔ وہ خود تو ایسی ہیں اور پھر دوسروں کو۔"

"غلط۔ مسز احمد نے کبھی تم سے کیا کسی سے کچھ غلط نہ کہا، نہ کیا اور جانتی کیا ہو تم ان کے بارے میں۔ تمہیں دن ہی کتنے ہوئے ہیں اور آتے ہی تم نے انہیں ناپسند کر دیا۔

جانتی ہو، وہ اے لیولز کے بچوں کو انگلش پڑھاتی ہیں۔ آکسفورڈ کی پڑھی ہوئی ہیں اور وہاں کی آفرز ٹھکرا کر یہاں پاکستان آئی ہیں۔ ان کا ایک بیٹا میڈیا سے منسلک ہے اور آج کل وہ پاکستان کے صوفی شعراء پر ایک انٹرنیشنل ڈاکیومنٹری بنا رہا ہے۔ ان کی بیٹی "ٹھٹھہ" پر ایک انگلش کتاب لکھ رہی ہے جو آکسفورڈ پریس سے شائع ہوگی۔ خود مسز احمد ٹیکسٹ بکس کے پینل میں شامل ہیں۔

اور یہاں تم ہو، ہر وقت ٹیکنالوجی کی باتیں کرتی ہو تو کہو کہ ہم دنیا میں ٹیکنالوجی میں سب سے آگے نکل گئے ہیں؟"

اس نے کہا اور چلی گئی۔

میں بوجھل دل سے گھر واپس آئی۔ نہ جانے کیوں سارا دن طبیعت اداس سی رہی۔ اسد اسلام آباد گئے ہوئے تھے۔ ایمن اور عمار، امی کے گھر جانے کی ضد کر رہے تھے۔ میں خود نہیں گئی اور انہیں بھیج دیا۔ میں نے نیٹ پر مختلف ویب سائٹس کے فورمز وزٹ کیے۔ میں زیادہ تر فیشن، ڈیزائننگ، انٹیریئر، شوبز، میوزک، ہیلتھ اینڈ بیوٹی ٹائپ کے فورمز کی ممبر تھی لیکن آج دانستہ طور پر میں نے بک ریڈنگ کے کمیونٹیز وزٹ کیں۔ بلاشبہ وہاں ممبرز کی تعداد ہزاروں میں تھی لیکن یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ پاکستانی ممبرز بہت کم، نہ ہونے کے برابر تھے۔ حالانکہ عام چیٹ رومز میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے پھر میں نے بددل ہو کر بی بی سی کی سائٹ کھول لی۔ نہ جانے کون سی خبر تھی، بچوں کا ایک ہجوم تھا، نہ صرف بچے بلکہ بڑے بھی۔ اتنا رش اور دھکم پیل۔ میں ڈر گئی۔ حادثات کے متعلق میں ویسے ہی بہت کمزور تھی۔ خبر سننے پر پتا چلا کہ یہ ہیری پوٹر سیریز کی بک لانچ تھی اور بچوں کا ہجوم بے کراں شاپ پر الڈا ہوا تھا۔ خبر سننے پر معلوم ہوا کہ نہ جانے کتنے لوگ رات سے وہاں آ کر بیٹھ گئے تھے پھر مصنفہ جے کے رولنگ کے بارے میں بتایا جانے لگا کہ کس طرح وہ ایک امیر ترین اور مشہور ترین مصنفہ بن گئی۔ ہیری پوٹر تو فلموں کی سیریز بھی ہے پھر بک لینے کے لیے اتنا رش۔ میں نے حیران ہو کر سوچا پھر عنبرین کی بات یاد آئی کہ کیا ہم ٹیکنالوجی میں سب سے آگے نکل گئے ہیں؟"

میں نے سوچا تو مجھے اپنے انگلینڈ میں رہائش کے چند سال یاد آ گئے اور مجھے یاد آیا کہ وہاں لوگ کتنا پڑھتے ہیں۔ چاہے اخبار ہو، ناول ہو یا کچھ بھی۔ ٹرین میں سفر کر رہے ہیں تو کتاب نکال لی۔ کہیں انتظار کر رہے ہیں تو کتاب۔ پارک ہو، فلو ہر جگہ......

اور یہ بک کے پیچھے پاگل ہوتے بچے......

کیا ہمارے بچے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے استعمال میں ان سے آگے ہیں یا کسی بھی طرح کی ٹیکنالوجی میں ہم ان سے آگے ہیں؟ تفریح کے مواقع ان کے پاس زیادہ ہیں یا ہمارے پاس؟ سہولیات میں، اکانومی میں کون آگے ہے؟

میں نے سوچا اور سوچتی چلی گئی۔

اور مسز احمد نے کہا تھا کہ "کسی سے سیاسی، مذہبی، سماجی طور پر کتنے ہی اختلاف ہوں لیکن ماننے والی بات مان لینی چاہیے۔"

زینب ممتاز

جاگ کہ دل یار کی خبر

"دیکھو جا رہی ہے' کہیں اس کا باپ دیکھ نہ لے۔ توبہ توبہ... غضب خدا کا' ڈر ہی نہیں ہے نا۔ دیکھو ذرا' باپ آ جائے اس کا سر پہ تو مار ہی نہ ڈالے۔" ہیروئن کے ہر اٹھتے پڑتے قدم پر دادی اماں کے تبصروں کو چار چاند لگ رہے تھے۔

"تھوڑا ماری جلدی بھی نہیں کرتی' اب جائے بھی واپس۔" ابھی تو بے چاری نے ہیرو کے غریب خانے پہ قدم رکھا بھی نہیں تھا اور دادی نے اس کی واپسی کی جلدی مچا دی۔

"خدا کی مار... لڑکی کو رتی بھر فکر ہی نہیں ہے۔ سچ کہتے ہیں کہ عشق اندھا ہوتا ہے۔"

ایمن کی بات اگر ہیروئن کے کان میں دادی اماں کی پھٹکار پڑ جائے تو اس کے عشق کی تو چھوڑو چار آنکھیں نکل آئیں۔ "ہائے دیکھو' خبر ہو گئی نا اس کے باپ کو۔ اب اللہ ماری چار چوٹ کی ہی کھائے گی نا۔"

"دادی اماں پلیز۔" ایمن سے وہ جھلا کر رہ گئی۔ "فلم دیکھنے دیں نا' تبصرے بعد میں کر لیجئے گا۔"

اسے سین کے کلائمیکس کی پڑی تھی۔ امیر کبیر باپ کی اکلوتی لڑکی غریب ہیرو سے ملنے کی تھی اور پیچھے سے باپ کو خبر ہو گئی۔ وہ جائے واردات بمطلب جائے ملاقات پر پہنچ گیا۔ اس کا چہرہ جلال سے چھوٹی ہیروئن اور دادی جان کے چہرے پہ جوش بھرے۔ کہاں وہی عام سی تھی مگر وہ فلم وی سی آر بہت کم دیکھا کرتی تھی۔ سو منہمک تھی ویسے بھی وہ ہر کام انہماک سے کرنے کی عادی تھی۔ کم از کم فلم تو دلچسپی سے کرنے ورنہ نہ کرے اور آج یونہی اس نے موڈ بنا لیا۔ فلم دیکھ لی جائے۔ سنا ہے اس کے گانے اچھے ہیں۔ ابھی وہ ٹی وی کا بٹن آن نہیں کر پائی تھی کہ دادی اماں کی آواز آئی۔

"تمہیں تو کبھی فرصت ہی نہیں ملتی کہ چار گھڑی بیٹھ کر مجھ سے بات کر لو اور کچھ نہیں تو اب ان تصویروں کے ڈبے میں سر کھپاؤ گی۔" یہ شکوہ اس نے اپنی اتنی سی عمر میں اتنی بار اور اتنے لوگوں سے سنا تھا کہ بے اثر ہوتے ہوتے اب اثر دکھانے لگا تھا۔

ناولٹ

"تو آپ بھی آجائیں نا دادی اماں، دونوں مل کر فلم دیکھیں گے۔"

"تو ابھی مصلّے سے اٹھے نہیں" ابھی شیطان کے آگے بیٹھ جائیں۔" وہ بڑبڑاتی، جھنجلاتی، پلٹتے پلٹتے رک گئیں۔ باقی سارے گھر والے دعوت میں گئے ہوئے تھے۔ اپنے کمرے کے جانے سے ہونے سے بہتر تھا نوفل کے ساتھ یہ تماشا ہی دیکھ لیں۔

* * *

"مردوں کو خوبصورت نہیں ہونا چاہیے۔"

"کیوں خالہ! آخر ان کا کیا قصور؟"

"نہیں میرا مطلب تھا یہ لفظ عورتوں کے لیے اچھا لگتا ہے، مرد تو..."

"ارے واہ! آپ نے خوبصورت لفظ پر عورت کی اجارہ داری کیوں؟" "کھیل کے میدان میں" کے صفحے میں سر کھپائے بیٹھا تھا اس کے فتوے پر اخبار چھوڑ اچھل ہی پڑا۔

"اچھا بھئی خوبصورت بھانجے! تمہیں اجازت ہے، جب چاہے اپنے آپ کو خوبصورت کہلوانا۔"

وہ تھا بھی اچھا خاصا وجیہہ بندہ۔ عمر اس کی اٹھارہ سال سے زیادہ نہ ہوگی مگر شخصیت اس کی بھرپور مردانہ وجاہت کا نمونہ تھی اور زارا سے بھی تو چھا جاتا۔ چاہو رہتی تھی کہ حسین، وجیہہ، جاذب نظر قسم کی تعریفیں ٹھیک ہیں مگر خوبصورت کے ساتھ نزاکت کا تصور ساتھ آجاتا ہے اور پھر مرد کی شخصیت کی کشش اس تصور کے ساتھ ہی ختم ہوجاتی ہے۔ یہ حقیقت بھی تھی کہ عمر ولید کم اس کے مشاہدے میں یہ بات ہمیشہ رہتی تھی کہ جو مرد واقعی اس تعریف پر پورے اترتے ہیں ان میں نزاکت کا شائبہ نہیں تو نہیں ضرور جھلکتا ہے اور اسی لیے وہ کہتی تھی کہ مردوں کو خوبصورت نہیں ہونا چاہیے یا دوسرے لفظوں میں اسے خوبصورت مرد اچھے نہیں لگتے تھے۔ اچھا لگنے اور نہ لگنے کا اظہار وہ بے دھڑک کردینے کی عادی بھی تھی۔ اس کے چاہنے والے اور رکھنے والے بھی تو بہت تھے۔ چچا، پھپھیں اور ایک بھائی اور اس کا نمبر آٹھواں تھا۔ چھوٹی تھی لاڈلی تھی، چہیتی تھی اور اسے لگتا کہ سب کی امیدوں اور محبتوں کا واحد مرکز بھی وہی تھی۔ سب اپنے اپنے گھروں میں مگن تھے مگر سب ہی ہر وقت اس کی دھن میں لگے رہتے۔

"زارا خالہ! میرے ساتھ شاپنگ کے لیے چلیں گی۔" خالہ دوڑی گئیں۔

"خالہ! آج میرے دوست آئیں گے، آپ "اسنو" بہت مزے کے کباب بناتی ہیں، بنا دیں گی نا؟"

وہ "کیوں نہیں" کہتی جُت جاتی۔

"چھوٹی پھپھو! آج میرے اسکول میں پیرنٹس ڈے ہے۔ ممی کو تو فرصت ہی نہیں، آپ چلیں نا۔"

وہ ایک دم معتبر ہو کر پل میں سرپرست بن جاتی۔

"زارا جی! آج روٹیاں ڈالو، چار چھ زیادہ ڈال لینا۔ میری کمر میں سخت درد ہے۔"

اکلوتی بھابی کا کچن الگ تھا مگر دیوار ملی ہوئی تھی۔ اکثر مزے دار خوشبوؤں کے ساتھ کھانے بھی دیوار پار کر جاتے۔ وہ کیوں اعتراض کرتی؟ آخر کو اکلوتی بھابی تھیں۔ دادی جان البتہ [illegible] اپنا ہر عمل اسی سے سرانجام دلوانا پسند کرتیں۔ ابو جان کو اس کی عادت تھی اور امی جان کو اس کی ضرورت۔ وہ ہر ایک کو لبیک کہتی ذرا نہ تھکتی۔

اور پھر اسی پر قناعت نہیں تھی، اس کے اوپر بھی اتنے پرستار تھے کہ شمار میں نہ آتے۔ ایک تو وہ تھی بلا کی حاضر جواب، خود اعتماد اور ذہین۔ حقیقت میں وہ اچھی خاصی سنجیدہ مزاج لڑکی تھی مگر منفرد یہ تھا کہ وہ اپنے مقدر کی ہر سنجیدگی کو شگفتہ انداز میں آسان بنا کر نمٹانے کی عادی تھی۔ جس سے ایک بار ملتی وہ دوبارہ ملنے کی تمنا کرتا۔ جس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتی وہ تا عمر اس سے لپٹنے کا آرزومند ہوتا اور جس کے ذرہ بھر کام آجاتی، دونوں داری صدقے ہوتا۔ اکثر وہ زچ ہو کر رہ جاتی۔

"بڑا مسئلہ ہے، آج کسی سے مسکرا کر بولو کل وہ گلے لگنے کو تیار رہے گا۔"

[illegible]

اور یہ بہت روپ دکھاتے تھے۔ قصور لوگوں کا بھی اتنا نہیں تھا وہ جس سے تھوڑا بہت آدھا تھا بات کرتی لگتا اسی کی ہو رہی ہے اور وہ اپنے نام کی ایک ہی ایک زارا عمر ہزاروں ٹکڑوں میں بٹ جاتی، تو بھی کسی کے ہاتھ اتنا نہ آپاتی کہ وہ مطمئن ہو جائے۔ اصل میں عرصے کی بات بھی یہی تھی کہ اس ہزار بکھرنے کے عمل سے گزر کر بھی وہ آج تک اپنے مستحق کسی ایک واحد شخصیت کو مطمئن نہ کرپائی تھی۔ اس کی اپنی عمر کم تھی اور اس کے چاہنے والوں کے شکوؤں کی عمر زیادہ۔

"تمہیں تو چوبیس گھنٹوں میں ایک فون کرنے کی بھی فرصت نہیں زارا، اولی یہ تو میں ہی ہوں جو تمہارا نمبر گھماتے انگلیاں گھستی رہتی ہوں، ورنہ تم تو پلٹ کر پوچھو بھی نا کہ زندہ ہے یا مر کھپ گئی ہے۔"

"ارے نہیں بھئی! میں اخبار بہت باقاعدگی سے پڑھتی ہوں۔ اگر ایسا کچھ ہوا تو تمہارے سوئم کی خبر ضرور مل جائے گی۔"

"ہاں اور پھر سوئم پہ [illegible] کھانے پہنچ جانا۔ تمہاری پسندیدہ ڈش جو ہے۔"

"ارے ہاں یار! بہت دنوں سے زردہ نہیں کھایا وہ بھی دیگ کا پکا ہوا۔ کتنا مزے کا ہوتا ہے نا۔"

"ہو تو آج مرجاؤں، پرسوں مل جائے گا زردہ۔ پوری دیگ کھا لینا۔"

وہ دونوں شروع سے ایک ساتھ پڑھتی آرہی تھیں۔ ایک ہی اسکول، ایک ہی کالج پھر فشر کے بعد زارا کو آرٹس کرنے کا جنون سوار ہوا اور وہ یونیورسٹی پہنچ گئی۔ اسے بھی بہت کھینچنے کی کوشش کی مگر اس کے اردگرد لوگوں کا حصار بہت مضبوط تھا، وہ اتنی آسانی سے کسی کے ہاتھ نہ آسکتی تھی۔ اس کا گھر سے دو گلیوں کے فاصلے پر موجود کالج میں گریجویٹ کرنا قیامت کا مسئلہ تھا۔

"آخر یہ موئی پڑھائی تمہاری کب ختم ہوگی۔" دادی جان کا مسلسل ٹوکنا اور اس کا مسلسل ہنس کر ٹالنا۔

"واہ اس سے ہوئی!" جھٹ کہہ جاتا اور [illegible] "امی جان روز نصیحت کرتیں، وہ روز تابعداری سے سرہلا دیتی۔

"غضب ہوگیا زارا! میں نے تو آج ہی دیکھا۔" وہ بمشکل میر تقی میر اور مومن خان مومن کو حفظ کرنے میں کامیاب ہوتے ہی لگی تھی کہ بھابی نے کمرے میں جھانک کر اسے ڈسٹرب کردیا۔

"کیا ہوا؟" وہ بڑی بڑی باتیں سکون سے سننے کی عادی تھی اور بھابی چھوٹی چھوٹی باتوں کو مزے سے غضب قیامت کہہ دیا کرتی تھیں۔

"ارے وہ ہمارا اکلوتا گلاب کا پودا جل گیا۔"

"جل گیا۔۔۔؟ پھر راکھ کہاں ڈالی؟"

"اب بھئی آپ کی جانا کس کس طرف دھیان دوں۔ امی اور ابو کا خیال رکھنا اور دادی جان کو تو چائے آج کل کیا ہو گیا ہے پھر تمہارے بھائی کے مزاج بھی پتہ ٹھکانے نہیں ملتے۔ کتنے دنوں سے میں نے پودوں کو پانی نہیں دیا۔"

"ارے چھوڑیں بھابی! جس جس کو دینے لگی ہیں دیتی رہیں پانی، باقی چیزوں کو جینے دیں۔"

اس کا لہجہ ایسا ہی تھا ہمیشہ سے، کسی کو طنز لگتا کسی کو پیار اور کسی کو بے نیازی۔ مگر جو نظر آتی یا نظر آنے کی کوشش کرتی، اتنی بے نیاز وہ ہرگز تھی نہیں۔ بہت چاہت سے اس نے گلاب کا پودا لگایا تھا اور بڑی لگن سے وہ اسے روز پانی دیا کرتی تھی۔ اب وہ مصروف امتحان تھی اور اس کی فراغت کو ترستے جتنے لوگ اس کے پیچھے روز جلتے کڑھتے تھے، وہ ان بے ضرر معصوم پھولوں کا کیا غم مناپاتی۔

جس دن وہ آخری پیپر دے کر لوٹی، ایک طویل پُرسکون اور جی بھر دینے والی نیند کی خواہش میں اس نے بہت سی چیزوں کو نظر انداز کردیا۔ دادی جان کو سلام کیا تو "آج تو بیٹا میرے ساتھ کھانا کھانا اور مجھ سے ڈھیروں باتیں کرنا۔"

"جی دادی اماں! بس تھوڑا سا سولوں۔"

"بیٹا! میری فائلیں اور ہر چیز کئی دنوں سے بے

"ترتیب دیا ہے۔" آج جو کہا لیٹ۔"

"جی ابو ضرور۔" وہ ذرا چاولوں پر رغبت سے کھاتے ہوئے دادی جان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

کھانا آج بھی بھابھی جان نے پکایا کرتی تھیں اور جلدی جلدی کے چکر میں وہ سالن چاولوں کے ساتھ کسی بھی قسم کے لوازمات سے گریز کرتی تھیں اور اسے اندازہ تھا کہ ابی ابو کو کتنے خاص بلکہ کتنے اس روش سے۔

"فرخندہ خالہ کو فون کر لینا اور سوتا بابا جی کے گھر ہو آنا انھیں کسی کام کے لیے ضروری بازار جانا ہے۔"

وہ جیسے ہی بستر پر آ کر لیٹی تو دادی جان نے یاد آیا سو دوہرا دیا۔

ابھی وہ کروٹ بدلنے ہی لگی تھی کہ بھابھی کی آواز آئی۔

"زارا... سوری وہ اچھا کوئی بات نہیں۔" آخری جملے کے ساتھ ان کے لہجے کی مایوسی کو اس نے بڑی طرح محسوس کیا مگر فوری طور پر نہ کہہ سکی۔ سو کر تازہ دم ہو کر اپنا پسندیدہ مسکراہٹ سب کے سامنے لانا بہتر تھا کہ جھنجلاتے ہوئے سب احکام بجا لانا۔ وہ مزے سے گہری نیند سو گئی۔ آنکھ اس کی فون کی مسلسل بجتی گھنٹی پر کھلی۔ بہت دنوں بعد اس نے ندا سے ڈھیر ساری باتیں کیں۔

"فرصت ملی نہیں اور تمہارا پہلا کام فون کا بیٹھ بھرنا۔" وہ ان جملوں کی عادی تھی جواباً چپ رہنا یا بات ٹال دینا اس کا مزاج تھا اور ایسا جب اکثر ہونے لگے تو لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ بندہ بالکل بے حس ہے، پتھر اور ڈھیٹ کسی بات کا اثر ہی نہیں۔ مگر جو لوگ کسی بات کا رد عمل ظاہر نہیں کرتے، ان کا ہمیشہ یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ محسوس بھی نہیں کرتے۔ کچھ لوگ احساس کا اظہار سے رابطہ پسند نہیں کرتے۔ کچھ اس رابطے کے قائل ہی نہیں ہوتے اور کچھ لوگوں کو اظہار کا ڈھنگ نہیں آتا۔

☆ ☆ ☆

"ابھی نیو ایئر آنے کب آئے گا؟"

"کہیں..." چائے کی پیالی چھوٹی سی میز پر رکھتے ہوئے اس شخص نے مڑ کر دیکھا تو زارا کے ہوش اڑ گئے۔

"آئی ایم سوری! اصل میں میرے بھانجے کا قد اور ہیئر اسٹائل ایسا ہی ہے۔ میں سمجھی۔"

"حیرت ہے! دیکھنے میں تو آپ بہت ڈیسنٹ لگتی ہیں اور ایسی غیر مہذب حرکت۔ کسی سے فری ہونے کا ویسے یہ نہایت گھٹیا طریقہ ہے۔" اس نے ایسا تاثر دیا جیسے واقعی کسی شدید صدمے سے گزرا ہو اور پھر کندھے اچکا کر چائے کی پیالی اٹھالی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا۔ میں نے آپ کو جان کر میرا بھانجا سمجھا۔"

"شرم کریں بھانجے کو کیوں بیچ میں لا رہی ہیں۔"

"دیکھیں جناب! میں منہ توڑ دیا کرتی ہوں ایسی باتوں پر۔ آپ ہیں کون اور اہم بات یہ کہ ہمارے گھر میں کیا کر رہے ہیں۔" غصے سے لال پیلی زارا کو کم لوگوں نے ہی دیکھا تھا مگر سعد خان کو لگا اس نے اب دیکھی ہے۔ ایک ہی شاہکار ملی۔

"او ہو تو یہ آپ کا گھر ہے۔ اس کا مطلب ہے آپ بد اخلاق بھی ہیں۔ گھر آئے مہمانوں کے ساتھ آپ یہ سلوک کرتی ہیں۔"

"میں اس سے بھی برا سلوک کر سکتی ہوں۔ اگر آپ ایک پل میں یہاں سے چلتے پھرتے نظر نہ آئے۔"

"اس کو کہتے ہیں کھسیانی بلی کھمبا نوچے۔ اگر میں آپ کے نیو ایئر کے جواب میں مسکرا کر آپ کو وش کرتا تو آپ اس وقت مجھے گرم گرم چائے کے ساتھ پکوڑے تل تل کر کھلا رہی ہوتیں۔ مگر بات یہ ہے کہ میں انگریزی کیلنڈر کا نیو ایئر منانے کا قائل نہیں ہوں اور مجھے اجنبی لوگوں سے یوں فری ہونے کی بھی قطعاً عادت نہیں۔"

اس کا دل چاہا سامنے لگے ناریل کے درخت سے بڑا سا ناریل توڑ کر اس کے سر پر دے مارے۔ حالانکہ اس

طرح غصہ برداشت کرنا اس کا ہرگز مزاج نہیں تھا۔

"آپ جاتے ہیں یا چوکیدار کو آواز دوں۔"

"شکریہ۔ مجھے باہر کا راستہ پتا ہے۔ ہاں سوچتا ہوں کہ بتا دوں گا کہ ان کے میکے میں میری کیا عزت افزائی ہوئی ہے۔" وہ ایک لمحے کو چونکی مگر اتنی آسانی سے زیر ہو جانے والوں میں سے تو وہ بھی نہیں تھی۔

"ساتھ یہ بھی بتا دیجیے گا کہ آپ ان کی بھولی اور لاڈلی بہن سے کتنی تمیز سے ملتے ہیں۔" بلا جھجک اس کے جواب پر سعد خان کو جو کنفرم لگا "لڑکی تیز ہے اور" ابھی دل ہی دل میں وہ اس کی مزید خوبیاں گننے ہی لگا تھا کہ سہیل کی آواز آئی۔

"ابھی سے کہاں چلے سعد چچا! نانا جان سے تو مل لیں، وہ بس آ رہے ہیں۔" ابو کی آمد کا سن کر وہ ایک لمحے میں وہاں سے کھسک لی اور اس سے اگلے لمحے وہ اپنا غصہ بھول بھال اس کے لیے واقعی پکوڑے تل رہی تھی ظاہر ہے اسے ابو کے پاس آئے مہمان کی خاطر داری کرنی تھی۔ بے دلی سے کرے یا دل سے کرنا تھا اور اس کا مزاج عموماً اس کے کام پر اثر انداز نہیں ہوا کرتے تھے۔

یکم جنوری کی ایک خاص اہمیت اس کے لیے یوں بھی تھی کہ اس دن اس کی سالگرہ ہوا کرتی تھی اور ستارے اس کے جو بھی کہتے ہوں اس دن اس کا ستارہ عموماً بہت جوش میں آ جایا کرتا تھا۔ صبح اس کی فون کی گھنٹی پر شروع ہوتی اور دن بھر خاص کر وہ جب دادی جان کے پاس ہی ہوتی تو میوزک ضرور بجتا۔

"یہ کیا تم میں جو راہ چلتے ہر کوئی تم سے دوستی کرنے بیٹھ جاتا ہے۔" وہ بچپن سے اسے کتنا قریب سے دیکھ رہی تھیں اور انھیں آج تک اس میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی تھی۔ کیسے آتی۔ وہ کوئی راہ چلتے اس کی دو چار باتوں یا ایک دوستانہ مسکراہٹ (جیسے لے رہی ہو، صرف تمہارے لیے ہے) سے متاثر ہوتی تھیں۔ وہ حسب عادت مسکرا کر ٹال گئی۔

"دادی جی! وہ سنبل نے کیک بھیجا ہے۔" آپ کھائیں گی؟ بہت مزے کا ہے۔"

"یہ سنبل اب تمہیں کیک بھی بھیجنے لگی، چند ڈالیوں پر کسی کا احسان نہیں لیا کرتے" یہ کوئی زمانہ ہے۔ آج کل لوگ۔"

"اف ہو دادی جی! دوست ہے وہ میری اور خود ہی اپنی خوشی سے بھیجا ہے کیک کوئی میں نے تھوڑی کہا تھا کہ بھیجو۔" جرح در جرح اس پر مسلسل اور متواتر ہمیشہ سے کی جاتی رہی تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی اس نے ان روایتوں کو برا کہنا اور جوابی بحث کرنا بھی اس کا مزاج نہیں تھا۔

مگر آہستہ آہستہ اسے شک پڑنے لگا تھا کہ اس کا مزاج بدل رہا ہے۔ وہ کوفت زدہ سی ہو کر لان کی طرف چل دی۔ اسے بالکل گمان نہیں ہوا تھا کہ سعد صاحب ابھی تک موجود ہوں گے۔

"یار! میں نے پہلے ہی بتا دیا ہے تمہاری خالہ کو کہ میں نیو ایئر وغیرہ کا قائل نہیں ہوں، پھر بھی انہوں نے یہ کیک بھیج دیا۔"

"اف! آہستہ تو بولیں سعد چچا! خالہ نے سن لیا تو قیامت آجائے گی۔ یہ نہ نیو ایئر کا کیک ہے نہ انہوں نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔ یہ تو میں پیچھے سے فریج میں سے مار لایا ہوں۔ ان کی سالگرہ کا کیک ہے۔ اور ان کی عزیز دوست نے خاص طور پر بنا کر بھیجا ہے۔ آپ میں پیش کر لیں "اس سے پہلے کہ ان کو خبر ہو۔"

"اف! تو تمہاری خالہ آج کے دن پیدا ہوئی تھیں، جب ہی میں کہوں کہ مجھے "اچھی کیوں نہیں لگیں" سعد خان نے اسے بڑے آڈے میں گھسا دیکھ لیا تھا شاید جب ہی اکتائے لہجے میں نہ زور سے بولا تھا۔

"آج کے دن میں کیا خرابی ہے بھلا؟"

"تمہیں نہیں پتا، یکم جنوری میرے لیے بہت منحوس دن ہے۔" "اس دن میری بہت پیاری چڑیا مر گئی تھی۔"

"کیا؟ چڑیا!" سہیل بہت حیرت سے چلایا اور اس کا دل چاہا اس شخص کا سر توڑ دے۔ سب کا کرنٹ میں اترائے جا رہا تھا۔ "سعید چچا! آپ اور چڑیا! کیوں مذاق کر رہے ہیں۔" سہیل چڑ کر بولا۔

"کمال ہے بھتیجے! میں اتنا سنجیدہ ہوں اور تم مذاق کہہ رہے ہو۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں، بچپن میں مجھے ایک چڑیا سے محبت بلکہ اچھا خاصا عشق ہو گیا تھا۔ مگر وہ مر گئی اور مجھے یاد ہے اس دن تاریخ بھی یکم جنوری تھی۔" … غصے میں وہ اس کا سر توڑ … تیز تیز چلتے ان کے درمیان رکھی ہوئی میز پر رکھے کیک کو جھپٹ لیا۔

"خبردار۔ جو تم نے اس کو ہاتھ بھی لگایا۔" اس نے گھورا سہیل کو اور سنایا سعد کو۔ اور پھر اسی تیزی سے پلٹ گئی۔

"خالہ! یہ زیادتی ہے اور انسلٹ بھی، چچا کیا سوچیں گے۔" چچا بیٹھے بیٹھے مزے سے ہنس رہے تھے اور وہ خالہ کے تعاقب میں دوڑا گیا تھا۔

"اور تم نے یہ خیال نہ کیا کہ خالہ کیا سوچیں گی، وہ میری سالگرہ کے کیک پر اپنی چہیتی چڑیا کا فاتحہ پڑھ رہے تھے اور پھر تمہیں بچانے طور … کچن کے جانب اپنے کمرے میں گھس گئی۔

"ارے اس موئے کیک کے لیے تم بچے سے خفا ہو گئیں، پلی پلی تمہیں دوست کی دی ہوئی چیز عزیز ہے۔ یا بچہ۔"

"یہ عزیز اور غیر عزیز کا معاملہ کب ہے، یہ تو صرف غصہ ہے۔" وہ چاہتے ہوئے دادی جان سے چھپا نہ سکی جو شدید قسم کا غصہ اسے "کبھی کبھی" آتا تھا اور یہ کبھی کبھی کا بھی رائیگاں جائے تو جو وحشت ہوتی ہے اس کی وضاحت ممکن نہیں۔

* * *

"دی پلیز! وہ میری بہت اچھی دوست ہے۔" صبح سے وہ کئی بار ان سے رفعت کی شادی میں جانے کا پوچھ چکی تھی اور ہر بار انہوں نے جواباً سوال ہی کیا تھا۔

"جانا بہت ضروری ہے کیا؟" ایک تو اس کا اپنا حلقہ احباب بہت وسیع تھا اور اپنی طرف سے کسی بھی دعوت وغیرہ میں جانا بلکہ جانے سے پہلے کا مرحلہ خاصا طویل اور صبر آزما ہوا کرتا تھا۔ امی کو ساری ہسٹری بتانا، جانے کا مقصد اور نہ جانے کی قباحتیں سمجھانا۔ یہ سب تو جائز تھا، وہ سکون سے بتا کر انہیں مطمئن کر دیتی اور ان کے قائل ہو جانے کی حد یہ جملہ ہوتا۔

"اپنے ابو کو بتا دینا۔" وہ اپنی طرف سے پروگرام کا مکمل اور لوڈی پوائنٹ خلاصہ کرتی۔ اور ابو جان کے گوش گزار کر دیتی۔ وہ عموماً "سر ہلا دیتے۔ لیکن وہ پلٹ کر چار قدم کا فاصلہ طے کر کے دروازے سے باہر نہ ہو پاتی کہ انہیں اپنی ماں یاد آ جاتیں۔

"اپنی دادی کو بتا دیا ہے نا بیٹا۔" کبھی کبھی اس کا دل کرتا ابو جان اثبات میں اتنا سر ہلائیں کہ وہ ان کے سامنے سے چھو ہو جائے کہ وہ ہلکا سا ابو دے کر جو اپنی ماں کو یاد کرتے ہیں، وہ جملہ بلکہ جملہ کیا ذمہ داری اس کے کانوں میں نہ پڑتا ہے کہ یہ ذمہ داری جاتے سے تک اس کی اچھی خاصی آزمائش کرواتی۔

"یہ کون سی دوست ہے تمہاری جسے میں نے آج تک نہیں دیکھا؟"

"کالج میں پڑھتی ہے میرے ساتھ دادی۔"

"مگر گھر تو کبھی نہیں آئی۔"

"کالج میں جو مل لیتے ہیں روزانہ!" وہ اپنے وارڈ روب سے ایک جوڑا نکالتی ایک رکھتی کم از کم ان کو انٹرویو کے ابتدا میں ہی جتا تو دیتی کہ اس نے بہر حال جانے کا ارادہ کر لیا ہے۔

"تو کالج میں مبارک باد دے لینا۔"

"شادی اس کی ہال میں ہو گی کالج میں نہیں، دادی جان۔!"

"وہ اصل کام تو یہی ہوتا ہے نا بیٹا! مبارک باد دینا۔"

بیگ وجانے کے کڑھائی والے وائٹ کرتے اور پنک ہی شلوار دوپٹے پر مطمئن ہو کر اس نے استری بھی کرنا شروع کر دی۔

"بیکار ہی ہے یوں غیر لوگوں میں چلے جانا، نہ جان نہ پہچان۔"

"دادی جی! ہم چار سال سے ایک ساتھ پڑھ رہے ہیں۔" مکمل سائز دوپٹہ استری کر کے اس نے ان کے سامنے پلنگ پر پھیلا دیا۔

"مرضی ہے تمہاری! ہم تو سالوں سے بیسیوں لڑکیوں کے ساتھ ہوں، سب کی شادیوں میں جاؤ گی کیا؟"

"سب لڑکیوں سے میری دوستی نہیں، دادی جی۔" وہ الماری سے تولیہ لے کر باتھ روم میں گھس گئی۔

"عمر سے پوچھ لیا اور بہو کو بتا دیا؟" نماز ختم کر بال پونچھتی جب وہ نکلی تو انہوں نے تھک کر مایوسی سے پوچھا۔

ہمیشہ وہ اسے مکمل طور پر زچ کرنے کے بعد آخر کار یہی پوچھا کرتیں اور ان کا اثبات میں اتنا سر دیکھ کر بے چین ہو جاتیں "اور جاؤ گی کیسے؟"

"ایک اور مرحلہ! یہ ہمیشہ سے یونہی تھا۔" اس کے عشق کے امتحان کبھی ختم ہونے میں نہ آتے تھے۔

"وقار بھائی کب آئیں گے بھابھی؟" شام کی چائے ابو امی، دادی جی سب کو چھوڑ کر وہ بھابھی کے ساتھ پی رہی تھی کہ ان کی وضاحتوں اور تفصیلات کا سلسلہ لمبا ہو چلا گیا تھا۔

"وقار کا کیا! عفت تو آج سے نہیں۔ ہاں شاید چچی کے ہاں جانے کا ارادہ کر رہے تھے پتا نہیں۔" پھر ایک گھونٹ چائے کا۔ ایک خستہ نمکین بسکٹ سے … اور وہ خود صبر کے گھونٹ لیتے ہوئے چائے کا گھونٹ لینا بھول جاتی۔

"یہ بھی تو کہہ رہے تھے کہ اگر کہیں جانے کا پروگرام بنا تو فون کر دوں گا۔ اب تو میرے خیال سے سیدھا گھر ہی آئیں گے۔" ان کی عادت تھی ہر گھونٹ پانی کی ضرورت ہوئی، وہ پورے سمندر کی سیر کروا دیا کرتی تھیں۔

"تمہیں کہیں جانا ہے کیا؟" یہ خبر صبح سے اتنی ہزار بار بتا چکی تھی کہ شاید دیواروں کو از بر ہو گئی تھی۔ مگر اس وقت وہ کسی دیوار کے آگے نہیں۔ اپنی اکلوتی چہیتی بھابھی کے سامنے بیٹھی تھی۔

"جی وہ رفعت کی شادی میں جانا ہے نا، وہ جو پچھلے ہفتے اس کی خالہ کارڈ دینے آئی تھیں۔"

"ارے ہاں۔ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا۔ کتنے بجے جانا ہے؟ تم نے صبح نہیں کہا۔ اب فون کروں گی انہیں تو غصہ کریں گے۔" وہ سکون سے ذرا سی چائے پی چکی تو تبدیل پالی تھی۔ ہر جملے کے اختتام پر وہ اسے لتاڑ رہی تھیں۔ وہ اپنی بے نیازی قطعاً ظاہر نہیں کر رہی تھی۔ مگر پھر بھی وہ مزہ لے رہی تھیں۔ ظاہر ہے کرتی تو کیا ہوا۔ بے قرار تو وہ ہو جاتی تھی۔ یہ ایک تھرو نکالا اس حرکت سے ایک جذباتی انسان کی نفسیات سے کھیلنے میں مزا بہرحال بہت آتا ہے۔

"ٹھیک ہے۔ میں فون کر کے دیکھتی ہوں۔"

چائے کی پیالی اور بسکٹ کی پلیٹ صاف کر کے انہوں نے بمشکل اوکے کہا۔ کرسی گھسکا کر وہ بھی اٹھنے لگی تو انہیں پھر کچھ یاد آیا۔

"مگر تمہیں جانا کس طرف ہے۔ مجھے فائزہ باجی سے سوٹ لینے جانا تھا پھر۔"

"کون سا سوٹ؟" اب کے اسے جھنجلانا چاہیے تھا مگر وہ سکون سے پوچھ رہی تھی۔

"کل میلاد میں پہننا ہے فائزہ باجی کے ہاں۔ چلو چھوڑو کچھ اور پہن لوں گی۔ تم اپنی تیاری کرو۔" نہ وہ احسان فراموش تھی۔ نہ احسان نہ ماننے والوں میں سے۔ مگر بھائی کی چھوٹے سے چھوٹے کام کی نوک پلک سنوار کر اسے جتانے کی عادت تھی۔ سو یوں وہ اپنے اکلوتے بھائی کو گھنٹہ دو گھنٹہ کے لیے مستعار لینے کے قابل ہو گئی۔

ویسے یہ نہایت مزے کی بات تھی اور سارے خاندان کے لیے وہ نہایت معتبر اور اونچے درجے والی شخصیت تھی، جس کی سفارش ہر جگہ چلتی تھی، اور جس کے نام پر بڑے بڑے لوگ بڑے بڑے کام نکلوا لیا کرتے۔ "زارا آنٹی" "زارا خالہ" اور "چھوٹی خالہ" کے نام کا سکہ نئی نسل تو ہر جا بے دریغ استعمال کرتی۔ روی پکنک پر جا رہی ہے۔ بڑی آپا سے اجازت چھوٹی خالہ لیں گی۔ سفینہ کو لال کرین بنارسی ساڑھی کا بری طرح شوق آگیا ہے۔ عظمیٰ باجی سے سفارش زارا خالہ کریں گی۔ سہیل کے سب دوست پاکستان ٹور پر جا رہے ہیں موٹا

باجی نے تو اگرچہ ان کے میاں اسلم بھائی کو بھی قائل کر لیا تھا ہی کر رکھی تھی۔ اور تو اور سارا آپی کے سات سالہ علی کو ویڈیو گیم لینے کا بھوت چڑھا تو اپنا مشن چھوٹی خالہ سے پورا کیا جس نے سامنے آپی پر اثر کیا اور علی کی مراد بر آئی۔ مگر یہ تو کچھ نہیں تھا۔ ساری بہنیں اور بھائی تک کے مشکل اور ٹیڑھے کاموں کا بیڑہ اٹھا پن زارا بی بی کے سر کے صدقے دور ہوتا۔

"زارا! تو بات کرنا ابو سے میرے شیئرز انگلش کروں۔ امتیاز کو بہت ضرورت ہے پیسوں کی۔" عظمیٰ باجی اٹھتے کھاتے بیٹے گھرانے کی بہو تھیں۔ مگر ان کے خاندان کا خاندان فضول خرچ تھا۔

"بڑا اچھا رشتہ ہے یہ" گیا ہوا جو زاوری کے لوگ نہیں، مجھے پتا ہے بیسا خوش رہے گی۔ مگر امی جان کو کون قائل کرے! زارا! تم کہہ کر دیکھو۔" بڑی آپا کی دو ہی بیٹیاں تھیں مگر انہیں وداع کرنے کا شوق ان کے پیدا ہوتے ہی لگ گیا تھا۔

"شو زارا! ابو سے ان کاغذات پر سائن کروا لینا پلیز۔" وقار بھائی دفتر جاتے جاتے بالائی کی کلام کرتے دیکھتے جلدی جلدی [illegible] یہ جا دو جا۔ باقی لان رو گیا۔ ابھی جان سے وہ بھی زارا کی "صرف آپ کے لیے" قسم کی طبیعت سے ہر طرح فائدہ اٹھانا جانتی تھیں۔

"ریحانہ باجی کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں میرے ساتھ شاپنگ پر چلو۔ اب میں انہیں منع تو نہیں کر سکتی۔ وقار آ گئے ہیں تم انہیں بتا دینا اور ہاں سنو ذرا ڈھنگ سے کہنا اس طرح کہ وہ ناراض نہ ہوں۔"

اور اس کے کہنے کا ڈھنگ ہی تو تھا جو اسے ہر جگہ سامنے لے آتا تھا۔ ہر کوئی اس کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلاتا اور خوب چلاتا کہ نشانہ ہرگز خطا نہ جاتا تھا کہ اس کے شانے بھی بہت مضبوط تھے اور اس کے قدم بھی کبھی لڑکھڑاتے نہ تھے۔ اصل میں ہوتا یہ ہے (یہ بھی ایک محسوس حقیقت ہے کہ کم کم ہوتا ہے مگر پھر بھی۔) کہ کچھ لوگ دوسروں کے لیے بڑی بڑی جنگیں لڑ لیتے ہیں مگر جہاں اپنی ذات کا قصہ چھڑتا ہے۔

لیں سر جھکا کر جاں بن جاتے ہیں کہ جو بوجھ اٹھائے ہوں ان کا بھی خواہ مخواہ دل کرتا ہے کہ ان کی راہ میں روڑے اٹکائیں۔

☆ ☆ ☆

"زہے نصیب آج تم نے مجھے فون کیسے کیا؟" اپنے ہیلو کے جواب میں اسے ندا سے اسی قسم کے جملے کی توقع تھی۔

"ایسے ہی دل کر رہا تھا تم سے گپ شپ کرنے کا۔"

"چندا! ایسے ہی تو تم نے آج تک مجھے فون نہیں کیا۔"

"بلاوجہ فون تمہیں ندا کر سکتی ہے مگر تم ندا تو نہیں ہو۔ کیا بات ہے؟"

"نہیں سچ۔ ایسے ہی بور ہو رہی تھی تو سوچا تم سے بات کر لوں۔"

"خیریت بھی آج سورج کہاں سے نکلا ہے۔ زارا عمر کو بور ہونے کا وقت بھلا کیسے مل گیا۔"

"دیکھو تمہیں [illegible] ہے تو میں فون رکھ رہی ہوں [illegible] کسی رانگ نمبر پر بات کر لوں۔"

"نہیں ڈیئر مجھے پتا ہے۔ تم رانگ نمبرز کو افورڈ نہیں کر سکتیں۔ تم تو پراپر (proper) نمبرز کو بھی ڈھنگ سے نپٹا نہیں سکتیں۔"

"کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو دوست! میں رانگ نمبرز کو ہرگز افورڈ نہیں کر سکتی۔" وہ حیران ہوئی۔ زارا نے اس کی کبھی کسی بات کی تصدیق بھی ——— کی تھی، حالانکہ یہ اس کا ہمیشہ کا شکوہ تھا بلکہ اس کا کیا سارے زمانے کا تھا۔

"مگر کبھی کبھی کوئی رانگ نمبر لگ جاتا ہے تو بار بار ڈائل ہونے لگتا ہے۔"

"ہیں۔ ایکسکیوز می میڈم کیا کہا آپ نے؟"

"ایسے ہی ایک عام سی بات کر رہی ہوں۔"

"کیوں آج" "ایسے ہی" "سب کچھ کیوں کہہ رہی ہو؟"

"دیکھو! دادی جی بلا رہی ہیں۔ اب میں چلتی ہوں۔" اس نے کھٹ سے فون رکھ دیا۔

آج دادی جان کا بلاوا اس کے لیے جان چھوٹنے کا بہانہ بن گیا تھا مگر اسے پتا تھا۔ ابھی کچھ دیر بعد پھر گھنٹی بجے گی اور وہ کہہ رہی ہو گی "سچ کیا ہوا ہے؟" اور وہ اسے کیا بتائے گی۔ کیا کچھ بتا پائے گی؟ یہ کہ آج اس دن وہ ڈھنگ سے سو نہیں پائی۔ اس کا دماغ کہیں اور رہتا ہے۔ جسم کہیں اور، اور فون کی ہر گھنٹی پر اس کے دل کی دھڑکن اس قدر تیز ہو جاتی ہے گزرنے لگتی ہے جس سے کبھی نہ گزری تھی۔ کچھ تو ضرور تھا۔ لہجے کی کوئی کرامت یا لفظوں میں کوئی سحر شاید جذبے میں کوئی سچ کوئی اثر ضرور ہو۔

"جب تلاش ختم ہو جاتی ہے تو بندے کا دل کرتا ہے ایک طویل گہری نیند سو جائے۔ سکون کی اس حد کو چھونے کی خواہش ہونے لگتی ہے جو انسان جیسی پیاری صفت مخلوق کا نصیب نہیں۔"

ان جملوں کی بازگشت مسلسل اس کے کانوں میں ہوتی رہتی تھی اور ان کے پیچھے دوڑ نہیں کبھی دہرا نہیں سکتی تھی۔ بھلا یہ سب بیان کرنا ممکن ہے جو صرف محسوس ہو سکتا ہے۔ کیسے بتائے کہ بجھنے لگتے ہیں؟ تنہائی میں آوازیں تعاقب کرتی ہیں اور اندھیرے میں سائے دوڑنے لگتے ہیں۔ وہ کیسے کہہ سکتی ہے کہ اس کے خواب سراب ہونے لگے ہیں۔ وہ یعنی زارا عمر جو پہلے ہی تعلقات کے ایک مضبوط دائرے میں گھری ہوئی ہے۔ اتنے ڈھیروں چاہنے والے اور ان کی امیدوں کا محور۔ مگر زارا عمر جس کا اپنا کوئی محور نہیں اور اس کی اتنی مجال بھی نہیں کہ وہ اپنا مرکز تلاش بھی کرے تو پھر وہ کیا کر سکتی ہے؟ یہی سوالیہ نشان تھا، جس نے اسے ندا کے آگے زبان کھولنے پر مجبور کیا تھا۔

"غالباً یہ سہیل کے وہی شعر چاہتی نہیں، جنہیں تم وہ منتقے بچپنے ہی جمع کر کر صلواتیں سنا رہی تھیں۔"

ہاں اس نے تو غور ہی نہیں کیا تھا کہ ایک واقعہ

ملاقات میں اس نے اس شخص سے بہت برا سلوک کیا تھا۔" فون پر تم اس سے بات کیسے کرلیتی ہو؟ ورنہ پھر تو ایکسٹینشن لگے ہوئے ہیں تمہارے گھر میں۔"

"کوشش کرتی ہوں کہ بھابھی کے کمرے سے بات کروں اور جب ابو گھر میں نہ ہوں تو۔"

"آئی ایم سوری زارا! مگر مجھے کچھ پسند نہیں آرہی تمہاری حرکت۔ اگر تمہارے گھر میں کسی کو ذرا سا شبہ بھی ہوگیا تو تمہیں پتا تو ہوگا کہ قیامت کسے کہتے ہیں۔"

ابھی اس نے دل کی خوشگوار دھڑکنوں کو چھو کر محسوس بھی نہیں کیا تھا کہ خدشوں کی زنجیریں پاؤں پکڑنے لگیں۔ اسے ندا کی سچائی کچھ اچھی نہیں لگ رہی تھی مگر وہ جانتی تھی کہ وہی ایک رہنما ہوتی اگر کبھی وہ بھٹکنے لگی تو ان کا تعلق اتنا مضبوط تھا کہ وہ دامن جھٹک کر گزرنے کے بجائے اسے ہاتھ بڑھا کر دلدل سے کھینچ لے اور یہ کیسا ستم تھا۔

وہ جانتے بوجھتے کہ راستہ غلط ہے اس پر چل نکلی تھی۔

ہاں، یہ حضرت انسان ہی تو ہے جو شعور بھی رکھتا ہے اور بھٹکتا بھی ہے اور انسانی زندگی کے کئی ہزار پہلو ایسے بھی ہیں۔ جو بیان کیے جائیں تو لطیفہ لگیں۔ اور محسوس کیے جائیں۔ تو ٹھوس حقیقت۔

پہلے دو چار دن کے وقفے سے فون پر بات ہوتی تھی، پھر ہر دوسرے روز ہونے لگی اور اب روزانہ۔ ایک مخصوص وقت پر وہ گھڑی کی ٹک ٹک اپنے دل پر محسوس کرنے لگتی۔ ادھر گھنٹی بجتی اور ادھر اس کا متردد ذہن گھر کے ہر فرد کے بارے میں کہاں ہے، کیا کر رہا ہے کے اندازے لگانا شروع کر دیتا۔ دادی جان اپنے وظیفوں میں مشغول ہوتی ہیں۔ امی جان سوگئی ہیں، بھابھی جان کتاب یا رسالے میں بری طرح غرق ہیں۔ اور وہ خود اتنی بہادر ہوگئی ہے کہ چوری کر رہی ہے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو رہی تو اطمینان کا سانس لینی ممکن ہو جاتی۔

"میں اگر آج مونا بھابھی سے تمہارا ذکر کروں تو وہ ہرگز انکار نہیں کریں گی مگر۔" بیسیوں بار وہ اس "مگر" پر آکر اٹکا تھا اور وہ اس سے وضاحت نہ مانگ پائی تھی۔

"اس سے پوچھا یا کہ اس "مگر" کے آگے کون سی دنیا ہے۔" ندا جھنجلا کر کہہ رہی تھی۔ مگر وہ پوچھ نہ پائی۔ آج اس نے یہاں تک کہا تھا کہ۔

"ایک الجھن ہے میں تمہیں تفصیل سے بتاؤں گا اسے ذرا خود سلجھانے کی کوشش کرلوں۔"

"پھر اس سے کہو روز فون کر کر کے سر نہ کھایا کرے جب مسئلہ حل ہو جائے تو ڈھنگ سے بات کرے۔" مصیبت یہ تھی کہ وہ ندا کے کہے جملے بے دھڑک ادھر منتقل نہ کرپاتی۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ بلا کا باتونی تھا اور حاضر جوابی میں یہ بھی اپنی کوئی مثال نہیں رکھتی تھی، پھر فون پر باتیں کرنا تو اس کا دیرینہ مشغلہ تھا۔ جب سلسلہ چلا تو وقت گزرنے کا پتا بھی نہ چلتا۔ اور یہ بھی درست تھا کہ سعد خان نے کبھی کوئی غیر شائستہ یا بے تکی بات نہ کی تھی، بے باک ضرور تھا مگر بے غیرت نہیں تھا۔

خاندان کا فرد تھا اس لیے اسے خاندان کی تہذیب و روایت کا بڑا پاس تھا۔ مگر زارا کے گھر کی تہذیب و روایات، اچھی خاصی کڑی تھیں۔ وہ ابھی ہلکی ضرور رہی تھی مگر ندا کو اتنا بھی یقین تھا کہ جب وقت پڑا تو سنبھلے بھی گی اپنے کو خود کو بھی تمہیں دوسروں کو بھی سنبھال لے۔ جو وہ اسے لگ بھی گا ہے ٹوک ضرور رہی تھی مگر روک نہیں رہی تھی کہ اپنوں انسانوں کی اس دنیا میں اپنی پسند کی شخصیت پر انگلی رکھنے کا حق۔ بہرحال وہ بھی رکھتی تھی۔

ڈاکٹرز ہمیشہ سے اس کی کمزوری رہے تھے اور سعد خان تو امریکہ سے ایف آر سی ایس کرکے آیا تھا اور بھری دنیا میں ندا شاید واحد ہستی تھی جس کے سامنے اس نے اظہار کیا تھا۔ اس دن جب کالج کے زمانے میں فری پیریڈ میں وہ دونوں خواتین کے ایک رسالے میں کسی خاتون فنکارہ کے انٹرویو کی ٹانگ توڑ رہی تھیں۔

"یہ دیکھو کتنا مزے کا سوال ہے۔ آپ کیسے مرد سے شادی کرنا پسند کریں گی؟" جواب ہے، "ڈاکٹر سے۔" ندا کی بات کاٹ کر اس نے کھٹ سے کہا تھا اس نے دیر تک اس کے مسکراتے مگر سنجیدہ چہرہ کو دیکھا تھا اور پھر کہا تھا۔

"چلو میں آج رات بارہ بجے کر تین مصلے پر چلہ کاٹوں گی کہ ایک عدد ڈاکٹر میری پیاری سہیلی کے نصیب میں لکھ دیا جائے۔" اب یوں تھا کہ ایک عدد ڈاکٹر اس کی سہیلی کی راہ میں تو آگیا تھا نصیب میں تھا کہ نہیں اس کے لیے وہ اب بھی صرف دعا ہی کر سکتی تھی۔

اصل میں کبھی کبھی ہوتا یوں ہے کہ گہرے اندھیرے میں کہیں کوئی جگنو نظر آجائے تو بندہ اسے پکڑنے کے لیے دوڑ پڑتا ہے اور اگر ہاتھ آجائے تو پھر خوف سے رونے لگتا ہے۔ اور وہ بھی ابھی دوڑ رہی تھی۔ فطرت انسان کو کبھی بہادر بناتی ہے اور کبھی بزدل بھی۔

"مسئلہ تم کو بولتی ہوئی بہت اچھی لگتی ہو۔" بہت جوش میں اسے عرفی کی سالگرہ کا قصہ سناتے ہوئے وہ چپ ہوگئی۔

"اچھا۔ اب جا رہی ہوں۔ امی بلا رہی ہیں۔" تعریف کا سلسلہ زیادہ چلے تو بس نہ پائے گی۔

"ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ امی سو رہی ہیں۔" سعد خان اس موڈ میں تھوڑی دیر اور کھویا رہنا چاہتا تھا مگر وہ اس سلسلے سے ہمیشہ کترا جاتی تھی۔

"اور لڑکیاں تو اپنی تعریف پر ساتویں آسمان پر پہنچ جایا کرتی ہیں۔"

"میں بھی لڑکی ہوں، اور میں بھی ساتویں آسمان تک ہی پہنچ جایا کرتی ہوں۔ مگر کیا کروں، مجھے نظریں نیچی رکھنے کی بھی عادت ہے اور آسمان کے نیچے زمین ہی ہوتی ہے نا۔"

"نظریں نیچی رکھنے کی عادت ہے تو مجھے کیسے دیکھ لیا۔"

"احسان مانیں کہ رک کر دیکھ لیا۔ ورنہ ہم اس مزاج کے بندے تھے نہیں۔"

"مان لیتے ہیں۔ مگر اس قدر بھی نہ منوائیے گا کہ چھت کا سعد خان پھر کبھی سر اٹھا کر بھی نہ دیکھ پائے۔"

"آپ کو ضرورت بھی کیا ہے سر اٹھانے کی۔"

"آپ کو دیکھنے کے لیے تو اٹھانا پڑے گا۔"

مونا باجی کی نند کی منگنی تھی۔ اسے جانے کا شوق ہو رہا تھا مگر اس نے شوق کا اظہار قطعاً نہیں کیا۔ کہ وہ منگنی شادی کی دعوتوں میں جانے کے نام سے ہمیشہ چڑا کرتی تھی۔ سو آج بھی اسے چڑنا اور نخرے کرنا لازمی تھا۔ پہلے وہ نخرہ نہیں کرتی تھی، اسے حقیقتاً دعوتوں وغیرہ میں جانے کے نام سے وحشت ہوا کرتی تھی مگر آج وہ دکھا رہی تھی، اور کچھ زیادہ ہی دکھا گئی۔ نتیجہ تو اسے پتا تھا۔ پہلے وہ اس نتیجے پر جلا کڑھا کرتی تھی آج اطمینان سے اس نے سفید موتیوں کے کام والا فیروزی کرتا شلوار پہنا۔ فیروزے کی بالیاں کانوں میں ڈال کر اور شفون کا بڑا سا دوپٹہ کندھوں پر پھیلا کر اس نے ایک نظر آئینے میں جھانکا۔ یہ سنتے ہیں کہ بندے کا شوق کبھی نہ کبھی تاوان ضرور ہوتا ہے۔

"آج تو بڑا اچھا جوڑا نکال کر پہنا ہے۔ شکر ہے تمہیں بھی کچھ عقل آئی۔ اب اس کا دامن تھامے رکھنا، چھوڑ نہ دینا۔" وہ خود کیا تجزیہ کرتی، دادی جان کا کہنا بہت تھا۔ اس نے پھر آئینے میں نہیں جھانکا۔

"سہیل! تم اب مجھے گھر پہنچا دو۔ دادی جی بالکل اکیلی ہیں۔ وہ سوگئیں نا کہیں۔ اور مجھے اب پریشانی ہو رہی ہے۔" سب کا خیال وہ ہمیشہ اسی طرح کیا کرتی تھی، اس لیے بھنانے کے بعد ہی اس نے سہیل کا سر کھانا شروع کر دیا تھا۔

"ٹھیک ہے خالہ! بس ابھی چلتے ہیں۔" پتا نہیں اس نے کیمرہ کس کو پکڑایا اور گاڑی کی چابی کس سے لی۔ وہ جب پلٹ کر آیا تو وہ چپ چاپ اس کے پیچھے چل پڑی۔ ابھی وہ گاڑی میں بیٹھی ہی تھی کہ پیچھے سے پھر کسی نے آہستہ سے بلا لیا۔

"چلیں خدا آپ کا محافظ۔" اس نے سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔ اس کا ایک منٹ کئی منٹوں کو ضرب دے کر بنا تھا، لیکن واپس لگتے ہی منٹ گاڑی کا دروازہ کھلا اور پھر انجن اسٹارٹ ہو گیا۔

"آپ۔۔۔؟ میرا مطلب ہے سہیل کہاں ہے؟" گاڑی گیئر میں ڈالتے اور تیزی سے اسٹیئرنگ گھماتے سعد خان کو وہ کیسے روک سکتی تھی۔

"اسے موٹا بھابھی نے روک لیا ہے، بہت کام ہیں۔" آرام سے گاڑی پارکنگ سے نکال کر وہ ہال کے گیٹ کے باہر لے گیا۔

"کاش آپ بھی تو رک سکتے تھے، مجھے چھوڑنے کے لیے اسے ہی جانا چاہیے تھا اگر نہیں تو پھر کچھ دیر اور رک جاتی۔"

"اوہ کا کیا مطلب ہے تمہارا۔ اس نے مجھے خود چابی دی ہے گاڑی کی۔"

"وہ تو بے وقوف ہے۔ کیا آپ بھی۔"

"ہاں میں بھی بے وقوف ہوں بلکہ پاگل ہوں اگر کوئی اعتراض ہو تو ابھی بتا دو۔"

"آپ سمجھ نہیں رہے سعد! کسی کو پتا لگ گیا تو آپ جانتے تو ہوں گے قیامت کسے کہتے ہیں۔"

آج پہلی بار اس نے عزا کی کوئی بات اس کے سامنے دہرائی تھی کیونکہ قیامت کسے کہتے ہیں کہ تشریح اس پر خود آج ہی سوار ہو رہی تھی۔ اکثر خوف آدمی کے اندر ہی اگتے ہیں اور اسے وحشت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے اپنے اندر چور بیٹھا ہے۔ جب ہی تو ڈر رہی تھی، ورنہ کم از کم موٹا بھابھی تو جانتی ہی ہوں گی کہ سہیل نہیں تو کون اسے چھوڑنے گیا ہے اور رات کے اندھیرے میں خاموش سڑک پر دوڑتی گاڑی میں جس شخص کے برابر بیٹھی وہ ظاہر میں تنگ اور اندر سے خشک ہو رہی تھی، وہ ایسا بے اعتبار بھی نہیں تھا۔

"یار! کبھی تو آدمی کو اپنی سمجھ کو چھٹی دے دینی چاہیے۔"

"پلیز! آپ سیدھے راستے سے چلیں۔" اس نے دیکھا وہ خواہ مخواہ میں راستہ لمبا کر رہا ہے۔

"دیکھو، مان لیتا ہوں کہ میں نے سہیل سے خود چابی مانگی ہے اور بے فکر رہو اس کے سوا کسی کو خبر نہیں اور میں تمہیں آرام سے گھر کے گیٹ کے باہر چھوڑ دوں گا۔ دادی جان کو کیا پتا چلے گا کہ تم کس کے ساتھ آئی ہو۔"

"میں اس طرح کی چوریوں کی قطعاً قائل نہیں سعد خان۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"میں بھی اس کا قائل نہیں، مگر تم سوچو تم میرے ہاتھ کس طرح آسکتی تھیں۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔" وہ چپ چاپ اندھیری سڑک کو دیکھتی رہی۔

"یار! اس طرح منہ بنا کر بیٹھی رہیں تو میں تم سے کیا بات کر سکوں گا بھلا۔ اور سوچو یہ سفر تو کتنا تھوڑا ہے ابھی ختم ہو جائے گا۔" وہ اب بھی کچھ بولی نہیں، ہاں ہلکی سی گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"خیر رہنے دو۔ اگر میں نے تمہارے تیوروں کی پروا کی تو وہ بات جس کو کہنے کے لیے میں نے یہ سفر مول لیا ہے وہ رہ جائے گی۔ بات تو فون پر بھی ہو جاتی، سامنے بیٹھ کر شاید بات کی حقیقت بھی سمجھ میں آجائے۔"

"ایسی کیا بات ہے جس کے لیے اتنی تمہید اور ایسی صورتحال بنانی پڑ گئی۔"

"اس دن میں سہیل سے یکم جنوری کے بارے میں جو کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ تم نے سنا تھا؟" اس نے موڑ مڑتے ہوئے ایک نظر اس کی طرف دیکھا، وہ حیران تھی، مگر اس کے چہرے پر بھی ثبت تھا۔ "اور تم نے ہرگز یقین نہیں کیا تھا۔"

"حد ہو گئی اس فضول سی بات کی بھی وضاحت کرنی تھی کیا۔" اس نے قدرے برہمی سے نفی میں سر ہلاتے سوچا۔

"اور میں کہوں کہ یقین کر لو پھر بھی نہیں کرو گی؟"

"اس ڈھکوسلے پر یقین کر لوں، یہ بات آتی کیا آپ کو۔" وہ مکمل خفگی سے بولی۔

"ورنہ کبھی کبھی ان بیکار سی منطقوں میں بھی کچھ حقیقت ہوتی ہے زارا! اور جن لوگوں کی زندگی میں ان کی حقیقت ہوتی ہے ان کی شخصیت میں کہیں نہ کہیں جھول رہ جاتا ہے۔

میں امریکی یونیورسٹی سے ڈگری یافتہ نوجوان یقین کرو کہ بچپن میں ایک چڑیا کے عشق میں مبتلا ہوا تھا اور اس طرح ہوا تھا کہ اس کے مرنے کا دن مجھے آج تک نہیں بھولا۔ اس دن میں اتنا رویا اور پھر اتنا بیمار ہوا کہ دنوں بستر سے نہیں اٹھ سکا اور آج بھی جب یکم جنوری کا سورج طلوع ہوتا ہے تو میں "جل تو جلال تو" کا ورد کرنا شروع کر دیتا ہوں، سارا دن مجھ پر ایک انجانا سا خوف سوار رہتا ہے کہ آج کچھ نہ کچھ ہو گا ضرور اور کئی بار یہ خوف درست ثابت ہوا ہے۔ کئی بار۔"

وہ ہلکی شفاف سڑک پر بہت آہستگی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔

"تمہیں پتا ہے میرے پاپا کا ایکسیڈنٹ اسی دن ہوا تھا۔ جس کے نتیجے میں ان کی ایک ٹانگ کٹ گئی تھی۔ میرا چھوٹا بھائی فہد اسی دن فوت ہوا تھا، میری بہن ثوبیہ اور کرن جس نے میرے ساتھ ایم بی اے کیا ہے، ڈاکٹر رشنا۔ کو طلاق بھی اسی دن ہوئی۔ پچھلے سال اسی دن ہمارے گھر میں چوری ہوئی تھی اور اس سال بھی میری نئی ٹیوٹا تمہارے گھر سے واپسی پر چوری ہو گئی تھی۔"

زارا کو یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ اتنا بظاہر باشعور شخص اتنا احمق بھی ہو سکتا ہے "لیکن یہ سچ ہے کہ ہر انسان پڑھا لکھا ہو کر ان پڑھ جاہل، اس کی زندگی کا کوئی نہ کوئی احمقانہ پہلو ہوتا ضرور ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی کبھی یہ پہلو بندے کی فطری کمزوری کے سبب عیاں ہو جاتا ہے، اور کبھی کوئی اپنی اندرونی طاقت سے اس پر غالب آجاتا ہے۔"

"آپ کے خیال میں اگر یکم جنوری کا سورج طلوع نہ ہوا کرے تو آپ کی زندگی میں جتنے نقصان ہوئے ہیں وہ نہ ہوتے۔"

"یہ اور ایسی بیسیوں دلیلیں میں ایک زمانے سے سنتا آرہا ہوں، لیکن محض دلیلیں کبھی کسی وہم کا علاج نہیں ہوا کرتیں۔"

نیپا چورنگی سے دائیں مڑا تو اس نے ... لیکن اس نے دیکھا کہ اس نے بہت دیر کے بعد بالکل موڑ پر پہنچ کر انڈیکیٹر دیا تھا، جیسے دور تک چلتے رہنے کے ارادے کو اچانک ملتوی کر دیا ہو۔ اس نے بہرحال سکھ کا سانس لیا۔ (راستہ لمبا کرنے کے چکر میں ہی ایسا نہ ہو کہ پیچھے آنے والے اس سے پہلے گھر پہنچ جائیں۔)

"تو پھر آپ کے خیال میں اس کا کوئی علاج ہے تو ڈھنگ سے کریں، آپ تو خود ڈاکٹر ہیں۔"

"وہم کا علاج کون کر سکتا ہے بھلا۔"

"کوئی بھی ماہر نفسیات یا پھر۔۔۔" گاڑی سفید لوہے کے گیٹ کے آگے ہی پہنچ گئی تھی۔ گھر کے سامنے پہنچ کر وہ بات پوری کرنا بھول گئی۔ اس نے ظاہر گو نہیں کیا تھا، لیکن پورا راستہ وہ خوف زدہ رہی تھی "کوئی دیکھ نہ لے" کے آسیب میں جکڑی رہی تھی، سو وہ فوراً دروازہ کھول کر دوڑ جانا چاہتی تھی۔

"یا پھر؟" اس نے پیچھے سے بہت مضبوط آواز میں اسے پکارا۔ یہ طے تھا کہ اس کا لہجہ ہمیشہ ایسا ہی مضبوط اور پر یقین ہوا کرتا تھا کہ اگلا بندہ ہوں ہاں کر کے ٹالنے کا مجاز نہیں ہو سکتا تھا، لیکن وہ بھی زارا عمر تھی کاکا کبھی ہوتی ہو، اعصاب اس کے بھی اتنی آسانی سے اس کا ساتھ نہیں چھوڑتے تھے۔

"یا پھر کوئی محبت کرنے والا۔" اس کا جوابی لہجہ بھی اتنا ہی پراعتماد تھا۔ اگلے لمحے وہ گاڑی سے نکل کر گھر کی طرف بڑھ گئی۔

* * *

"رات تم سعد کے ساتھ اکیلی گھر چلی گئیں۔ وہ رشتہ دار ضرور ہے اور بے شک اچھا لڑکا ہے، مگر تمہیں پتا ہے آپا ایسی باتوں پر بہت خفا ہوا کرتی ہیں۔"

"افسوس آپا! میں نے تو سہیل سے کہا تھا کہ چھوڑ آؤ۔ اور آرہا ہوں، آرہا ہوں، کرتے کرتے اس نے اپنے چچا کو بھیج دیا تو میرا کیا قصور۔" یوں تھا کہ نہ اس نے کوئی ڈیٹ ماری تھی نہ کوئی غلط حرکت کی تھی۔ مگر جانے کیا تھا کہ اندر کی بے چینی نہیں جا رہی تھی، ساری

رات تو وہ جانے کس عفریت سے چپٹی رہی گھڑی بھر
کو نہ سو سکی۔ اور ایسے میں اگر کوئی ٹوک دے تو
شرمندگی چڑ میں بدل جاتی ہے۔

"میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ احتیاط اچھی چیز ہوتی
ہے۔ سیل تو بچہ ہے مگر تم کو تو عقل ہونی چاہیے نا۔
اچھا خیر اب کوشش کرنا کہ امی اور دادی جان کو ہوا نہ
لگے ورنہ تمہیں تو خبر ہے وہ قیامت سے کم کوئی معاملہ
نہیں کریں گی۔" حد ہو گئی جس کو دیکھو قیامت کو یاد
کر رہا ہے آخر ایسی کیا بات کر دی ہے میں نے۔" سارا
دن وہ جھنجھلائی رہی۔ فون کی بجتی گھنٹی پر بھی کان بند
کر لیے۔ رات آٹھ بجے تک یہ میوزک وقفے وقفے
سے بجتا رہا اور وہ بھی مسلسل شکوہ کرتی رہیں۔ کہ
فون کرنے والے کو میری آواز قطعی پسند نہیں
آرہی۔ بے چارا ہر بار میرے "ہیلو" کے جواب میں
مایوس ہو کر فون رکھ دیتا ہے۔" وہ بغیر کوئی دلچسپی لیے
ان کے لطیفے یا طنز کو ان سنی کرتی رہی۔ ویسے بھی فون
کے معاملے میں ہر شکایت امی سے منسوب کی جاتی
تھی کہ وہ "بیچارا" کہہ کر وہ اس گمنام فون کی صنف بھی
جتا چکی تھیں۔

"سعد زارا انہیں نے آج تک اپنے اس وہم کو کسی
کے ساتھ شیئر نہیں کیا سوائے رشنا کے "میرے گھر
والے بھی اس قصے کو یاد ضرور کرتے ہیں لیکن صرف
ایک مذاق کے طور پر۔ کوئی نہیں جانتا کہ ہر نئے سال کا
پہلا دن میں کس اذیت میں گزارا کرتا ہوں۔ کیا تم
جاننے کے بعد مجھ سی ہو زارا اس اذیت کو کس میں
میں مبتلا ہوں۔ یہ جان کر کہ تم یکم جنوری کو پیدا ہوئی
تھیں۔"

کبھی آپ یقین اور بے یقینی کے دوراہے پر اس
طرح کھڑے ہوئے ہیں؟ وہ سوچ رہی تھی "کیا واقعی
اتنی فضول سی بات کسی کی زندگی پر اس طرح محیط
ہو سکتی ہے" اور جب اسے کوئی سرا نہ ملا تو اس نے خدا
کو یاد کیا۔ کچھ لوگ اتنی طاقت رکھتے ہیں جو ہمیں
وقت کے کسی ایسے لمحے میں جس میں ہم پھنس کر رہ
گئے ہوں۔ اس سے نکال سکتے ہیں تو اس کا نمبر
ڈائل کرتے ہوئے اچانک اسے یاد آیا کہ وہ ایک ہفتے
کے لیے لاہور گئی ہوئی ہے اپنے ماموں کی شادی پر۔

"اوہ خدا۔ ابھی کل صبح ہی تو اس نے فون کر کے خدا
حافظ کہا تھا" اور وہ چوبیس گھنٹوں میں اتنی اہم بات
بھول گئی۔" اور۔ صبح سے لے کر اب تک وہ کتنی
معمولی باتیں بھول رہی تھی" دادی اماں کے لیے دودھ
میں چینی ڈالنا یاد نہ رہی۔ اور امی جان کو اس نے میٹھی
چائے پلا دی۔ یہ تو عرصہ ہوا پھیکی پی جانے کا ذائقہ ہی
بھول گئی تھیں۔ جب ہی تو بولی تھیں۔

"بیٹا! یہ آج چائے اتنی عجیب سی کیوں لگ رہی
ہے۔"

"وہ امی انہیں تو بھول ہی گئی۔" پھیکی چائے کا مگ
کچن میں ہی پڑا رہ گیا تھا۔ اور تو اور وہ سر کو اس نے حد
درجہ خطرناک غلطی کر ڈالی تھی۔ امی صبح سے کئی بار
کہہ چکی تھیں کہ عظمی باجی کو فون کر کے پوچھے ان کی
طبیعت کیسی ہے؟ انہیں دو دن سے بخار آ رہا تھا۔ کھانا
کھا کر وہ بھی کمرے میں آ گئی "نمبر ڈائل کر کے
پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب آ گئے ہیں؟" اور جواب میں عظمی
باجی ہکا بکا پوچھ رہی ہیں۔ "تم نے کس کا نمبر ملایا ہے
زارا؟" وہ ایک پل میں ہوش کی دنیا میں لوٹ آئی۔

"کیا یہ ڈاکٹر توقیر کا کلینک نہیں؟" اپنی ہمت سے اپنا
لہجہ اور اپنا انداز چھپانا آسان نہیں تھا۔ مگر اس نے
بھرپور وثوق سے انہیں غلط فہمی کا یقین دلایا۔ اور ان
کے منہ سے سوری رانگ نمبر سنتے ہی ریسیور رکھ دیا۔
دوسرے ہی منٹ گھنٹی بجی۔

"تم نے ابھی کسی کو فون کیا زارا؟"

"نہیں کس کو۔ ہم تو ابھی کھانا کھا رہے تھے۔" عظمی
باجی جوش میں جلدی آجاتی تھیں۔ مگر ان کا دھیان
ہٹانا اور ان کو ٹالنا آسان کام تھا۔ صد شکر۔ اگر وہ یہ
حرکت مونا باجی کے ساتھ کرتی تو وہ کبھی بھی اتنی آسانی
سے نہ ٹلتیں۔

یہ سب کیا ہو رہا تھا اس کے ساتھ؟ وہ غور کرنے
سے کترا رہی تھی۔ ہاں آج دوسرا دن بھی گزر گیا۔ فون

کی گھنٹی نہیں بجی تھی۔ تیسرے دن اس نے مکمل
حاضر دماغی کا ثبوت دیا۔ ابھی بھی چوبیس گھنٹوں کا ایک
دن بھی کٹھن امتحان لگتا ہے۔ کرنا ہی ہوتا ہے۔ روز
مرہ کے کام اکثر ایسے کام جن کا جسم اس قدر عادی ہوتا
ہے کہ کبھی کبھی دماغ کی ہدایت کے بغیر ہی قدم اٹھ
جاتے ہیں۔ ہاتھ چلنے لگتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ
ہے کہ یہ ہر گز ٹھیک نہیں۔ جو دماغ حکم نہ دے تو آدمی
قدم چھوڑ آنکھ بھی نہ اٹھا سکے ہاتھ چھوڑ انگلی بھی نہ
ہلا سکے۔ اس لیے ہر معمولی اور ہر بڑے کام کے لیے
حاضر دماغی شرط ہے۔ اور زارا عمر بہر حال اتنی ارزاں
نہیں تھی کہ اتنی آسانی سے کسی بھی ایسی راہ پر خود
کو کھو آئے۔

"سعد میں اگر مر جاؤں تو تمہیں اندازہ" کتنے دنوں
تک خبر نہ ہو گی ہے کہ میرے سوئم کا زردہ اور فاتحہ تو
جس کر رہی دو۔" اسے حیرت ضرور ہوا کرتی تھی کہ سعد
خان اس سے کبھی شکوہ نہیں کرتا تھا "آج کر ہی ڈالا۔
اور یہ شکوہ اس کے لیے ہر گز نیا نہیں تھا۔ اس سے
محبت کرنے والے [illegible] مشترکہ سوچ
کی کہ وہ ان کی سنتے ہیں اور ضرور ہے کہ کسی کا مرنا
جینا اس کے لیے کوئی اہم بات نہ تھی۔ شاید اس لیے
کہ اس نے آج تک "ہائے اللہ! یہ کیا کہہ رہے ہیں
آپ۔" کہہ کر منہ پر ہاتھ نہیں رکھا تھا۔ وہ چپ چاپ
اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا کرتی تھی مگر اس کی کسی کو کیا
خبر۔

"بڑی بات ہے مگر آپ کو بتا دوں کہ زردہ
میری پسندیدہ ترین سویٹ ڈش ہے۔"

"یار! پلیز تو جب میرا دل چاہتا ہے۔ میں تم سے
بات کر لیتا ہوں۔ مگر کبھی کبھی بات کرنے کو دل کرتا ہے
تو خواہش ہوتی ہے کہ سلسلہ دوسری طرف سے
چلے۔"

"سعد! آپ کو پتا ہے۔ میں اتنی آسانی سے آپ کو
فون نہیں کر سکتی۔"

"کبھی کبھی کسی کے لیے مشکل میں بھی پڑ جانا
چاہیے۔"

"مجبوری تو اتنی مشکل میں ہوں مزید مشکلات میں
پڑنے کا کیسے سوچ سکتا ہے۔"

"کچھ مشکلات کو برتنے میں مزا ملتا ہے۔"

"مزے کی تاثیر بہت جلد خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔
اور مشکلات کی تلخی کو خود اپنی انگلیوں کی پوروں سے
کھرچ کر مٹانا پڑتا ہے۔" اس کا لہجہ مایوس ہوتے ہوتے
اب تلخ ہو چلا تھا۔

"کیا بات ہے آج بہت تلخ ہو رہی ہو کہیں کوئی گڑ
بڑ ہو گئی ہے کیا؟"

"جو گڑ بڑ کا بانی ہو وہ خود آپ سے پوچھے کہ "کیا ہوا
ہے؟" تو برداشت کی جس حد سے پٹخا رہتا ہے۔ اسی
سے بھی شفٹ کر دیکھیے۔ زندگی کا ایک جلتا ہوا پہلو نظر
میں آ جائے گا۔"

سعد خان نے ایک بار بھی جاننے کی کوشش یا
خواہش نہیں کی تھی۔ کہ اس دن کی ملاقات یا پھر اس
کی باتوں نے اس پر کیا اثر کیا تھا۔ وہ تو خود جیسے اپنی
الجھن کا بوجھ اس کے کندھوں پر ڈال کر ہلکا ہو گیا تھا۔

اور وہ۔ حقیقت میں تو وہ اب تک بیچ راہ میں کھڑی
پیچھے چھوڑ کر آنے والے اور آگے کو جانے والے
راستوں کی طوالت کو ناپنے میں لگی ہوئی تھی یوں ہوتا
ہی ہے جب بندہ آنکھ بند کر کے کسی راستے پر چل
پڑے اور پھر اچانک کسی ٹھوکر سے آنکھ کھل جائے تو
گھپ اندھیرا اور لمبا سفر نظر میں آ جاتا ہے۔ ابتدا تو
شادمانی میں ہو جاتی ہے جب کوئی خوشبو دامن میں بس ہو
تو ایسے ہی بندہ تھوڑی دیر کو آنکھیں موند کر مدہوش
ہو جاتا ہے لیکن انتہا اس کی ہوتی ہے ایک مسلسل اذیت
کی ابتدا ہوتی ہے ٹھیک ہے جب انتہا کی ہے تو اس
سے دور کیا بھاگنا۔ ایک "دو" تین دن اسے مشکل لگا
لیکن اب وہ مسلسل بجتی فون کی گھنٹیوں کو سکون سے
نظر انداز کر سکتی تھی۔ یہ راستہ ہی ایسا ہے جو اس کو
چھوئے اسے شدید جھٹکا لگتا ہے اور پھر ایک برقی لہر
تمام عمر جسم میں سرسراتی رہتی ہے۔ یہ تو تمہیں
پتا ہے؟ کچھ لوگوں کو چھو کر لگتا ہے کہ ان پر ایک کپکپی
سی طاری ہے ہاں مگر ساری انگلیاں ایسی مہیا نہیں

ہوتیں کہ اس کرنٹ کو محسوس کر سکیں اور سارے
لوگ زارا عمر جیسے مضبوط نہیں ہوتے کہ جس راہ پر
آنکھیں بند کر کے بڑھ گئے ہوں۔ اسی پر ہی باہوش
وحواس پیٹھ موڑ کر چلنے لگیں۔

"میں دوڑ سکتی ہوں ساری عمر پیچھے کی طرف' اس
سراب سے کبھی نہ بھی نکل تو دور ہو جاؤں گی۔" اس
نے بہت وثوق سے ندا سے کہا۔ اور ندا کو بھی اس بات
پہ ہرگز شک نہ تھا۔

"ٹھیک ہے لیکن تم ایک بار اس سے بات تو کرلو'
صرف اس پروپوزل کا ذکر کر دو اس سے' جس پر کچھ
دنوں میں تمہارے گھر والے بالآخر متفق ہو جائیں
گے۔ ہو سکتا ہے وہ۔"

"مت الجھاؤ مجھے بہتر ہو سکتا ہے۔" کے تصور میں
دو ہستیاں میں کبھی بھی اس بات میں پہل نہیں کر سکتی۔
جس کا اظہار سعد خان کو خود پہلے کرنا چاہیے تھا جو
مجھے خود نہ مانگے میں اسے اپنی پیش کش کیسے کر سکتی
ہوں۔"

"وہ اچھا ہوا ہے یار' یہ ذرا سی بات شاید اس کے
لیے آسانی کر دے۔" اس نے چائے کا گھونٹ لینے
کے لیے پیالی منہ تک لے جاتے ہوئے واپس رکھ
دی۔

"وہ مرد ہو کر ذرا سی الجھن سے نہیں لڑ سکتا تو میں
کیوں اس کی خاطر اپنی زندگی میں مزید الجھنیں پیدا
کروں۔"

عظمیٰ باجی کے پڑوس میں رہنے والے کرنل
صاحب بہت دنوں سے اپنے صاحبزادے کے لیے
عظمیٰ باجی اور شکیل بھائی سے کہہ رہے تھے اور اب
باقاعدہ پروپوزل بھیجا تھا۔ وہ سن رہی تھی' دیکھ رہی
تھی اور جو کچھ ہو رہا تھا اسے بھی سمجھ رہی تھی لیکن
اسے پتا تھا۔ وہ کچھ کرے گی نہیں۔ وہ کچھ کر بھی نہیں
سکتی تھی تکیے میں منہ دے کر رونا اسے نہیں آتا تھا۔
اور اپنی مشکل کسی اور کو سمجھانا اس کا شیوہ نہیں تھا'
کسی کسی پر تو آدمی کو یہ مان ہوتا ہے کہ وہ اس کی مشکل
سمجھے گا۔ اگر وہی نہ سمجھے تو پانی ڈالو کہ مٹی دونوں میں کھڑی
رہی ویسے ہی۔

☆☆☆

"زارا خالہ پلیز امی کو منائیں۔ مجھے نائلہ کی شادی
میں ایک دن اس کے ہاں رہنے کی اجازت دے دیں۔"
رداس کا حلقہ احباب وسیع تھا اور آنے جانے کے
معاملے میں اجازت دینے کے لیے بڑی آپا کا نظریہ
تنگ۔ وہ فون پر بڑی آپا کو منا رہی تھی اور اندر کمرے سے
عظمیٰ باجی کی آواز اس کے کانوں میں با آسانی پڑ رہی
تھی۔

"کیوں جان' زارا سے پوچھ کر کیا کرنا ہے۔ آپ اپنی
مرضی بتائیں' اس کی بھلا کیا رائے ہوگی۔ وہ بہرحال ہم
سے چھوٹی ہے۔ ہماری ہی بات سنے گی۔"

"میں کہہ رہی ہوں ناں آپا! آپ میری بات تو کبھی
نہیں ٹالتیں۔ جانتی ہیں اسے' نائلہ بہت اچھی لڑکی
ہے اور اس کے گھر والے بھی بڑے ڈیسنٹ لوگ
ہیں میں مل چکی ہوں ان سے" پیشانی پر آئے بالوں کو
انگلیوں سے پیچھے کرتے مسکراتے ہوئے بولی آپا
سے کہا۔ [illegible]
زارا عمر کی رائے مقدم تھی اگر وہ کسی کو اچھا کہہ رہی
تھی تو وہ یقیناً اچھا ہوگا۔ بڑی آپا نے اجازت دے
دی۔ اور اس کی یہی رائے جو اس کے سارے چاہنے
والوں کے لیے بڑی محترم و مقدم تھی' اس کی اپنی
زندگی کے اہم ترین موڑ پر اس قابل بھی نہ ٹھہری کہ
کوئی رک کر اس پر ایک نگاہ غلط انداز ہی ڈال لے' اس
نے بھی محسوس کرنا چھوڑ دیا۔

"چندا! تم کسی سے کچھ کہہ کر تو دیکھو۔ سارا آپی
سے تو تمہاری بڑی انڈراسٹینڈنگ ہے۔"

"جس معاملے میں مجھ سے کچھ پوچھا ہی نہ
جائے میں اس میں بے کار میں ٹانگ کیوں اڑاؤں۔"

وہ آج بہت دنوں بعد ندا کے اصرار پر لائبریری آئی
تھی۔ گریجویشن تک وہ دونوں اکثر یہاں پڑھنے کے
لیے آیا کرتی تھیں۔

"چاہے وہ تمہاری زندگی کا معاملہ ہی کیوں نہ ہو؟"

اس معاملے میں تم صرف ٹانگ نہیں پوری کی پوری
اڑ سکتی ہو۔" لائبریری کی چیئر میں پر کونے میں دو موٹی
موٹی کتابیں رکھے بیٹھی ندا کو اس نے پورا گھوم کر سر
سے پیر تک دیکھا۔

"آئی ڈونٹ بلیو اٹ۔ یہ تم کہہ رہی ہو ندا۔ اتنا خالص
مشورہ! تم جو مجھے کئی دنوں سے ہوش دلانے کو ہزاروں
دلیلیں دیتی آ رہی ہو۔ اب ہوش میں آئی ہوں تو کہہ
رہی ہو کہ اڑ جاؤں۔ مگر کس بات پر اڑ جاؤں کس
برتے پر اڑ جاؤں اور کس کے لیے؟"

"تمہارے خیال میں تم ہوش میں آگئی ہو؟ اور میرا
خیال ہے کہ یہ جو تھوڑے بہت تمہارے حواس
تمہارے ساتھ ہیں ناں' وہ بھی چند دنوں میں تمہارا
ساتھ چھوڑنے والے ہیں۔ بھلا چاہو' تمہیں یہ بھی خبر
نہیں کہ دو دن ہوئے سعد خان کا پروپوزل تمہارے
گھر پہنچ چکا ہے۔"

"نہیں۔ کب؟ کیسے؟ مجھے تو کسی نے بتایا ہی
نہیں۔" وہ تو اس طرف سے اس کا ہر دیا بجھا کر مکمل
اندھیرے میں تھی۔ اور ندا کہہ رہی کہ چراغ نے خود
چل کر اس کے در پر دستک دی ہے۔ وہ واقعی ہوش میں
نہیں تھی۔

"تم پتا کرنے کی کوشش کرو تو کوئی تمہیں بتائے بھی۔
جبکہ وہ تمہیں بتانے کی کوشش میں بلاناغہ ٹیلیفون کے
ڈائل پر اپنی انگلیاں گھستا رہتا ہے' تم نے سننا ہی
چھوڑ دیا ہے۔" اسے لگ رہا تھا کہ اس کی سمجھ میں
کچھ بھی نہیں آ رہا۔ مگر بہرحال کچھ بھی سمجھنے کی
کوشش وہ ندا کے سامنے ہی کر سکتی تھی۔

"ویسے یار تم کب سے سعد خان کے معاملے
میں sincere (مخلص) کیسے ہو گئی ہو۔" پہلی بات تو
یہی تھی جو اس کی عقل میں نہیں آ رہی تھی۔

"زارا عمر! تم جس معاملے میں ہوش و حواس سے
جاؤ گی میں اس میں مخلص کیسے نہ ہوں ویسے سعد خان
نے مجھے فون کیا تھا اور رشنا جو اس کی کزن اور واقعی
اچھی دوست بھی ہے اس سے بھی میری اچھی خاصی
بات ہو چکی ہے اور بقول اس کے کچھ الجھنیں ایسی
ہوتی ہیں' ذہن میں عورت مرد کی کوئی تخصیص نہیں
ہوتی۔ دنیا میں بھی ایک ایسی ہی تیاری ہے۔ اگر تم وہ واحد
شخصیت ہو جس کے حصول کے لیے وہ اپنی ہر الجھن
سے لڑ رہا ہے مگر ابھی پھنسا ہوا ہے دلدل میں۔ تمہیں
ہاتھ بڑھا کر اسے کھینچنا ہوگا۔" وہ ندا کی ایک ایک بات
بالکل بہت غور سے سن رہی تھی یا بالکل نہیں سن رہی
تھی۔ مگر اس کے چہرے کے تاثرات تیور دیکھ کر اسے
بولتے ہوئے رکنا پڑا۔

"تم نے اس سے ذکر کیا تھا کرنل صاحب کے بیٹے
کا؟ اور سعد خان نے تمہیں فون نہیں کیا بلکہ تم نے
اسے۔" ابھی چند لمحوں پہلے اس کی بات سمجھ میں نہیں
آ رہی تھی۔ مگر اب جو کچھ آ رہا تھا قیامت تھا۔ یقین تھا۔

"ہاں۔ میں نے اسے فون کیا تھا مگر۔"

"ندا! میں تمہیں اس بات کے لیے کبھی بھی
معاف نہیں کروں گی۔ تم نے میرا مان توڑا ہے۔" وہ
بیگ کاندھے پر ڈال کر ایک جھٹکے سے اٹھی اور دو
تین قدم ایک ساتھ پھلانگنے لگی۔

"زارا! سنو تو۔" وہ پیچھے سے آوازیں دیتی رہی تھی
مگر جانتی تھی کہ اگر زارا نہ سننا چاہے تو قیامت کا شور
بھی اٹھے تو اس کے کان پر جوں نہ رینگے گی۔ اس کے
پیچھے دوڑنا بھی بے سود تھا وہ سامنے سے گزرتی بس کو
ہاتھ دے کر اس میں سوار ہو گئی تھی۔

☆☆☆

آج پھر سارے بہن بھائی شام کی چائے کے بعد ابو
کے کمرے میں جمع تھے۔

"ٹھیک ہے ابو آپا کے رشتے پر بھی غور کرنا چاہتے
ہیں تو میں کرنل صاحب کی بیگم سے کہہ دوں کہ وہ
ایک ہفتہ ٹھہر جائیں لیکن بہرحال انکار تو ہمیں انہیں
کرنا نہیں ہے۔" جانے آج اس نے کان کھڑے
کر لیے تھے یا آوازیں خود ہی اس کے تعاقب میں
تھیں۔ باہر لان میں ٹہلتے ہوئے پچھلی کھڑکی سے سب
باتیں اس کے کان میں پڑ رہی تھیں۔ عظمیٰ باجی حسب
عادت سب سے پہلے جوش میں آئی تھیں۔

"خیر انکار، اقرار کا فیصلہ تو ابھی ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔ سعد خان بھی کوئی معمولی چیز نہیں ہے کہ اسے آسانی سے نظر انداز کیا جا سکے۔ ابو جی آپ مل تو چکے ہیں اس سے۔"

وقار بھائی کا لہجہ ہمیشہ بارعب ہوا کرتا تھا۔ بات کرتے تو لگتا فیصلہ دے رہے ہیں، لیکن وہ فیصلے اتنی آسانی سے نہیں دیا کرتے تھے۔ البتہ لوگوں سے ان کا فیصلہ اگلوانے میں اچھے خاصے ماہر تھے۔ وہ ٹھنڈے مزاج شخص یہ بحث سنتی رہی تو کوئی سرا ہاتھ نہ لگا۔ بحث وہیں تھی۔ جہاں سے چلی تھی اور اسے احساس ہو رہا تھا کہ جتنا چلے گی، الجھتی جائے گی۔ اور سرا ان مباحث کا بھی نہیں مل رہا تھا جو اس کے اندر چل رہے تھے۔ وہ سوچنے بیٹھتی تو خیالات کی یلغار اسے بہت حد تک بے حال کر ڈالتی۔ اچھا خاصا اس نے سب چھوڑ چھاڑ (حتیٰ کہ احساس بھی) بیٹھ رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا کہ ندا کی دوستانہ ہمدردی نے اسے پھر کھولا کر رکھ دیا اور چوبیس گھنٹے کے بعد بھی اس کے غصے کا وہی عالم تھا۔ جب وہ اس کے ہاں آئی۔ ایک بار اس کا دل چاہا منہ پھیر کر چلی جائے لیکن وہ اس کے گھر آئی تھی، یہاں اس سے منہ پھیر کر وہ کہاں جا سکتی تھی۔

"اگر کل تم دو منٹ اور سکون سے بیٹھ کر میری بات سن لیتیں تو یہ جو پورا دن جل بھن کر کوئلہ ہو گئی ہو اس کی نوبت نہ آتی۔"

اس کی امی اور دادی جان سے سلام دعا کر کے خیر خیریت پوچھ کر وہ کتنی دیر تک اس کے کمرے میں بیٹھی دادی جان کے پسندیدہ موضوعات یعنی وہی "زمانہ خراب ہے" اور نئی نسل کی بے راہ روی اور ہوڑی کو بہت دل لگا کر سنتی رہی تھی۔ پہلے کتنی دیر تک وہ الماری میں سر دیے کچھ کر لینے کی ناکام کوشش کرتی رہی اور پھر باتھ روم میں گھس پانی سے کھیلنے لگی تھی۔

"ٹھنڈا ٹھنڈا لگ رہا ہوگا۔ ہے ناں۔" پانچ منٹ بعد اس نے اندر جھانک کر اسے ٹوکا تھا۔ بہت غصے میں (کچھ نہ کرتا) اور صرف نظر آتا اس کا چہرہ پڑھنا... بالآخر جب اس کے لیے چائے بنانے کچن میں گھسی تو ندا نے کہہ ہی ڈالا۔ وہ بھری بیٹھی کھولتی چائے کو دیکھتی رہی۔

"ساری دنیا میں تم شور مچاتی پھرتی ہو کہ اعتماد ہر رشتے کی بنیاد ہے مگر تم خود ایک فیصد بھی اس اصول پر پوری نہیں اتر سکیں۔ غصہ مجھے تم پر کرنا چاہیے۔ تم نے کس طرح سوچا اور مسلسل سوچے جا رہی ہو کہ میں ندا علی یعنی تمہاری دوست کوئی ایسی بات کر سکتی ہوں۔ جو تمہارے وقار کو مجروح کرے۔ مجھے کوئی شوق نہیں ہے 'شیو بڑھائے ہیرو اور روتی سسکتی ہیروئن کو ملوانے' کا۔ آئی سمجھ۔ میں نے تو فون کر کے تمہارے ہیرو صاحب سے صرف اتنا کہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اگر آپ کا جذبہ اتنا طاقتور نہیں ہے کہ آپ کی ایک الجھن کو قابو میں کر سکے تو آپ اسے اپنے دل کے اندر کہیں دفن کر کے رکھ دیں۔ اور میری دوست کو پریشان کرنا چھوڑ دیں۔" چائے کا کپ اس کے آگے رکھ کر وہ خود کھڑی ہی رہی تھی۔ بہت دیر بعد وہ کچھ بول سکی۔

"آئی ایم سوری ندا لگتا ہے میرا دماغ الجھا ہوا ہے۔"

"لو سوری! احمق تمہیں بھی پتا ہے مجھے اس لفظ سے چڑ ہے۔ ہاں جب تمہارا دماغ ذرا سلجھ جائے تو غور کرنا کہ اگر میں تم سے کہوں کہ تم نے میرا مان توڑا ہے تو۔"

فون کی گھنٹی اسی وقت بجی۔ اس نے بہت دنوں بعد ویسی ہی احتیاط سمیت فون اٹھایا۔

"دیکھو بغیر قصور کے کسی کو سزا دینا زیادتی کی انتہا ہے۔"

"آپ کو کوئی ضروری بات کہنی ہے کیا؟"

"اس وقت تو تم بولو اور میں سنتا ہوں۔ یہی اہم ترین بات ہے۔"

"ٹھیک ہے پھر فون رکھ رہی ہوں۔"

"زارا کیا کسی قسم کی کوئی آس بھی نہیں دلاؤ گی؟"

"بھلا میرے ہاتھ میں کیا ہے جو آس اور امید کی بات کروں۔"

"چاہتیں یہ تحفے بھی ہے پاس نہیں۔ بہرحال میرا خیال ہے کہ صرف تم ہی میری الجھن کو مجھ سے بہتر طریقے سے سمجھ سکتی ہو۔ اور یہ بھی میرا ہی خیال ہے کہ اس کا حل صرف تمہارے ہاتھ میں ہے۔" وہ اس بات پر بھی کھل کر ہنسنا چاہ رہی تھی مگر اگلی طرف سے فون بند ہو چکا تھا۔ اس نے سر اٹھایا تو ندا سامنے ہی بیٹھی تھی۔

"اس نے کل رات رشنا سے کہا تھا کہ اس سلسلے کے اچھے انجام کی اسے ہرگز توقع نہیں مگر میں نے رشنا سے کہا کہ اس کا خیال بالکل غلط ہے۔ تم بتاؤ کون ٹھیک ہے؟" اس نے حد درجہ مضحکہ خیز قہقہہ لگا کر اسے دیکھا۔

"میں جو نہ تمہیں پتا ہے۔ نہ تم جو میں۔ میں بھلا کیا بتا سکتی ہوں۔" وہ واقعی کچھ نہ بتا سکتی تھی۔ ہر روز محفل جمتی، ہر روز مذاکرات ہوتے۔ "آج اس کو فون کر کے اس سے پوچھا جا رہا ہے 'کل فلاں کے گھر جا کر اس سے پوچھ لینے کا مشورہ' ابو جی، وقار بھائی کو دے رہے ہوتے، حتیٰ کہ جمعہ کی رات بڑے ماموں، خالہ، تایا، تائی سب ان کے گھر کے ٹی وی لاؤنج میں سر جوڑے بیٹھ گئے۔ ضرورت تھی ایک عدد 'رائے' کی سو جو اس قابل سمجھا گیا اسے بلا لیا گیا۔ مگر نتیجہ۔

"دن پہ دن گزر رہے ہیں۔ عمر اتم سے ایک ذرا سا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔" دادی جان نے ٹوک ہی دیا آج سارے بہن بھائی، ابو، امی سمیت اس کے کمرے میں دادی جان کے گرد ڈیرا ڈالے بیٹھے ہوئے تھے۔

"دادی جان! آپ ذرا سا کہہ رہی ہیں، مجھے تو دن سوجھ رہا ہے نہ رات۔ ایک ڈاکٹر ہے تو دوسرا انجینئر۔ اس کا اعلیٰ خاندان تو اس کا بہترین سیٹ۔ یہ خوبرو تو وہ اسمارٹ، اس کو باکردار کہا جا رہا ہے تو اس کو شریف۔ اب کیا کروں؟

"میرا تو خیال ہے ابو جی! سکہ اچھال لیتے ہیں جس کا ہوگی وہ جیتے گا۔" وقار بھائی نے کچھ جھنجھلا کر کہا تو ابو جی اور دادی جان سمیت سب ہنسنے لگے۔

اور اپنے کمرے کی کھڑکی کے نیچے لان کے دائیں طرف بیٹھی زارا عمر کا دل چاہا کہ گھٹنوں میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے اتنا اچھا کہ سارے خاندان سے سر ٹکرا آئے۔ کسی ایک کو بھی اس کا خیال نہیں آ رہا ہے۔ اتنے لوگوں میں کوئی بھی نہیں سوچ رہا کہ پیچھے دیوار سے لگی بیٹھی زارا عمر ایک عاقل و بالغ اور پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ مگر اقرار یا انکار میں گردن ہلانے کا شعور ضرور رکھتی ہے۔ اور شریعت میں بھی کہیں نہیں لکھا ہوا کہ یوں اس کی زندگی کا سلسلہ چلنے اور اسے دیوار کے پیچھے بٹھا چھوڑ دیا جائے۔ کیا کسی کو اس کا واقعی خیال نہیں آیا؟

بڑی آپا جو اپنی بیٹیوں کے رشتوں کے لیے پہلے اس سے مشورہ لیتیں، عظمیٰ باجی جو اس کے ہر معاملے میں اپنے آپ کو حد درجہ حساس ثابت کرتیں، موٹا پاجی جو شاید اپنے دیور کے دل کے حال سے واقف نہیں۔ سارہ آپی جنہیں گھر میں اس کا بہترین ہمدرد رازداں ہونے کا دعویٰ تھا، اور وقار بھائی اور بھابھی جن کے بیشتر مسئلے اور الجھنیں اس نے ان کے بغیر کسی خاموشی سے شیئر کیے تھے۔ اور شاید ندا کو نہ دادی جان ان لوگوں کو بھی نہیں۔ ہاں کسی کو احساس نہیں اس کی ذات کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس کی بھی کوئی مرضی ہو سکتی ہے۔ اگر (تائی) پڑھی لکھی ہے تو اس کا ووٹ بھی کوئی قانونی حیثیت رکھتا ہے۔

"مسئلہ اچھائیوں کے ٹکراؤ" زارا عمر کا منہ کھول کر نہیں دیکھیں گے کہ اس میں بھی زبان ہے۔ "اس کے دل پر ہاتھ رکھ کر نہیں محسوس کریں گے کہ یہ بھی دھڑکتا ہے۔" وہ ریسیور کان سے لگائے کمرے کے کنارے کی دیوار سے لگی کھڑی تھی۔

"تو تم کیوں منہ کھول کے اپنی زبان کو زحمت کلام نہیں دے دیتیں۔" ندا اس سارے سلسلے سے حد درجہ بیزار ہو گئی تھی۔

"بھئی۔ تم دیوار کے پیچھے سر جھکائے بیٹھی رہو گی تو کسی کو کیا خاک نظر آؤ گی۔ سامنے آؤ اور لوگوں کو اپنے ہونے کا احساس دلاؤ۔" وہ روز اس کو ایک ہی مشورہ دے رہی تھی۔

"کیا کروں؟ لوگوں کے کندھے پکڑ کر ان سے کہوں کہ سنو میں بھی تو ہوں۔"

"ہاں تو کیا حرج ہے اگر اسی طرح اپنا آپ منوا لو۔"

"یہ بھی ممکن نہیں کہ میں اس طرح اپنا آپ ان لوگوں کو محسوس کرواؤں جنہیں میں اپنی ذات کا حصہ سمجھتی ہوں۔"

"اور آج اگر اس ذرا سی بات کو تم نے ناک کا مسئلہ بنا لیا تو ساری عمر خود اپنے آپ کو محسوس کرنے سے بھی گھبراتی رہو گی۔ ایک بار زارا عمر ایک بار چند لفظ چند جملے بول جاؤ۔"

کسی بندے کے سامنے، جس پر تمہیں بہت مان بھی ہو اور جس کے بارے میں تمہارا خیال ہو کہ وہ تمہارا بھرم بھی قائم رکھے گا۔ وہ کیا کہے کہ مان تو اسے سب پر تھا بھرم تو اس نے بھی ہمیشہ ہر کسی کا رکھا تھا مگر۔

"دیکھو، سعد خان اگر ناکام ہوا تو مر تو نہیں جائے گا مگر ابھی یوں ہے کہ اس کی زندگی میں ایک الجھن ہے، پھر یہ الجھن اس کی زندگی ہو گی۔" تب اسے فون رکھ دیا تھا مگر وہ کتنی دیر تک ریسیور تھامے بیٹھی رہی تھی۔ وہ سب کی باتیں سمجھتی ہے، محسوس کر سکتی ہے اور اس کی ایک ذرا سی بات ہے صرف یہ تمنا تھی کہ بن کہے بنا ظاہر ہوئے اس کی بات رہ جائے۔ ایسا ہوتا ہے ناں جب آپ الجھ الجھ کر پاگل ہو رہے ہوں۔ اور ایک ہی چار دیواری میں رہنے والے آپ سے اونچ دو انچ کے فاصلے پر چلنے والے آپ کے برابر بیٹھے ہوئے، آپ سے باتیں کرتے ہوئے، آپ کے ساتھ کام کرتے ہوئے، تو وہ پھر آپ کی کیفیت کو محسوس نہ کر سکیں۔

ندا کی باتوں کا اس پر اثر تھا سو آج سارا دن وہ اسی جستجو میں رہی کہ ایک ایسے جملے کو ترتیب دے لے۔ چند لفظ ایسے جوڑ کر کسی سے کہہ دے، دادی جان کو کھانا دیتے ہوئے وہ کئی بیکار سی باتیں بول گئی۔ مگر ان سے کچھ کہا۔

"میں تو پہلے ہی کہتی تھی، یہ فلمیں وی سی آر دیکھ دیکھ کر آج کی نسل کے بیٹوں کا پانی بالکل مر گیا ہے۔

ویسے لڑکیاں بھی ابھی اپنے بیاہ کی باتیں ... بے شرم ہو گئی ہیں۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر ... ذہن کو جھٹکنے لگی۔ امی جان کو دوا دی کے پاس سے آ کے کچن کی فہرست بناتے ہوئے اور ابا جی یہاں سے خالہ کے گھر ہونے والی عزت کی روداد سنتے ہوئے بھی اس نے کئی بار رک کر غور کیا۔

رات کے کھانے کے لیے روٹیاں ڈالتے ہوئے بھی اس نے سوچا آج وہ دو چار روٹیاں زیادہ ڈال لے اور ساتھ ہی تیار کر کے گرم گرم روٹیاں دیکھ کر یقیناً سب نہایت خوشگوار حیرت سے پوچھیں گے کہ۔

"کیا بات ہے زارا الخیر ہے یہ عنایت۔" "کوئی کہہ دے گی۔ کیا کہہ دے گی؟ اف ہے اس پر اور اس کی سوچ پر۔" اس نے جھنجھلا کر آج روٹیاں ہی نہیں ڈالیں۔ دادی جان آج ڈبل روٹی کھائیں گی اور امی ابو چاول اور وہ خود غصہ، یہ ناممکن ہے۔ وہ بھی کسی سے ایسی کوئی بات نہیں کہہ سکتی۔ ابو کو چاہیے تھی اس نے آج حتی المقدور خوشامد کر کے دی تھی اور اب سر جھکائے کمرے سے باہر جا رہی تھی۔

"بالکل ٹھیک ہوں میں [illegible] سعد خان!" وہ دروازے تک پہنچ رہی تھی۔

"کیا بات ہے زارا بیٹا مجھے لگ رہا ہے تم کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔" ابو جان ہمیشہ اسے اس دروازے پر چونکا دیتے تھے۔

"جی وہ کچھ نہیں۔ ہموں۔" اگر ابھی اس نے امید کی سی کرن کو اپنی "نہیں" سے بجھا دیا تو آگے یقیناً اندھیرا ہی ہے۔

"وہ ابو مجھے اصل میں ڈاکٹر بہت اچھے لگتے ہیں۔" "او میرے خدا" زندگی کا مشکل ترین لمحہ اور مشکل ترین جملہ، وہ اپنے بستر پر لیٹ کر کتنی دیر تک یقین کرتی رہی کہ کیا واقعی اس نے کہہ دیا۔

☆ ☆ ☆

"آج یکم جنوری ہے۔" نرم بستر پر کروٹ بدلتے ہوئے چڑیوں کی چہچہاہٹ سے سعد خان کی آنکھ کھل گئی اور روشنی کی پہلی کرن کے ساتھ یہ احساس اس کے ذہن میں گردش کر گیا۔ اس کی تمام حسیات بیدار ہو چکی تھیں اور اب نیند اسے یقیناً دوبارہ مدہوش نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے پھر بھی چادر تان کر آنکھیں بند کر لیں۔ کاش وہ آج کی تاریخ میں بیدار نہ ہو۔ سویا رہے اور یہ دن گزر جائے۔ وہ ایک ذمہ دار شخص، معاشرے کا اہم فرد ڈاکٹر سعد خان اس وقت اپنے آپ کو دنیا کا کمزور ترین شخص سمجھ رہا تھا۔ اور اس کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ پورے چھ فٹ کا مرد اس وقت کسی کی گود میں سر رکھ کر کہے کہ "مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" بے شک اپنے آپ سے لڑنا اور پھر اپنی سوچوں پر فتح پانا بہت بڑی کامیابی ہے۔ وہ بستر چھوڑ کر اٹھ گیا۔

نماز پڑھ کر اس نے کپڑے تبدیل کیے۔ جاگرز پہنے اور جاگنگ کے لیے نکل گیا۔ صبح دم بہت حد تک ویران سڑک پر دوڑتے ہوئے اس نے اپنے اندر بے پناہ تازگی جذب کرنے کی کوشش کی۔ یہ اونچا درخت ابھی اس کے اوپر بھی گر سکتا ہے۔ اس کا ذہن اس کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ وہ بہت دور تک گیا اور پلٹ کر آتے ہوئے کیا حال احوال پوچھنے آئے تک آ کر وہ پھر گزرا۔ سب خیریت ہو۔ کلینک جاتے ہوئے تین منٹ کی ڈرائیو میں وہ بیسیوں بار ٹھٹکا۔ اب یہ ٹرک اس کو روندتا ہوا گزر جائے گا۔ یا یہ گاڑی ضرور اس کی گاڑی سے ٹکرا جائے گی۔ مگر روز کے وقت پر وہ کلینک میں موجود تھا۔ ہر مریض کی نبض ٹٹولتے ہوئے اس کے اپنے دل کی دھڑکن بے قابو ہوئی۔ ہر فون کی گھنٹی پر اس نے "خدا خیر کرے" کا ورد کیا۔ اور شام کو ہاتھوں میں سر لیے وہ چائے کی پیالی سے اٹھتے بھاپ کے بگولوں کو دیر تک تکتا رہا۔ اور اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔

"ابھی تیار ہو کر میرے گھر پہنچو۔ فوراً۔"

مونا بھابی سے "کیوں" پوچھنا بیکار تھا۔ وہ وضاحتیں سننے اور سنانے کی عادی نہ تھیں۔ اگلے دس منٹ بعد پھر اس کی شیراڈ سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ اور اس کے واہمے اس کے پیچھے۔ اچانک ہی گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تو اسے لگا اس کی گاڑی کے پرخچے اڑ گئے ہیں۔ وہم کی آخر حد یہ ہے کہ اس کو بالآخر حقیقت جان لیا جائے۔ مونا بھابی کے گھر کے آگے شدید دباؤ میں اس کے پاؤں بریک پر پڑے تھے سو صرف بریک چرچرائے تھے اور اس کے دماغ میں دھماکے ہوئے تھے۔ بے شک آج کے دن میں اس نے جتنے وہم کیے تھے شاید آج تک نہیں کیے تھے۔ مگر اس کا کوئی وہم درست ثابت نہیں ہوا تھا حالانکہ یہ بھی سچ ہے کہ آدمی مستقل ایک ہی بات سوچتا رہے تو وہ ہو کر رہتی ہے۔

اگلے لمحے وہ اپنے والدین، بھابیوں، بہنوں اور بھائیوں کے ہمراہ زارا عمر کے خوبصورت لان میں بیٹھا بہت سے ہنستے مسکراتے چہروں کو دیکھتا ایک پر اٹک گیا تھا۔

ہلکے گلابی سوٹ میں بڑے سے شیفون کے دوپٹے کو سر پر سیٹ کیے جمائے وہ روشنی کا ہالہ بنی اس کے عین سامنے والے صوفے پر بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ نازک سی انگوٹھی اس کے ہاتھ میں ڈالنے سے پہلے اس نے سرگوشی کی۔

"ابھی رک جاؤ۔" اور پھر اس نے انگوٹھی پہناتے اس کا ہاتھ پھر لرز رہا تھا۔

"ہاں یہ واقعی مبارک دن ہے۔" اس کی آنکھوں کی چمک اس کے واہموں کو جلا ڈالنے میں واقعی تیز تھی۔ مبارک سلامت کے شور کے بعد سب ادھر ادھر مگن ہو گئے۔

"میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھے ابھی آپ سوچ رہے تھے کہ اسی لیے آپ کے دل کی دھڑکن رک بھی سکتی ہے؟"

"ہاں اور پھر میں نے سوچا اگر اس لیے رک بھی جائے تو کیا۔"

"مگر آج آپ کا کوئی وہم درست ثابت نہیں ہو سکا کہ آج سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی امید کی ایک کرن آئی۔ اس کا ایک دیا ہی تمام دن آپ کے گرد روشن رہا تھا۔"

"یقیناً" زارا عمر [illegible] اعتماد پیار ہی تو میرے واہمے ختم کر سکتا تھا۔" وہ سوچ کر مسکرا دیا۔

☆

تحسین اختر

تیری آنکھ سے بہتے آنسو

"السلام علیکم!" وہ دونوں کالج جانے کے لیے گھر سے نکلی تھیں۔ گلی سے گزرتے ہوئے اوصاف ان کے قریب سے گزرا تھا اور ان دونوں کو دیکھتے ہی نگاہیں جھکائے سلام کر کے آگے بڑھ گیا تھا۔

"وعلیکم السلام!" فرازیہ نے زیر لب سلام کا جواب دیا تھا جبکہ مازیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

"تم اپنی عادت سے باز نہیں آسکتیں۔ دانت نکالنے کے بجائے بے چارے کے سلام کا جواب دے دیتیں تو تمہارے اعمال میں کچھ نیکیوں کا اضافہ ہی ہو تا کمی نہ ہوتی لیکن تم تو......" فرازیہ نے چلتے چلتے مازیہ کو اچھی خاصی جھاڑ پلا دی تھی۔

فرازیہ اور مازیہ جڑواں بہنیں تھیں لیکن ان کی عادت، مزاج اور خیالات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

"مجھے تو آرام سے ڈانٹ دیا ہے لیکن اس کا اسٹائل ملاحظہ نہیں کیا۔" مازیہ بمشکل اپنی ہنسی پر قابو پا کر بولی تھی۔

"کیوں کیا ہوا ہے اس کے اسٹائل کو؟"

"یہ خالہ فراست کے اکلوتے فرزند ارجمند اوصاف جاوید صاحب کچھ زیادہ ہی دقیانوسی قسم کے اور مولوی ٹائپ نہیں ہیں؟ اب دیکھو نا یار آج کل کے لڑکوں کا یہ اسٹائل کہاں ہوتا ہے لیکن اسے تو دیکھ کر لگتا ہے کہ بے چارہ ابھی تک اٹھارہویں صدی میں ہی رہا ہے۔ ابھی اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو کبھی ہمیں دیکھ کر اس طرح گھر میں نہ گھستا جیسے دو پیاری اور خوب صورت لڑکیوں کی بجائے گلی میں کوئی بھوت دیکھ لیا ہے۔"

مازیہ نے دوپٹہ کھینچ کر مزید چہرے کے اوپر ڈالا تھا۔ اس سے پردہ کرنا مقصود نہیں تھا بلکہ دھوپ کی شدت سے بچنے کے لیے ایسا کیا گیا تھا۔

وہ حسین تھی اور اسے اپنے حسن کو بچا کر رکھنے کے تمام گر بھی آتے تھے۔ وہ ہمیشہ اوصاف جاوید کا جی بھر کر مذاق اڑاتی تھی اور فرازیہ ہمیشہ اسے ڈانٹ دیتی تھی۔

"شرم کرو کچھ۔ مجھے تو لگتا ہے وہ تمہیں بے حد پسند کرتا ہے بلکہ تم سے شدید محبت کرتا ہے۔" فرازیہ نے اسے چڑانے کے لیے اب وہ بات چھیڑی تھی جو مازیہ عارف کا بلڈ پریشر منٹوں میں ہائی کر دیتی تھی حالانکہ یہ بات فرازیہ کو سو فیصد سچ لگتی تھی۔

"کیا؟؟" وہ رک کر یوں چیخی تھی کہ ارد گرد سے گزرنے والے بھی رک کر اسے دیکھنے لگے تھے۔

"کیا بد تمیزی ہے چلو تو۔" فرازیہ نے سٹپٹا کر اس کا بازو کھینچا تھا۔

"تم ایسی بات کرتی ہی کیوں ہو۔ تمہیں معلوم ہے نا کہ میں اس شخص کو قطعی پسند نہیں کرتی اور تم پھر بھی میرا نام اس کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کرتی ہو۔ فری! آخری بار کہہ رہی ہوں آئندہ تم نے ایسی الٹی سیدھی بات کی تو میں تم سے پکی پکی ناراض ہو جاؤں گی۔"

"یہ لو۔ میری توبہ جو آئندہ تم سے کچھ کہا۔ تم تو یہ بھی خیال نہیں کرتی ہو کہ یہ ہمارا گھر نہیں شہر کی ایک سڑک ہے جس پر لڑکیوں کا یوں چلانا معیوب

سمجھا جاتا ہے۔" وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولی تھی۔

"اور تم خیال کرتی ہو کہ کون سی بات کہنے والی ہے اور کون سی نہیں۔" وہ دونوں ہمیشہ کی طرح لڑ پڑی تھیں۔

بیس منٹ کی پیدل مسافت پر ان کا کالج تھا جس میں سے دس منٹ گزر چکے تھے۔ فرازیہ کو یقین تھا کہ باقی دس منٹ کا فاصلہ بھی لڑائی میں کٹے گا اس لیے وہ اس سے دو قدم آگے ہو کر چلنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

"چائے ملے گی!" سب سے پہلے مانوس اور مسحور کن خوشبو کا جھونکا چائے بناتی مازیہ کے نتھنوں سے ٹکرایا تھا اور پھر اس نے شائستہ آواز میں یہ الفاظ سنے تھے۔

"کیوں نہیں! بس ابھی لائی" آپ باہر جا کر بیٹھیں" کچن کے دروازے میں ایستادہ ذیشان کو دیکھ کر وہ یکدم فریش ہو گئی تھی۔

یہ شخص اس کی زندگی میں ایسا ہی تازہ ہوا کا جھونکا تھا جس نے اس کے روز و شب کو معطر کر رکھا تھا۔

"یہاں کھڑا اچھا نہیں لگ رہا ہوں کیا۔" وہ دو قدم چل کر اور آگے آیا تھا۔

"دم گھٹ رہا ہے یہاں گرمی بہت ہے نا۔"

کیتلی میں دودھ انڈیلتے ہوئے اس کے ہاتھ اور لہجہ دونوں لرز رہے تھے۔ وجہ ذیشان ہی تھا جو اب اس کے بالکل پیچھے آ کھڑا ہوا تھا۔

"تم بھی گرمی میں ہی کھڑی ہو۔ جب تم جیسی نازک لڑکی گرمی کی شدت کا مقابلہ کر سکتی ہے تو کیا میں اتنا مضبوط آدمی اسے نہیں سہہ سکتا۔"

"میں تو چائے بنا رہی ہوں اس لیے اس گرمی کو برداشت کر رہی ہوں اور آپ!"

"اور میں اس لیے اسے برداشت کر رہا ہوں کہ مازیہ عارف بھی اسی گرمی میں کھڑی ہے اور میں مازیہ عارف سے الگ تو نہیں ہوں۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر

شیلف پر پڑا بھاپ اڑاتا چائے کا مگ اٹھایا تھا اور کچن سے باہر آ گیا تھا۔ وہ بھی پیچھے پیچھے باہر آئی تھی لیکن اب قدم رکھ کہیں رہی تھی اور پڑ کہیں رہے تھے۔

"میں مازیہ عارف سے الگ تو نہیں ہوں۔" یہ فقرہ مسلسل سماعتوں میں گردش کر رہا تھا۔

ذیشان جیسا ویل سیٹلڈ، وجیہہ اور ویل ایجوکیٹڈ شخص جس لڑکی کو اس طرح چاہتا ہو وہ خود پر جتنا بھی ناز کرے کم تھا۔ یہ مازیہ عارف کا ذاتی خیال تھا۔

"اوہ چائے سے شغل فرمایا جا رہا ہے۔" مازیہ اور ذیشان صحن میں پڑی کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھے سرگوشیوں میں جانے کیا باتیں کر رہے تھے جب فرازیہ دونوں ہاتھوں سے بکھرے بالوں کو سمیٹتے ہوئے باہر آئی تھی۔

ذیشان ان کا خالہ زاد تھا لیکن مازیہ کی طرح وہ بھی مانتی تھی کہ جو بات ذیشان میں ہے وہ ان کے پورے خاندان کے کسی اور شخص میں نہیں ہے۔ وہ اپنی بہن کی اس میں حد سے زیادہ دلچسپی سے بھی بخوبی آگاہ تھی اس لیے دل سے ذیشان کو وہی مقام دیتی تھی جو مازیہ کے رشتے کے حوالے سے دینا چاہیے تھا۔

"تم سو رہی تھیں اس لیے تمہیں نہیں بلایا۔ حالانکہ ذیشان تو کہہ رہے تھے فرازیہ کو جگا کر لاؤ۔" مازیہ نے وضاحت دی تھی۔

"یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ تم دونوں میرے آنے سے پہلے اس طرح باتوں میں گم تھے کہ تم لوگوں کو کسی تیسرے بندے کا کیا خیال آنا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے تم اب ہماری جاسوسی کرنے لگی ہو۔" ذیشان خالی کپ زمین پر رکھتے ہوئے اس کی جانب مڑا تھا۔

"جی نہیں مجھے کیا پڑی ہے جاسوسی کرنے کی یہ تو سامنے کی بات ہے۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا اس منظر کو دیکھ کر وہی اندازہ لگاتا جو میں نے لگایا۔" وہ منہ پھلا کر بولی تھی۔

"اچھا بابا! اب لڑنے مت بیٹھ جانا۔ یہ بتاؤ چائے پیو گی؟"

مازیہ اتنا خیال رکھنے والی اور بڑھ چڑھ کر کام کرنے والی نہیں تھی لیکن ذیشان کے آتے ہی اس کے مزاج میں ایک واضح تبدیلی آئی تھی۔ فرازیہ اور دوسرے گھر والے پہلے پہل اس تبدیلی پر حیران ہوتے تھے لیکن جوں جوں بات ان کی سمجھ میں آتی گئی تھی ان سب نے حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔

"تم بتاؤ گی تو ضرور پیوں گی۔" فرازیہ بھی ایسے موقعوں پر اسے خوب تنگ کرتی تھی۔

"بنا لائی ہوں۔" وہ اپنا اور ذیشان کا خالی کپ اٹھا کر کچن کی طرف چلی گئی تھی۔

"یہ مازیہ اتنی اچھی نہیں ہے لیکن تمہاری موجودگی میں ہو جاتی ہے۔" وہ مازیہ کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے ہنس کر بولی تھی۔

"پھر تو تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں تمہاری بہن کو ایسا بنا دیتا ہوں۔" وہ بھی اس کی بات کا مزا لیتے ہوئے بولا تھا۔

"یہ تو ہے۔" وہ بولی پھر دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے۔

کچن میں چائے بناتی مازیہ نے فوراً کچن کی کھڑکی کھول کر انہیں ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ چائے کا پانی جو چولہے پر رکھا کھول رہا تھا اور وہ یک ٹک ذیشان کو دیکھتی اس کی دلکش ہنسی میں کھوئی رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"بیٹا! اندر آجاؤ۔ تمہارا اپنا گھر ہے۔" خالہ فراست نے بیٹے اوصاف کو کسی کام سے ان کے گھر بھیجا تھا اور اب دروازے پر ہی کھڑا ان کا پیغام شکیلہ بیگم کو پہنچا رہا تھا۔

وہ اوصاف کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھیں۔ وہ بہت شرمیلا اور کم گو لڑکا تھا اور سلجھی ہوئی عادات کا مالک تھا۔ وہ بہت چھوٹا سا تھا جب ان لوگوں نے اس محلے میں آ کر رہنا شروع کیا تھا۔ فراست اور شکیلہ پہلے دن سے ہی دوستوں کی بجائے بہنوں کی طرح رہی تھیں۔ اوصاف، فرازیہ اور مازیہ کے ساتھ کھیل کود کر جوان ہوا تھا لیکن اب وہ ان دونوں سے کچھ جھجکنے لگا تھا۔

"بیٹا! یہ وہی گھر ہے جہاں تم دن کا بیشتر حصہ گزارتے تھے اور بلا روک ٹوک آتے جاتے تھے پھر اب اتنا کیوں جھجک رہے ہو؟" وہ اسے اندر لے آئی تھیں۔ جو نگاہیں جھکائے ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

"بیٹھو بیٹا!" انہوں نے صحن میں رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ شکیلہ بیگم کے بیٹھنے کے بعد خود بھی بیٹھ گیا تھا۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟" کچھ فاصلے پر بچھی چارپائی پر مازیہ بیٹھی کالج کا کوئی کام کر رہی تھی۔ اوصاف کے بیٹھتے ہی اس نے اپنی کتابیں سمیٹی تھیں۔

"بس امی! میرا کام ختم ہو گیا ہے اور پھر یہاں دھوپ بھی بہت تیز ہے اندر کمرے میں جا رہی ہوں۔" وہ چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"اوصاف آیا ہے تم نے اسے سلام بھی نہیں کیا۔ بھائی ہے تمہارا۔" شکیلہ بیگم کو مازیہ کی بدتمیزی ایک آنکھ نہ بھائی تھی۔ ابھی بھی اوصاف کی موجودگی کا

خیال نہ ہوتا تو اسے بے بھاؤ کی سناتیں۔ لیکن اپنا غصہ پی کر رہ گئی تھیں۔ جبکہ ان کے بھائی کہنے پر اوصاف نے کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔

"السلام علیکم!"

وہ اپنی اماں کی طبیعت سے واقف تھی۔ اگر اب بھی سلام نہ کرتی تو پھر بعد میں ایک لمبا لیکچر سننا پڑتا اس لیے ہونٹ بار سے والے انداز میں سلام جھاڑا تھا۔

"وعلیکم السلام!" اوصاف نے صرف ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی تھی۔

دھوپ میں چلنے سے گلابی چہرہ جو اب انار کی طرح دہک رہا تھا۔ وہ لاپروا اور مغرور لڑکی اسے اپنے دل کے بہت قریب محسوس ہوتی تھی۔ وہ اندر کمرے میں جا چکی تھی لیکن اوصاف کے تن من کو سرشار سا کر گئی تھی۔

"بہت لاپروا ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو بیٹا اسے" اس میں اور فرازیہ میں بہت فرق ہے۔ میں تو اسے بہت سمجھاتی ہوں کہ اگلے گھر جاؤ گی تو کیا لے کر جاؤ گی۔ کچھ تربیت اور طریقہ سلیقہ ہی سیکھ لو۔ لیکن اس لڑکی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔" وہ مازیہ کے جانے کے بعد اوصاف سے اس کی شکایتیں کرنے لگی تھیں۔

"خالہ جان! مازیہ آہستہ آہستہ سب سمجھ جائے گی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔" اس نے انہیں تسلی دی۔

"خاک سمجھے گی۔ تم بیٹھو بیٹا! میں ذرا فرازیہ کو دیکھوں وہ تمہارے لیے چائے تو بنائے۔"

"نہیں نہیں خالہ جان! آپ تکلف نہ کریں۔ چائے پھر کبھی سہی اس وقت تو مجھے ایک بہت ضروری کام سے جانا ہے۔" وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ارے بیٹا! بیٹھو تو چائے کی ایک پیالی کے لیے تکلف کیسا اور تم کون سا روز روز آتے ہو۔ آج بھی دروازے سے لوٹ رہے تھے وہ میں ہی زبردستی لے آئی۔"

"خالہ جان! میرا آپ سے وعدہ رہا چائے پھر کبھی پیوں گا اس وقت پلیز مجھے اجازت دیں۔"

"اچھا بیٹا! تمہاری مرضی۔" وہ جیسے ہار مان کر بولی تھیں۔

"اچھا خالہ! خدا حافظ۔" وہ جس طرح دبے پاؤں آیا تھا اسی طرح خاموشی سے باہر نکل گیا تھا۔

"خدا حافظ بیٹا!"

"فرازیہ کتنی خوش بخت ہے۔ ایک بیٹا ہے لیکن دس پر بھاری ہے۔ اللہ ایسی سعادت مند اولاد ہر کسی کو دے۔" اوصاف کے جانے کے بعد شکیلہ بیگم نے دل میں سوچا تھا اور مازیہ کی خبر لینے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"فری! میری اچھی بہن پلیز مان جاؤ نا۔ دیکھو تم میری مدد نہیں کرو گی تو اور کون کرے گا اور پھر اس میں غلط ہی کیا ہے۔ ذیشان کوئی غیر نہیں ہے ہمارا اپنا ہے پھر اس کے ساتھ جانے میں کیا اعتراض ہے۔"

"دیکھو مازی! یہ ٹھیک ہے کہ ذیشان ہمارا کزن ہے لیکن جب تم اس طرح کالج کے یونیفارم میں اس کے ساتھ جاؤ گی تو دیکھنے والے کیا سمجھیں گے۔ تمہارے یا اس کے ماتھے پر تو نہیں لکھا ہوا کہ تم دونوں رشتہ دار ہو لوگ تو [illegible] انہیں روک [illegible]۔"

"تم یہ لیکچر چھوڑو بس وہ آنے ہی والے ہیں۔ میں ان کے ساتھ جاؤں گی۔ تم امی سے کہہ دینا میرا پریکٹیکل ہے اس لیے دیر ہو گی۔"

"امی! مجھے ڈانٹیں گی کہ میں کچھ دیر انتظار کر کے تمہارے ساتھ نہیں آ سکتی تھی۔" فرازیہ نے اسے گھورا تھا۔

"فری پلیز!" وہ اپنی بات پر ڈٹی ہوئی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے لیکن آخری بار۔" فرازیہ ہمیشہ کی طرح اس کی ضد کے آگے ہار گئی تھی۔

"او سو سوئٹ۔" مازیہ نے آگے بڑھ کر اس کے گلے میں پیار سے بانہیں ڈال دی تھیں۔

"اچھا اب ہٹو۔ ساری لڑکیاں ہمیں دیکھ رہی ہیں۔ ذیشان کے ساتھ میں اور تم دونوں جائیں گے مجھے آگے جا کر اتار دینا۔" فرازیہ نے اس کے بازو پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا تھا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ چلو آؤ گیٹ پر چلتے ہیں۔ یہ نہ ہو ذیشان وہیں کھڑے انتظار کر رہے ہوں۔" مازیہ اسے گھسیٹتے ہوئے کالج کے گیٹ پر لے آئی تھی۔

"فری بے چاری تم سے بہت محبت کرتی ہے۔" فری کو انہوں نے بڑی سڑک پر اتارا تھا اور اب مازیہ بڑے مزے سے ذیشان کی گاڑی میں بیٹھی تھی۔ جب ذیشان نے فری پر تبصرہ کیا تھا۔

"ہاں تو اسے محبت کرنی بھی چاہیے میری بہن نہیں ہے کیا۔" وہ شوخی سے بولی تھی۔

ذیشان کی ہمراہی اور سہانا موسم اس کے انگ انگ پہ سرور طاری تھا۔

"یہ تو زبردستی والی محبت ہوئی نا یار!" وہ اسے چھیڑنے کے انداز میں بولا تھا۔

"نہیں محبت بس محبت ہوتی ہے اس میں زبردستی والی کوئی بات نہیں ہوتی۔"

"اوہ مازیہ عارف بھی ایسی گہری بات کر سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں جناب! [illegible] ایسی بات [illegible]۔"

"دیکھو کبھی لڑنا نہیں ہے۔ تمہیں لڑنے کے لیے تو اپنے ساتھ نہیں لایا ہوں۔" اس نے گاڑی ایک خوبصورت پارک کے باہر کھڑی کی تھی۔

"پھر کس لیے لائے ہیں؟"

"تم سے باتیں کرنے کے لیے، تمہیں جی بھر کر دیکھنے کے لیے، تمہیں اپنی سنانے اور کچھ تمہاری سننے کے لیے۔" وہ چلتے چلتے پھولوں کے ایک کنج کے قریب آ بیٹھے تھے۔

"سنو مازی! تمہارے بغیر یہ زندگی مجھے زندگی ہی نہیں لگتی کیونکہ میرے پاس ایسی زندگی کا کوئی تصور نہیں ہے جس میں تم شامل نہ ہو۔ تمہارے بغیر میں زندہ بھی نہیں رہ سکتا۔"

"ذیشان! ایسے مت کہیں۔ ہمارے مقدر میں کوئی رکاوٹ کوئی گردش نہیں ہے۔ ہم ہمیشہ ساتھ ساتھ رہیں گے۔ آپ مایوسی کی باتیں مت کریں۔"

"مازی! یہ جو محبت ہوتی ہے نا یہ ہمیں بزدل بنا دیتی ہے۔ یہ ہمیں ہر پل ڈراتی رہتی ہے۔ میں بھی بہت بزدل ہو گیا ہوں تمہارے بچھڑنے کا ڈر کا میرے دل کو خوفزدہ کرتا رہتا ہے۔"

"میں نے تو سنا ہے ذیشان! محبت انسان کو بہت بہادر بنا دیتی ہے۔ بندہ اس کی خاطر ہر شے سے ٹکرا جاتا ہے۔ اسے ہر قیمت پر حاصل کر کے چھوڑتا ہے بشرطیکہ محبت سچی ہو۔"

"پروین شاکر نے شاید ایسے ہی لہجے کے بارے میں کہا ہے۔" وہ اس کی باتیں سن کر بولا تھا۔

کتنی شفاف ہے یہ آواز
چشمے کی طرح ہے جس نے میرے
اندر کے تمام موسموں کو
آئینہ بنا کے رکھ دیا ہے
چاہے ہو کہ پھول ہو کہ سبزہ
تاروں کی برات ہو کہ مہتاب
سورج کا جلال ہو کہ تن میں
خوابوں کی دھنک کھنچی ہوئی ہو
بارش ہو شفق کھلی ہوئی ہو
ہر رت کا گواہ اس کا لہجہ
تہہ تک جسے آنکھ چھو کے آئے
کتنی شفاف ہے یہ آواز!

"ذیشان! آپ بھی نا بس۔" وہ بری طرح جھینپ گئی تھی۔ ذیشان کی پرحدت نظریں اسے موم کی طرح پگھلانے لگی تھیں۔

"چلیں بہت دیر ہو گئی ہے۔" مازیہ کو اچانک خیال آیا۔

"ہاں چلو!" وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"مازیہ! پتا ہے میں تمہیں سارے زمانے سے چھین لوں گا۔ تم صرف میری ہو صرف میری۔"

راستے میں ذیشان نے یقین کا ایک اور جگنو اس کی ہتھیلی پر دھرا تھا اور وہ آنکھیں موندے ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

"خالہ فراست کی ہمت کیسے ہوئی اپنے پینڈو اور جاہل بیٹے کا رشتہ میرے لیے لے کر آنے کی۔ کیا سوچ کر انھوں نے ہمارے گھر کا رخ کیا ہے آخر۔" اس نے جیسے تیسے بابا جان کے گھر سے نکلنے تک صبر کیا تھا اور اب کمرے میں آتش فشاں بنی بیٹھی تھی۔

اوصاف جاوید اس کے لیے رشتہ بھیجے یہ سوچ سوچ کر اس کا دماغ ماؤف ہوا جا رہا تھا۔

"مازیہ ہوش کے ناخن لو۔ اس طرح چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس گھر میں بیٹی ہو وہاں پھر تو آتے ہی ہیں۔ بیٹی والوں کو ہر کوئی پوچھتا ہے اور پھر اوصاف کے رشتے پر جس طرح تم واہی تباہی بک رہی ہو میں پوچھتی ہوں ایسی کون سی قیامت آگئی ہے۔ وہ لڑکا ہیرا ہے ہیرا لاکھوں میں ایک ہے۔ ٹھیک ہے اس گھر میں سب کا جھکاؤ ذیشان کی طرف ہے اور پھر وہ میرا بھانجا ہے میرے بیٹے ہر کسی سے بڑھ کر ہے۔ اس لیے میں نے فراست کو بڑے طریقے سے جواب دے دیا ہے لیکن کوئی تم سے پوچھے کہ تم کیوں آگ بگولا بنی بیٹھی ہو۔ اوصاف جاوید کا رشتہ ہی آیا ہے نا ہم نے تمہیں اس کے ساتھ رخصت کرنے کی تیاری تو نہیں کرلی۔" شکیلہ بیگم نے اس کی طبیعت اچھی طرح صاف کردی تھی۔ وہ کب سے بیٹھی اس کا رد عمل سن رہی تھیں۔

"اوہو امی جان! آپ بھی نا بس۔" رخصتی والی بات پر وہ جھنجھلا گئی تھی لیکن ان کی ان سب باتوں سے ایک بھید تو کھل گیا تھا کہ ذیشان کی اور اس کی پسندیدگی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

"اس اوصاف کے بچے کی خبر تو میں اچھی طرح لوں گی۔ مجھے کہیں ملے تو سہی۔" شکیلہ بیگم کے کمرے سے نکلتے ہی وہ دانت کچکچا کر بولی تھی۔

"خبردار جو تم نے اوصاف سے کچھ کہا تو۔ پہلے ہی بے چارے کا دل توڑ دیا اور پھر بھی تمہاری تسلی نہیں ہوئی۔" فرازیہ نے سختی سے کہا تھا۔

"کب کیا؟ کیا کہا تم نے بے چارے کا دل توڑ دیا۔"

"فری تم سب جانتی ہو پھر بھی ایسا کہہ رہی ہو؟" اسے سچ فرازیہ کی بات سے صدمہ پہنچا تھا۔

"چلو چھوڑو۔ اسے انکار کر تو دیا ہے اب تم کیا چاہتی ہو۔"

"تمہیں اس کا اتنا خیال ہے تو خود کرلو اس سے شادی۔" اسے فرازیہ کا اوصاف جاوید کی حمایت کرنا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا اسی لیے تپ کر بولی۔

"وہ مجھے بہن سمجھتا ہے اس لیے مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ ویسے بھی ہماری ایسی قسمت کہاں جو بھی آتا ہے تمہارا امیدوار بن کر آتا ہے۔" فرازیہ نے ٹھنڈی آہ بھر کر اسے مزید تپایا تھا۔

"میں جا رہی ہوں بس۔" وہ تکیہ اس پر پھینک کر کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

موسم بے حد خوب صورت ہو رہا تھا۔ مست ہوا جھومتی جھامتی ہر آنگن میں دستک دے رہی تھی۔ یہ سہانی شام اور دلکش موسم ذیشان اور مازیہ کے دل کا سفیر بنا ہوا تھا۔

آج ان کی منگنی کی تقریب ہو رہی تھی۔ چونکہ کسی بھی کوئی دکھاوا نہ تھا اسی لیے سادہ سی یہ تقریب کسی بھی تکلف کے بغیر تھی۔ ذیشان کی طرف سے نبیلہ خالہ اور خالو مازیہ کو انگوٹھی پہنانے آئے تھے۔ ان کے علاوہ چند ایک رشتہ دار تھے جن کو خاص طور پر بلایا گیا تھا۔

مازیہ ہلکے گلابی جوڑے میں کھلی پڑ رہی تھی۔ وہ خوب صورت تو تھی لیکن محبتوں اور چاہتوں کے اعجاز نے اس کے چہرے پر وہ رنگ بکھیر رکھے تھے کہ اس پر سے نگاہ ہٹانا مشکل تھا۔

"میری مازیہ تو چاند کا ٹکڑا ہے چاند کا ٹکڑا۔" نبیلہ خالہ نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے کر چوما تھا اور وہ شرم سے دوہری ہوگئی تھی۔

"آپ خالہ نہیں ساس ہیں جو اپنی بہو کی اس طرح تعریف کر رہی ہیں۔" لڑکیوں کے جھرمٹ میں سے کسی نے کہا تھا اور ہر طرف قہقہے بکھر گئے تھے۔

"مازیہ میری بہو نہیں میری بیٹی ہے۔ میری دل جانی کے دل کا ٹکڑا۔"

خالہ نے اسے سینے سے لگا لیا تھا اور ہر لڑکی اور ہر عورت نے مازیہ عارف کی قسمت پر ایک بار تو ضرور رشک کیا تھا۔ لیکن فراست بیگم چپکے سے اس محفل سے اٹھ کر باہر چلی آئی تھیں۔ اس چاند کو تو ان کے آنگن میں چمکنا تھا کیونکہ ان کا پیارا اور سعادت مند بیٹا اس چاند کا اس شدت سے تمنائی تھا کہ اس کے بعد وہ ہر آرزو، ہر خواہش بھلا بیٹھا تھا۔

اس نے آج تک ان سے کچھ نہیں مانگا تھا اور اگر کچھ مانگا تھا تو وہ اپنے بیٹے کی جھولی میں نہ ڈال سکی تھیں۔ اس خیال سے ان کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ لیکن مازیہ انھیں بیٹیوں کی طرح ہی عزیز تھی وہ اس کی خوشیوں کو اپنی نظر لگ جانے کے ڈر سے اس کے قریب سے اٹھ آئی تھیں۔

حسین شام کی باقیات پھول، مٹھائیوں کے خالی ڈبے، سنہری لڑیوں کی صورت صحن میں جا بجا بکھری ہوئی تھیں۔ چونکہ سب مہمان قریب ہی سے آئے تھے اس لیے تقریب ختم ہوتے ہی اپنے گھر لوٹ گئے تھے۔ چونکہ رات بھی کافی ہوگئی تھی اس لیے پھیلاوا سمیٹنے کی بجائے اپنے اپنے بستروں پر گر گئے تھے۔

واحد مازیہ تھی جس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی جو خوش رنگ سپنے بن رہی تھیں۔ وہ بستر سے نکل کر باہر صحن میں چلی آئی تھی۔ صحن میں بکھری بہت سی چیزیں اور پھر اس کے ہاتھ کی ایک انگلی میں چمکتی ہوئی خوب صورت نگوں والی انگوٹھی اسے یاد دلانے کو کافی تھی کہ وہ ذیشان کی ہو چکی ہے۔

☆ ☆ ☆

عارف احمد محکمہ انکم ٹیکس میں تھے۔ انھوں نے ہمیشہ ایک سچے مومن کی طرح اپنے آپ کو حرام کی کمائی سے بچائے رکھا تھا اور اپنی بیٹیوں کی پرورش حق حلال کی کمائی سے کی تھی۔ وہ قناعت پسند تھے اور قناعت پسندی کو ہی پسند کرتے تھے۔ لیکن آج کل وہ ایک مشکل میں پھنسے ہوئے تھے۔ ایک مل اونر ٹیکس کی لاکھوں کی رقم بچانے کی خاطر انھیں بہت تنگ کر رہا تھا۔

"عارف احمد یہ معاملہ زیادہ ہو تو ہم تمہارا منہ بند کر دیں گے۔" ہاشم صدیقی نے اپنے موقف پر ڈٹے عارف احمد سے آخری مرتبہ ڈیل کرنے کی کوشش کی۔

"ہاشم صاحب آپ میرا منہ بند کرنے کے بجائے قومی خزانے کا منہ بھر دیں تو آپ کے حق میں زیادہ بہتر ہوگا۔" عارف احمد نے بھی ٹکا تو ڑ جواب دیا تھا۔

"تم جیسے معمولی افسر ہاشم صدیقی کی جوتیاں سیدھی کرتے ہیں اور تم اس معمولی افسری پر اتنا اترا رہے ہو کہ ہاشم صدیقی کو سمجھانے لگے ہو۔ خیر ہم تمہارے منہ نہیں لگنا چاہتے تم نے ہم سے ڈیل نہ کر کے اپنا ہی نقصان کیا ہے۔"

"ہونہہ! بھری ہوئی تجوریوں کو مزید بھرنے کے لیے ہر کام کر گزرتے ہیں یہ بھی نہیں سوچتے کہ دوزخ کا ایندھن خرید رہے ہیں۔" عارف احمد نے بے جان ریسیور کو گھورتے ہوئے دل میں سوچا تھا اور ریسیور کریڈل پر پٹخ کر پھر سے اپنا کام کرنے لگے تھے۔

☆ ☆ ☆

"امی جان! چار بجنے والے ہیں اور مازیہ ابھی تک کالج سے واپس نہیں آئی۔" فرازیہ کو ہلکا سا بخار تھا اس لیے اس نے کالج سے چھٹی کرلی تھی۔ وہ سو کر اٹھی تو سہ پہر کے سائے ڈھل چکے تھے۔ اس نے شکیلہ بیگم سے پوچھا تھا۔

"ہاں میں خود پریشان ہوں بتا جاتے وہ بھی اتنی دیر سے نہیں آئی۔ تم اس کی دوست آسیہ سے معلوم کرو کہیں اس کی طرف نہ ہو۔"

"جی اچھا۔" فرازیہ جلدی سے ٹیلی فون کی طرف بڑھی تھی۔

"امی جان وہ آسیہ کے ساتھ بھی نہیں ہے۔" تھوڑی دیر بعد اس نے باہر آکر تشویش سے انھیں بتایا

تھا۔

"ہائے اللہ! تو پھر وہ کہاں چلی گئی؟"

"کیا ہوا خیریت تو ہے۔ تم دونوں کے چہروں پہ ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟" عارف احمد آفس سے لوٹے تو ان دونوں کو پریشانی سے ادھر ادھر پھرتے دیکھ کر پوچھا تھا۔

"بابا! وہ مازیہ ابھی تک نہیں آئی۔"

"اچھا۔ تم لوگ پریشان مت ہو میں پتہ کرتا ہوں۔" وہ الٹے قدموں باہر نکل گئے تھے۔

سہ پہر سے شام اور شام سے رات ڈھلی لیکن مازیہ کا کہیں نام و نشان نہ ملا تھا۔ عارف احمد اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک چکے تھے لیکن اس کا کہیں سراغ نہیں مل رہا تھا۔

بیٹی کا نازک معاملہ تھا اس لیے وہ کسی کو بتا بھی نہیں رہے تھے۔ لیکن جب ساری رات اسی بھاگ دوڑ میں گزر گئی اور صبح کا اجالا ہر طرف پھیلنے لگا تو عارف احمد نے شکیلہ بیگم کے کہنے پر ذیشان کے گھر اطلاع کی اور اس کے والد کو مدد کے لیے بلایا جو ایک ایس پی تھے۔

ذیشان اس کے والد اسحاق جمال اور عارف احمد تینوں اسے ڈھونڈنے نکلے ہوئے تھے جب فرازیہ نے مازیہ کو کھلے دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا اور شکیلہ بیگم کو چیختے ہوئے متوجہ کیا تھا۔

"مازیہ میری جان!" شکیلہ بیگم جن کے آنسو کل شام سے نہ تھمے تھے دوڑ کر اس سے لپٹ گئی تھیں۔

"مازیہ! تم کہاں چلی گئی تھیں؟ تمہیں پتہ ہے ہم کتنے پریشان تھے۔" فرازیہ نے آگے بڑھ کر ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کیا تو نبیلہ بیگم نے پوچھا تھا۔

"خالہ! مجھے نہیں پتہ وہ کون لوگ تھے۔ میں تو کالج سے آرہی تھی کہ وہ زبردستی مجھے ایک گاڑی میں ڈال کر لے گئے تھے اور ایک کمرے میں بند کر دیا تھا ساری رات میں دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر روتی رہی تھی لیکن کسی نے مجھے باہر نہیں نکالا اور جب صبح ہوئی تو وہ مجھے گاڑی میں ڈال کر گھر کے باہر چھوڑ گئے۔ پتہ نہیں کون لوگ تھے اور کیا چاہتے تھے۔" مازیہ نے رندھی ہوئی آواز میں بتایا تھا۔

"تمہیں کسی نے کچھ کہا تو نہیں میرا مطلب ہے کوئی غلط نیت سے تو تمہارے قریب نہیں آیا۔" نبیلہ بیگم نے اس کے قریب ہو کر اپنے اندیشوں کی تصدیق کرنا چاہی تھی۔

"نہیں خالہ جان! جس طرح وہ مجھے لے کر گئے تھے ایسے ہی چھوڑ گئے کمرے میں کوئی بھی نہیں آیا تھا مجھے تو انہوں نے کھانے کو بھی کچھ نہیں دیا تھا۔"

"اچھا پھر ان لوگوں کا کیا مقصد تھا؟" مازیہ کے جانے پر جہاں فرازیہ اور شکیلہ بیگم نے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا تھا وہیں نبیلہ بیگم سوچ میں پڑ گئی تھیں۔

"فرازیہ! تم اپنے بابا جان کو فون کر کے بتا دو۔ وہ جانے کہاں کہاں خوار ہو رہے ہوں گے۔" شکیلہ بیگم کو کچھ دیر بعد خیال آیا تو انہوں نے فرازیہ سے کہا تھا۔

عارف احمد کو لگ رہا تھا کہ ایک رات میں ہی ان پر قیامت گزر گئی ہے۔ فرازیہ کا فون سنتے ہی وہ تینوں الٹے قدموں گھر کی طرف لوٹے تھے اور مازیہ کو صحیح سلامت دیکھ کر انہوں نے رب کا شکر ادا کیا تھا۔

"میں جانتا ہوں یہ کمینی حرکت کس کی ہے۔" عارف احمد کے ذہن میں ہاشم صدیقی کا نام ابھرا تھا۔

"بھائی جان! کیا آپ اسے جانتے ہیں؟" نبیلہ بیگم نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"ہاں بہت اچھی طرح۔ ہاشم صدیقی ایک مل اونر ہے۔ لاکھوں کا ٹیکس تھا اس پر جسے وہ ادا نہیں کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے وہ مجھے کئی بار دھمکیاں بھی دے چکا تھا۔"

"تو آپ نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا؟ میں اب بھی اسے نہیں چھوڑوں گا اس کے خلاف اغوا کا پرچہ ضرور کٹے گا۔" اسحاق جمال نے غصے سے کہا تھا۔

"ہاں پرچہ تو میں ضرور کٹواؤں گا تاکہ اسے پتہ چلے کہ عارف احمد اتنا کمزور نہیں ہے۔"

☆ ☆ ☆

اس سارے معاملے میں ہاشم صدیقی کا ہاتھ تھا یا نہیں البتہ مازیہ عارف کی زندگی پر اس واقعے نے گہرے اثرات چھوڑے تھے۔ جب عارف احمد نے اسحاق جمال سے بات کی تھی تو اس نے بے اعتنائی سے ہنستے ہوئے ان کے شک کی تصدیق کر دی تھی۔

"عارف احمد! تمہاری بیٹی کو ایک رات کے لیے مہمان بنایا تھا لیکن خدا گواہ ہے اس کی طرف کسی نے میلی آنکھ سے دیکھا تک نہیں تھا۔" اسحاق جمال کے ٹھنڈے لہجے نے عارف احمد کو ساکت کر دیا تھا۔

یہ خبر جس جس کے کانوں تک پہنچی تھی اس نے ایک دفعہ افسوس کرنے کے بہانے مازیہ کو کھوجتی ہوئی اور شک بھری نگاہوں سے ضرور دیکھا تھا۔

مازیہ عارف ایسے کسی شخص کا سامنا کرتے ہوئے سمٹ کر رہ جاتی تھی اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس ماحول سے بھاگ کر کہیں دور چلی جائے ان لوگوں کی شک بھری نظروں سے چھپ کر بیٹھ جائے۔

"ذیشان! تم گھر کیوں نہیں آتے۔ تم سے ملے تمہیں دیکھے اتنے دن ہو گئے ہیں۔" ایک دن دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے ذیشان کو فون کیا تھا۔

"وہ مصروفیت کچھ زیادہ ہے اس لیے کسی اور چیز کا ہوش ہی نہیں رہتا۔" اس کا لہجہ پہلے والا نہیں تھا۔ مازیہ نے دھڑکتے دل کو قابو میں رکھتے ہوئے اس لہجے کو پہچاننے کی کوشش کی۔

"ذیشان.... میں کوئی چیز تو نہیں مازیہ ہوں تمہاری مازیہ۔" وہ سسکی تھی۔

"مازیہ پلیز! مجھے ڈسٹرب مت کرو۔ اس وقت میں واقعی بہت مصروف ہوں۔" وہ الجھا ہوا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے جب تم فارغ ہو جاؤ تو مجھے کال کر لینا۔ پھر ہم ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔"

"مازیہ! میری کال کا انتظار مت کرنا میں کچھ دنوں تک بزی رہوں گا۔"

"ذیشان! پہلے ہی بہت دن ہو گئے ہیں ہمیں بات کیے ہوئے۔ مجھے لگتا ہے تم بھی بدل رہے ہو۔" وہ رونے والی ہو گئی۔

"میں نہیں بدل رہا ہوں بلکہ تم بدل گئی ہو۔" وہ پراسرار انداز میں بولا تھا۔

"میں! میں کیا بدلی ہوں۔ میں تو پہلے والی مازیہ ہوں۔"

"یہ تم کہتی ہو نا۔ لوگوں سے پوچھو جو تمہارے بارے میں کیسی الٹی سیدھی باتیں بنا رہے ہیں اور میں تم سے محبت ضرور کرتا ہوں لیکن اپنے اندر اتنا ظرف اور حوصلہ نہیں پاتا کہ زندگی بھر کے لیے لوگوں کی نظروں میں تماشا بن جاؤں۔ اس لیے پلیز آئندہ مجھے کال مت کرنا۔" اس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں بتا دیا تھا کہ وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح اس پر شک کرتا ہے۔

"تو کیا تم بھی.... تم بھی ذیشان! مجھے ایسا سمجھتے ہو!" بے اختیاری کا دکھ اس کے لفظوں میں کراہنے لگا تھا۔

"میرے سمجھنے یا نا سمجھنے سے کچھ نہیں ہوتا مازیہ! جو حقیقت ہے سو ہے۔ پلیز مجھے آئندہ ڈسٹرب مت کرنا۔"

"ذیشان.... ذیشان.... ذیشان۔" دوسری طرف فون بند ہو چکا تھا۔ وہ بے جان لفظوں میں زندگی کو پکارتی رہی تھی۔

حلقوم ساعت میں
اگ آئے ہیں اب کانٹے
آواز کا اک قطرہ
لیکن نہیں مل پاتا
شبنم تیرے لہجے کی
کس تن میں اترتی ہے
نم تیری ہنسی کا اب
کس تن کو بھگوتا ہے
میں پیاس سے بے کل ہوں
اور تیرے تکلم کا!
اک گھونٹ نہیں ملتا
اس قحط صدا میں دل
اب کے نہ بچے شاید
یہ پیاس سماعت کی

جاں زلزلے کے تلے شاید

مازیہ عارف لوگوں کی طرف نظریں بھن کی شک بھری زہر آلود باتیں؟ مرچ مسالے سے بھری اپنے متعلق مختلف کہانیاں سب سہہ گئی تھی۔ لیکن ذیشان کی بے اعتباری اس کی نس نس کو تیز دھار آلے کی طرح کاٹ گئی تھی۔ جس شخص کو وہ زندگی سے بھی زیادہ قابل اعتبار سمجھتی تھی اس نے اتنی کم ظرفی دکھائی تھی کہ حقائق جانے بغیر اس کی زندگی سے یوں الگ ہو گیا تھا جیسے کبھی اسے جانتا ہی نہ ہو۔

”شکیلہ! اولاد کی مرضی کے آگے ماں باپ کا کیا بس چلتا ہے۔ میں نے تو اس لڑکے کو بہت سمجھایا ہے لیکن وہ میری ایک نہیں سنتا۔ وہ کہتا ہے کہ وہ مازیہ سے شادی نہیں کرے گا۔ ہاں اگر آپ اپنی بہن سے مستقبل میں ایسا کوئی رشتہ ضرور جوڑنا چاہتی ہیں تو پھر فرازیہ کے لیے بات کرلیں لیکن مازیہ نہیں۔“ نبیلہ خالہ شرمسار سی امی جان کے پاس بیٹھی کہہ رہی تھیں۔ اور مازیہ کی آنکھیں یہ سب سن کر مفلوج ہوئی جا رہی تھیں۔

”ارے فرازیہ تو میری پیاری سی بہن ہے۔“ کسی وقت ذیشان نے یہ فقرہ بہت لاڈ سے کہا تھا جو اب مازیہ کے دل پر قیامت ڈھا رہا تھا۔

”لیکن نبیلہ! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اور پھر مازیہ میں اچانک اس کو کیا برائی نظر آنے لگی ہے۔ وہ اور مازیہ ....“

”وہ کل کی بات تھی شکیلہ! اب وہ ایسا نہیں چاہتا۔“ نبیلہ خالہ نے ان کی بات کاٹ کر سفاکی سے کہا تھا اور مازیہ کو یہ سن کر اپنے پاؤں پر کھڑا رہنا دشوار ہو گیا تھا۔

ان کے درمیان اور کیا کیا باتیں ہوئی تھیں اس میں یہ سننے کی تاب تھی نہ حوصلہ۔ وہ قدموں کو گھسیٹتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

فرازیہ تک جب یہ بات پہنچی ذیشان نے مازیہ سے منگنی توڑ کر اسے پروپوز کیا ہے تو اس نے گھر میں ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

”نبیلہ خالہ سے ہمارا رشتہ اتنا کمزور نہیں ہے کہ ہمیں اسے مضبوط کرنے کے لیے مزید کسی رشتے کا سہارا چاہیے۔ وہ آپ کی بہن ہیں اور ہمیشہ بہن ہی رہیں گی میرے لیے ایسا سوچیے گا بھی مت۔ مجھے ذیشان کی خواہش سے زیادہ اپنی بہن کی خوشی عزیز ہے۔“

اور دل سے تو وہ بھی ایسا نہیں چاہتی تھیں سو انہوں نے نبیلہ کو انکار کہلوا دیا تھا۔

”فرازیہ ......“ مازیہ اس سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کچھ نہ کہہ سکی۔ جس طرح اس کی بہن نے اس کا مان رکھا تھا وہ ہلکی پھلکی ہو گئی تھی اور اب اس کے گلے لگی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

”مازیہ! جو شخص زندگی کی اونچ نیچ کو نہ سمجھ سکے، اعتبار قائم نہ رکھ سکے، جو ظاہر میں کچھ ہو اور باطن میں کچھ اور، جس کے قول و فعل میں اتنا تضاد ہو اس کے لیے یہ قیمتی موتی مت ضائع کرو۔ یہ تو اچھا ہے اس نے شروع میں ہی اپنا اصلی رنگ دکھا دیا۔ اگر تمہاری شادی اس سے ہو جاتی اور وہ بعد میں یوں کھل کر سامنے آتا تو سوچو زندگی تمہارے لیے موت سے بھی بدتر ہوتی۔ اس لیے اس پر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں ایک بڑی اذیت سے بچا لیا۔“

فرازیہ کی ہر بات اپنی جگہ سو فیصد درست تھی لیکن مازیہ اس دل کو کیسے سمجھاتی جس پر آج بھی اسی بے وفا کا راج تھا۔

☆ ☆ ☆

ایک چھوٹے سے واقعے نے مازیہ عارف کی زندگی کو سرتاپا بدل کر رکھ دیا تھا۔

ذیشان اب ان کے گھر نہیں آتا تھا۔ صرف نبیلہ خالہ آتی تھیں وہ بھی شکیلہ بیگم کے پاس بیٹھ کر چلی جاتی تھیں۔ ان کی فرازیہ اور مازیہ سے پہلے والی بے تکلفی نہ رہی تھی۔

”ذیشان کی شادی ہو رہی ہے۔“ ایک شام نبیلہ خالہ ان کے گھر سے ہو کر گئیں تو اپنے پیچھے وہ خبر چھوڑ گئیں جس نے مازیہ عارف کے دل کو نئے سرے سے کئی گرم سلاخوں میں پرو دیا۔

شکیلہ بیگم مازیہ سے نظریں چرائی پھر رہی تھیں کہ جیسے اس سارے معاملے میں ان کا قصور ہو۔

”امی جان! آپ تیاری کرلیں آپ کو اس شادی میں ضرور جانا ہے۔“

وہ بہت بے صبری اور لاپروا لڑکی تھی لیکن وقت نے قبل از وقت سمجھدار کر دیا تھا۔

”نہیں بیٹا! نبیلہ سے میں نے کہہ دیا ہے اس کو بیٹے کی خوشیاں مبارک ہوں لیکن ہم میں سے کوئی نہیں آئے گا۔ اولاد کے آگے تو کوئی چیز کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ تمہارے بیٹے نے میری بیٹیوں کے دل دکھائے ہیں ہم اس کی خوشی میں شریک نہیں ہو سکتے؟“

”امی جان! جس طرح ہم سب لوگ مجبور تھے اس طرح نبیلہ خالہ بھی بیٹے کے سامنے مجبور تھیں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اور اگر ان کے اکلوتے بیٹے کی خوشی میں ان کی بہن شریک نہیں ہو گی تو تصور کریں ذرا انہیں کتنا دکھ ہو گا۔ آپ وعدہ کریں آپ وہاں ضرور جائیں گی۔“

”میری بچی!“ شکیلہ بیگم نے اپنی لاپروا اور کھلنڈری سی بچی کا یہ روپ دیکھا تو اسے سینے سے لگا کر رونے لگی تھیں۔

اس نے ماں کو تو سمجھا دیا تھا باقی لوگوں سے بھی اپنے آنسو چھپا لیے تھے لیکن ذیشان کی شادی کا سن کر اس طرح دل کو کوئی نوچ رہا تھا وہ تکلیف سہی نہ جا رہی تھی۔ بھوک پیاس اڑ گئی تھی اور نیند آنکھوں سے یوں روٹھی تھی کہ جیسے اب کبھی مہربان نہ ہو گی۔

☆ ☆ ☆

”بہن! مازیہ کو میری جھولی میں ڈال دو۔ میرا بیٹا اسے پھولوں کی طرح رکھے گا۔ دیکھو اب میری پھیلی ہوئی جھولی کو خالی مت لوٹانا۔ میرا بیٹا بہت صابر اور معصوم ہے۔ اس نے کبھی مجھ سے کچھ نہیں مانگا اور زندگی میں پہلی اور آخری بار جو چیز مانگی ہے وہ اگر میں اسے نہیں دے سکی ہوں۔ بہن! اب کے مجھے خالی ہاتھ نہ لوٹانا میں اپنے بیٹے کا سامنا نہیں کر سکتی۔“

دھوپ ڈھل کر صحن سے ہوتی ہوئی دیواروں پر بسیرا کر چکی تھی۔ درختوں کے پتے ہلکی ہوا سے دھیرے دھیرے ہل رہے تھے۔ شکیلہ بیگم چاول چھنتے چھنتے یکدم ساکت ہوئی تھیں اور اب خالی خالی نظروں سے ان کو دیکھے جا رہی تھیں۔

”اوصاف تمہاری نظروں کے سامنے پلا بڑھا ہے تم سے زیادہ اس کی عادتوں کو کون جانتا ہو گا پھر بھی شکیلہ! تم سوچ لو جتنا دل چاہے انتظار کروا لو لیکن اس بار مجھے خالی ہاتھ نہ لوٹانا۔“ فراست خالہ نے ایک بار پھر اپنی بات دہرائی تھی۔

فرازیہ جو قریب ہی تھی۔ فراست بیگم کی بات سن کر ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”امی جان! اوصاف بھائی بہت اچھے ہیں۔ فراست خالہ صحیح کہہ رہی ہیں۔ وہ اپنی مازیہ کو بہت خوش رکھیں گے۔“

اس نے آج سے بہت پہلے اوصاف جنید کی آنکھوں میں اپنی بہن کے لیے بہت سچی، پاکیزہ اور خالص محبت دیکھی تھی۔ ایسی محبت جو دکھاوے سے نہیں بلکہ عمل سے کی جاتی ہے۔ جس کی سچائی کی گواہی کسی پارک، باغ یا کسی سڑک پر نہیں دی جاتی بلکہ صرف کسی راز کی طرح دل میں چھپائی جاتی ہے اور وقت آنے پر اس کی خوشبو چاروں اور پھیلتی ہے۔

وہ کہہ کر اٹھی اور سیدھی مازیہ کے کمرے میں چلی گئی۔

”مازی! اب تمہیں سچی اور جھوٹی محبت کا فرق معلوم ہو گا۔ دیکھو اوصاف جنید سے ہمارا کوئی رشتہ نہ تھا لیکن وہ تم سے محبت کرتا تھا اور اس نے بھی ذیشان کی طرح بہت سی جھوٹی کہانیاں تمہارے بارے میں سن رکھی ہوں گی لیکن اس میں اور ذیشان میں کتنا فرق ہے کہ اس نے تمہیں مورد الزام نہیں ٹھہرایا اور نہ

تمہاری محبت ختم ہوئی بلکہ فراست خالد پہلے سے بھی زیادہ چاہت اور شوق سے تمہارا ہاتھ مانگنے چلی آئی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اب تم کیا چاہتی ہو؟" وہ سچائی جانتے ہوئے بھی ذیشان کی جگہ اوصاف جاوید کو نہ دے سکی تھی اس لیے اس کی باتوں سے اکتا کر بولی۔

"میں یہ چاہتی ہوں کہ اب امی جان تم سے پوچھیں تو تم انکار نہ کرنا۔ شادی تو تمہیں ایک دن کرنی ہی ہے تو پھر وہ شخص کیوں نہ ہو جو پورے خلوص سے تمہیں چاہتا ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ اور کچھ!" وہ بڑے آرام سے مان گئی تھی۔

مغرب کی اذانیں ہونے لگی تھیں وہ فرازیہ سے کہہ کر وضو کرنے چلی گئی تھی۔

"اب ذیشان نہیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔" وضو کرتے ہوئے بھی اس کا دل عجیب انداز میں کرلایا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ دلہن بنی بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھوں پر مہندی رچی تھی۔ پور پور خوشبو میں بسی ہوئی تھی۔

اوصاف جاوید کو اس بات سے کوئی غرض نہ تھی اسے تو بس اتنا پتہ تھا کہ ماریہ عارف ہمیشہ کے لیے اس کی ہو چکی ہے۔

اس نے ماریہ عارف کو بے تحاشا چاہا تھا لیکن اس کو اس سے مانگا نہیں تھا۔ اس نے اسے ہمیشہ دعاؤں میں اپنے اللہ سے مانگا تھا۔ اس اللہ سے جو معجزے دکھاتا ہے ان دعاؤں میں جن سے تقدیر بدل جایا کرتی ہے۔ محبت کے ساتھ جو بے غرض اور بے ریا ہوتی ہے۔

وہ کم رو تھا۔ اس میں اعتماد کی کمی تھی۔ اس میں صنف مخالف کو اپنی طرف راغب کرنے کے اوچھے ہتھکنڈے نہ تھے لیکن اس میں سچائی تھی اس کے قول و فعل میں تضاد نہ تھا اور پھر اسے اس ذات اعلیٰ صفات سے مانگنے کا ہنر آتا تھا جو کسی کی جھولی خالی نہیں رہنے

دو رکعت نماز شکرانہ ادا کرنے کے بعد وہ کمرے میں آیا تھا۔

"السلام علیکم!" وہ بیڈ پر ماریہ کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

"وعلیکم السلام!" ماریہ کو وہ دن یاد آیا تھا جب اسی طرح سلام کرنے پر اس نے فرازیہ کے سامنے اوصاف کا خوب مذاق اڑایا تھا۔ دل پہ آنسوؤں کی بارش میں کچھ اور تیزی آگئی تھی۔

"میں بہت خوش نصیب ہوں۔ پتہ ہے کیوں؟" اس نے تو گھونٹ الٹ دیا تھا۔ جانے وہ شعلہ جوالہ بن اس کے دل کے تاروں کو چھو گئی تھی۔

"پوچھو گی نہیں کیوں؟"

"کیوں؟" اس کے لہجے میں اصرار تھا سو اسے پوچھنا ہی پڑا۔

"اس لیے کہ تمہارا ساتھ نصیب ہوا ہے۔" اس کا دل ایک بار پھر بھر آیا تھا اور آنکھیں آنسو چھپاتے چھپاتے بھی چھلک پڑی تھیں۔

"آئندہ ان آنکھوں کو کبھی رونے نہیں دینا کیونکہ تمہارے آنسو میں برداشت نہیں کر سکتا۔ تمہیں جو بھی دکھ ہوگا میں اسے اپنی ذات پہ سہوں گا صرف اور صرف خوشیاں تمہاری ہوں گی۔ بولو یہ سودا منظور ہے؟" اس نے ماریہ کے آنسو اپنی انگلیوں کی پوروں پہ چنتے ہوئے ایک جذب کے عالم میں کہا تھا۔

"منظور ہے۔" اس نے کچھ پل کے لیے سوچا اور اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"یہ ہوئی نا بات۔" اوصاف نے مسکراتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

اور ماریہ نے پہلی بار کھل کر مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھوں پر اپنا سر رکھ دیا تھا۔

رخسانہ نگار عدنان

ناولٹ

سعدیہ بیگم سے ردا کی گم صم کیفیت چھپی نہیں رہ پاتی۔ وہ ردا کو بہانے سے عارفہ بیگم سے ملوانے لے جاتی ہیں۔ عارفہ بیگم کی خراب طبیعت اسے ہر چیز بھلا دیتی ہے۔ وہ پوری تندہی سے ان کی تیمارداری کرتی ہے لیکن بدر غازی کا احساس اسے بے کل کیے رکھتا ہے۔ زریاب کی حقیقت کھلنے پر اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ ردا آپ کو بے بسی کی انتہا پر محسوس کرتے ہوئے اللہ سے گڑگڑا کر سکون کی دعا مانگتی ہے۔ ولید کے ذریعے اسے واقعے کے جزئیات کا اندازہ ہوتا ہے تو وہ مزید دل گرفتہ ہو کر واپس سعدیہ بیگم کے پاس جانے کو بے چین ہو جاتی ہے۔ اس کی اچانک روانگی عارفہ بیگم، صوبیا اور ولید کو تعجب میں مبتلا کرتی ہے۔ اسی وقت کسی کی آمد سب کو چونکا دیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر امیبا، سعدیہ بیگم کو دل پر ہاتھ پڑتے دیکھ کر دھک سے رہ جاتی ہے۔

۱۷

سترہویں اور آخری قسط

ضوبیا کے سامنے حارث کھڑا تھا۔

"آپی آ گئی ہیں؟ دیکھو میں میچ ادھورا چھوڑ کر آیا ہوں۔ کدھر ہیں وہ۔ اوکے یار! تھینکس بائے۔" وہ مڑ کر اپنے لفٹ دینے والے دوست کو ہاتھ ہلاتے ہوئے اندر آ گیا۔

"مگر تم تو کہہ رہے تھے آج اکیڈمی میں ٹیسٹ ہے تمہارا فزکس کا اور تم میچ کھیل کر آ رہے ہو۔" ضوبیا وہیں کمر پہ ہاتھ جمائے کر پوچھنے لگی۔

"ڈیئر آپی! میچ کا بھی سیمی فائنل تھا۔ سمجھا کرو سب چلتا ہے۔ آپی کدھر ہیں آپی!" وہ پکارتے ہوئے اندر چلا گیا اور ضوبیا اسے گھورتی رہ گئی۔ ولید کندھے اچکا کر حارث کے پیچھے ہی اندر چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

"ہر انسان خوش قسمتی یا بد قسمتی کو اپنی نظر سے دیکھتا اور سمجھتا ہے مگر ایک پیمانہ تو سب کی نظروں میں سب سے زیادہ قابل قدر ہوتا ہے اور وہ ہے دولت کا پیمانہ!

میری نظروں میں بھی اس پیمانے سے بڑھ کر کبھی کوئی پیمانہ نہیں رہا اور ساری زندگی میں نے اس پیمانے کے تعاقب میں سرپٹ بھاگتے گزاری اور سرپٹ بھاگنے کے دوران میں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ کیسے قیمتی انمول رشتے اور لوگ میں خود اپنے ہاتھوں سے جھٹکتا دھتکارتا اس ایک بے وفا پیمانے کے پیچھے بھاگتا رہا اور اندھا دھند بھاگنے میں میں یہ قطعاً بھول گیا کہ اس پیمانے سے بے وفا شے بھی اس روئے زمین پر اور کوئی نہیں بلکہ اس دنیا کے تماشا گاہ میں سراسر نظر کا دھوکا ہے۔

دولت کا یہ پیمانہ اگر کبھی میرے پاس آ بھی جاتا تو کتنے دن میرے پاس رہتا؟ گنتی کے چند دن اور ایسا ہوا بھی۔ یہ پیمانہ میرے ہاتھ آیا بھی اور میں نے خود اسے اپنے ہاتھوں سے جھٹک کر چکنا چور کر دیا ہے۔ نام نہاد کا لطیفہ!

اس لاحاصل دوڑ کے دوران میں بھول گیا کہ میری اصل دولت روپے پیسے اور زر و جواہر نہیں بلکہ مجھ سے وابستہ رشتے ہیں جنہیں اس بے وفا دولت کی خاطر میں ایک ایک کر کے دھتکارتا رہا۔

میری ہر زیادتی، طعن و تشنیع کا ان گھونسوں کے جواب میں بھی مجھ سے وفادار رہنے والی میری پاکباز، پرہیز گار بیوی جس نے میرے ہر ظلم کو صبر کے ساتھ سہنے کی انتہا کر دی اور اس کے صبر نے مجھے اور شہہ دی۔ آج مجھے سمجھ میں آ رہا ہے کہ ظالم کو ظالم کون بناتا ہے مظلوم کی خاموشی اور صبر......

اس نے خاموشی اور صبر سے اپنے اعمال کے توشہ خانے میں میرے لیے دائمی سزا کیسے درج کرائی۔ ہر لات، ہر گھونسے، ہر تھپڑ، ہر الزام کا جواب آج میرے سامنے ان تاریک اندھیری خوفناک راتوں کی صورت میں موجود ہے۔

اور مجھ سا بد نصیب کون ہو گا کہ میرے جیسے بچوں کے بچپن اور لڑکپن کو ٹھوکریں مارتا کاغذ کے نوٹوں کے پیچھے بھاگتا رہا اور سچ کہوں تو ان نوٹوں کے حصول کے لیے میں نے کس کس برائی کو اپنے گلے کا طوق نہ بار بنایا۔ اب یاد بھی نہیں۔ جوا کھیلا، بھتہ لیا، چوری کی، چکاری، تھوڑا سا فراڈ، چھوٹا موٹا گھپلا اور سب سے بڑا ہاتھ جو میں نے ایک مالدار عورت سے جھوٹی محبت کا فریب رچا کر شادی کر کے مارنے کی کوشش کی مگر پانسہ الٹا پڑ گیا اور میرے ہاتھ ایک جھنجھلائی ہوئی کوفت زدہ ناکام زندگی آئی۔

نیک بیوی کی کھری محبت اور بے ریا ساتھ نے بھی میری آنکھیں نہ کھولیں۔ حقیقتاً میرے قلب پر دولت کی مہر لگ چکی تھی اور یہ مہر آنسوؤں سے، نیکی سے یا دعاؤں کے سحر سے ٹوٹنے والی نہیں تھی اور سچ کہا گیا کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں قلب اندھے ہو جاتے ہیں۔ سو میں دولت کی حرص میں دل کا اندھا ہو چکا تھا۔ سو مجھے کیا سجھائی دیتا تھا۔ الٹا اس ہوس زر میں جو ہاتھ مارا سو الٹا ہی پڑا۔

میرے کردار کا گھٹیا پن اس سے بڑھ کر کیا ہو گا کہ ایک بار بیوی کے دام چوری نے کی کوشش کی تو دوسری بار [illegible] اور میری قسمت کا مذاق دیکھو ہر بار مجھے منہ کی کھانی پڑی۔

ایمپا انصاری...... سعدیہ انصاری کے بعد دوسری بار مجھے اپنی قسمت کی لاٹری لگی تھی کہ جس کا ہر نمبر میرے مقدر سے میچ ہو رہا تھا۔ میں نے اس ٹکٹ کو استعمال بھی بڑی مہارت سے کیا اور دوسری بار قسمت نے بڑی مہارت سے اس کا جواب میرے منہ پر دے مارا اور دو ڈھائی لاکھ کے چیک اور تھوڑے سے زیورات کے ساتھ بھلا میری حرص کا منہ بند ہوتا تھا؟ مجھے تو ڈھیروں ڈھیر دولت چاہیے تھی۔

اگرچہ وہ دو ڈھائی لاکھ بھی میں نے آرام سے ہتھیا لیے۔ اپنی پھپھو جیسی بے وقوف بھتیجی سے مگر دل بے قرار کو قرار نہیں تھا اور بالآخر یوں "چھ ہزار سالہ تپسیا" کے بعد اس دولت کے طلسم کدے کا دروازہ مجھ پر کھل ہی گیا۔ اشتیاق کی صورت میں۔

ہاں! آہ! مگر میری بری قسمت آڑے آ گئی۔

چند دن کے خوابناک عیش کے بعد میری حریص طبیعت نے روز سونے کا انڈا دینے والی مرغی کے سارے انڈے ایک بار حاصل کرنے کے لیے مرغی ہی حلال کر ڈالی اور ساتھ ہی اس طلسم کدے سے ذلت و رسوائی کے ساتھ دھکا بھی مل گیا۔

آج میں ہوں اور عمر قید کی یہ کال کوٹھری کہ جہاں پورے قد کے ساتھ کھڑا ہوں تو کمر کو خم دینا پڑتا ہے میں جو کبھی خمیدہ کمر تو کیا خمیدہ نہیں چلا تھا اور آج سیدھا کھڑا ہونے سے بھی قاصر ہوں۔

مجھے دولت سے بڑا پیار تھا اور اس پیار نے مجھے قدم قدم پر رسوائی، جگ ہنسائی دی اور میں نہیں سمجھا اور اب اس پیار نے میرے جسم پر ہی نہیں میری روح پر بھی سکوں کے نقش کندہ کر دیے ہیں۔ میرے سارے بدن پر اٹھنی، چونی اور روپے برابر اٹھے کے نشانات۔

میرا تو بدن میرے اللہ نے تمسخر بنا دیا۔ دہکتے ہوئے سرخ سرخ جلتے بجھتے دہکتے سکے...... کوئی میری اذیت میری تکلیف کا شاید ہی اندازہ کر سکے۔ درد و [illegible] کلڑی کی طرح جل رہا ہے اور کوئی خیال کرنے والا تو در کنار میری حالت دیکھنے والا بھی نہیں۔ اور یہ سب لکھنے کا مقصد یہ نہیں کہ میری حالت پہ رحم کھا کر میرے لیے رحم کی دعا کی جائے۔ مجھ جیسا رذیل، گھٹیا انسان کسی رحم، کسی ہمدردی کی دعا کا مستحق نہیں اور سچ کہوں تو میرا دل اس تکلیف دہ حالت، ناروا سی والی تنہائی اور گھٹا ٹوپ اندھیرے سے نہیں گھبراتا۔ سوچتا ہوں شاید اسی طرح اگلی زندگی کی دائمی سزا میں کچھ کمی واقع ہو جائے، تھوڑی سی معافی مل جائے۔

تو پھر یہ سب لکھنے کا مقصد؟ یہ سب پڑھ کر بھی جن جن کی زندگیوں کو میں نے دوزخ بنانے کی کوشش کی ان کے دلوں میں میرے لیے ہمدردی کی رمق پیدا نہیں ہو سکتی۔

ایمپا انصاری! بیٹی! اس لیے نہیں کہوں گا کہ مجھ جیسا بد بخت "باپ" کہلوانے کا مستحق ہو ہی نہیں سکتا۔ جو اپنی فرشتوں جیسی معصوم بیٹی کے جذبات کو روندنے اور اس کی روح تک کچلنے سے دریغ نہ کرے وہ کیسے باپ کہلا سکتا ہے؟

میں نے دیکھی تھی تمہاری آنکھوں میں اس منحوس پیمانے کے لیے تڑپ، تشنگی اور حسرت......

نعمتیں جب تک ہمارے پاس ہوں ہم انہیں محسوس تک نہیں کرتے بلکہ اکثر دوسروں کی طرف دیکھ کر اپنی حالت پر جلتے کڑھتے ہی رہتے ہیں۔ میں نے بھی تو ایسا ہی کیا۔ کبھی باپ کی محبت نے انسانی فطرت سے مغلوب ہو کر بچوں کو سینے سے لگانے کی خواہش بھی کی تو بیوی "دفع دور...... یہ منحوس تھوڑے سکتے ہیں" کہہ کر جھٹک دیا اور آج...... آج بری طرح سے یہ ذہنی طلب ہمک رہا ہے کوئی...... کوئی میرے پاس ہو...... روشنی...... رافع ایک بار ایک بار...... میں اپنے بچوں کو گلے لگا سکوں، گلے نہ بھی لگا سکوں، ان کو چھو کر ان کا محبت بھرا لمس اپنی انگلیوں کی پوروں میں محفوظ کر سکوں۔

مگر میں نے تو انہیں کبھی نعمتیں کیا ساتھ رہنے والے بھی نہ گردانا اور آج...... یہ تو میری تا عمر کی

بے بسی ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔

اور نعمتیں جو تم سے چھین لیں ان کا ملال ہمہ وقت تمہاری حسرت بھری نگاہوں میں“ میں نے بغور دیکھا۔

اب اس کال کوٹھری میں بیٹھ کر سوچتا ہوں، تجزیہ کرتا ہوں کہ ہم سے وہی کچھ چھینا جاتا ہے جو ہمارا ہوتا ہی نہیں۔

اور چھوٹا نقصان ہمیشہ بڑے فائدے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اگر ہم بے تحاشا واویلا نہ کریں تو۔

رافع مجھ جیسے بدنصیب کھوٹے سکے جیسے انسان کا کھرا ہیرے جیسا بیٹا ہے کہ جسے یقیناً ”بیٹا“ پکارنے کا بھی مجھے حق نہیں مگر تم نے میری کمینگی اور گھٹیا پن کے باوجود میرے ساتھ نیکی کی ہے۔ میرے چار آنسو بہانے پر اپنی کل متاع میرے حوالے کر دی۔ اس وقت تو مجھے اپنی کامیاب اداکاری پر ہنسی اور تمہاری بیوقوفی پر مزہ آیا تھا اور آج سوچتا ہوں تو تمہاری یہ معصوم حرکت میرے لیے حسد و رشک کا باعث ہے کہ تم نے کس طرح اپنے نصیب کے خسارے کو میری تقدیر کا حصہ بنا دیا۔

”انصاری ہاؤس“ کا جھوٹا سہارا، مصنوعی خوشی تم سے چھین کر رافع جیسے انمول انسان کی رفاقت شاید تمہاری اس معصومیت کو دیکھتے ہوئے رب نے تمہاری قسمت میں لکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ایمپا انصاری! خوشیاں مناؤ اور سارے آنسو دھو ڈالو..... کہ میری کمینگی اور گھٹیا پن نے تمہارے لیے دائمی مسرت کا اہتمام کروا لیا اور کبھی روپے پیسے جیسی بے جان چیز کے چھن جانے پر ایک آنسو نہ بہانا۔ اپنے انمول آنسو اس چیز کے لیے بہاؤ جو تمہارے لیے رو سکتا ہے اور دولت جیسی بے وقعت شے کسی کے لیے ایک قطرہ آنسو نہیں بہاتی پھر ہم اس کے چھن جانے پر کیوں روتے ہیں؟

تمہاری اصل دولت رافع جیسا بلند کردار انسان ہے اور دیکھنا تمہاری یہ دولت دن دگنی رات چوگنی ہوتی جائے گی کہ تمہارے دل سے اس کے چھن جانے کے سارے ملال کہیں گم ہو جائیں گے۔ اسے تحفہ، ایک باپ کی بے جا تعریف نہ سمجھنا۔ اپنے بیٹے کے لیے بستر مرگ کی گھڑیوں میں اذیت کے جہنم سے گزرتے انسان کا بے ریا مخلص مشورہ جاننا۔

تمہیں چھوٹے دکھ پہنچا کر بڑی خوشیوں کی نوید سنائی گئی ہے۔ اس نوید کو کان لگا کر سنو۔

جانے سے پہلے معافی نہیں مانگوں گا نہ تم سے نہ کسی اور سے، مجھے معلوم ہے میں معافی کا حقدار ہوں ہی نہیں۔

اور اس خط کو پڑھنے کے بعد ضائع کر دینا۔ آفتاب زبیری کو یہ گوارا نہیں کہ اذیت کی ان گھڑیوں میں کوئی غائبانہ ہی اس پر ترس کھائے۔ ہاں روشی سے جب بھی ملاقات ہو تو ایک الگ پیار بھرا ہاتھ میری طرف سے اس کے سر پر ضرور رکھ دینا۔

یہ خط میں تم تک کیسے پہنچا رہا ہوں؟ ان سارے بے جان نوٹوں کے بدلے جو میں نے تم سے اینٹھے تھے، اب میرے لیے کاغذ کے پرزے ہیں کسی کے کام آجائیں گے۔“

اندھیری رات کے مسافر کا آخری پیغام

صبح کے اجالوں کے نام

خط پر جا بجا آنسوؤں کے دھبے تھے اور ٹوٹی پھوٹی تحریر، بے ربط جملے آفتاب زبیری کی شکستہ حالت کے گواہ تھے۔

وہ خود بھی تو رو رہی تھی۔

اس منحوس خاکی لفافے کا عقدہ حل ہو چکا تھا۔ اور اب اسے یاد آیا تھا ملازمہ نے اسے یہ کہہ کر لفافہ دیا تھا کہ آپ کے لیے باہر سے کوئی شخص دے کر گیا ہے۔ وہ اس وقت فریال کی اذیت بھری کہانی سن کر آرہی تھی۔ ذہنی طور پر بری طرح سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ اس نے تو شاید ملازمہ کی بات بھی نہیں سنی تھی۔ خاکی لفافے سے فوراً ”طلاق“ کے وسوسے نے سر اٹھایا اور اس کے دل و دماغ کی دنیا تہہ و بالا ہو گئی۔

وہ زریاب سے ملنے کے بعد اپنے برباد دل کو پھر سے آباد کرنے کے لیے اس کی ہمراہی کے لیے بری طرح

سے بے تاب ہو رہی تھی۔ اس وقت تو اسے زریاب ہی اپنے ہر درد کا درماں، ہر زخم کی دوا لگ رہا تھا جو اس کے خوب صورت رومانس بھرے ماضی کو ایک بار پھر زندہ کر کے اس کی زندگی کا حصہ بن سکتا تھا اسی لیے تو رافع سے علیحدگی کے مطالبے میں شدت آگئی تھی۔

اور زریاب کی جو بھیانک صورت فریال نے اسے دکھائی تھی کہ اسے لگا وہ بھی کوتاہ بینی اور حماقت کے ہاتھوں خود اپنی زندگی کی کشتی کو آگ لگانے چلی تھی۔

رافع کے ساتھ وہ کیوں ایڈجسٹ نہیں کر پا رہی تھی؟ وہ جب بھی رافع کی دبی ہوئی شخصیت کا زریاب کی شاندار، ڈیشنگ پرسنالٹی اور دولت کی چمک دمک سے مقابلہ کرتی تو دل ہر سمجھوتے سے انکار کر دیتا۔

اس کے دل کی دوسری چبھن جب اس نے رافع کو روشی کے معاملے میں جنگلیوں کی طرح چیختے اور گالیاں بکتے سنا۔

اور جو زبان اور فحش گفتگو زریاب کے بارے میں فریال نے بتایا۔ رافع کی بدکلامی اس کا عشر عشیر بھی نہیں تھی۔

زریاب کے مقابلے میں رافع کہاں کھڑا تھا

مگر آج وہ جس مقام پر کھڑا تھا وہ اس کی اپنی ان تھک محنت کا پھل تھا۔ کسی کے باپ کی بخشی ہوئی وراثت نہیں جس کے بل بوتے پر زریاب اپنا قد کاٹھ اونچا کیے کھڑا تھا۔

اور میرا دل جو اس سے خائف تھا اس دل میں لطیف درد نے کروٹ لی کہ وہ مجھے..... ایمپا انصاری کو کیسے نظر انداز کر سکتا ہے۔ ہاں صرف یہ غم تھا سب سے بڑا کہ وہ مجھے اگنور کر رہا ہے۔

”یعنی ابھی رافع نے کوئی فیصلہ نہیں کیا..... اور ان سارے نئے واقعات کی روشنی میں ابھی تو میرے دل نے بھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔“ اچانک ہی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی تھی نہ جانے کب کا سینے میں گھٹا ہوا سانس اس نے بصد اطمینان سے خارج کیا۔

”وہ سب کچھ جو میرے دل کے نہاں خانے میں اندر ہی کہیں پوشیدہ ہے وہی سب تو رافع کے دل میں ہے تب ہی تو وہ میری ضد کو ٹالے جا رہا ہے۔

وہی..... وہی تو ہے میرا چارہ گر..... میرے ہر درد کی دوا اور میں خواب کے پیچھے سراب کے پیچھے خوار ہو رہی تھی۔“

وہ آنکھیں موندے مسکرائے جا رہی تھی۔ ایک زمانے کے بعد جیسے اس کے اعصاب پر دھری غم کی چٹانیں ایک ایک کر کے اس کے قدموں میں جا گری تھیں۔ اس کے کندھے ہر بوجھ سے آزاد ہو گئے تھے۔

وہ اٹھی اور اس خط کو شائع کرنے چل دی آفتاب زبیری کی خواہش کے مطابق..... شاید اسی ایک نیکی کے عوض اس دنیا یا اس دنیا میں آفتاب زبیری کی سزا میں تخفیف ہو جائے۔

”ان کے مجھ پر ایک نہیں دو احسان ہیں۔ ایک اس طوفانی رات کو مجھ پر جھوٹا الزام لگانے کا احسان اور دوسرا آج .....“ وہ جلتے ہوئے کاغذ کے شعلوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

”اسی لیے پھپھو رو رہی تھیں۔“ اسے سعدیہ بیگم کے آنسو یاد آئے دفعتاً باہر فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

”رافع کا فون ہوگا۔“ پہلی بار اس کا دل فون کی گھنٹی سن کر انوکھی تال پر دھڑکا تھا۔

وہ تیزی سے فون کی طرف بڑھی۔

”تمہارے پاس مجھ سے ملنے کے لیے صرف اڑتالیس گھنٹے ہیں۔ ان دو دنوں کے دوران اگر تم مجھ سے ملنے نہ آئیں تو مجھ سے محبت کے جو بڑے بڑے بیان تم نے باندھے ہیں پرسوں تک سارے شہر میں نشر ہو جائیں گے۔ مجھے معلوم تھا تم ایک دن میرے ساتھ یہ گھٹیا رویہ ضرور اپناؤ گی اسی لیے..... میں نے اس دن کی تیاری پہلے سے کر رکھی تھی۔ ہم دونوں کے بیچ ٹیلیفون پر، میرے بلیک بیری کا ریکارڈنگ سسٹم ہمیشہ آن ہوتا تھا کہو تو کوئی خوب صورت سے دو چار جملے سنوا دوں یا تم یونہی مجھ سے ملنے آجاؤ گی؟“ اس وقت اس کی جو ذہنی حالت تھی وہ کسی بھی طرح زریاب کے فون کے لیے تیار نہ تھی اور اس کا فون نہ سننے کے لیے

تو اس نے اپنا سیل فون مسلسل آف کر رکھا تھا۔ مگر وہ اس طرح کے اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر سکتا ہے اس کا اسے قطعاً اندازہ نہیں تھا۔

"نہیں..... میں نہیں آؤں گی جو کر سکتے ہیں کر لیں۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

"ویل ویری ویل۔ مجھے تمہاری یہ بہادری پسند آئی۔ اوکے اب سب کچھ تمہارے حسب خواہش ہوگا بلکہ یہ تو تمہارے ساتھ نیکی ہی ہوگی کہ رافع جو تمہیں طلاق دینے پر آمادہ نہیں وہ تمہاری رومانٹک گفتگو سننے کے بعد ایک منٹ کی تاخیر نہیں کرے گا۔ چلو ہم کسی کا بھلا ہی کر سکیں۔ تم نہیں آتیں نہ سہی کل یا پرسوں شام کو میں خود حاضر ہو جاؤں گا کیونکہ تین دن بعد میری سیٹ کنفرم ہے۔ اب جانے سے پہلے اپنی ڈارلنگ سے آخری ملاقات نہ کی تو یہ پیار کی بدنامی ہو گی چلیں۔ جی محبت کے سارے تقاضے ہم ہی نبھائیں گے۔ اوکے ٹیک کیئر بائی ملتے ہیں....."

اس کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا۔ اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔

اسے تو یاد ہی نہیں رہا تھا کہ وہ جس شاخ پر بیٹھی تھی بار بار اسے کاٹنے کی کوشش کر چکی ہے اور آج اس کی یہ کوشش رنگ لا رہی تھی۔

"تو یہ ہے میری زندگی میں خوشی کی حقیقت..... رافع کتنا ہی بلند کردار، روشن خیال، کھرا اور مخلص کیوں نہ ہو کم از کم بے غیرت نہیں۔ اس کا تو مجھے اچھی طرح سے علم ہے جب بھی موقع آیا وہ غیرت پر محبت اور اپنی ذات کی ہر خوشی کو قربان کر ڈالے گا۔ اوہ میرے خدا! یہ میں نے کیا کیا؟"

وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے جھکتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"کل سے عارفہ بھابی اور ضوبیا کے دس فون آ چکے ہیں کہ تم اچانک کیوں چلی آئیں اور فوراً آنے کا کہہ کر آئی تھیں پھر آئیں بھی نہیں۔ بے چارہ حارث تو تم سے ملا بھی نہیں۔ چلو رہنا نہیں ویسے جا کر مل آؤ۔" پھپھو اٹھتے بیٹھتے اسے کہہ رہی تھیں۔

اور وہ بس فکر فکر انہیں دیکھے جاتی یا وہاں سے اٹھ کر چل دیتی۔

"آخر ہوا کیا ہے؟ کچھ پتا بھی تو چلے کسی نے کچھ کہہ دیا اور یہ رافع کو دیکھو پورے چار دن ہو گئے آج کوئی فون نہیں آیا خود کر رہی ہوں تو وہ مشین بولتی ہے آگے سے..... ایسے تو کبھی نہیں ہوا کہ وہ مجھے فون کرنا بھول جائے۔" وہ بات کرتے کرتے اٹھ کر چل دیں۔

"عصر کا ٹائم ہو رہا ہے نماز پڑھ لوں۔ تم بھی اٹھ کر پڑھ لو اور چلو وہ گھڑی جا کر ان سے مل آتے ہیں۔ تم ذرا رافع کو فون کرنے کی کوشش تو کرو شاید نمبر مل ہی جائے۔" وہ جاتے جاتے اسے کہہ گئیں۔

وہ بیٹھی لب کاٹتی رہی۔

"زریاب کی ڈیڈ لائن ختم ہونے میں چند گھنٹے باقی ہیں۔ رات کو یا کل شام..... یا اللہ میں کیا کروں.....؟ پھپھو کو بتا دوں سب۔ وہ کیا سوچیں گی کہ میں اس طرح جھوٹ بول بول کر اس سے ملنے جاتی تھی۔ بے شرمی اور ڈھٹائی کے ساتھ۔"

وہ بے چینی سے اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

وہ ایک پل کو خوفزدہ سی ہو گئی۔

"زریاب کا فون ہو گا۔" وہ وہیں کھڑی سہمی ہوئی نظروں سے بجتے فون کو دیکھتی رہی۔

"رافع کا فون نہ ہو میں اسی سے پوچھوں وہ کب آ رہا ہے؟" اسے اس پل رافع کا خیال کسی ڈھال کی طرح لگا تھا پھر چھاؤں کی طرح..... بے اماں کڑی میں کسی سائبان کی طرح۔

"ہیلو....." اس نے کانپتی آواز میں ریسیور کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔

"آپا! آپا! تم آ جاؤ..... تم کیوں چلی گئی تھیں ممی....." ضوبیا بری طرح سے رو رہی تھی۔

"ضوبیا! کیا ہوا؟ بولو کیا ہوا ممی کو؟" وہ تڑپ کر بولی۔

"ابھی تایا جی آئے تھے انہوں نے ممی کو، چاچو کو، ولید کو بہت برا بھلا کہا اور ساتھ ہی کہہ گئے کہ ہم لوگوں

کا جتنا بھی حصہ بنتا تھا وہ ماہانہ خرچ کی صورت میں انہیں دیتے رہے ہیں۔ سارا حساب کتاب ان کے پاس لکھا رکھا ہے ہمارے حصے میں فقط دو تین لاکھ آئیں گے ورنہ کہتے ہیں تم لوگ کیس کر دو۔ ممی تو کچھ بول ہی نہ سکیں وہ گرجتے برستے چلے گئے اور ممی وہیں بے ہوش ہو گئیں۔ میں انہیں ہسپتال لے کر جا رہی ہوں پلیز تم آ جاؤ۔"

"میں آ رہی ہوں ضوبیا! تم فکر نہیں کرو گھبراؤ نہیں میں آ رہی ہوں۔" وہ آنسوؤں کے درمیان تیزی سے بولی۔ ضوبیا شاید پہلے ہی فون بند کر چکی تھی۔

"کیا ہوا؟" پھپھو اس کی پریشان آواز سن کر اس کے پاس آ کھڑی ہوئیں تو اس نے روتے ہوئے ساری بات بتا دی۔

"اوہ یہ تو بہت برا ہوا۔ پتا نہیں بھائی صاحب نے اس دولت کی خاطر اور کتنی جانوں سے کھیلنا ہے اور جس کے لیے یہ سب کچھ سمیٹ رہے ہیں وہ عیش میں اڑاتے ہوئے گویا اسے تیلی لگا رہا ہے۔ چلو تم کپڑے بدل لو میں بھی چلتی ہوں۔" وہ سہارا دیتے ہوئے بولیں۔

"نہیں میں ایسے ہی ٹھیک ہوں چلیں۔"

وہ دونوں جب ہسپتال پہنچیں تو عارفہ بیگم کو آئی سی یو میں لے جایا جا چکا تھا۔

"ڈاکٹرز کہہ رہے ہیں اگلے چوبیس گھنٹے ان کے لیے بے حد خطرناک ہیں اگر سروائیو کر گئیں تو ٹھیک ہے ورنہ..... بہت جان لیوا ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔" ضوبیا نے روتے ہوئے بتایا تھا۔

کھڑے کھڑے سب کی ٹانگیں شل ہو گئیں اور دعا کرتے لب تھکنے لگے باہر شام گہری رات میں ڈھل رہی تھی۔ اس کا موبائل بار بار بج رہا تھا اور ہر بار نمبر دیکھتے ہی اس کا دل ڈوبنے لگتا۔

اسے رافع کی کال کا انتظار تھا اور زریاب..... شاید انتظار کی آخری انتہا پر تھا۔

"بیگم صاحبہ! مجھے اجازت ہے میں جاؤں۔ موسم بھی خراب ہو رہا ہے۔" ڈرائیور سعدیہ بیگم کے پاس آ کر بولا تھا۔

"ہاں تم جاؤ۔" انہوں نے اسے اجازت دے دی۔

"ٹھہرو حبیب گل۔" وہ چند لمحوں بعد اس کے پیچھے چلی آئی۔

"مجھے جاتے ہوئے ذرا ڈراپ کر دینا۔" اس نے آر یا پار ہو جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"کیوں اس کو اور شہہ ملتی جائے گی مجھے کھا تو نہیں جائے گا۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔" اس نے دل میں سوچا اور پھپھو کو تھوڑی دیر میں آنے کا کہہ کر چلی آئی۔

"بی بی جی! باہر موسم بہت خراب ہے۔ بارش ہو رہی ہے اور بادل....."

"تم مجھے صرف ڈراپ کر دو گے۔" وہ دو ٹوک لہجے میں کہتے ہوئے اس کے ساتھ باہر آ گئی۔

باہر تیز بارش ہو رہی تھی اور سارا آسمان بادلوں سے اٹا پڑا تھا۔

"تو میری قسمت کا فیصلہ آج پھر یہ دیوانہ وار برستی بارش ہی کرے گی۔" وہ ونڈ اسکرین پر تیزی سے گردش کرتے وائپرز کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

وہ اب اس کشمکش کے برزخ سے نکل آنا چاہتی تھی اور اس برزخ سے نکلنے کا تاوان کیا ہو گا اس کی خبر اس کے دل ناداں کو نہ تھی۔

☼ ☼ ☼

"وہ کہہ رہے ہیں وہ نیچے نہیں آ سکتے انہیں ٹمپریچر ہے آپ اوپر آ جائیں۔" ریسپشنسٹ نے ریسیور رکھتے ہوئے اس سے کہا۔ وہ چند لمحے یخ فرش پر جیسے گڑی رہ گئی۔

"یہ خوف یہ وحشت میری جان لے لے گا۔ آج جو ہو گا دیکھا جائے گا۔" اس نے لفٹ سے اتر کر کاریڈور کے ریڈ کارپٹ پر چلتے رکتے بے شمار بار سوچا اور آخر کار فیصلہ کر لیا۔

"بس جو ہو سو ہو۔" اور وہ اندر داخل ہو گئی۔

وہ واش روم سے گیلا چہرہ لیے نکل رہا تھا اس کی طرف دیکھ کر بڑی جاندار مسکراہٹ اچھالی۔

"میں نیچے آنا چاہ رہا تھا مگر نقاہت چلنے نہیں دے رہی تھی۔ اسی لیے تمہیں زحمت دی ورنہ تمہارے خوف سے میں آگاہ ہوں۔" وہ جتانے والے انداز میں بولا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔" اس نے کنکھیوں سے سائیڈ ٹیبل پر پڑی "بوتل" کی طرف دیکھا زریاب کی آنکھوں کے سرخ ڈورے اور لڑکھڑاتا لہجہ تو اس کا گواہ تھا۔

"بیٹھو نا میں جانتا ہوں تم کتنی بہادر ہو۔" اس نے بے تکلفی سے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر کاؤچ پر بٹھانا چاہا۔

"پلیز۔" وہ جیسے کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی تھی۔

"میں خود بیٹھ سکتی ہوں اور میرے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔" اسے یک دم یاد آیا تھا کہ ممی ہسپتال میں ہیں اور کس وجہ سے ہیں۔ اس کا خون کھولنے لگا۔

"میں جانتا ہوں مائی ڈیئر! یہ ادائیں حسین والوں کی شان ہوتی ہیں۔ تمہاری موجودگی اور یہ قاتل موسم ہم خود کو سنبھالیں تو کیسے؟" وہ لڑکھڑاتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔

"ہٹ جائیں۔۔۔۔" اس نے چلاتے ہوئے اسے دھکا دینے کی کوشش کی مگر وہ تو کسی بھاری چٹان کی طرح وزنی تھا۔

"چھوڑو مجھے۔۔۔ چھوڑو۔۔۔" اس نے اپنی پوری طاقت لگائی تھی اسے دھکیلنے کے لیے۔

"چھوڑنے کے لیے تو نہیں پکڑا زریاب۔۔۔۔ بس چند خوب صورت لمحات اس حسین شام میں اپنے اس پروانے کی جھولی میں ڈال جاؤ اور بس۔۔۔ اتنی سی بات کے لیے اتنے نخرے۔۔۔۔ بھول گئیں کبھی ہم بھی تمہاری چاہ تھے۔ تمہاری صبح تھے تمہاری شام تھے۔۔۔۔ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد۔۔۔۔" وہ اس کے بازو جکڑے لڑکھڑاتی آواز میں کہہ رہا تھا۔

اسے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ اتنی کمزور اور کم ہمت ہے تھوڑی سی کوشش اور زور آزمائی کے بعد ہی اس کی ہمت دم توڑ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

جس کے ساتھ کبھی اس نے دن رات رو رو کر دعائیں مانگی تھیں آج اس کے ساتھ رسوائی اس کا مقدر بننے والی تھی۔

"میں نے ایسا کیوں کیا۔۔۔ کیوں آگئی اکیلی ادھر فریب کھانے۔۔۔ فریال نے کہا تھا۔۔۔ یا! وہ انسان کے روپ میں چھپا ہے شیطان ہے۔۔۔ اور میں نہ جانے کس زعم میں اس شیطان سے نپٹنے چلی آئی میرے خدا! میری مدد کر۔۔۔۔"

اور پھر تو نہ جانے کیسے اس کے اندر کوئی لاوا سا بھڑک اٹھا تھا۔

اس نے زریاب کے ہاتھ پر زور سے کاٹتے ہوئے پوری طاقت سے اسے دھکا دیا اور کاؤچ کے دوسری طرف الٹ گئی۔

زریاب شاید اس کے کمزور پڑ جانے سے اس دھکے کے لیے تیار نہیں تھا تبھی لڑکھڑاتے ہوئے بیڈ کی سائیڈ سے ٹکرایا چند لمحوں بعد وہ سر پکڑ کر بمشکل اٹھا۔

ایمہا کے پاس بس یہی چند لمحے تھے۔ اس نے واش روم کے پاس پڑا پیتل کا گملا اٹھا کر زریاب کی طرف پھینکا۔ اور زریاب کے منہ سے نکلنے والی تیز چیخ نے اسے بتا دیا کہ اس کا نشانہ خطا نہیں ہوا۔

وہ اس کے سنبھلنے کا انتظار کیے بغیر دروازے کی طرف لپکی پتا نہیں دروازہ باہر سے لاک تھا یا آٹومیٹک لاک ہو گیا تھا اس کی ہزار کوشش اور جھٹکوں سے بھی نہ کھل سکا۔

زریاب دونوں ہاتھوں میں سر پکڑے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

وہ چیختی ہوئی واش روم کی طرف بڑھی اور جلدی سے اندر گھس کے لاک لگا لیا۔

وہ اب دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ "اگر اس نے لاک باہر سے کھول لیا تو۔۔۔" اس نے گھبرا کر دروازے کے اوپر لگی چٹخنی بھی چڑھا لی اور خود نیچے

بیٹھ کر ہچکیاں کرتے ہوئے بے اختیار رونے لگی۔

نجانے کتنی ہی دیر گزر گئی اسے کچھ پتا نہیں چلا۔

"کیا کروں! باہر بھی مکمل خاموشی ہے کیا معلوم وہ درندہ گھات لگائے بیٹھا ہو۔۔۔ اب کیا میں ساری رات ادھر۔۔۔ ایک بار پھر نہیں نہیں میرے خدا! اب کی بار نہیں۔۔۔ رحم کر مجھ پر رحم کر میری خطائیں بخش دے۔۔۔ ممی! پھپھو میں نے یہ کیا کر ڈالا۔۔۔ کیا کروں؟" وہ منہ پر ہاتھ رکھے اپنی سسکیاں روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

باہر ابھی بھی بارش ہو رہی تھی۔ باتھ روم کی چھت کے پاس چھوٹا سا روشن دان تھا بارش کی آواز ادھر ہی سے آ رہی تھی۔

"یا اللہ! کیا کروں! کیا دروازہ کھول کر باہر جاؤں۔" وہ وحشت بھرے انداز میں اٹھ کر ٹہلنے لگی۔

کان لگا کر دروازے سے باہر کوئی آواز سننے کی کوشش کی مگر باہر مکمل خاموشی تھی۔

"اگر زریاب کو کچھ ہو گیا۔۔۔۔ وہ گملا کتنا بھاری تھا اس کے شاید خون بھی نکل رہا تھا۔۔۔ میں یہاں باتھ روم میں بند ہوں۔۔۔ وہ باہر مر۔۔۔ نہیں نہیں میں مر جاؤں گی۔" اس خیال سے تو اس کی روح تک کانپ اٹھی تھی ایسا بہرحال اس نے کبھی نہیں چاہا تھا۔

"اگر زریاب ٹھیک ٹھاک ہوا اور ہوش میں۔۔۔۔ اور میرے انتظار میں۔

اور اگر وہ۔۔۔ مر گیا ہو۔۔۔ تو بھی میں نہیں بچ سکوں گی۔"

ایک طرف کنواں اور دوسری طرف کھائی والا حساب تھا۔ اسے لگا یہ منحوس بارش اس کی زندگی کو آخری اندھیروں کے حوالے کرنے آئی ہے۔

وہ نیچے بیٹھ کر ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"کاش میں کسی کو بتا ہی آتی۔۔۔ ولید کو ہی ساتھ لے آتی کسی کو تو ہمراز بنایا ہوتا۔۔۔ حارث کو لے آتی۔۔۔ میرا موبائل باہر پڑا ہے کمرے میں۔۔۔ اگر میں کسی طرح ولید کو کال کر سکوں۔۔۔ مگر باہر کیسے جاؤں؟"

اور پھر شاید اس کے آنسوؤں پر تقدیر کو ترس آ گیا کسی دل سے چاہنے والے کی کوئی دعا اس کے حق میں مقبول ہوئی یا اس کی اپنی ہی کسی نیکی کا بدل۔۔۔ اس کے کان قریب ہی کوئی غیر مانوس سی آوازیں سن رہے تھے۔

اس نے گھبرا کر چہرے سے ہاتھ ہٹائے اور ادھر ادھر دیکھا۔

"اوہ میرے خدایا! مائی گاڈ اوہ۔۔۔" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے دیکھتی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

وہ سارے سفر کے دوران ایک پل کے لیے بھی پرسکون نہیں ہو سکا تھا۔ اس ذہنی کشمکش نے اس کے اعصاب شل کر ڈالے تھے مگر کوئی حل نظر نہ آتا تھا۔ ایک آخری حل تو ان کاغذات کی صورت میں اس کے بریف کیس میں موجود تھا جو وہ ڈائیورس پیپرز کی شکل میں تیار کروا کے لے جا رہا تھا۔

بیا کے لیے۔۔۔ جو اس نے اپنے لیے اکلوتی فرمائش کی تھی۔۔۔ وہ دیکھیے اس کی یہ خواہش کن مراحل سے گزر کر پوری کرنے کے قابل ہوا تھا یہ بس وہی جانتا تھا۔

کاش۔۔۔ کاش پہلے دن سے ہی اپنے دل میں چھپے ان جذبات کو بیا پر آشکار کر دیتا خواہ اسے ناگوار ہی گزرتا جس طرح آہستہ آہستہ وہ ناموافق ماحول میں رہنے کی عادی ہوتی چلی گئی اسی طرح میرے جذبات بھی اس کے دل پر خواہ ہولے ہولے سہی اثر کرتے جاتے مگر میں نے تو ان جذبات کو سیپ کے موتی کی طرح سخت خول جیسے نظر انداز کر دینے والے رویے کے پیچھے چھپا کر رکھا اچھے حالات سے مشروط کر کے۔۔۔ جب میں بیا کے لیے سب سہولتیں حاصل کر لوں گا پھر ان موتیوں جیسے سچے انداز بھرے جذبات کو اس کے سامنے کھول کر رکھ دوں گا۔

اور میں جو ساری زندگی وقت کی قدر کو اپنی ہر ترجیح پر اولیت دیتا رہا بیا کے معاملے میں بھول گیا کہ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا کہ مناسب و موافق حالات پیدا ہونے پر مجھ جیسے منصوبہ ساز اپنے جذبات کا اظہار

سامنے صوفے پر ولید کا موبائل پڑا تھا جاتے ہوئے شاید وہ ادھر ہی بھول گیا تھا۔ رافع نے آگے بڑھ کر موبائل اٹھالیا۔

"وہ... ولید بھائی... پلیز تم فوراً چلے آؤ... میں ہوٹل... کے کمرے میں ہوں۔ میں یہاں لاکڈ ہوں۔ پلیز آجاؤ پلیز ولید" وہ ہچکیوں کے ساتھ روتے ہوئے کہہ رہی تھی اور رافع کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔

اسے بات کی سمجھ میں نہیں آئی تھی مگر ہچکیاں سن کر اس کی سماعتوں میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔

"وہ اس وقت ہوٹل کے کمرے میں کیا کرنے گئی ہوگی اور... اور ولید کو فون...؟"

"اللہ کا شکر ہے چھوٹی تائی کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔ ڈاکٹرز کافی مطمئن ہیں۔ خطرہ تو ابھی ہے مگر پہلے سے کم تمہارا آنا مبارک ہوا۔" اسی وقت ولید اندر آتے ہوئے بولا تو رافع نے چونک کر ہاتھ میں پکڑا موبائل دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے ہاتھ پشت پر کرلیا۔

"تمہارے پاس گاڑی ہے نا!" وہ یک دم ولید سے بولا۔

"ہاں ہے۔" وہ کچھ حیران سا بولا۔

"مجھے ذرا چابی دو میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔" وہ عجلت بھرے انداز میں بولا تو ولید نے کچھ بھی پوچھے بغیر چابی نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی تو وہ ولید کا موبائل آہستگی سے پیچھے صوفے پر رکھتے ہوئے "ابھی آتا ہوں۔" کہہ کر باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

دروازہ لاکڈ تھا چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے دروازے پر دستک دی۔ اندر مکمل خاموشی تھی۔

اس نے ایک قدم پیچھے ہو کر روم نمبر پڑھا، یہی نمبر تھا جو ایبہا نے بتایا تھا۔ رافع نے اب کے ذرا زور سے دستک دی۔ مسلسل خاموشی پر اس نے کی ہول سے اندر جھانکا۔

سامنے بیڈ خالی تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر پڑی بوتل نے اس کا خون کھولا دیا۔ اس نے دروازہ دھڑ دھڑانا شروع کردیا۔

"ایبہا! تم اندر ہو تو دروازہ کھولو۔" اس بار اس نے بلند آواز میں کہا تھا۔ بند دروازے کے پیچھے ہلکی سی آہٹ ہوئی۔

"دروازہ لاکڈ ہے شاید۔" اس کی کانپتی ہوئی آواز رافع کو سنائی دی تو ایک گہرا اطمینان اسے اپنے رگ و پے میں اترتا محسوس ہوا۔ وہ حیران سی تھی۔

"ہینڈل کو گھما کر دیکھو ورنہ چابی اندر ہی کہیں ہوگی۔"

دروازے کے ساتھ کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ رافع کے صبر کا پیمانہ جیسے چھلکنے کو تھا تب ہی دروازہ کھل گیا۔

"را... رافع۔" وہ رافع کو اپنے سامنے پانے کی بالکل بھی توقع نہیں کر رہی تھی۔ اس کی حالت بے حد مخدوش ہو رہی تھی۔

"رافع۔" پھر گھٹی گھٹی سی چیخ اس کے لبوں سے نکلی اور وہ اس کے فراخ سینے میں منہ چھپا کر ہچکیوں سے رونے لگی۔

"چپ کرو بیا! پلیز چپ کر جاؤ دیکھو یہاں سب..." وہ اسے اپنے ساتھ لگائے لگائے دو قدم اندر کمرے میں آگیا۔

"نہیں نہیں مجھے اندر نہیں جانا۔ مجھے یہاں سے لے چلیں... چلیں۔" وہ ایک جھٹکے سے اس کے سینے سے علیحدہ ہوتی ہوئی باہر کی طرف لپکی۔

"اچھا چلتے ہیں ایک منٹ ٹھہرو۔" وہ اسے تسلی دیتے ہوئے اندر کی طرف دیکھنے لگا۔

"رافع! چلیں... چلیں پلیز میں مر جاؤں گی چلیں۔" وہ ایک بار پھر اس کے ساتھ چپکتے ہوئے ہسٹریائی انداز میں چلائی تھی۔

اس نے کندھوں سے پکڑ کر ایبہا کا چہرہ سامنے کیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر کوئی نشان نہیں تھا بجز گردن پر دو تین جگہ خراشیں تھیں۔

اس کے یوں دیکھنے پر وہ ایک پل کو ٹھٹکی۔ اور اسے پہلی بار اپنے دوپٹے کی غیر موجودگی کا احساس ہوا۔ بے اختیار اس نے مڑ کر اپنے دوپٹے کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔

دوپٹہ تین قدم کے فاصلے پر کاؤچ کے پاس پڑا تھا۔ رافع نے آگے بڑھ کر اسے دوپٹہ پکڑایا اور باتھ روم کے دروازے کے پاس ٹھہرتے ہوئے زیر لب کو جھک کر دیکھنے لگا۔

"بظاہر وہ زخمی نہیں تھا مگر بے ہوش تھا۔"

"چھوڑیں رافع! اس موذی کو... پلیز چلیں... چلیں یہاں سے۔" وہ اس کی شرٹ کا کالر پیچھے سے کھینچتے ہوئے خوفزدہ آواز میں بولی۔

"ایک منٹ دیکھ تو لینے دو کہیں خدا نخواستہ..." وہ اس کے دل کی دھڑکن اور نبضیں چیک کر رہا تھا۔ اسے شاید کہیں گہری چوٹ آئی تھی۔

رافع نے اسے بمشکل اٹھا کر بیڈ پر لٹایا۔ ایبہا نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

رافع نے گاڑی میں آکر بیٹھنے تک اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ وہ خود کو بمشکل گھسیٹتے ہوئے چل رہی تھی۔ گھنٹہ بھر کے اس جان لیوا حادثے نے اس کے جسم سے ساری توانائیاں نچوڑ لی تھیں۔

لفٹ سے باہر قدم رکھتے ہی وہ چکرا کر گرنے لگی تھی۔ رافع نے اسے کندھے سے تھام کر سہارا دیا اور اسے پتا بھی نہیں چلا ان ہاتھوں کی اجنبیت کب اس کے لیے اتنی گہری اپنائیت میں بدلی کہ اسے ان کا لمس ناآشنا محسوس ہی نہیں ہوا۔

"تم بیٹھو میں ابھی آیا۔" اسے گاڑی میں بٹھا کر وہ ایک بار پھر ہوٹل کے اندر چلا گیا۔ وہ ریسیپشنسٹ سے کچھ کہہ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھا۔ باہر بارش تھم چکی تھی۔ مگر سڑکیں ابھی گیلی تھیں۔ رات گہری اور تاریک ہو چکی تھی۔ ہوٹل کی بارونق سڑک سے مڑتے ہی آگے سب طرف خاموشی سناٹا اور اندھیرا تھا۔

وہ چپ چاپ بیٹھی رافع کے سوالوں کا انتظار کر رہی تھی۔

"کیا ولید نے رافع کو بھیجا ہے؟" اس کو یہ الجھن بھی پریشان کر رہی تھی۔ مگر رافع تو یوں لب بھینچے انہماک سے ڈرائیونگ کر رہا تھا جیسے ساتھ بیٹھے اس کے وجود ہی سے لاعلم ہو۔

گاڑی نے موڑ کاٹا ہی تھا کہ گھڑ گھڑ کی آواز کے ساتھ اس کا انجن بند ہو گیا۔

"کیا مصیبت ہے۔" وہ اترتے ہوئے بڑبڑایا اور بونٹ اٹھا کر چیک کرنے لگا۔

ایبہا کی پریشان بھٹکتی نگاہیں اچانک اپنے بائیں جانب دیکھتے ہوئے ٹھہر سی گئیں۔

اسے پتا بھی نہیں چلا کہ وہ انجانے میں رستوں پر سفر کر رہی تھی۔ نہ جانے کب اور کیسے زندگی ایسے رخ بدلتی ہے کہ مانوس رستے اجنبی اور اجنبی راہ گزر انسان کو اس کی منزل کی جانب لے جاتی ہوئی ہے۔

وہ "انصاری ہاؤس" کے سامنے کھڑے تھے جس کے باہر مین گیٹ کے اوپر بڑا سا بینر لگا تھا برائے فروخت کا۔

کبھی یہ انصاری ہاؤس اس کے لیے باغ عدن کے باغوں میں سے ایک تھا جس سے نکلے جانے کا غم اسے آدم و حوا کی طرح دن رات رلاتا تھا۔ یہ وہ سراب تھا جس کے پیچھے بھاگتے بھاگتے اس نے اپنے خوابوں کے پاؤں ہی لہولہان نہیں کیے تھے آج اپنی جان اور آبرو سب داؤ پر لگانے چلی گئی۔

سراب خواب ہی تو ہوتے ہیں اور خواب بند آنکھوں سے ہی دیکھے جائیں تو بھلے لگتے ہیں۔ حقیقت میں ان کے تعاقب میں نکلو تو تلخ حقیقتوں کے پتھر آدمی کی آنکھیں پھوڑ دیتے ہیں۔

"شکر ہے کوئی گڑبڑ نہیں تھی۔" تب رافع نے اس کے برابر آکر بیٹھتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی اسے پتا نہیں چلا۔ ایبہا کی محویت پر ایکسیلیٹر پر پڑا اس کا پاؤں ذرا سا پیچھے ہٹا تھا۔ انصاری ہاؤس پر...

فروخت کے بینر نے اسے ذرا سا چونکایا پھر اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

ایمہا کی محویت ٹوٹی تو ایک گہرا سانس لے کر اس نے گردن موڑ کر رافع کی طرف دیکھا۔ وہ ایک بار پھر گاڑی ڈرائیو کرنے میں محو ہو چکا تھا اس کی موجودگی سے لاعلم۔

ایمہا کا جی چاہا وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے یا چلا چلا کر اس سے پوچھے کہ وہ اس سے کچھ پوچھتا کیوں نہیں۔

وہ بے بسی کے اپنے گہرے احساس میں گرفتار لب کاٹتے ہوئے اپنے ہاتھ مسلنے لگی۔

"تم فریش ہو تو پھر ہسپتال چلتے ہیں۔" وہ رافع کی آواز پر چونکی۔ ان کی گاڑی گھر کے آگے کھڑی تھی۔

"یہ چابی لے لیں۔ میں ابھی سے لے کر آیا تھا۔" اس نے چابی دیتے ہوئے کہا تو اسے گہری شرمندگی نے آ لیا اس کے جملے سے کوئی کیا کچھ نہیں اخذ کر سکتا تھا۔

"اگر اللہ نے میرا پردہ رکھنا ہوتا تو یقیناً" ولید کو بھیجتا رافع کو بھیجنے کا مطلب ۔۔۔ اب جو بھی کچھ ہے میں خود رافع سے پوچھ لوں گی اس نے کیا طے کیا ہے" مزید شش و پنج کی حالت میں رہ کر مجھے ایک بار پھر ان وسوسوں کی سولی پر نہیں لٹکنا۔" وہ دل میں فیصلہ کرتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

اس کی گود سے کوئی چیز آہستہ آواز کے ساتھ نیچے گری تھی۔ پہلے رافع کا ارادہ بھی اندر جا کر تھوڑا فریش ہونے کا تھا مگر نیچے گری اس چیز نے اسے گاڑی میں بیٹھے رہنے پر مجبور کر دیا۔

☆ ☆ ☆

"مجھے اب اپنی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔" وہ دھوپ میں کرسی پر بیٹھی تھیں اور بیا ان کی کمزور پنڈلیوں اور پاؤں پر زیتون کے تیل سے ہلکا ہلکا مساج کر رہی تھی۔ غضویا ان کے پاس بیٹھی سیب کاٹ رہی تھی۔

"ممی یہ کون سی نئی بات ہے جب سے پاپا کی اولاد آدم جیسے ہی پیدا ہوتی ہے موت کا خوف اس کے بڑے ہونے کے ساتھ ہی بڑا ہوتا جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ ابھی حضرت ملک الموت میرے سامنے آئے اور غضویا بی بی ۔۔۔ مرحوم ہو گئیں کہ ہو گئیں۔" وہ سیب کی پتلی پتلی قاشوں پر نمک اور کالی مرچیں چھڑکتے ہوئے مزے سے بولی۔

"ہر وقت الول فول نہ بکا کرو۔ اس بار تو شاید تم دونوں کی دعائیں مجھے کھینچ لائیں مگر اب مزید انتظار نہیں ۔۔۔ میں نے تمہاری پھپھو اور چچا کو آج شام بلوا لیا ہے شادی کی ڈیٹ فکس کرنے کے لیے۔ تمہاری پھپھو تو تھوڑی دیر میں آنے والی ہیں ان سے کچھ مشورہ کرنا ہے اور۔"

"ممی اللہ کا خوف کھائیں۔ ابھی آپ کو ہسپتال سے ڈسچارج ہوئے ایک ہفتہ ہوا ہے اور آپ ڈھول ڈھمکے کا پروگرام بنا رہی ہیں۔" غضویا زور سے چیخی تھی۔

"پھر وہی فضول بکواس۔ تم اٹھو اور جا کر کچن کو دیکھو۔ میں بیا سے بات کر لیتی ہوں۔" انہوں نے باقاعدہ ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھا دیا۔

"ماشاء اللہ ممی جی! کیا سیانا بندہ ڈھونڈا ہے آپ نے مشورے کے لیے۔" وہ بیا کی سنجیدہ شکل کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ "اس سے تو اچھا آپ کو سامنے والی دیوار مشورہ دے دے گی۔ نہ دیوار نے آگے سے ہوں ہاں کرنا ہے نہ انکار۔ اس طرح بیا بی بی نہ ہاں کریں گی نہ ناں۔" وہ جاتے جاتے اسے چڑا گئی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہے غضویا۔ بیا! مجھے بتاؤ بیٹا مسئلہ کیا ہے۔ کیوں اس قدر گم صم سی ہو گیا پریشانی ہے۔ پہلے میں سمجھی شاید رافع کے ساتھ تمہاری کچھ گڑبڑ ہے مگر جس دن سے ہوش آیا ہے رافع سے ملی ہوں تو اپنی ہی نظر لگ جانے کے ڈر سے اسے جی بھر کر دیکھتی بھی نہیں کہ میرے رب نے میری معصوم بچی کا کیسا دیکھ بھال اور جوڑ بنایا ہے۔ سعدیہ تو کہہ رہی جان چھڑکتی ہے اور گھر میں کون ہے جس سے تم پریشان ہو؟" وہ اسے ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھنے لگیں۔

"ممی! ایسی کوئی بات نہیں۔ بس یونہی آپ کی بیماری نے مجھے جیسے خوفزدہ کر دیا کہ خدانخواستہ اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو ۔۔۔ آپ نے ٹھیک فیصلہ کیا ہے غضویا کی جلد سے جلد شادی کر دینے کا ۔۔۔ ممی! ہم بیٹیاں بہت کمزور بہت بزدل ہوتی ہیں اور خود سے کوئی بھی فیصلہ کم از کم میں تو درست نہیں کر سکتی۔ میں نے تو اپنا ہی تجزیہ کیا ہے ممی! مجھے نہ انسانوں کی پہچان ہے نہ اپنی ۔۔۔ دوسروں کو جاننے پرکھنے کا انسان تب دعویٰ کرے جب وہ خود کو سمجھ لے اور اس دنیا کا سب سے مشکل کام اپنے آپ کو سمجھنا ہے۔ بڑے واقعات کو جانے دیں۔ اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہم اس طرح سے ری ایکٹ کر جاتے ہیں کہ اپنا وہ روپ دیکھ کر ہم خود چونک جاتے ہیں کہ یہ میں ہوں؟ اور جو انسان درست فیصلے کی قوت ہی نہ رکھے وہ مشکل حالت کا کیا سامنا کرے گا۔"

وہ نہ جانے کیا کہے جا رہی تھی۔ عارفہ بیگم کچھ سمجھ نہ پائیں۔

"کیا پریشانی ہے بیا!" انہوں نے پیار سے اس کا گال سہلایا۔

"ممی مجھے لگتا ہے میرے اعصاب بہت کمزور ہو گئے ہیں اب ۔۔۔ اب مزید کوئی بھی بڑی بات کوئی صدمہ کچھ برداشت نہیں کر سکیں گے۔ ممی مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" وہ ان کے کندھوں پر سر رکھ کر سسکنے لگی۔

"کیا رافع نے کچھ کہا ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"السلام علیکم بھائی جان! ماشاء اللہ آج تو بہت بہتر لگ رہی ہیں۔" سعدیہ بیگم کی بشاش آواز کے ساتھ رافع کے بھاری قدموں کی آہٹ نے اسے یکدم سے سیدھا ہونے پر مجبور کر دیا۔

چہرے پر آئے بال ہٹاتے ہوئے اس نے اپنی آنکھیں رگڑیں اور پاس کھڑی پھپھو کو سلام کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اسے پیار کر کے کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"کیسی ہیں اب ممانی جان۔" وہ اسی طرح کھڑے کھڑے عارفہ بیگم کا حال پوچھنے لگا۔ ایمہا نے ایک شکایتی نگاہ اس پر ڈالی اور سر جھکا لیا۔

"اللہ کا شکر ہے بیٹا! اس نے کچھ فرائض ادا کرنے کے لیے نئی زندگی دی ہے۔ اس کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔ بیٹھو نا۔"

"ممانی جان! کچھ فرائض نہیں انشاء اللہ آپ اپنے سارے فرائض اپنے ہاتھوں سے ادا کریں گی۔" وہ بڑے پُراعتماد اور اپنائیت بھرے لہجے میں بولا تھا۔

"انشاء اللہ۔" سعدیہ بیگم نے بلند آواز میں کہا۔

"میں اب چلتا ہوں ابھی مجھے آفس سے دیر ہو رہی ہے۔" وہ اسی طرح کھڑے کھڑے بولا۔

"یہ کیا بات ہوئی بیٹا! اب آئے ہو تو تھوڑی دیر بیٹھو۔ بیا! اٹھو بیٹا چائے لے آؤ۔ اتنی دیر تو بیٹھو گے نا؟" انہوں نے کچھ ایسے لہجے میں کہا کہ وہ سر ہلاتے ہوئے بیٹھ گیا۔

وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر آ گئی۔ اس نے چائے بنا کر غضویا کے ہاتھ بھجوا دی اور خود کچن میں ہی رہی۔ نہ جانے دل کو کیسی آس لگی تھی کہ وہ جانے سے پہلے ضرور اس کے پاس آئے گا۔

اس رات اسے ہسپتال پہنچا کر بے حد سنجیدہ چہرے کے ساتھ وہ تھوڑی دیر ہی رکا تھا۔ اگلے دن بھی کھڑے کھڑے عارفہ بیگم کی خیریت پوچھنے آیا۔ اس سے اس نے کوئی بات نہیں کی حالانکہ اس رات کے بعد اس کا رواں رواں رافع کے کچھ کہنے کا منتظر تھا۔ پتا نہیں وہ اس سے بات کیوں نہیں کر رہا تھا۔ نظر تک نہیں ملا تا تھا۔ یوں پاس سے گزر جاتا جیسے کسی کرسی یا صوفے کے پاس سے کوئی لاتعلقی سے گزر جاتا ہے۔

اس کے دل میں کیا تھا؟ وہ اس کی ذرا سے کمرے میں موجودگی سے کیا سمجھا تھا اور اس کے نتیجے میں کیا طے کیے بیٹھا تھا یہ خیال ہی اسے وحشت زدہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ اور اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے نہ اس کے پاس الفاظ تھے اور نہ

کوئی گواہ۔

ابھی تو وہ خاموش تھا مگر جب بولے گا اس سے پوچھے گا تو وہ کیا کہے گی کیسے اپنی صفائی پیش کرے گی؟ یہ خیال آتا تو اس کی خاموشی ہی غنیمت لگتی لیکن آخر کب تک؟ کوئی کب تک انتظار کی سولی پر لٹک سکتا ہے وہ اس سارے قصے کو آر یا پار کیوں نہیں کرتا؟ وہ یونہی برتن ادھر ادھر اٹھا کر رکھتی رہی اپنی الجھی ہوئی سوچوں سے باہر آئی تو رافع کے قدموں کی گونج دار چاپ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ چکی تھی۔ اس کا جی چاہا اپنا سر دیوار کے ساتھ دے مارے۔ یہ آخر اب مجھ سے کون سا کھیل کھیلنا چاہتا ہے۔ میری بے بسی کا مزہ لے کر "سنگدل انسان۔" پہلے بے بسی پھر طیش نے اسے آلیا وہ زور زور سے برتن پٹخنے لگی۔

"ارے رے... بیٹا یہ برتن ہمارے اپنے ہیں کرائے کے یا ہمسایوں کے نہیں، کچھ تو خیال کرو۔"

اسی وقت ضوبیا اندر داخل ہوئی تھی اور اس نے ضوبیا کی بات سن کر اپنے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ زور سے سنک میں دے ماری اور آنکھوں میں امڈتی نمی کو چھپاتی بھاگتے ہوئے باہر نکل گئی۔

"اس... اسے کیا ہوا؟" وہ اس کے یوں بھاگنے پر حیران سی سوچتی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

ضوبیا اور ولید کے نکاح اور رخصتی کی تاریخ محض پندرہ دن بعد کی رکھی گئی حالانکہ اس نے عارفہ بیگم سے کہا بھی کہ اتنی جلدی بھلا تیاری کیسے ہو گی پھر وہ بھی ابھی پوری طرح سے صحت مند نہیں ہوئیں۔

"تیاری کے لیے تو تمہارے چچا چچی نے صاف منع کر دیا ہے کہ انہیں فرنیچر، مشینری اور اس طرح کی دوسری چیزوں میں سے کچھ بھی نہیں چاہیے۔ ان کے گھر میں سب کچھ موجود ہے۔ ولید نے ابھی دو ماہ پہلے اپنا کمرہ فرنشڈ کروایا ہے۔ اس لیے فرنیچر کے نام پر تو ایک پیڑھی بھی انہیں نہیں چاہیے۔ رہے کپڑے اور زیور تو وہ اس کے لیے بھی منع کر رہے تھے مگر اتنا تو بہر حال ہم کریں گے اور دیکھنا جیسے ہی تیاریاں شروع ہوں گی میری بیماری کیسے غائب ہوتی ہے۔ میں تو ایک ایک سانس میں ہزار بار شکر ادا کر رہی ہوں کہ اپنے ہاتھوں سے اپنی بیٹی کو رخصت کر سکوں۔"

"ممی! آپ کو یہ سب ابھی اتنی جلدی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ابھی آپ مکمل طور پر ٹھیک بھی نہیں ہوئیں پھر آپ کے پاس کون رہے گا بھلا۔" ضوبیا سنجیدگی سے ان کے پاس بیٹھ کر کہنے لگی۔

"میں جو ہوں ممی کے پاس۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔" اس کے منہ سے اچانک نکلا تھا۔

"شادی تک نا! اس کے بعد تو تم بھی چلی جاؤ گی۔ پھپھو نے تمہیں یہاں اسی لیے تو رہنے دیا ہے شاید!"

ضوبیا کے "شاید" نے بیا کے دل میں جتا دیا جیسے بجھا ڈالا۔ پھپھو ہر دوسرے تیسرے دن چکر لگاتی تھیں آتے جاتے اسے اسی لگاوٹ سے پیار کرتیں مگر ساتھ چلنے کو ایک بار بھی نہ کہتیں۔

"پتا نہیں ان کا بیٹا کیا طے کیے بیٹھا ہے" اسے اب اس خیال سے ہی وحشت ہونے لگی تھی۔

"اور ممی پلیز میرے لیے یہ بکس بھر بھر کپڑے اور دیہاتی عورتوں کی طرح ڈھیر سارے بھاری زیورات نہ بنائیے گا بس۔ میری پسند کے اسٹائلش تین چار جوڑے اور ہلکی سی جیولری بس۔" وہ اپنے خیالوں سے چونکی تو ضوبیا کو کہتے سنا۔

اور وہ خود کتنے دن تک اس بات کا سوگ مناتی رہی تھی کہ ممی نے اسے خاندانی دستور اور رسوم کے مطابق ٹرک بھر کر جہیز نہیں دیا بس تھوڑا سا زیور، دو سوٹ کیس کپڑوں کے اور چیک بک کی صورت بوجھ گلے سے اتار پھینکا ہے اور یہ ضوبیا...

"کیا واقعی میرے بہت سے غم بہت سی محرومیاں خود ساختہ تھیں؟" وہ قدم قدم پر خود احتسابی سے گزر رہی تھی۔

"میں واقعی بہت بدل گئی ہوں۔ ضوبیا ٹھیک کہتی ہے۔" اس نے آخر میں خود ہی اعتراف کر لیا۔

"اور ممی یہ آپ ہی تو کہتی ہیں کہ ٹرک بھر جہیز لے جانا بھی کوئی کامیاب شادی کی ضمانت نہیں تو پھر اتنے تردد کی بھلا کیا ضرورت۔ زندگی تو لوگوں کے ساتھ گزارنا پڑتی ہے چیزوں کے ساتھ تو نہیں۔" ضوبیا کی آواز ایک بار پھر اس کے کان میں پڑی۔

"روشی کیا لے کر گئی تھی؟ اور کتنی خوش ہے۔ وہ میں تو پھر بھی شاندار خاندانی بیک گراؤنڈ جہیز کے نام پر اچھا خاصا سونا پیسہ لے کر آئی تھی۔ یہ ہے میری کامیاب زندگی۔" ڈھیر ساری اداسی نے پھر اسے گھیر لیا تھا۔ وہ ان دونوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر چپکے سے اٹھ کر باہر آ گئی۔

☆ ☆ ☆

"یہ تو بھئی سراسر زیادتی ہے۔ ہر کوئی میری بنی سنوری دلہن کو دیکھنے کے بجائے کسی اور کی پرانی دلہن کو دیکھے جا رہا ہے۔ انتہا تو بھئی یہ ابیہا بی بی کو میری دلہن کے پہلو سے۔" وہ جو ضوبیا کے سجے سنورے شرمائے شرمائے روپ کو نگاہوں کے رستے دل میں [illegible] اس کی تعریف کر رہی تھی۔ ولید کی اچانک آواز پر ایک دم سے سیدھی ہوئی تھی۔ وہ ضوبیا کے دوسری طرف بیٹھا بڑے معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا ابیہا نے اسے گھور کر دیکھا۔

"کیا کہہ رہے تھے تم؟" ایک دم ہی سب اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

"یہی ابھی مووی والے سے کہہ رہا تھا کہ میری دلہن کے اچھے اچھے کلوز اپ لینا۔ دن کوئی بار تھوڑی آتا ہے تو کہنے لگا اچھا جی لے لیں گے پہلے یہ جو حسین چہرہ ہمارے کیمرے کے فوکس میں آ رہا ہے پہلے اس کے تو چند اچھے اچھے کلوز اپ محفوظ کر لیں۔ اب بولو یہ زیادتی ہے کہ نہیں۔" وہ ابیہا کے گھورنے کی پروا کیے بغیر اسی ڈھٹائی سے بولا تو وہ غصے میں اٹھ کر جانے لگی۔

"بیا! تم ولید کی باتوں کا برا نہ مانو وہ یہی تو چاہ رہا ہے کہ تمہیں غصہ آئے اور تم اس سے لڑو۔" ضوبیا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھنے سے روک دیا تھا۔

گولڈن اور براؤن بنارسی پھولوں والی خوب صورت ساڑھی میں وہ کیسی لگ رہی تھی اس کا اندازہ اسے خود بھی تھا مگر اس طرح سب اسی کی طرف متوجہ ہو جائیں گے یہ اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا جس کی نظروں میں وہ اچھا لگنا چاہ رہی تھی وہ تو شاید اس کی طرف دیکھنا ہی بھول گیا تھا۔

مہندی اور بارات میں کئی بار ایسے مواقع آئے کہ وہ بنی سنوری خوشبوؤں میں بسی اس کے بالکل آس پاس سے گزرتی رہی اور وہ کسی پتھر کے بت کی طرح انجان بنا رہا تھا۔ کئی بار اسے احساس ہوا کہ اس کا چہرہ مستقل کسی کی نظروں کے حصار میں ہے اور ان نظروں کی تلاش میں جب اس کی متلاشی پیاسی نگاہیں رافع کے چہرے پر آکر ٹھہرتیں تو وہ پہلے کی طرح بالکل اجنبی ہوتا۔ اب تو اسے اپنی ٹھیک ٹھاک انسلٹ محسوس ہونے لگی تھی اور وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ شادی کے ہنگامے سرد پڑتے ہی وہ خود خلع کے لیے درخواست دے دے گی۔

رافع کا انجان رویہ اسے بہت کچھ سمجھا چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس پر کوئی گھٹیا الزام لگا کر اسے ٹھوکر مارے وہ خود کیوں نہ پہل کر ڈالے اور اب وہ اتنی بہادر ضرور ہو گئی تھی کہ یہ سب کر سکتی تھی۔

"اب" پھپھو نے بیا اقبال سے اسے بیٹھنے کو کہا۔

"نہیں تھینکس، اب تم بیٹھو اپنی بھابی بھائی جان کے پاس۔" اس نے ولید کی طرف دیکھتے ہوئے جتانے والے انداز میں کہا تو وہ آنکھ دبا کر ہنس پڑا۔

"ہاں بھئی! انہیں بہت جلدی ہے۔ جانے دو انہیں کسی اور کی جان بننے۔" پاس سے گزرتے ہوئے اس نے ولید کی سرگوشی سن لی تھی کوئی اور موقع ہوتا تو واقعی پاؤں سے سینڈل اتار لیتی۔

پھپھو اور ممی چچی کے ساتھ میٹھی باتوں میں مگن تھیں وہ چپکے سے ان کے پاس سے گزرتی پنڈال کے ہجوم سے باہر نکل آئی۔

لیکن گرین لان کے درمیان میں بہت خوب

صورت سوئمنگ پول بنا ہوا تھا جس میں صاف شفاف پانی بلوریں تیتا سفید روشنی کو مختلف رنگوں میں تقسیم کر رہا تھا۔

وہ پول کے کنارے چلتی ایک طرف بنی ریلنگ سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ باہر اچھی خاصی خنکی تھی مگر آسمان بالکل صاف تھا۔ تاروں بھرا گہرا نیلا آسمان۔

"ولید اور ضوبیا کتنے خوش قسمت ہیں جو چاہا سو پالیا۔ اللہ ان دونوں کی خوشیاں اور محبت یونہی قائم و دائم رکھے۔" اس کا دل کسی اور بات کے غم میں نڈھال ہوا جا رہا تھا اور وہ اپنے خیالات کی رو کسی اور جانب موڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ جو پچھلے چند دنوں میں خوب زور شور سے کہے جا رہی تھی کہ ضوبیا کے بعد وہ ممی کے پاس رہے گی۔ ولید اور ضوبیا نے چچا جان کے ساتھ مل کر پہلے سے اس کا بھی حل ڈھونڈ لیا تھا۔

ممی کے بالکل ساتھ والا گھر چچا جان نے خرید لیا تھا۔ دونوں گھروں کی پچھلی دیوار گرا کر بیچ میں رستہ بنا لیا گیا تھا اور عارفہ بیگم نے یہ گھر کس طرح خریدا اس کا علم بھی اسے کل ہی ہو سکا۔ وہ اس بات پر سب سے خوب جھگڑنا چاہ رہی تھی کہ اسے کسی بھی بات سے باخبر نہیں رکھا جاتا مگر شاید اسے اپنے خیالوں سے ہی نجات نہیں ملتی تھی جو وہ کسی کی خبر رکھ سکتی۔

عارفہ بیگم نے اپنا سارا زیور بیچ ڈالا تھا۔ ضوبیا نے اپنے لیے محفوظ رکھی گئی ساری رقم اور زیور بھی ممی کو دے دیا تھا۔ کچھ چچا جان نے رقم دی تھی اور یہ گھر خرید لیا گیا تھا۔ تایا جان نے تو حصے کے نام پر ان کو صرف ڈھائی لاکھ روپے دیے تھے جو انہوں نے کوئی بھی شکوہ کیے بغیر رکھ لیے تھے کہ بہرحال ایک چھت انہیں چاہیے تھی کہ ان کی بیٹیاں سسرال سے آئیں تو ماں کے گھر کا دروازہ کھلا ملے۔

ضوبیا نے ممی کی اصل غم گسار بیٹی ہونے کا حق ادا کیا تھا اور میں... میں کیا کروں مجھے تو اپنے غم— پیچھو کیسی خود غرض سی ہو گئی ہیں بالکل انجان۔

شاید کسی نے اسے آواز دی تھی۔ وہ گہرا سانس لیتے ہوئے پلٹ کر جانے کو تھی کہ ایک دم پیچھے سے کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تھا وہ ذہنی و جسمانی طور پر اس کے لیے تیار نہیں تھی سو اس جھونک میں کھینچنے والے کی طرف کھنچتی چلی گئی۔

دائم کے سینے سے ٹکراتے ہی اس نے ایک جھٹکے سے خود کو الگ کیا تھا وہ نہ جانے کب اس کے پاس آ کر کھڑا ہوا تھا۔ اسے پتا بھی نہیں چلا تھا۔

"یہ کیا مذاق ہے؟" وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کے لیے زور لگاتے ہوئے بولی۔

"یہ مذاق نہیں۔ میرے صبر کی انتہا ہے۔" وہ گہری آواز میں بولا۔

"صبر یا تماشا۔" وہ دانت کچکچا کر بولی اور اپنا ہاتھ کھینچنے لگی۔

"تماشا... ہاں یہ لفظ ٹھیک ہے۔ ہم دونوں شروع سے اب تک جن ڈرامائی موڑ سے گزر کر یہاں تک پہنچے ہیں اسے ایک تماشا ایک کہانی کہا جا سکتا ہے۔ ایک ایسی کہانی جو آنسوؤں میں بھیگی ہوئی ہے اب یہ تمہارے اور میرے ہاتھ میں ہے کہ ہم اسے المیہ انجام سے دوچار کرتے ہیں یا طربیہ۔" وہ اسی طرح اس کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں لیے نرمی سے بولا۔

"اچھا پلیز، میرا ہاتھ چھوڑیے اور یہ کہانیاں بنانے یا سنانے کی ضرورت نہیں۔ آپ نے شروع سے اپنے دل میں سوچ رکھا ہے اور اس روتی بسورتی کہانی کو جو بھی انجام دینے کا فیصلہ کر رکھا ہے مجھے سنا دیجئے۔ میں ہر طرح کا انجام سہنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ اس تکلیف دہ ڈرامے نے میرے اعصاب اس قدر تھکا ڈالے ہیں کہ مزید انتظار... شاید آپ میرے جان سے گزرنے کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے میں نے اتنے دن جو تم سے لاتعلقی اختیار کیے رکھی ہے وہ کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے تھی؟" وہ شاید اس کی مزاحمت سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اس کے نازک ہاتھ پر اپنی گرفت اور بھی سخت کر لی۔

"توبہ کتنے ظالم ہیں آپ۔ کیا توڑیں گے میرا ہاتھ

"!" کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"ظالم کون ہے ابھی اس کا فیصلہ ہونا باقی ہے۔" سلو چھوڑ دیا ہاتھ ' ویسے بھی میں نے چھوڑنے کے لیے نہیں پکڑا تھا۔" اس نے کہتے ہوئے ایک دم سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا جسے دوسرے ہاتھ سے سہلاتے ہوئے وہ ناراض نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"میں فیصلے پر اسی رات پہنچ چکا تھا جب تمہیں ہسپتال چھوڑ کر گیا تھا۔"

"کیا مطلب؟" وہ اپنے ہاتھ کی تکلیف بھول گئی۔

"کیسا فیصلہ؟" اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"تمہیں چھوڑ دینے کا۔" وہ سنجیدگی سے بولا تو اس کا سانس جیسے سینے میں اٹک گیا۔

"مجھے بتاؤ کوئی بھی غیرت مند شوہر جو اپنی بیوی کو کسی غیر مرد کے اغوا کرنے سے اس حال میں نکالے اور پھر بھی اسے اپنے سے علیحدہ نہ کرے تو ایسے مردوں کو ہمارے معاشرے میں کیا کہا جاتا ہے۔۔۔ اس رات رستہ بھر یہ خیال میرے دل و دماغ پر کسی تازیانے کی طرح برستا رہا تھا اور شاید میں اس معاشرتی دباؤ میں آکر اپنے جذبات کا خون کرنے پر بھی تیار ہو جاتا اگر تم وہ چیز اپنے ساتھ زریاب کے کمرے میں نہ لے کر آتیں۔"

"کیا ..... کیا چیز۔" اس نے الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"اس چیز کے متعلق بتانے سے پہلے سن لو کہ اس واقعے کے باوجود اور خود پر اٹھنے والی انگلیوں کا اذیت ناک احساس بھی میرے دل کو تمہیں خود سے علیحدہ کرنے پر مجبور نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ چیز اگر مجھے نہ بھی ملتی تو بھی بیا میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔" وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔

"وہ بیا جو میرے باپ کے جھوٹے ڈرامے اور بیماری کے ناٹک پر اس سے ہمدردی کرتے ہوئے اپنی ساری رقم اس کی جھولی میں ڈال دے۔ وہ بیا بد کردار اور بری نہیں ہو سکتی پھر تمہارے وہ قرض میرے اوپر واجب الادا تھے۔ ایک رات میرے باپ نے جھوٹ بول کر تمہارے کردار پر کیچڑ اچھالی اس جھوٹ کا سب بوجھ تھا میرے سینے پر۔

دوسری وہ شام جب روشی نے نیند آور گولیوں کی آدھی شیشی حلق میں انڈیل کر خودکشی کی کوشش کی تھی۔ اس شام جب اس کا نکاح ہونے والا تھا۔ اور میں اسے سب طرف ڈھونڈ آیا تھا اور ٹھیک وہی کچھ ہمارے ساتھ ہونے جا رہا تھا جو میرے باپ نے تمہاری زندگی کے ساتھ کیا تھا۔ اس شام اگر تم مجھے اس بند اسٹور میں بے ہوش پڑی روشی کے پاس نہ لے جاتیں جبکہ تمہارے پاس اپنا انتقام لینے کا اچھا موقع بھی تھا۔

اس شام تم نے ہمارا 'میری بہن کا پردہ رکھا' بولو ایسی لڑکی بری کیسے ہو سکتی ہے جو موقع ملنے کے باوجود اس کے ساتھ بھلائی کر جائے جس نے اس کے ساتھ برا ترین کیا ہو۔ اس شام تم نے دوسرا بوجھ میرے کندھوں پر رکھ دیا تھا۔

میں نے اپنے دل میں عہد کیا تھا کہ کبھی زندگی میں موقع آیا تمہارا پردہ رکھنے کا یا کسی بھی گناہ کا تو میں ضرور ضرور اس قرض کو اتارنے کی کوشش کروں گا۔ سو اس رات جب تم نے ولید کو فون کر کے بلوایا اور قدرت نے مجھے اپنی آمد سے دو دن پہلے وہاں بھجوا کر وہ فون کال سننے کی توفیق دی اور میرے سامنے میرے عہد کو کھڑا کر دیا۔ اس عہد کی وجہ سے میں معاشرے کی کسی بھی گالی کو قبول کرتے ہوئے تمہیں اپنانے کو تیار تھا۔

میں ضوبیا کی شادی کے فوراً بعد تمہیں لے جانا چاہتا تھا تم سے کچھ بھی سوال جواب کیے بغیر کہ میرے عہد نے مجھے اس کا پابند کر دیا تھا۔

رہ گیا زریاب کا معاملہ ..... تمہیں شاید یاد نہ ہو جب پہلی رات تم ہمارے گھر رہنے کے لیے آئیں اور میں نے تم سے زریاب کے بارے میں پوچھا تو تم نے بڑی نخوت سے جواب دیا تھا جیسے کسی بہت معتبر انسان کا ذکر آیا ہو۔

زریاب کی ان ساری حرکات کا مجھے چند دن پہلے علم

ہو چکا تھا اور میں تمہیں وہی بتا کر خبردار کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ اگر میں تمہیں کچھ بتاؤں تو تم یقین نہ کرو گی۔ تو تم نے بڑی رکھائی سے کہا تھا کہ یقین کرنا یا نہ کرنا میرا مسئلہ نہیں۔ تمہیں بتاؤں۔ اس کے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ مجھے یہ سب باتیں بتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا کیونکہ تم یقین نہیں کرو گی۔ الٹا اسے میرے حسد پہ محمول کرو گی اس لیے میں نے کچھ نہیں بتایا تھا۔

تم زریاب کے جال میں کیسے پھنسیں اس کا بھی مجھے کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا اسی رات ..... اور میں سمجھتا ہوں اس میں بھی کوتاہی میری ہے اپنی ملکیت کو آپ خود Own (اپنائیں) نہیں کریں گے تو دوسرے ضرور اسے چھیننے کی کوشش کریں گے جس اتفاقات کی تلاش میں تم زریاب کی طرف کھنچیں اگر وہ مجھ سے ملا ہوتا تو۔۔ پھر مجھے بار بار تمہاری طرف سے طلاق کے مطالبے کا بھی رنج تھا۔ تمہارے دل کا کیا حال ہے مجھے اندازہ نہیں تھا مگر پھر تمہاری کیفیت دیکھ کر ہوتا چلا گیا۔"

"خیر چھوڑو اس ذکر کو یہ تو لمبا قصہ ہے مگر اس میں سب سے مزے کی بات یہ ہے کہ تم اپنی صفائی اپنا گواہ اپنے ساتھ لے آئی تھیں جس نے سارا معاملہ شیشے کی طرح صاف کر دیا۔" وہ کہہ کر چپ ہو گیا تو بیا نے بے چین ہو کر اسے دیکھا۔

"زریاب کا 'بلیک بیری'" جس سے تم نے ولید کے موبائل پر کال کی تھی اور خوف و وحشت میں تم وہ موبائل اس طرح مٹھی میں دبائے میرے ساتھ گاڑی میں آبیٹھیں اور جب تم چینج کرنے کے لیے گھر اتریں تو وہ سیل فون تمہاری گود سے نیچے گر گیا اور اس میں شاید زریاب نے تمہیں بلیک میل کرنے کے لیے سب کچھ ریکارڈ کر رکھا تھا۔" رافع کی بات پر بیا کی سانسیں جیسے تھمنے لگیں جس خوف کے باعث وہ اس سے ملنے گئی تھی اسی۔۔ اپنے قتل کے سامان کو اپنے ساتھ اٹھا کر لے آئی۔

"تف ہے میری بے وقوفی اور حماقت پر ..... مجھ سے احمق لوگوں کا یقیناً" ایک خوشگوار و کامیاب زندگی پر کوئی حق نہیں ہوتا۔" وہ ایک بار پھر دل ہی دل میں خود کو لعن طعن کرنے میں مصروف ہو چکی تھی۔

"اور اس میں اس آخری شام کی ساری گفتگو بھی ریکارڈ تھی وہ شاید تمہیں مزید ہراساں کرنے کے لیے ریکارڈنگ بٹن پش کر کے واش روم میں چھوڑ آیا تھا اور اسے نہیں پتا تھا یہ تمہاری بے گناہی پر آخری مہر ثبت ہو گی اس کی بدنیتی اور تمہاری مزاحمت و مقصد سب کچھ واضح تھا۔" وہ کہہ کر ایک دم چپ ہو گیا۔

"زریاب کی سحر انگیز شخصیت کا بت تمہاری نگاہوں کے سامنے پاش پاش ہونا ضروری تھا ایک کامیاب زندگی کا آغاز کرنے کے لیے۔"

بیا کو کافی دیر بعد جیسے اس جملے کی بازگشت اپنے کانوں میں سنائی دی۔

[illegible]

میری بے گناہی بھی اور زریاب کی خباثت بھی۔۔۔" وہ بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو اتنے دن۔۔۔۔ اتنے ڈھیر سارے دن۔۔۔ جب آپ اور ہر گھر آتے رہے، میرے آس پاس پھرتے اجنبی نظروں سے تکتے منہ پھیرتے آپ کو سب معلوم تھا؟" وہ کہتے ہوئے جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھی اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"یعنی میری بے بسی کا مذاق اڑاتے رہے، مزہ لیتے رہے۔" وہ اب اس کے بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔

"اصل میں تمہارا حسن پر سوز، غمگین تھوڑا روہا دھوہا اتنا اچھا لگتا ہے جیسے چاند کے گرد ہالہ۔۔۔ تو میں نے سوچا۔۔۔" وہ معصومیت سے اقرار کرتے ہوئے بولا۔

"تو میں نے سوچا کچھ دن اور اس روتی صورت کا نظارہ۔۔۔" غصے میں چلاتے ہوئے اس نے پوری قوت سے رافع کو پیچھے سوئمنگ پول میں دھکیلنے کی کوشش کی مگر یہ الگ بات کہ اس کے فولادی جسم کو وہ پیچھے نہ دھکیل سکی الٹا اس کے بازوؤں کی مضبوط گرفت میں آ گئی۔

"چھوڑیں مجھے بے ایمان انسان، ظالم۔۔۔" وہ اب بھی پوری طاقت سے اسے دھکیلنے کی کوشش کرتے ہوئے کچھ اور اس کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔

"اسی لیے تو کہہ رہا تھا کہ اس سے زیادہ خود پر صبر کے بند نہیں باندھ سکتا۔ تمہیں سب کچھ بتا دیا تو پھر ایک پل کے لیے خود سے دور نہیں رکھ سکوں گا۔ کہاں تمہیں ضوبا کی شادی کے لیے رکنے دوں۔۔۔ ابھی تو تم سے بہت سارے ڈھیر سارے اولین دن سے لے کر اس گھڑی تک کتنے بدلے لینے ہیں گن گن کے کہ تم ضوبا اور ولید تو کیا اپنے گھر میں بھی کسی کو کتنے ہی دن تک نظر نہیں آؤ گی۔ ظالم میں ہوں کہ تم چلو ابھی سارے حساب کتاب کر لیتے ہیں کون ظالم ہے اور

[illegible]

پارکنگ کی طرف جو بڑھا تو وہ گھبرا گئی۔

"چھوڑیں مجھے چھوڑیں نا کوئی دیکھ لے گا۔"

"آئی ڈونٹ کیئر اب تو چاہے سارا شہر دیکھ لے۔" وہ اسے اسی طرح بازو سے پکڑے پارکنگ تک لایا تھا۔

"ایں۔۔۔" اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ ابھی تھوڑی دیر پیشتر جو آسمان ستاروں سے جگمگا رہا تھا وہاں جگہ جگہ سیاہ بدلیاں منڈلا رہی تھیں اور ہلکی ہلکی بوندیں پڑنا شروع ہو چکی تھیں۔

"یہ بارش بھی نا۔ یہ بارش میرے لیے کتنی بابرکت ثابت ہوتی ہے کوئی مجھ سے پوچھے۔ یہی بارش تو تمہیں مجھ تک لائی تھی ہمیشہ کے لیے۔ اور آج پھر۔۔۔" اس نے ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ کا دروازہ کھولتے ہوئے اسے بٹھا کر خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

اور وہ جو آج تک اس بارش سے خائف رہی تھی مسکراتے ہوئے اپنی ہتھیلی کھڑکی سے باہر نکالتے ہوئے رافع کی بات کی تائید کرنے لگی۔ واقعی یہ بارش تو جب بھی برسی اس کی جھولی میں دامن خوشیاں بھر گئی بس اسے سمجھ دیر میں آئی اور اب جب سمجھ آئی تو

"میں اب بھی بارش سے خفا نہیں ہوں گی۔" اس کے لبوں سے پھسلا تھا۔

"صرف بارش سے؟" رافع نے شوخی سے پوچھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس بار اس کی ہنسی میں رافع کی ہنسی بھی شامل تھی۔

اسے معلوم تھا یہ بارش اسے رلانے نہیں ہنسانے آئی ہے اس کے من کی پیاس بجھانے۔

وہ کھڑکی سے باہر سر نکال کر بڑے شوق اور لگن سے بوند بوند برستی اللہ کی اس رحمت کو دیکھنے لگی جو دو پیار کرنے والوں کو محبت کی بوچھاڑ میں بھگونے کو بے تاب ہوئی جا رہی تھی۔

حفاظتی بند باندھ لیجیے

ہم ہیں آوارہ سو بسو لوگو!
جیسے جنگل میں رنگ و بو لوگو!

ساعتِ چند کے مسافر سے
کوئی دم اور گفتگو لوگو!

تجھے تمہاری طرح کبھی ہم بھی
رنگ و نکہت کی آبرو لوگو!

قریۂ عاشقی، سرا چھوڑ دل
گھر ہمارے بھی تھے کبھو لوگو

وقت ہوتا تو آرزو کرتے
جانے کس شے کی آرزو لوگو!

تاب ہوتی تو جستجو کرتے
جانے کس کس کی جستجو لوگو!

کوئی منزل نہیں، دوانا ہیں
ہم مسافر ہیں بے ٹھکانا ہیں

ابن انشاء

زندگی

تم مجھے زندگی کہتے ہو
مجھے یقین ہے
مگر میری ایک خواہش ہے
کہ اس زندگی کے بعد
مجھے ایک اور زندگی ملے
تاکہ میں دیکھ سکوں
کہ تم
میری زندگی سے
کسی اور زندگی تک کا فاصلہ
کتنے عرصے میں طے کرتے ہو

فرزانہ سہیل

کل اور آج

پہلے ایسا
کب ہوتا تھا

اجیارا ہو یا اندھیارا
جب ہونا ہو تب ہوتا تھا

ایک ہی دن
چلتا تھا ہفتوں
خواب تھے چھوٹے
رات بڑی تھی

وقت!
نکلا تھا کم باہر
جیب کے اندر
جیب گھڑی تھی
آنکھ اٹھی
اور منظر بدلے
یہ کیسا...!
جنجال نیا ہے
پچھلا سال
گیا تھا کل ہی
آج جو دیکھا
سال نیا ہے
پہلے ایسا
کب ہوتا تھا!

ندا فاضلی

نگری نگری پھرا مسافر، گھر کا رستا بھول گیا
کیا ہے تیرا، کیا ہے میرا، اپنا پرایا بھول گیا

کیا بھولا، کیسے بھولا، کیوں پوچھتے ہو، بس یوں سمجھو
کارن دوش نہیں ہے کوئی، بھولا بھالا بھول گیا

یاد کے پھیر میں آ کر دل پر ایسی کاری چوٹ لگی
دکھ میں سکھ ہے، سکھ میں دکھ ہے، بھید یہ نیارا بھول گیا

سوجھ بوجھ کی بات نہیں ہے، من موجی ہے مستانہ
لہر لہر سے جا سر پٹکا، ساگر گہرا بھول گیا

ہنسی ہنسی میں کھیل کھیل میں بات کی بات میں رنگ مٹا
دل بھی ہوتے ہوتے آخر گھاؤ کا رستا بھول گیا

اپنی بیتی جگ بیتی ہے، جب سے دل نے جان لیا
ہنستے ہنستے جیون بیتا، رونا دھونا بھول گیا

جس کو دیکھو اس کے دل میں شکوہ ہے تو اتنا ہے
ہمیں تو سب کچھ یاد رہا، پر ہم کو زمانہ بھول گیا

کوئی کہے یہ کس نے کہا تھا کہہ دو جو کچھ جی میں ہے
میرا جی کہہ کر پچھتایا اور پھر کہنا بھول گیا

میرا جی

حماقت

ایک آرٹسٹ قتل دیکھ کر وہاں سے باہر آرہا تھا کہ پولیس نے اسے پکڑ لیا۔ پوچھ گچھ کا آغاز ہوا۔

"اچھا ڈان اور لی! آخر ہم نے تمہیں پکڑ ہی لیا۔"

آرٹسٹ قہقہے لگانے لگا۔ پولیس نے اسے پانچ دن اور پانچ رات سونے نہ دیا۔ آرٹسٹ ہنستا ہی رہا۔ ایک ماہ تک اسے صرف چند گھونٹ پانی اور چند ٹکڑے کھانے کے سوا کچھ نہ ملا۔ لیکن وہ ہنستا ہی رہا۔ دو ماہ تک قید تنہائی میں رکھا۔ اس کو مرنے مٹنے کی دھمکی دی۔ چند دن تک آنکھ سے ٹپکتے کوئی کم از کم چھ ماہ کی سخت سے سخت ... مسکراتا ہی رہا ... بعد کا کام ہونے پر ایک روز پولیس آفیسر نے کہا۔

"ڈان اور لی! آخر اس سارے فیصلے کے بعد تم کس بات پر ہنس رہے ہو؟"

اس نے کہا "مجھے تم لوگوں کی حماقت پر ہنسی آرہی ہے۔"

"ہماری حماقت...؟"

"ہاں تمہاری حماقت۔" آرٹسٹ نے جواب دیا۔ "میرا نام ڈان اور لی نہیں ہے۔ تم نے اپنی حماقت سے ایک غلط شخص کو پکڑ رکھا ہے۔"

سیدہ نسیبہ زہرا۔ کھروڑ پکا

وصیت

ایک شرارتی کنجوس جب مرنے لگا تو اس نے وصیت نامے میں لکھوا دیا کہ پانچ ہزار روپے میرے ان ملازمین کو دیے جائیں جو عرصہ پانچ سال سے میری خدمت میں مامور ہیں۔

وکیل نے اس فیاضی کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ "آپ نے بڑا نیک کام کیا ہے۔" کنجوس نے جواب دیا۔ "میرا تو ایک ملازم بھی ایسا نہیں جو ایک سال سے زیادہ عرصے سے میری ملازمت میں رہا ہو۔ البتہ اخباروں میں تو یہ بات اچھی لگے گی۔"

گڑیا شاہ۔ کھروڑ پکا

سیٹھ صاحب

سیٹھ صاحب نے آرٹسٹ سے پوچھا۔

"آپ میری جو پورٹریٹ بنائیں گے وہ خوبصورت ہوگی نا؟"

"جی ہاں آپ مطمئن رہیں صاحب! آپ خود کو بھی نہیں پہچان پائیں گے۔"

کہانی

"یہ اس علاقے کا سب سے اونچا اور مشہور پہاڑ ہے۔" گائیڈ نے سیاح کو بتایا۔

"اس سے کوئی دلچسپ روایت یا کہانی بھی وابستہ ہوگی؟" سیاح نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ہاں! ایک مرتبہ ایک سیاح جوڑا اس پہاڑ پر چڑھا اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آیا۔" گائیڈ نے بتایا۔

"اوہ! کیا ان کے بارے میں کچھ نہیں پتا چلا کہ ان کا کیا بنا؟" سیاح نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے پوچھا۔

"بس اتنا ہی پتا چلا کہ وہ دوسری طرف اتر کر آگے روانہ ہو گئے تھے۔" گائیڈ نے مطمئن سے لہجے میں بتاتے ہوئے جواب دیا۔

ثمرہ اقرا۔ کراچی

سشر طیہ

خرم بٹ کے سر پر پٹی اور بازو پر پلستر چڑھا دیکھ کر ہمسائے نے پوچھا۔

"خیریت تو ہے۔ کیا آج پھر موٹر سائیکل کا ایکسیڈنٹ ہو گیا؟"

"نہیں۔" خرم بٹ نے مری مری سی آواز میں جواب دیا۔

"تو پھر یہ حالت کیسے ہو گئی؟"

"دراصل میں نے عادل بٹ سے دو سو روپے کی شرط لگائی تھی کہ وہ مجھے بغیر پکڑے بالکنی کی سیڑھی پر نہیں چڑھ سکتا۔"

"تو پھر؟"

"تو پھر کیا۔ میں شرط جیت گیا۔" خرم بٹ نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

بے نیازی

نئے نئے دولت مند ہونے والے میاں بیوی یورپ کی سیر کے لیے چلے گئے۔ واپسی پر ان کے دوست احباب بے چینی سے ان کے سفر کا حال سننے کے منتظر تھے۔ ان کے اعزاز میں دی گئی ایک دعوت میں ایک خاتون نے خوبرو لیڈی کی بیگم سے پوچھا۔

"آپ نے روم کو بھی اپنے دورے میں شامل رکھا تھا یا نہیں؟"

"مجھے تو معلوم نہیں۔" بیگم نے بے نیازی سے کندھے اچکا کر کہا۔ "ٹکٹ ہمیشہ میرے میاں خرید کر لاتے تھے۔"

اپنی حفاظت

عراق کے ایک راستے میں دو امریکی فوجی ایک ٹرک میں جا رہے تھے کہ راستے میں ایک جگہ بم پڑا نظر آیا۔ ایک فوجی نے چلا کر ڈرائیور فوجی سے کہا۔

"ادھر ادھر سے گاڑی دور کو۔ سڑک کے بیچوں بیچ بم پڑا ہے۔"

ڈرائیور کرنے والے فوجی نے آنکھیں سکیڑ کر بم کی طرف دیکھا پھر بے پروائی سے ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں یہ ہمارا اپنا بم ہے۔"

بے قصور

آسیہ نے دھوبی سے شکایت کی۔

"پچھلی بار تم جو کپڑے دھو کر لائے تھے ان میں سے منی کے قمیص میں بھی بو آ رہی تھی۔"

"بی بی! اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں جب کپڑے لے کر گیا تب بھی ان میں سے منی کے تیل کی بو آ رہی تھی۔" دھوبی نے اطمینان سے جواب دیا۔

سہری مرچیں

1۔ وہ کچھ اس قسم کا ایکٹر ہے کہ جب ڈائریکٹر کو کسی سین میں ڈھکنے کے لیے لکڑی یا پتھر نہیں ملتا تو وہ اسے کاسٹ کر لیتا ہے۔

2۔ ہمارے ہاں بہت سے لوگ فلموں پر تبصرہ کرنے کے اہل ہیں لیکن افسوس کہ اگر گندی باتوں اور گالیوں کو ان تبصروں سے نکال دیا جائے تو پھر اخبار میں چھاپنے کے لیے کچھ نہیں بچتا۔

3۔ کمپنی کا ایک ملازم اپنے لیے پنشن کی بھیک منظور کرنے کی غرض سے فارم بھر رہا تھا۔ اس میں ایک سوال تھا۔

"کیا آپ کے خیال میں آئندہ تین مہینوں کے اندر کسی وقت آپ کو ایمرجنسی میں اسپتال جانے کی ضرورت پیش آ سکتی ہے؟"

4۔ چین ہی کے مرکزی علاقے میں بہت سے مانگنے والے مختلف ملے کارڈ لیے کھڑے ہوتے ہیں جن پر مختلف انداز میں لکھا ہوتا ہے کہ ان کی مالی مدد کی جائے۔ لوگ ان عبارات پر توجہ نہیں دیتے لیکن پچھلے دنوں ایک مانگنے والے کی عبارت نے سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لی۔ اس نے اپنے گلے کارڈ پر لکھا تھا "بریڈ پٹ اور انجلینا جولی کے ہاں بچے کی پیدائش متوقع ہے۔ میں اس موقع پر تحفہ دینے کے لیے رقم جمع کر رہا ہوں، براہ کرم میری مدد کریں۔"

صدف عمران۔ کراچی

شگفتہ حیاء

اے میں بے شمار خوشی

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

سیدنا جریر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ کچھ اعرابی لوگ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ وہ کمبل پہنے ہوئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا برا حال دیکھا تو لوگوں کو صدقہ دینے کی رغبت دلائی۔ لوگوں نے صدقہ دینے میں دیر کی یہاں تک کہ اس بات کا رنج آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر معلوم ہوا۔ پھر ایک انصاری شخص روپوں کی ایک تھیلی لے کر آیا پھر دوسرا آیا یہاں تک کہ صدقہ اور خیرات کا تار بندھ گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر خوشی معلوم ہونے لگی پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص اسلام میں اچھا طریقہ جاری کرے (یعنی عمدہ کام کو جاری کرے جو شریعت کی رو سے ثواب ہے اور اس کا ثبوت قرآن و سنت میں ہو) پھر لوگ اس کے بعد اس پر عمل کریں تو اس کو اتنا ثواب ہو گا جتنا سب عمل کرنے والوں کو ہو گا اور عمل کرنے والوں کے ثواب میں کچھ کمی نہ ہو گی اور جو اسلام میں برا طریقہ جاری کرے (مثلاً بدعت یا گناہ کا کام) اور لوگ اس کے بعد اس پر عمل کریں تو تمام عمل کرنے والوں کے برابر گناہ اس پر لکھا جائے گا اور عمل کرنے والوں کا گناہ کچھ کم نہ ہو گا۔"

(صحیح مسلم)

حج اکبر

عبداللہ بن مبارک جو درجہ کے متقی تھے۔ ایک سال حج کرتے، ایک سال جہاد میں شریک ہوتے۔ آپ حج سے فارغ ہوئے تو حرم شریف میں ایک ساعت کے لیے سو گئے۔ آپ نے خواب میں دیکھا کہ دو فرشتے آسمان سے نازل ہوئے۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا۔

"اس سال کتنے لوگ حج کو آئے؟"

دوسرے نے جواب دیا۔ "چھ لاکھ۔"

پھر اس نے پوچھا۔ "کس قدر لوگوں کا حج قبول ہوا؟"

دوسرے نے کہا۔ "کسی کا حج قبول نہیں ہوا۔"

آپ فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ سنا تو میرے دل میں ایک اضطراب پیدا ہو گیا۔ میں نے کہا۔

"اس قدر لوگ اطراف سے اس قدر رنج اٹھا کر جنگل اور بیابانوں کو عبور کر کے آئے ہیں ان کی تکلیفیں اور عذاب ضائع ہو گیا؟"

پھر اس فرشتے نے کہا۔ "دمشق میں ایک موچی رہتا ہے اس کا نام علی بن الموافق ہے۔ وہ حج کو نہیں آیا مگر اس کا حج قبول ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان سب لوگوں کو اس کے طفیل بخش دیا۔"

جب میں نے یہ سنا تو خواب سے بیدار ہو کر خیال کیا کہ مجھے دمشق جا کر اس شخص کی زیارت کرنا چاہیے۔ جب میں دمشق پہنچا تو اس کا گھر تلاش کیا اور دروازے پر دستک دی۔ اندر سے ایک شخص نکلا۔ میں نے اس کا نام دریافت کیا۔ اس نے کہا۔

"علی بن الموافق۔"

میں نے کہا۔ "مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

اس نے کہا۔ "ہاں کہو۔"

میں نے کہا۔ "آپ کیا کام کرتے ہیں؟"

اس نے کہا۔ "میں پارہ دوزی کرتا ہوں۔"

پھر میں نے خواب کا تمام واقعہ اس سے بیان کیا۔

اس نے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

میں نے بتایا۔ "عبداللہ بن مبارک۔"

اس پر انہوں نے بتایا۔ "مجھے تیس سال سے حج کی آرزو تھی سو میں نے اس مدت دراز میں تین ہزار دینار جمع کیے اور اس سال حج کا ارادہ کیا۔ ایک دن میری بیوی

نے جو کہ حاملہ تھی، مجھ سے کہا: "ہمسایہ کے گھر سے طعام کی خوشبو آ رہی ہے۔ جاؤ اور میرے لیے کچھ طعام ان سے مانگ لاؤ۔" جب میں گیا تو میرے ہمسائے نے مجھ سے ذکر کیا کہ تین دن سے اس کے بچے فاقے میں ہیں۔ انہوں نے کچھ نہیں کھایا۔ آج اتفاق سے میں نے ایک مردار گدھا دیکھا تو اس سے ایک ٹکڑا گوشت کاٹا اور لا کر طعام بنایا، وہ تمہارے لیے حلال نہیں۔ جب میں نے یہ سنا تو میری جان کو ایک آگ سی لگ گئی۔ میں تین ہزار درہم گھر سے اٹھا کر لایا اور اسے دے دیے کہ اس سے بال بچوں کا گزارہ کرو، میرا حج یہی ہے اور اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہے کہ میرے خلوص نیت کو دیکھ کر بغیر ارکان حج ادا کیے اس نے مجھے اس عمل کو قبولیت حج کا درجہ عطا فرمایا۔"

آمنہ صدیقی۔ عنایت پور بھٹیاں

محبت کیا ہے؟

ایک دفعہ حضرت سیدنا شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ سے دریافت کیا گیا۔

"محبت کیا ہے؟" تو آپ نے فرمایا۔

"محبت، محبوب کی طرف سے دل میں ایک تشویش ہوتی ہے۔ پھر دنیا اس کے سامنے ایسی ہوتی ہے جیسے انگوٹھی کا حلقہ یا چھوٹا سا ہجوم۔ محبت ایک نشہ ہے جو ہوش ختم کر دیتا ہے۔ عاشق ایسے محو ہیں کہ اپنے محبوب کے مشاہدہ کے سوا کسی چیز کا انہیں ہوش نہیں۔ وہ ایسے بیمار ہیں کہ اپنے مطلوب کو دیکھے بغیر تندرست نہیں ہوتے۔ وہ اپنے خالق عزوجل کی محبت کے علاوہ کچھ نہیں چاہتے اور اس کے ذکر کے سوا کسی چیز کی خواہش نہیں رکھتے۔"

(اقتباس از بہجۃ الاسرار)
آئمہ رانا۔ چکوال

راز رکھو

حضرت عمرؓ کے دور کا واقعہ ہے کہ ایک لڑکی نے حد شرعی سے بچنے کے لیے خودکشی کی کوشش کی اور زندہ بچ گئی اور پھر گناہ سے تائب ہو گئی۔ ایک آدمی نے اسے نکاح کا پیغام دیا جو کہ اس واقعہ سے لاعلم تھا۔ سرپرست نے حضرت عمرؓ سے پوچھا۔

"کیا میں اس آدمی کو یہ واقعہ بتا دوں؟"

آپؓ نے فرمایا۔ "کیا جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے چھپایا ہے تو اسے ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ واللہ اگر تو نے کسی سے بھی اس کا ذکر کیا تو میں تجھے لوگوں کے لیے عبرت بنا دوں گا۔ جس طرح پاک دامن عفیفہ کی شادی کرتے ہیں اسی طرح اس کی بھی شادی کر۔"

ثمرہ شعیب جٹ۔ گوندلانوالہ

یاد رکھیے

- حضرات آپ ہمارا فیصلہ نہیں کر سکتے کیونکہ تاریخ کی ابدی عدالت نے یہ فیصلہ صادر کیا ہے کہ ہم اور وقتی طور پر تو ہار سکتے ہیں لیکن شکست نہیں کھا سکتے

بکھر تو سکتے ہیں لیکن مٹ نہیں سکتے۔
(ہٹلر)

- جلد بازی میں پوری کتاب کو پڑھنے سے بہتر ہے ایک ایک صفحہ کو پڑھا اور ہضم کیا جائے۔ (میکلے)
- ایک بزدل آدمی کے ہاتھ میں پستول بھی پکڑا دو لیکن جب اس پر حملہ ہوگا تو وہ ایک گولی بھی نہیں چلا سکے گا لیکن ایک بہادر آدمی بے دست و پا بھی میدان فتح کرے گا۔ ([illegible])

انیلا مختار۔ بیچہ بھٹی

جواہر پارے

- آنسو کسی ذات کے قریب آنے کی دلیل ہیں۔
- ماسوا ہٹے تو ماورا کدھر سے آئے۔
- آنسو کا سفر رکتا نہیں، یہ سیدھا بارگاہ حضوریت میں لے جاتا ہے۔
- خوش نصیب انسان وہ ہے جو اپنے نصیب پر خوش ہے۔
- راستہ، سڑک یا زندگی، کسی کا اپنا کوئی شعبہ نہیں ہے۔ سڑک تو وہی رہتی ہے، صرف مسافر کا فرق ہے۔ اسی سڑک پر جو رک کر بھی چلتے رہتے ہیں وہی ہیں جسے اللہ کا ولی بھی کر دیتا ہے۔

(واصف علی واصف)
خدیجہ رحمٰن۔ ایم۔ بی دین (ڈسکہ)

دریا، سمندر

※ عاجزی اور کمینگی میں بڑا فرق ہے۔ کسر نفسی کو تحقیر ذات تک نہ پہنچاؤ۔
※ طوفانوں کی عادت سب کشتیوں کو نہیں ڈبو سکتی۔
※ انسانی عقل و خرد کی تمام طاقتیں مکڑی کے کمزور جالے کے سامنے بے بس ہیں۔

(واصف علی واصف)
گل پری مرزا۔ لاہور

عورت

حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا۔ "عورت! میں تیری تعریف اس لیے نہیں کرتا کہ تو کائنات میں سب سے زیادہ حسین ہے، میں اس سبب تجھ سے محبت نہیں کرتا کہ تو انسانی راحت کا سب سے موزوں سرچشمہ ہے بلکہ میں اس واسطے تیری تعظیم کرتا ہوں کہ انسانیت تیرے ہی فیض سے ہے۔"

زاہدہ شاہ۔ [illegible] شریف

دعا

ایک مرتبہ ایک قوم حضرت معروف کرخیؒ کے پاس سے دجلہ میں کشتی پر گزری جن کے پاس شراب اور دیگر سامان عیش رکھا ہوا تھا۔ لوگوں نے کہا۔

"آپ ان کے لیے بددعا کیوں نہیں کرتے؟" آپ نے فرمایا۔

"اے اللہ ان کو آخرت میں بھی ایسا ہی خوش و خرم رکھ جیسے یہ دنیا میں خوش ہیں۔" لوگوں نے اس دعا پر تعجب کیا تو فرمایا۔

"نعوذ باللہ میں کسی مسلمان پر بددعا کروں۔ بے شک اللہ انہیں آخرت میں اسی وقت خوش کرے گا جب دنیا میں نیکی اور توبہ کی توفیق دے کر معاف کرے گا۔ یہ اس کی حسن سیاست میں سے ہے۔"

نورین ظفر خان۔ اوجھڑاں

سنہرے اقوال

★ ضرورت، بزدل کو بھی بہادر بنا دیتی ہے۔ (سالسٹ)
★ آنسوؤں کو بہہ جانے دو، یہ غموں کو مایوسیوں میں تبدیل ہونے سے روکتے ہیں۔ (لی ہنٹ)
★ طنز وہ آئینہ ہے جس میں دیکھنے والا اپنے سوا ہر کسی کے چہرے کو دیکھتا ہے۔ (سوئفٹ)
★ وہ آدمی عظیم ہے جو اپنا کام چلانے کے لیے دوسروں کے دماغوں سے استفادہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ (پیاٹ)
★ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ چھوٹے بچوں کو ہم پہلے تو بولنے کی ترغیب دیتے ہیں اور پھر ان کو ڈانٹتے ہیں کہ خاموش ہو جاؤ۔ (جیو برٹ)
★ تقریباً ہم سب ماضی کے محتاج ہیں۔ (چیمبرلین)
★ عقل مند لوگ اندازہ نہیں کر سکتے کہ بے وقوف اب کیا کہنے والا ہے۔ (برائیٹ)
★ ذہانت گفتگو کا نمک ہے۔ (ہیزلیٹ)
★ فلسفہ، جنگلی بیل پر گلاب کا پھول۔ (لارڈ [illegible])
★ آہ! اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لیکن آنکھوں میں آنسو تھے۔ (اسکاٹ)
★ بے محل، غیر ضروری گفتگو کرنا اور غلط جگہ ہنسنا بے وقوفی ہے۔ (ریو مانٹ)

سیدہ نسبت زہرا۔ کبیر والا

سادگی و نفس کشی

امیرالمومنین حضرت علی المرتضیٰ شیر خدا کرم اللہ وجہہ کے زمانہ خلافت میں ایک اعرابی کا اونٹ مر گیا۔ وہ دور دراز کا سفر طے کرتا ہوا بیت المال سے اونٹ حاصل کرنے کے لیے دارالخلافت مدینہ منورہ پہنچا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی رہائش گاہ پر آیا تو حضرت امام حسینؓ نے اس کا استقبال کیا اور خوش آمدید کہا اور فرمایا۔ "حضرت امیرالمومنین کرم اللہ وجہہ تو کاروبار خلافت کے سلسلے میں کہیں باہر تشریف لے گئے ہیں۔"

حضرت امام حسینؓ نے اس اعرابی کو مسجد کے حجرے میں بٹھایا اور کہا۔

"میں آپ کے لیے کھانا تیار کر کے لاتا ہوں۔" چنانچہ تھوڑی دیر میں پرتکلف کھانا تیار کر کے آپؓ نے اس کے سامنے رکھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی مسجد میں

تشریف لے آئے۔ اعرابی نے کہا۔
"میں یہ کھانا ہرگز نہ کھاؤں گا جب تک اس غریب شخص کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک نہ کر لوں جو صحن مسجد میں خشک روٹی پانی میں بھگو بھگو کر کھا رہا ہے۔" حضرت امام حسینؓ نے فرمایا۔
"یہی تو میرے والد امیر المومنین حضرت علی شیر خدا کرم اللہ وجہہ ہیں۔ وہ اپنے معمول کے برخلاف یہ پرتکلف کھانا ہرگز نہ کھائیں گے۔"
اعرابی یہ سادگی اور نفس کشی دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سلطنت عظیم کے سیاہ و سپید کے مالک کی یہ سادگی ایسی خشک غذا جس کو غریب ترین انسان بھی کم ہی گوارا کرے۔ غرض اس اعرابی کو بیت المال سے ایک عمدہ اونٹ دلا دیا گیا۔
اور وہ شکر گزاری و حیرانی کے جذبات سے لبریز شاد کام اور بامراد اپنے وطن مالوف کو واپس چلا گیا۔
گڑیا شاہ۔ کبیر والا پکا

کچھ باتیں آپ سے کہنی ہیں،

- بے صبری، صبر سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔
- تکلف کی زیادتی، محبت کی کمی کا باعث بن جاتی ہے۔
- زمین اور آسمان کے درمیان بکھری اچھی باتوں کو یوں چنیے جیسے پرندے زندگی کے لیے دانہ چنتے ہیں۔
- جب انسان کچھ پاتا ہے تو کچھ کھو بھی دیتا ہے۔ پالینے کی سرشاری وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم ہوتی جاتی ہے اور کھو دینے کا ملال وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔

صبا سلیم ذوالفقار۔ ٹنڈو جان محمد

قبر کی منزلیں،

حضرت عثمان بن عفان کے غلام حضرت ہانیؒ سے منقول ہے کہ حضرت عثمانؓ جب کسی قبر پر کھڑے ہوتے تو ان پر اس قدر رقت طاری ہوتی کہ آنسوؤں سے ان کی داڑھی بھیگ جاتی۔ ان سے کسی نے دریافت کیا۔
"جب آپ جنت و دوزخ کا ذکر کرتے ہیں، اس وقت تو نہیں روتے لیکن جب آپ کو قبر یاد آ جاتی ہے یا آپ کسی قبر کو دیکھ لیں تو اس قدر شدت سے روتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"
حضرت عثمان بن عفانؓ نے فرمایا۔ "میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنا ہے کہ قبر آخرت کی منزلوں میں سے سب سے پہلی منزل ہے۔ جو اس منزل میں کامیاب ہوا اس کے بعد کی منزلیں بھی اس پر آسان ہوں گی۔ اور جو اس منزل میں کامیاب نہ ہو سکا اس کے لیے اس کے بعد کی منزلیں اور بھی مشکل ہوں گی۔"
کنول شاہین۔ تلہ گنگ

سنہری باتیں،

- جس نے مجھے ایک لفظ سکھا دیا اس نے مجھے غلام بنا لیا۔ (حضرت علیؓ)
- چونکہ جاہل کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ وہ عالم ہے اس لیے وہ کبھی کوئی بات نہیں مانتا۔ (حضرت امام شافعیؒ)
- ہنسنا اور خوش رہنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ غذا کو چبانا۔ (جعفر)
- ضمیر کی خلش اس دنیا کو ہی دوزخ بنا دیتی ہے۔ (بوعلی)
- خاموشی گفتگو کا حسن ہے۔ (بوعلی سینا)
- جو شخص ارادے کا پکا ہو وہ دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتا ہے۔ (گوئٹے)

عظمیٰ شیرازی۔ ٹنڈو آدم

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ

خالدہ جیلانی

ربیعہ شعیب ـــــــ میرپور آزاد کشمیر

وہ جو چاند تاروں کے ہاں پر سر شام گھر سے نکل پڑا
جسے دوستوں پہ غرور تھا، وہ کہاں ڈھلا وہ کہاں گیا
دھڑکنوں میں جو شخص تھا یہ کہ جس کے دل کا سکون تھا
غم زندگی تیری تلخیاں، وہ کہاں گیا وہ کہاں گیا

پروین افشاں شاہین ـــــــ بہاولنگر

ہم صنم پرستوں کی یہ ریت پرانی ہے
ہاتھوں میں قلم رکھنا یا ہاتھ قلم رکھنا

کشمالہ ـــــــ بطرانی عربیا

لمحہ لمحہ نظر آتا ہے کبھی اک اک سال
کبھی لمحے کی طرح سال گزر جاتا ہے
کبھی تاریخ کبھی عمر کبھی ملتا ہے
وقت اپنے دریغ ہر حال گزر جاتا ہے

صبا رانا سلیم ـــــــ ٹنڈو جان محمد

میں تو اس وقت سے ڈرتا ہوں کوئی پوچھے
یہ اگر ضبط کا آنسو ہے تو ٹپکا کیسے

صبا فرید ـــــــ کبیر والا پکا

اک اور برس بیت گیا اشک رواں کے ساتھ
اس سال تو خدا کرے کوئی خوشی ملے

انیقہ انا ـــــــ بھکوال

اک اشک چھلک جائے تو طوفان اٹھا دے
دکھتا ہوں میں آنکھوں کے پیمانوں میں سمندر
اک چاند ہے کیا اس کی ملاقات ہوئی ہے
رہتا ہے ہر وقت اجالوں میں سمندر

نورین ظفر خان ـــــــ ٹوبہ عمران

کیوں اداس بیٹھے ہو اس اندھیرے میں
دکھ تو کم نہیں ہوتے روشنی بجھانے سے
کچھ نہیں آتی شہر کے مکینوں کی
نقاب روٹھ جاتے ہیں آئینہ دکھانے سے

نزہت جبیں ضیاء ـــــــ کراچی

دم توڑتے برس نے اس بار پھر صدا دی
بھیگا ہے اس برس بھی نصیب کا وسیر

کنول شاہین قیصر ـــــــ تلہ گنگ

میں لوٹ کر نہ آؤں گا
تو سنتیں ہزار کر
یہ عمر پھر نہ آئے گی
نہ دل کا اعتبار کر

ثریا فرحت ـــــــ خانیوال

مجھ سے مخلص نہ واقف میرے جذبات سے تھا
اس کا رشتہ تو فقط اپنے مفادات سے تھا
اب جو بچھڑا تو کیا روئیں جدائی پہ تیری
یہ اندیشہ تو ہمیں پہلی ہی ملاقات سے تھا

روبی گیلانی ـــــــ جڑانوالہ

کس قدر تکلیف وہ تھا آرزوؤں کا سفر
مسئلہ در مسئلہ سانحہ در سانحہ

عائشہ اسلم ـــــــ گجرات

جنوں میں مجھ کو ڈبوتے تو بات تم پہ بھی آتی
یہ ساحل پہ لا کر ڈبوتا، کوئی سنے گا تو کیا کہے گا
جی میں آیا تو خوب کھیلا خوشی سے تڑا تو توڑ ڈالا
میرا جگر بھی ہے اک کھلونا، کوئی سنے گا تو کیا کہے گا

تسکان بتی ـــــــ ملتان

ہجر کی شب نالۂ دل وہ صدا دینے لگے
سننے والے رات کٹنے کی دعا دینے لگے
باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو میرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

صائمہ سلیم ـــــــ کراچی

یادوں کے حاشیے بھی اہم ہیں بہت
دیمک لگی کتاب کو آہستہ کھولیے

عمرو طاہر بٹ ـــــــــــ لاہور

دنیا کا ذکر بھی ہوگا زمانے کو ہم یاد بھی آئیں گے
مگر فائلوں میں رکھی بوسیدہ کتابوں کی طرح
میرے خواب تجھے جگا جائیں گے چاندنی بن کر
تیری یادیں مجھ پہ برسیں گی عذابوں کی طرح

تہمینہ شاہ، رابعہ شاہ ـــــــــــ کنگن شریف

آنکھوں میں کوئی خواب اترنے نہیں دیتا
یہ دل کہ مجھے چین سے مرنے نہیں دیتا
بچھڑے تو عجب پیار جتاتا ہے خطوں میں
مل جائے تو پھر حد سے گزرنے نہیں دیتا

منزہ رابعہ ـــــــــــ اسکندر آباد

سمجھتے تھے ہم کہ پاؤں کے کانٹے نکل گئے
منزل قریب آئی تو رستے بدل گئے
دوست ہم کو جن کی رفاقت پہ ناز تھا
وہ لوگ بھی ہوا کی طرح رخ بدل گئے

انیلہ عزیز ـــــــــــ میانوالی

کھیتوں میں پھر سرسوں کی رُت آ پہنچی
آج تمہیں دیکھے پھر اک سال ہوا

تسنیم بشیر ـــــــــــ میانوالی

ہمہ وقت رنج و ملال کیا جو گزر گیا سو گزر گیا
اسے یاد کرکے نہ دل دکھا جو گزر گیا سو گزر گیا

نغمانہ بٹ ـــــــــــ لاہور

یارب یہ سال سب کی مسرت کا سال ہو
پیغام عیش لائے یہ عشرت کا سال ہو
آنسو کا سال ہو نہ یہ آہوں کا سال ہو
نغمے نئے سنائے بہاروں کا سال ہو

مصباح گل ـــــــــــ سرگودھا

نئی رتوں میں دکھوں کے سلسلے ہیں نئے
وہ زخم تازہ ہوئے جو کہ بھرنے والے تھے
یہ کس مقام پہ سوجھی تجھے بچھڑنے کی
کہ اب تو جا کے کہیں دن سنورنے والے تھے

عائشہ جٹ ـــــــــــ بہاولپور

منزل تو کچھ بھی دور نہ تھی اس نشان سے
تھک کر جہاں گرا تھا پرندہ اڑان سے
برسوں کا ساتھ چھوڑ کر وہ اس طرح گیا
جیسے کوئی ستون گرا ہو مکان سے

ثمرہ احمد بٹ ـــــــــــ پتوکی

اک پردیسی لوٹ کے آیا اپنے دیس
مدتوں بعد کسی کی دید ہوئی ہے
جگمگ جگمگ سارا نیا سال
روشن ایسی اپنی عید ہوئی ہے

گڑیا شاہ ـــــــــــ کہروڑ پکا

کہیں سورج سے ذرے کی ٹھنی ہے
کہیں تتلی سے بھنورا لڑ گیا ہے
پڑی ہے اوس رشتوں پر کچھ ایسی
لہو کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے

شازیہ رانا ـــــــــــ دیپالپور

یہ سال بھی گزر رہا ہے تیرے پیار کی مانند
آتے ہوئے کچھ اور تھا جاتے ہوئے کچھ اور

ریحانہ چوہدری ـــــــــــ ساہیوال

جس نے یہ سورج کے بجھنے کا ہنر سیکھ لیا
درد رکھتا ہے تو پھر دیدۂ تر کیا رکھنا

سیدہ حنا تبسم ـــــــــــ حیدر آباد

جہاں سوال کے بدلے سوال ہوتا ہے
وہیں محبتوں کا زوال ہوتا ہے
کسی کا بن کر رہنا بڑی بات نہیں
کسی کو اپنا بنانا بھی کمال ہوتا ہے

راحیلہ ملک ـــــــــــ اسلام آباد

سال کی پہلی کرن کے ساتھ پھر جاگا ہے دل
پھر وہی میری طلب اب کے برس مل جائے تو

آنشین ـــــــــــ فیصل آباد

وہ اس انداز کی مجھ سے محبت چاہتا ہے
کہ میرے ہر خواب پر اپنی حکومت چاہتا ہے
وہ کہتا ہے کہ میں اس کی ضرورت بن چکا ہوں
تو گویا وہ مجھے حسب ضرورت چاہتا ہے

حنا سلیم اعوان ـــــــــــ ہری پور ہزارہ

ہر ایک آنکھ تھی پرنم یہ کیسا موسم تھا
جدا ہوئے جو درختوں سے پات اب کے برس
کسی کے جانے کا اشرف گلہ کروں کس سے
جدا ہوئی ہے میری خود سے ذات اب کے برس

رضیہ جمیل

خط

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
Shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔
آپ کی خوشیوں، سکون اور عافیت کے لیے دعا ہیں۔

پہلا خط نادیہ جہانگیر اور ثوبیہ جہانگیر کا ہے، لکھتی ہیں
ٹائٹل ہمیشہ کی طرح بہت خوب صورت تھا۔ لڑکی کا گلابی گلابی چہرہ بہت نرم... بہت پرکشش سا لگا۔
جب "شعاع" ہاتھ میں لے کر دیکھا تو نزہت شانہ حیدر کا نام سامنے ہی جگمگا رہا تھا۔ ہماری تو خوشی سے باچھیں کھل اٹھیں، اسی لیے سب سے پہلے "ابھی عشق ہو تو پتا چلے" کو پڑھا۔ بہت زبردست اور خوب صورت ناول تھا۔
اسماء قادری کا ناول بھی بہت زبردست تھا اور سعدیہ سحر عمران نے بھی ہمیشہ کی طرح بہت خوب لکھا۔
رخسانہ نگار نے اس دفعہ پھر "آخری تحفہ" کا کمال دکھایا مگر آخر میں جب ان کا محبت نامہ پڑھا تو ان پر پیار آیا۔
ارے رخسانہ آپی! آپ کی محبت کا شکریہ، جو ہم قارئین کا اتنا خیال رکھتی ہیں کہ ہمارے لیے وقت نکال کر خط بھی لکھ ڈالا۔ ہمیشہ خوش رہیں۔ "اکیسویں صدی کی لیلیٰ" سعدیہ رئیس نے بہت اچھا لکھا۔ افسانوں میں تحسینہ عظمت علی کا افسانہ پہلے نمبر پر رہا۔ رفعت ہمایوں نے چہرے پہ مسکان سجا دی۔ راشدہ رفعت تو لکھتی ہی بہت زبردست ہیں۔ "رنگ ہائے زیست" بھی ہمیشہ کی طرح پسند آیا۔
"زرد موسم" راحت آپی نے اس دفعہ بہت تیز تیز لکھا۔ اب تو ہمیں صد فیصد یقین ہے کہ طارق صاحب ہی ایمن کے شوہر نامدار ہیں۔
نور بانو محبوب نے سچ کی ایک ایک بات اتنے خوب صورت انداز سے پیش کی کہ ہمارے دلوں کو وہیں باندھ کے رکھ دیا۔
عاقب جاوید نے [illegible]
میں صالحہ شبیر کا انتخاب پسند آیا۔
اور امید ہے اس بار بھی "ہر بار کی طرح" ہمارا تبصرہ ٹوکری میں جانے کے بجائے کہیں ہے پاس......؟

☆ نادیہ اور ثوبیہ! تفصیلی تبصرے کا شکریہ۔ آپ کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ آپ کا خط اس بار شامل اشاعت ہے۔ آپ نے ناولٹ لکھنے کا وعدہ کیا تھا، اس کا کیا ہوا؟ مقابلہ افسانہ نگاری کے لیے اپنی تحریریں ضرور بھجوائیں۔ ہم انتظار کر رہے ہیں۔
شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

بینش رحمت اللہ نے نارووال چھبر سے لکھا ہے۔
دسمبر کا شمارہ ہر لحاظ سے تو نہیں مگر بہرحال زبردست تھا۔ اگر ٹائٹل موسم کی مناسبت سے ہوتا تو زیادہ اچھا تھا۔ سب سے پہلے سلسلے وار ناول پڑھے۔ "تاریخ کے جھروکے" میرا پسندیدہ ترین سلسلہ ہے، پلیز "آئینہ خانہ" کو ختم کر کے اس کے صفحات میں اضافہ کریں۔ آپی! مجھے

لکھنے کا بے حد شوق ہے۔ لکھا بھی مگر خود ہی پھاڑ دیا کہ شعاع والے تو خط شائع نہیں کرتے، افسانہ یا ناولٹ کیا شائع کریں گے۔
☆ بینش! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے دو خط شائع نہ ہو سکے۔ آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ خط شائع نہیں کرتے تو افسانہ یا ناولٹ بھی شائع نہیں کریں گے۔ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے تو ضرور لکھیں۔ شعاع میں نئے مصنفین کی صلاحیتوں کو سامنے لانے کے لیے ہم نے مقابلہ افسانہ نگاری کا انعقاد کیا ہے۔ آپ اس میں حصہ لے سکتی ہیں۔ دوسری بہنوں کو بھی جن میں لکھنے کی صلاحیت ہے، اس مقابلے میں حصہ لینے کی دعوت دے رہے ہیں۔
فرحت اشتیاق اور نبیلہ تقوی کے جن ناولوں کے بارے میں آپ نے پوچھا ہے وہ کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئے۔

سیما افتخار لاہور سے ای میل کے ساتھ جلوہ افروز ہیں، لکھتی ہیں۔
دسمبر کا ٹائٹل بہت جاذب نظر تھا۔ سب سے پہلے بات ناولوں کی۔ [illegible] ایسے یوں لگا جیسے 1966ء کی کوئی فلم دیکھ رہے ہیں۔ جس کے آخری پندرہ منٹ میں سارا کچا چٹھا کھولنا فرض ہو۔ بہت ہی فلمی انداز لگا۔ "زرد موسم" تھوڑا سلو ہوتا جا رہا ہے۔ راحت آپی! کچھ خیال کریں۔ نزہت شانہ کا "عشق ہو تو پتا چلے" میں عبیر کا انجام پڑھ کر افسوس ہوا۔ اسماء قادری کا ناول روایتی سا لگا۔ "محبت اور تم" سعدیہ سحر عمران کا پسند آیا۔ اس بار بھی "میرے چارہ گر" کی آخری قسط پڑھ کر ابھی آستینیں چڑھا ہی رہی تھیں کہ رخسانہ جی کے خط نے ہمیں ٹھنڈا کر دیا۔ افسانوں میں راشدہ رفعت بازی لے گئیں۔ جبکہ تحسینہ عظمت علی کا "حسن" بے ساختہ مسکرانے پہ مجبور کر گیا۔ مستقل سلسلے سارے ہی زبردست تھے۔ البتہ شاعری میں ندا فاضلی کی غزل بے حد پسند آئی۔
☆ پیاری سیما! یاد آوری کا شکریہ۔ آپ کی تعریف اور تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

رابعہ شاہد پانوالی سے تفصیلی تبصرے کے ساتھ آئی ہیں، لکھتی ہیں۔
ٹائٹل کی سادگی اور معصومیت بہت پسند آئی۔ سب سے پہلے "میرے چارہ گر" ناولٹ پڑھا اور رخسانہ آپی کا خط بھی۔ "ریگ زار تمنا" کو ماہا جی بہت اچھے طریقے سے آگے لے کر جا رہی ہیں۔ "زرد موسم" میں ایمن بالکل اچھا نہیں کر رہی اور میرا خیال ہے ایمن کو جو کھلی چھوٹ دے رکھی ہے اور اپنی بیٹیوں پر جو بے جا سختی کر رہی ہے تو یہ دونوں باتیں ہی غلط ہیں۔ ایمن بھی خراب ہو جائے گی اور سرمل بھی بگڑ جائے گی۔
پھر اسماء قادری کا مکمل ناول "چاہا ہے تجھے" پڑھا تو بہت اچھا لگا۔ واقعی اس دنیا میں تیمور خان جیسے وحشیوں کی کمی نہیں ہے۔ اس کا اینڈ بہت پسند آیا۔
"ذکر عشق ہو تو پتا چلے" نزہت شانہ حیدر کا پسند آیا مگر اس کا اینڈ اچھا نہیں لگا۔ ثوبان اور عبیرہ کا ملاپ ہو جاتا تو اچھا تھا مگر شاید ایمان کو اس کے صبر کا پھل ملنا تھا۔
"میں، محبت اور تم" سعدیہ نے بہت اچھا لکھا۔ کبھی کبھار سنجیدہ پن بھی انسان کو پرکشش بنا دیتا ہے۔
آخر میں سب بہنوں کو نیا سال بہت بہت مبارک ہو۔

محبت ہی محبت کا تحفہ اب کے سال کرتے ہیں
چلو پھر آنے والی رت کا استقبال کرتے ہیں
کہ اب ہم سب کو سہاروں کی ضرورت ہے
نئے سال میں آنے والی بہاروں کی ضرورت ہے

☆ رابعہ! ہماری طرف سے بھی نئے سال کی مبارک باد قبول کیجیے۔ آپ کا محبت بھرا پیغام پہنچا رہے ہیں۔ محبت اس کائنات کا سب سے خوب صورت جذبہ ہے۔ اگر سب لوگ محبت سے رہیں تو یہ دنیا جنت بن جائے۔
ادارے کے اراکین کی تصاویر خواتین ڈائجسٹ کے 25 ویں سالگرہ نمبر میں شائع ہو چکی ہیں۔ پھر کسی موقع پر آپ کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔
"شعاع" کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

صائمہ مشتاق حمد نے حافظ آباد سے لکھا ہے۔

نامکمل نظر پڑی تو دماغ کو جھٹکا سا لگا۔ بہرحال نامکمل ناول اچھی تھی۔

فہرست پر نظر دوڑائی۔ ایک ساتھ تین ناول دیکھ کر ہمیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ویسے "شعاع" آج کل کچھ زیادہ "دریا دل" نہیں ہو گیا مکمل ناولز کے معاملے میں۔ سب سے پہلے سدرہ سحر کا ناول پڑھا۔ موضوع اگرچہ پرانا ہی تھا لیکن سدرہ نے جس طرح کہانی کو آگے بڑھایا اس میں جو ایک تسلسل تھا وہ قابل تحسین ہے۔ اسماء قادری آپ کا ناول بھی ایک ایسا ناول تھا جس کا پہلا سین مکمل ہوتے ہی میں ساری کہانی سمجھ گئی تھی لیکن پڑھ کر مزہ آیا۔ رخسانہ نگار جی، آپ کے وعدے پر یقین ہے۔ آخری قسط یقیناً اچھی ہوگی۔ سعدیہ رئیس کافی عرصے بعد ناولٹ کے ہمراہ آئیں۔ کہانی کے شروع میں ان کا اسلوب بیان بے حد اچھا لگا مختصر سا لیکن اختتام کچھ مبہم سا تھا۔ کیا عمر حیات ماہم کو پسند کرتا تھا یا نہیں؟ رفعت ہمایوں اس دفعہ پہلے جیسا مزہ نہ دے سکیں۔ افسانہ بہت دلچسپ لگا۔ "زرد موسم" کی تو کیا ہی بات ہے۔ بہت روانی اور تسلسل سے آگے بڑھ رہا ہے لیکن راحت جی "زرد موسم" کے علاوہ بھی کچھ لکھیے نا۔ فائزہ آپ کہاں چھپ گئی ہیں؟ پلیز جلد واپس آئیں اپنے "کہوری اسٹائل" کے ساتھ۔ "تاریخ کے جھروکے" میں رابرٹ کلائیو کے بارے میں پڑھ کر بے حد مزہ آیا اور حیرانی بھی ہوئی کہ کیسے کیسے لوگ ہیں جن کے بارے میں ہم جانتے تک نہیں لیکن تاریخ کے صفحات پر انہوں نے کتنے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

اور میری شائستہ مومن کے انٹرویو کی درخواست کا کیا ہوا؟ پلیز ضرور پوری کیجئے گا۔

ج: عائلہ اشفاق! تفصیلی تبصرے کا شکریہ۔

عمر حیات نے سب کچھ جانتے بوجھتے ماہم سے شادی کی تھی تو ہمدردی کا جذبہ ضرور ہوگا لیکن شادی کے بعد ماہم کا رویہ دیکھنے کے بعد آپ خود فیصلہ کریں کہ چاہت یا پسندیدگی ہو سکتی ہے؟

شائستہ مومن کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی ہے۔ کسی خاص نمبر میں ان کا انٹرویو شائع کریں گے۔

یہ ای میل ہمیں روبینہ توقیر نے کراچی سے بھیجی ہے، لکھتی ہیں۔

نامکمل لیں سو سوتھا۔ "پیارے نبی کی پیاری باتیں" اور "صحابیات" کا سلسلہ بے حد معلوماتی ہے۔ اس سے آگے بڑھے تو "رنگ زار تمنا" اب کچھ زیادہ ہی تیزی سے انجام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ آپا! راحت نامیہ کا ... ناول مجھے کچھ خاص متاثر نہ کر سکا۔ حالانکہ ماہا جی میری فیورٹ رائٹرز میں سے ایک ہیں۔ "زرد موسم" میں بے چاری ایمن پہ بے تحاشا ترس آیا اور یہ سر طاہر محمود کتنا خبیث ہے۔ راحت آپی اس کو ٹھیک ٹھاک سبق دیجئے گا۔ مکمل ناولز تینوں ہی اچھے لگے۔ "چارہ گر" کی آخری قسط کا بے حد انتظار ہے۔ گو انجام یقیناً ہماری توقع کے خلاف نہیں ہوگا اس کا تو ہمیں یقین ہے مگر پھر بھی۔ افسانے تینوں ہی زبردست تھے۔ "شعاع" کے ساتھ ساتھ "مجھے" بہت پسند ہے۔ انٹرویو میں ایمان علی کو پا کر خوش ہو گیا۔ نور بانو محبوب کا "لیکیپ" پڑھ کر بے ساختہ خواہش جاگی کہ کاش ہم بھی وہ سب کچھ کبھی اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ بے حد ایمان افروز تحریر تھی۔ "موسم کے پکوان" بہت اچھے تھے۔ اور پیارے شعاع کے سارے مستقل سلسلے تو ہوتے ہی لاجواب ہیں۔

ج: پیاری روبینہ! ہمیں افسوس ہے کہ ماہا ملک کا ناول آپ کو متاثر نہ کر سکا۔ دیگر ... تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

ارم الطاف نے راولپنڈی سے لکھا ہے

دو چھوٹے چھوٹے بیٹوں کی حد درجہ بڑھتی ہوئی مصروفیت اور اپنی لیکچرر شپ کے ہاتھوں خط نہ لکھ سکی۔ آج اچانک دل میں یہ خواہش شدت سے ہوئی کہ آپ کو خط لکھا جائے۔

"کبھی عشق ہو تو پتا چلے" نزہت سمن حیدر کی اچھی کاوش تھی۔ اگرچہ عبیرہ جیسی خود غرض لڑکی سے کوئی خاص ہمدردی نہیں محسوس کی مگر کہانی اپنی جگہ سولڈ تھی۔ "چاہا ہے تجھے" میں کوئی نیا پن نہیں تھا۔ "میں محبت اور تم" بھی بس ٹھیک تھی۔ "زرد" جو مغرب میں رہا اس سے زیادہ ... بے باک تو تحریر لگ رہی تھی۔ "زرنگ بابے زیست" بہت بہترین انداز میں لکھی گئی کہانی تھی اور صحیح معنوں میں حقیقت کی عکاسی لگی۔ "21ویں صدی کی لیلیٰ" بڑی اچھی ہوئی کہانی لگی اور جبکہ عمر حیات اور ماہم

کے بارے میں جان چکا ہے کہ وہ جواد سے ملنے جا رہی تھی تو کیا وہ اسے قبول کرے گا۔ عجیب سی کہانی تھی مزہ نہیں آیا۔ "میرے چارہ گر" پڑھنے کا ایک اپنا ہی لطف ہے۔ پتا نہیں ہماری قارئین بہنیں اس چیز کو اتنا کیوں اچھالتی ہیں کہ آخری قسط کو لکھا اور دی گئیں۔

ج: پیاری ارم! آپ نے اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر خط لکھا بے حد خوشی ہوئی۔ جواد احسان واقعی ڈاکوؤں کا سرغنہ تھا۔ عمر حیات کو شادی سے پہلے ہی ماہم کے عشق کے بارے میں پتا تھا لیکن اس نے گھر والوں کے اصرار پر شادی کر لی تھی۔ شادی کے بعد ماہم نے جو کیا اب اس کے لیے عمر حیات کے دل میں جگہ بنانا بہت مشکل ہوگا۔

سعدیہ انیس اور سدرہ انیس نے کراچی سے لکھا ہے

اس بار سرورق کی معصوم دو چوٹی لڑکی اچھی لگی اور "زرد موسم" کی ایمن تو بالکل ہی پاگل لگتی ہے۔ سر طاہر تو بہت ہی زہر لگتے ہیں۔ ہم تو کہتے ہیں اس کو پھانسی پر لٹکا دینا چاہیے۔ ماہا ملک کی تو کیا بات ہے۔ زبردست "بہت اچھے لگے" ... آخری قسط میں ... بالکل بھی نہیں تھا۔ "میرے چارہ گر" ... ناول لکھا تھا۔ تین چار قسطوں کے نامکمل ناول کا افسوس ہے کیا بنا دیا۔ ہمارا نہیں خیال کہ اس میں اتنی گنجائش تھی۔ اول تو ان کے ناول کے ہیروئن کی دوغلی شخصیت اچھی نہیں لگی۔ چلو مانتے ہیں کہ جب اس کو اس کے پیار (یعنی منگیتر) سے الگ کر کے اس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کر دی گئی۔ غلط ہوا تھا اس کے ساتھ لیکن اس کا رد عمل تو اس سے بھی زیادہ غلط تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ مجبور تھی ... دوسری بات ... اسی چکر میں اس کی ... نہیں کر سکی ... دوبارہ سے زندگی سے ملنا بالکل بھی صحیح نہیں تھا۔ وہ اب ایک شادی شدہ لڑکی تھی۔ نومبر کے "مجھا آپ کے" میں آخری خط کی آخری لائن میں لکھا تھا عمیرہ احمد "پیر کامل" کا دوسرا حصہ لکھنے والی ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں "پیر کامل" کا اینڈ نہیں معلوم کہ امامہ ہاشم اور سالار سکندر نے بھی شادی کی تھی یا نہیں۔ اور ہاں محترمہ عمیرہ احمد کہاں غائب ہو گئیں۔ انہیں اپنا ... دوا کر دبانے اور ...

یہ دلوں کے رشتے اور دل کے موسم جیسے زبردست ناول لکھنے والی پیاری سی مریم عزیز کہاں ہیں؟ پلیز مریم کوئی زبردست سا ان جیسا ناول لکھو۔

ج: سعدیہ اور سدرہ! ہمیں افسوس ہے آپ کے پچھلے خط شائع نہ ہو سکے۔ رخسانہ نگار نے دراصل یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کبھی کبھی جو ہمیں بہت ناگوار ہوتا ہے اور ہم اسے شدید ناپسند کرتے ہیں وہ ہمارے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ کیا بہتر ہے اور کیا بدتر وہ انسان کے لیے اچھا کرتا ہے لیکن انسان بے صبرا ہوتا ہے۔ ایسا کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ وہ جان نہ سکی کہ جس چیز کے پیچھے وہ بھاگ رہی ہے وہ سراب ہے۔

"پیر کامل" کے اینڈ میں امامہ اور سالار مل گئے تھے اور ان کی شادی ہو گئی تھی۔

نمرہ احمد نے آپ کے لیے بہت خوبصورت ناول لکھا ہے۔ فروری کے شمارے میں آپ پڑھ سکیں گی۔ شعاع یا خواتین ڈائجسٹ میں شامل ہوگا۔

مریم عزیز بھی آپ کے لیے ناول لکھ رہی ہیں شاید۔

مہرین احمد کالا کلاٹھ سے لکھتی ہیں

میں نے کبھی کسی رسالے میں خط نہیں لکھا مگر آپ کو چار خط لکھ چکی ہوں۔ آپ کا رسالہ بہت اچھا ہے۔ آپ کی سب رائٹر بہت اچھا لکھتی ہیں۔ اس بار مکمل ناول میں "کبھی عشق ہو تو پتا چلے" اور "چاہا ہے تجھے" بہت پسند آیا۔ "میرے چارہ گر" بھی اچھا جا رہا ہے مگر بہت جلدی ختم ہو رہا ہے۔ ماہا ملک کا "رنگ زار تمنا" بھی اچھا ہے مگر اب اختتام ہونا چاہیے۔ سدرہ سحر عمران کا مکمل ناول کچھ کچھ اچھا تھا مگر مکمل طور پر اپنے مقصد میں نہ لے سکا۔ "اکیسویں صدی کی لیلیٰ" بہت ہی اچھا لگا۔ اگر عمر حیات کا رویہ ماہم کے ساتھ کچھ نرم ہو جاتا تو اور بھی اچھی بات تھی۔ اس رسالے کی جان جو کہانی تھی وہ "تبسم" تھی۔ اس کہانی کو پڑھنے کے بعد ہنسی بھی آئی اور ڈر بھی لگا۔ تہمینہ عظمت علی کو اتنی اچھی کہانی لکھنے پر مبارکباد اور آخر میں ایک فرمائش کر کر عمران نذیر کا انٹرویو شائع کریں۔

ج: مہرین! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کے پچھلے خط شائع نہ ہو سکے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔ سدرہ سحر عمران نئی مصنفہ ہیں۔ وقت کے ساتھ

ساجدہ لیاقت کی تحریر میں بہتری آرہی ہے۔ آپ کو ان کے ناول میں کمی محسوس ہوئی۔ ہمیں یقین ہے ان کی آئندہ تحریروں میں آپ کو یہ احساس نہیں ہوگا۔
عمران نذیر کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کرلی ہے۔ جلد پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔

مریم مظہر نے پاڑہ (ڈنگہ) سے لکھا ہے

اس ماہ کا ٹائٹل بہت ہی زبردست تھا۔ "اکیسویں صدی کی لیلیٰ" "کا انجام حیرت میں ڈال گیا۔ ناول بھی بہت ہی بہت اچھے تھے۔ اسماء قادری کا "جا رہا ہے بچے" زبردست تھا لیکن یہ پڑھ کر حیرت ہوئی کیا ایک باپ کا ایسا روپ بھی ہوسکتا ہے۔ "میں، محبت اور تم" ناول بہت اچھا تھا۔ خاص کر اس میں حریم کا کردار بہت اچھا تھا۔ ارے ارے رکیے۔ میں اس ناول کا ذکر کرنا تو بھول گئی جو اس ماہ کی جان تھا۔ ہاں وہی "یہی عشق ہو تو پتا چلے"۔ آپ "آئینہ خانے میں" کی جگہ کوئی ایسا سلسلہ شروع کریں جس میں کسی بھی ایک مصنفہ کا انٹرویو شائع کریں۔
☆ مریم! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ مصنفہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

ساجدہ امین پن سومرو نے سانگھڑ سے لکھا ہے

اگر اس ماہ کے شعاع کی بات کی جائے تو بہت خوب تھا اور کہانیوں کا تو کیا ہی کہنا۔ خاص طور پر "میرے چارہ گر" کی تو کیا ہی بات ہے۔
پچھلے ماہ میری چوتھی بھانجی پیدا ہوئی تو میں نے دیکھتے ہی کہہ دیا ایسا ہے۔ ایسی نے کہا۔ نہیں، میں نے اس کا نام حنا رکھنا ہے لیکن وہ ساجدہ ہی کیا جو پیچھے ہٹ جائے۔ اب ہم اسے پیا کہتے ہیں لیکن ہمیں اس کے معنی پتا نہیں۔ اگر آپ کو معلوم ہو تو ضرور بتائیے گا۔
اب آتے ہیں شعاع کی طرف تو "پیارے نبی کی پیاری باتیں" میں کبھی پڑھنا بھولتی نہیں۔ وہ بہت زبردست تھیں۔ آپ سے گزارش کرتی ہوں کہ وصی شاہ اور فیض احمد فیض کی غزلیں شائع کریں۔
☆ ساجدہ! معذرت کہ آپ کے پچھلے خط شعاع میں جگہ نہ پا سکے۔
"پیا" کے معنی ہیں "جنت کی چڑیا"

فیض احمد فیض اور وصی شاہ کی غزلوں کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔ تھوڑا انتظار کریں۔

مصباح گل سرگودھا سے لکھتی ہیں

"باتوں سے خوشبو آئے" سلسلے میں آخری انتخاب "بات دل کو لگتی ہے" میرا بھیجا ہوا تھا جو کہ "تحریم (کراچی)" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کو معقول بات نہ جانیے اور اس پر خاص توجہ دیں کہ شائع ہونے والا انتخاب اپنے اصل بھیجنے والے کے نام سے ہی شائع ہو۔
☆ مصباح! ہمیں بے حد افسوس ہے ایسا دانستہ نہیں ہوا ہے۔ آئندہ خیال رکھیں گے کہ آپ کا بھیجا ہوا انتخاب کسی اور کے نام سے شائع نہ ہو۔ ایک بات بتاتے چلیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی شعر یا لطیفہ بہت سی بہنیں بھجوا دیتی ہیں۔ ممکن ہے آپ کے سلسلے میں بھی یہی ہوا ہو۔

حاصل پور سے عمرانہ کوثر تشریف لائی ہیں۔ لکھتی ہیں

ضروری تو نہیں کہ لبوں سے کہہ دوں داستان اپنی
زباں اک اور بھی ہوتی ہے اظہار کے لیے

واقعی یہ بات بہت [illegible] ہے۔ [illegible] ہوسکے تو دوسری زبان استعمال کرنی پڑتی ہے اور وہ ہے قلم کی زبان۔ میں برسوں سے شعاع کی خاموش قاری ہوں اور اس کے ساتھ محبت کا رشتہ اتنا پائیدار اور مستحکم ہے کہ ہر چیز کے بغیر گزارہ ممکن ہے مگر شعاع کے بغیر گزارہ ناممکن ہے۔ آج کے اس مصروف اور مسائل سے بھرپور دور میں شعاع بہترین تفریح کا سامان مہیا کرتا ہے۔
دسمبر کا شمارہ خلاف توقع بہت ہی لیٹ یعنی 4 تاریخ کو ملا۔ سب سے پہلے نظر ٹائٹل گرل پر پڑی۔ فیروزی کلر کے سوٹ میں ملبوس لائٹ میک اپ میں اچھی لگی۔ آنکھوں میں اٹریکشن تھی مگر لبوں مسکراہٹ سے خالی تھا۔
دسمبر کے حوالے سے پرتاثیر اور اسپیدکی تحریر نے دل پر گہرا اثر ڈالا۔ حمد و نعت سے دل لبریز ہوا۔ "پیارے نبی کی پیاری باتیں" بہت اچھی لگیں۔ فنکاروں سے ملاقات اچھی لگی۔ جھولے... تعریف و تنقید پر مبنی خطوط پڑھ کر مزا آیا۔ واقعی قارئین بہت باریک بینی سے کہانیوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔
"شاعری یتیم ہوگئی ہے" میں صالحہ شبیر نے بطور شاعرہ

ہمیں بھی پسند آئے۔ "اس ماہ کی سپر اسٹار" [illegible] مسکرانے پر مجبور کر دیا اور ذہن فریش ہوگیا۔ اب ہو جائے کچھ تبصرہ کہانیوں پر بھی۔ سلسلے وار تو ساری ہی قابل داد ہیں۔
"رنگ ہائے زیست" باپ بیٹی اور ماں بیٹے کی محبت پر مبنی افسانہ ایک دلکش تحریر تھی تحریم اور ربیعہ کی محبت تو دیکھی ہے مگر باپ بیٹی کی اتنی گہری محبت کچھ معقول سی نہ لگی۔
"اے محبت" "عشق و معشوق" پر مبنی افسانہ کچھ خاص نہ لگا۔
سعدیہ رئیس کا ناولٹ "اکیسویں صدی کی لیلیٰ" دلچسپ بہت زبردست تھی۔ کہانی کا اسٹارٹ اینڈ بھی اچھا تھا مگر کہانی تو تمام کہانیوں جیسی ہی تھی۔
☆ عمرانہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ آپ کو شعاع سے اتنی محبت ہے پھر بھی اتنی دیر بعد قلم کو زبان دی۔ اب ہمیں ذرا لکھتی رہیے گا۔
باپ بیٹی کی محبت آپ کو معقول نہیں لگی یہ جان کر حیرت ہوئی۔ بیٹیاں ماں کی قدم کا بھی سامان ہوتی ہیں لیکن وہ محبت باپ سے زیادہ کرتی ہیں۔ اسی طرح بیٹے باپ کا بازو ہوتے ہیں لیکن ماں سے زیادہ محبت [illegible] ہوتے ہیں۔ یوں بھی پرائی ہونے کے بعد بیٹیاں زیادہ یاد آتی ہیں۔
ربیعہ! اپنے شہر کا نام لکھنا بھول گئی ہیں انہیں شکوہ ہے
آپ "باتوں سے خوشبو آئے" اور "رنگا رنگ پھول" میں میری تحریریں شائع کیوں نہیں کرتیں؟ میرا انتظار رہتا ہے مگر کچھ کرتی نہیں۔ اداس ہو جاتا ہے کہ اس بار بھی میرے "اقوال زریں" "لطیفہ" "شعر" وغیرہ آپ کو شاید پسند نہیں آتے۔
☆ ربیعہ! آپ اچھی چیزیں انتخاب کرکے بھیجیں۔ ہم ضرور شائع کریں گے۔ قارئین کی شرکت کے لیے ہی ہم نے یہ سلسلے شروع کیے ہیں اور انہوں کے انتخاب سے ہی شعاع کے سلسلے سجاتے ہیں۔

نسرین خورشید، ثمرین خورشید خانیوال سے آئی ہیں، لکھتی ہیں

ماڈل کا فیروزی اور براؤن لباس بہت خوبصورت لگا۔ اگر اس کی گھنیری زلفیں پورے ٹائٹل پر جلوہ گر نہ ہوتیں۔ آج کل کے پر مصائب حالات میں ٹینشن زیادہ ہیں اور تفریح بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہی ہے۔ اس لیے اخلاقی حدود کے اندر رہتے ہوئے انسانوں کی تفریح کا سامان کرنا اور تفریح بھی ایسی جس میں اصلاح کا پہلو نمایاں ہو بہت بڑا اور عظیم کام ہے اور اس سلسلے میں شعاع لیڈنگ رول ادا کررہا ہے۔ اب تھوڑا تبصرہ ہو جائے کہانیوں پر۔ سب سے پہلے تو رخسانہ جی آپ پر غصہ آیا پھر قسط پڑھی تو یہ قسط اتنی اچھی تھی کہ اگر رخسانہ صاحبہ اس جیسی دس اقساط اور بھی لکھ دیں تو منظور۔ کہانی میں ہماری متلاشی نگاہیں خاکی تعاقب کے معمے کو حل کرتی رہیں۔
☆ نسرین اور ثمرین! یہ تو بہت اچھا ہوا کہ رخسانہ کی قسط پڑھ کر آپ کا نہ صرف غصہ ختم ہو گیا بلکہ آپ دس مزید قسطیں پڑھنے کے لیے تیار ہیں۔
اب آخری قسط پڑھ کر بتائیے گا کہ رخسانہ کا ناول آپ کو کیسا لگا؟
شعاع کی اتنی اچھی تعریف کے لیے بہت شکریہ۔

گوجرہ سے صدف حسین نے لکھا ہے

ٹائٹل بس سو سو تھا۔ سب سے پہلے میں ذکر کروں گی نور بانو محبوب کا ان کی حج کی داستان جن کو پڑھ کے لگا جیسے ہم ان کے ساتھ مدینہ منورہ کی گلیوں میں گھوم رہے ہیں۔ لیکن پڑھتے ہوئے میری اپنی بھی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔ نور بانو نے ہمیں گھر بیٹھے ہی حج کروا دیا۔ اس کے بعد "رنگ زار تمنا" پڑھی۔ اب لیں قسطوں کو ایک ہی قسط میں نمٹا دیا جس دن ربیعہ نے "عبادولا" لیل قدر پڑھا مجھے اسی دن شک تھا کہ منزہ نیلم کا ضرور ربیعہ سے کوئی رشتہ ہوگا۔ "میرے چارہ گر" رخسانہ نگار کے قلم سے سارے گلے شکوے دور ہوگئے لیکن یہ نہیں پتا چلا کہ ان کا خاکی لفافہ کس نے کیا تھا۔ اسماء قادری کے ناول میں حسن کا کردار انمول تھا۔ اسماء قادری نے بہت اچھا لکھا۔ غزالہ نگار نے اچھا لکھا۔ گیت نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا۔ سعدیہ رئیس نے بھی اچھا لکھا۔ تمثیلہ عظمت علی جب بھی لکھتی ہیں جھنڈے ہی گاڑ دیتی ہیں۔ مستقل سلسلے سب ہی اچھے جارہے ہیں۔
☆ صدف! نور بانو محبوب کا "سفر حج" آپ کو پسند آیا۔ ہم آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے ان تک پہنچا رہے

ہیں۔
خاکی لفافے میں کیا تھا، یہ آپ کو اس ماہ کی قسط پڑھ کر پتا چل گیا ہوگا۔

کراچی سے صالحہ امجد نے لکھا ہے

یہ میرا کسی بھی ماہنامے میں پہلا خط ہے اور خط لکھنے کی وجہ نور بانو محبوب کا سفرنامہ "لبیک اللھم لبیک" ہے۔ اس قدر پُراثر تحریر ہے کہ اس کو پڑھ کر دل خوش ہو گیا اور دل میں شدت سے یہ امنگ جاگی کہ اے کاش ہمیں بھی یہ سعادت نصیب ہو جائے۔ (آمین)

خط لکھنے کی ایک اور وجہ انیسہ سلیم کے نارنسٹ کی ایک بات ہے۔ دسمبر کے شمارے میں لاہور کی شاہ شاہد نے جو اعتراض کیا ہے، وہ ہمیں بھی صحیح لگا ہے کیونکہ ہم نے تو کہیں پڑھا اور نہ ہی کسی حدیث وغیرہ میں لکھا دیکھا کہ اگر عورت خلع لے تو اس کو اپنے شوہر سے بغیر حلالہ رجوع کا حق ہے۔ یہ بات بہت عجیب لگی ہے اور اس کی وضاحت بہت ضروری ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ علماء نے فتویٰ دیا ہے تو براہ مہربانی اس کے بارے میں ضرور وضاحت کریں یا قرآن علماء کرام کا نام بتائیں یا کسی حدیث یا کسی کتاب میں لکھا ہے تو اس کا حوالہ ضرور دے دیں کیونکہ جب سے یہ پڑھا ہے، ذہن الجھ گیا ہے کیونکہ یہ ہمارے لیے بالکل نئی بات ہے جس کا علم میں آنا سب کے لیے ضروری ہے۔

باقی آپ کا رسالہ آج کل کے زمانے میں واقعی ایک نیکی کی شعاع ہے۔ اس میں وہ سب کچھ ہوتا ہے جو لڑکیوں کی زندگی کو سنوارنے میں کام آتا ہے۔

☆ صالحہ! دیوبند کے علماء کرام نے متفقہ طور پر فتویٰ دیا ہے کہ اگر عورت خلع لے اور مرد اسے طلاق نہ دے اور پھر عورت اپنے شوہر سے دوبارہ رجوع کرنا چاہے تو اسے حلالہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ جب چاہے رجوع کر سکتی ہے۔ عائلی قوانین میں بھی یہ فتویٰ شامل ہے۔

عقیلہ بتول خانیوال سے لکھتی ہیں

دسمبر کے شمارے کا ٹائٹل دیکھتے ہی دل سے آواز آئی۔ بہترین۔ ویسے تو اس سال زیادہ تر ٹائٹل اچھے ہی تھے۔ سب سے پہلے تو "زرد موسم" پڑھی۔ پڑھ کر بہت دکھ ہوا اور طاہر محمود پر غصہ بھی آیا۔ … تا آخر دار جی بی امین کو ایک دن اپنے پاس بٹھا کر طاہر محمود کے بارے میں بتا کیوں نہیں دیتے۔

ماہا جی، پلیز عنیزہ بیگم کی ملاقات احمد صاحب سے ضرور کروائیں کیونکہ شہریار کے والد ہیں اور میرا خیال ہے وہ ریحہ کے بھی بھائی لگتے ہیں، اسی لیے ریحہ کو ان میں کشش محسوس ہوئی تھی۔

اس قسط میں شہلا اور ہاشم کے بارے میں کچھ بھی نہ لکھا گیا تھا۔ تشنگی سی محسوس ہوئی۔ وردہ کا فیصلہ مجھے تو بہت پسند آیا۔ محبت جرم نہیں لیکن زرافہ نے وردہ کے ساتھ تو ناانصافی کر دیا تھا۔ رخسانہ باجی اس خاکی لفافے میں کیا تھا یہ تو جاننا ہوا تھا۔ اگلی قسط تک صبر … ویسے مجھے اس سیگمنٹ کا بھی بہت انتظار ہے کہ ابیہا اس جن سے بچ کے جو رائے نے اسے کٹ کیا تھا کہ یہ یقیناً اس جن کی مدد سے کوئی فیصلہ تحریر میں لائے گی۔

نور بانو محبوب کا "سفر حج" پڑھ کر دل سے دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی ضرور یہ مقامات دکھائے۔ (آمین)
بہت مزہ آیا اس کو پڑھ کر بالکل ایسا ہی محسوس ہوا کہ میں بھی وہیں پہنچی ہوئی ہوں۔

… ہوا اور ایڈ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔

تینوں مکمل ناول اچھے تھے لیکن ان میں بہترین تھا۔
"میں محبت اور تم" سدرہ سحر عمران نے بہت اچھا لکھا۔ ایک اچھا ناول لکھنے پر میری طرف سے مبارک باد قبول کریں سدرہ۔

☆ عقیلہ! "زرد موسم" پڑھ کر آپ کو دکھ ہوا اور طاہر محمود پر غصہ آیا تو صحیح ہے لیکن اگر راحت جبیں کو طاہر محمود کے بارے میں بتا بھی دیں تو امین ماننے والا نہیں۔ کچھ تو فطرتاً وہ ضدی اور خود سر ہے، کچھ حالات نے اس کا ذہن خراب کر دیا ہے۔ ویسے بھی محبت میں عقل غائب ہو جاتی ہے۔ انسان کسی کی نہیں سنتا۔
ماہا ملک تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں، وہ احمد صاحب کے بارے میں ضرور لکھیں گی۔

نیو کراچی سے شازیہ حمید نے لکھا ہے

دسمبر کا شعاع حسب توقع پہلی تاریخ کو ملا۔ دیگر قارئین کی طرح مجھے بھی رسالے کے لیے بک اسٹال کے چکر نہیں لگانے پڑتے کیونکہ میرے میاں کا خود بک

اسٹال ہے۔ پورا رسالہ پڑھنے کے لیے مجھے مشکل سے دو دن چاہیے ہوتے ہیں۔ اس مرتبہ کا شعاع بھی بہت اچھا تھا لیکن سعدیہ رئیس کی "اکیسویں صدی کی لیلیٰ" پڑھ کر از حد کوفت کا سامنا کرنا پڑا اور کسی بھی رسالے میں پہلی بار خط لکھنے کا موجب بنا۔ کہانی میں جانے تو خیر کرنے سے مفقود تھا بلکہ سعدیہ رئیس کے نام کو دیکھتے ہوئے کہانی بھی ان کی نہیں لگی۔ شعاع اور خواتین کے پرانے شمارے اگر اٹھا کر دیکھے جائیں تو شاید اس موضوع پر کئی کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ بے تکے پن سے بھرپور کہانی شعاع میں نہیں لگنی چاہیے تھی۔ اس کے علاوہ سدرہ سحر عمران کی "میں، محبت اور تم" بھی بے پناہ جھول لیے ہوئے قارئین قسم کی کہانی تھی۔ راشدہ رفعت اور امامہ قادری اچھی رہیں۔

البتہ رخسانہ نگار کی "میرے چارہ گر" ان کے منفرد انداز نگارش کی وجہ سے پسند کی جارہی ہے۔ ماہا ملک کا ناول بھی اختتامی مراحل میں داخل ہو چکا ہے۔ راحت جبیں کے ناول کا بھی انتظار رہتا ہے۔ دسمبر کے شعاع کی خاص بات ایمان علی کا انٹرویو تھا جس کی وجہ سے میری ایک شدید خواہش پوری ہوئی۔ نزہت شاہد حیدر کی "عشق ہو تو ایسا" … مستقل سلسلے تو ہماری پسند کے ہی ہیں … افسانوں کے بارے میں … کوشش کروں گی کہ پہلے خط کے بعد پہلے افسانہ کو بھی لکھ ڈالوں۔

☆ شازیہ! آپ کی تعریف اور تنقید دونوں ہی متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ افسانہ ضرور لکھیں۔ آپ کی تحریر کی روانی سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔

ساہیوال سے ریحانہ چوہدری نے لکھا ہے

ٹائٹل اچھا تھا، منفرد سا اور کلر اسکیم بھی خاصی بولتی سی تھی۔
پچھلی دفعہ غلطی سے شعاع والوں نے ہمارے آپ آپ ہونے کا بڑا ہی اچھا بندوبست کیا۔ یعنی ریحانہ کے بجائے ہمیں ریحا بنا ڈالا۔ اب چلتے ہیں شعاع کے دوسرے سلسلوں کی طرف۔

نادیہ خان اور توفیق حیدر کے ساتھ بھی ایک اچھی سی ملاقات کروا کر شکریہ کا موقع دیں۔ "شاعری سچ بولتی ہے" میں صالحہ شمیم نے سحر کوثر کے بہت اچھے اشعار کا انتخاب کیا اور باقی اشعار میں سے حنا سلیم کا منتخب کردہ قطعہ بہت زبردست تھا۔ مسکراہٹیں میں تحریم اور اقراء کا کھینچا ہوا "شکوہ" اچھا لگا۔ رخسانہ جی نے "میرے چارہ گر" کا اختتام ابھی تک نہیں کیا۔ اتنا اچھا لکھتی ہیں وہ کہ طوالت بھی گراں نہیں گزرتی اور اب تو اس کے لیے بھی کوئی گلہ نہیں کہ انہوں نے اتنی اچھی وضاحت دے دی ہے۔ رخسانہ جی نے ایک بہت شاندار مکمل ناول لکھا تھا "شہوار"، مجھے ان سے کہنا ہے کہ وہ ناول اگر وہ سلسلے وار لکھتیں تو شاید زیادہ افیکٹو ہوتا۔ بہرحال ٹائٹل تو ابھی بھی موجود ہے نا، وہ اپنے زرخیز ذہن کا استعمال کر کے اسی تھیم کو کسی نئے انداز سے بھی لکھ سکتی ہیں۔

اور آخر میں بات ناول تک دی ایڈ کی۔ میری بات یوں تو اس دفعہ نزہت شاہد حیدر کا مکمل ناول "یہی عشق ہو تو ایسا" بہت بہت اور بہت ہی اچھا لگا۔ وہ بہت منفرد لکھتی ہیں اور بہت ہی اچھا بھی اور ان کے کریکٹر عام ہوتے ہوئے بھی کتنے خاص لگتے ہیں۔ ان کی اسٹوری اسٹارٹ ہر سطر سے آگے بڑھتی ہے کہ یوں لگتا ہے آپ کوئی اچھا سا کلاسک سونگ سن رہے ہوں۔ صرف لفاظی یا مزے دار سی اسٹوری ہی نہیں بلکہ ہمیشہ ایک شوگر کوٹڈ اخلاقی سبق بھی موجود ہوتا ہے۔

آپ نے عدیم ہاشمی کی بہت اچھی غزل منتخب کی۔ اب آپ سے ایک سوال کیا تحریری مقابلے میں حصہ لینے کی دعوت عام ہے۔

☆ ریحانہ! بہت معذرت خواہ ہیں کہ آپ کا نام غلط شائع ہوا۔
تحریری مقابلے میں ہماری سب قارئین حصہ لے سکتی ہیں۔ آپ اپنی تحریر ضرور بھجوائیں۔
شعاع کو پسند کرنے اور تفصیلی تبصرے کا شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

☆

جس کی چوٹی پر بنایا تھا قبیلہ میں نے
زلزلے جاگ پڑے ہیں اسی کہسار کے بیچ

کاش اس خواب کو تعبیر کی مہلت نہ ملے
شعلے اگنے لگے آتے ہیں مجھے گلزار کے بیچ

ڈھلتے سورج کی تمازت نے بکھر کر دیکھا
سر کشیدہ مرا سایا صف اشجار کے بیچ

رزق، ملبوس، مکان، سانس، مرض، قرض، دوا
منقسم ہو گیا انسان، انہی افکار کے بیچ

دیکھے جاتے نہ تھے آنسو مرے جس سے محسن
آج ہنستے ہوئے دیکھا اسے اغیار کے بیچ

سرشار صدیقی کی یہ نظم چھوٹی ہے مگر بات بڑی ہے
لوگوں نے کہا
اس در سے کبھی
کوئی نا امید نہیں لوٹا
کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹا
میں بھی لوگوں کے ساتھ چلا
چہرے پہ گرد ملال لیے
اک پر امید خیال لیے
اک خالی دست سوال لیے
جب قافلہ اس در پر پہنچا
میں اس گھر کو پہچان گیا
پھر خالی ہاتھ ہی لوٹ آیا
اس در سے مجھے کیا ملنا تھا
یہ گھر تو میرا اپنا تھا

رات کے سحر پر کتنے شاعروں نے کیا کچھ لکھا۔ ذرا وزیر آغا کو بھی پڑھیے۔
رات سجا کر لائی ہے اک تھال میں پھول ہزار
بچھے موتی، کچی کلیاں اور کلیوں کے ہار

بھینی بھینی باس کی زد میں آیا ہے سنسار
رات سجا کر لائی ہے اک تھال میں دیپ ہزار
ہاتھ رنگیلے ہونٹ دہکتے گالوں کا گلنار
روشن ماتھے کی کرنوں نے چھیڑے دل کے تار
رات سجا کر لائی ہے اک تھال میں تیر ہزار
زخمی آنکھیں، گھائل سپنے، شبنم کے اسرار
دکھ کے زرد نکیلے کانٹے ہوتے جو دل کے پار

اور سلیم کوثر صاحب محبت کو کس طرح بیان کرتے ہیں دیکھیے۔
تم سے منزل کا نہیں
رشتہ سفر کا ہے مرا
یہ ضروری تو نہیں
ساتھ چلا بھی جائے
تم سے ملا بھی جائے
عشق دیدار کا محتاج نہیں ہوتا ہے
ایک احساس کا رشتہ ہے یہ خوشبو کی طرح
دیکھنے، چھونے سے عاری کسی جادو کی طرح
صرف آواز ہی کافی ہے محبت کے لیے
اور سب کچھ ہی اضافی ہے محبت کے لیے

اور یہ غزل سوئی گیس کمپنی (جہاں میرے والد کام کرتے تھے) کے میگزین میں، میں نے پڑھی تھی۔ شاعر ہیں شمیم احمد شمیم (مرحوم) ملاحظہ کیجیے۔

ہماری چاہ کی تم کو نہ کچھ خبر ہو گی
شب فراق تڑپ کر یوں ہی بسر ہو گی

تمہارے حسن تصور سے ہے جہاں روشن
تمہارے دید کے قابل نہ یہ نظر ہو گی

ہم اپنی چاہ کو رسوا کریں، یہ ناممکن!
زبان دل نہ کھلے گی نہ چشم تر ہو گی

رواں ہے کون سی منزل کو قافلہ دل کا
تمہاری یاد فقط اس کی ہم سفر ہو گی

نہ جانا تم نے کبھی میری عاشقی کا سبب
ہمارے بعد ہماری نہیں قدر ہو گی

میں ناتواں یہ ارادے تمہیں بھلانے کے
میں جانتا ہوں کبھی، یہ مہم نہ سر ہو گی

تمہارے پیار کی شمع ہے اس طرح روشن
نہ ہو گی شام کبھی اس کی نہ سحر ہو گی

جو سن سکو تو سناؤں میں داستان الم
تمہاری پلکوں پہ آ کر جو مختصر ہو گی

شمیم ان سے گلہ کیا کہ وہ تو سنگدل ہیں
تمہاری نالہ و فریاد بے اثر ہو گی

اور اب چند متفرق اشعار بھی پڑھ لیجیے۔

- خواب محلوں کے تو میں نے نہیں دیکھے لیکن
دل میں اک حسرت تعمیر لیے پھرتا ہوں

تم بھی بالوں میں لیے برف چلے آئے ہو
میں بھی اک مشکوہ تاخیر لیے پھرتا ہوں
(سجاد ہاشمی)

- بہت دل کو کشادہ کر لیا کیا
زمانے بھر سے وعدہ کر لیا کیا

ہنر مندی سے اپنے دل کا صفحہ
مری جاں تم نے سادہ کر لیا کیا

بہت نزدیک آتی جا رہی ہو
بچھڑنے کا ارادہ کر لیا کیا
(جون ایلیا)

- آدمی عقل کل نہیں ہوتا
حرف آخر نہیں کسی کی رائے
(انور شعور)

- در مسجد پہ کوئی شے پڑی ہے
دعائے بے اثر ہو گی ہماری!
دعا مانگیں گے کب تک آسمان سے
زمیں کب معتبر ہو گی ہماری
(راحت اندوری)

اب میرا خیال ہے کافی ہو گیا۔ باقی کبھی آئندہ شیئر کر لیں گے۔ ارے ہاں میں ہوں آپ کی جانی پہچانی سیدہ رشنا ہلالی۔ اس امید بلکہ یقین کے ساتھ کہ میرا انتخاب پڑھنے والوں کو پسند آئے گا اب اجازت دیجیے۔ اور ہاں اپنی رائے ضرور دیجیے گا۔

شعاع کے ساتھ ساتھ

زارا

عظمیٰ رئیس شیرازی ٹنڈو آدم

میرا نام عظمیٰ ہے لیکن زیادہ تر لوگ امی کہتے ہیں۔ 20 اگست میری ڈیٹ آف برتھ ہے اور تعلیم میری ابھی جاری ہے۔ میں بی اے فائنل کی اسٹوڈنٹ ہوں اور مستقبل میں انشاء اللہ اردو ادب پڑھنے کا ارادہ ہے۔ آپ سب دعا کریں کہ میں اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جاؤں۔

1۔ شعاع سے وابستگی کو زیادہ لمبا عرصہ نہیں گزرا لیکن چند سالوں میں میں نے شعاع 'خواتین اور کرن کے تمام پرانے شمارے پڑھ ڈالے۔ شعاع ہمارے گھر آج سے نہیں بلکہ اس وقت سے آرہا ہے کہ جب سے اس کی اشاعت عمل میں آئی تھی۔ شعاع کے حوالے سے یادگار واقعہ کچھ یوں ہے کہ ہمارے یہاں شروع سے ہی شعاع 'خواتین اور کرن پڑھنے کے بعد بڑے بڑے کارٹن میں ترتیب سے رکھ دیے جاتے ہیں تاکہ محفوظ رہیں تو ہوا کچھ یوں کہ ان ڈائجسٹوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے بہت ہی زیادہ ہو گئی تو آنٹی نے ان تمام ڈائجسٹوں کو تین بڑے بڑے کارٹن میں ترتیب سے رکھ دیا آدھی رات کا وقت تھا جب ہم سب عجیب سی آواز سن کر اٹھ گئے۔ سب کے سامنے انوکھا سا منظر تھا۔ سلیپ سے تینوں کارٹن کی کتابیں جب بارش کی صورت میں نیچے سوئے ہوئے ماموں کے اوپر برس رہی تھیں، وہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ہم سب کا ہنس ہنس کر برا حال تھا اور رہے ماموں تو انہیں کافی دیر بعد یہ صورت حال سمجھ میں آئی۔ یہ کتابوں کی بارش تو شاید انھوں نے زندگی میں پہلی اور آخری بار دیکھی تھی۔ یہ عقدہ تو بعد میں کھلا کہ جو تین کارٹن ایک کے اوپر ایک رکھے گئے تھے ان بیلنس ہونے کی وجہ سے یہ واقعہ ہوا۔ ایک اور واقعہ کہ جسے میں شعاع کے توسط سے ہی سمجھتی ہوں وہ واقعہ 2 دسمبر 2005 کو شعاع کے دفتر آنے کا ہے۔ جن لوگوں کے نام آپ نے کتابوں میں پڑھے ہوں ان سے آپ اچانک ملیں تو شاید آپ کو بھی ایسے ہی لگے جیسے میری طرح لگا۔ مجھے ایسا لگا کہ آپ ان پیارے لوگوں سے کتنا مل چکے ہیں میں اس بات کا برملا اظہار کروں گی کہ سب لوگ بہت اچھے ہیں۔

2۔ میری صبح ساڑھے سات بجے ہوتی ہے۔ ساڑھے آٹھ بجے میں گھر سے کالج کے لیے نکلتی ہوں۔ کالج میں ٹیچرز بہت اچھی ہیں۔ عائشہ، صدف، بشریٰ، طاہرہ کے ساتھ فری پیریڈز میں گپ شپ چلتی ہے۔

مجھے کالج کا ایس سی بلاک پسند ہے۔ وہاں ہریالی بہت خوب صورت منظر پیش کرتی ہے اور خوش رنگ پھول جہاں ماحول کی خوب صورتی کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ وہیں پرندوں کی چہکاریں ماحول کو سحر زدہ کر دیتی ہیں۔ میرا اس کالج میں لاسٹ ایئر ہے اور ہم سب کی خواہش ہے کہ یہ تمام عرصہ یادگار گزرے۔

کالج ایک بجے آف ہوتا ہے۔ گھر آکر فریش ہو کر کھانا کھاتی ہوں اور نماز پڑھ کر سو جاتی ہوں۔ ساڑھے تین بجے اٹھتی ہوں کیونکہ چار بجے ٹیوشن پڑھنے

والے بچے آجاتے ہیں۔ ان کو پڑھانے میں ٹائم کے گزرنے کا بالکل ہی پتا نہیں چلتا۔ چھ بجے مغرب کے بعد گھروں کو روانہ ہوتے ہیں۔ بچوں کے جانے کے بعد دوبارہ سے صفائی کرنا کھانا بنانا اور دوسرے کاموں کو نمٹانا۔ اسی دوران اگر کوئی اچھا ڈرامہ آرہا تو وہ دیکھ لیتی ہوں خصوصاً "جیو" پر بننے والے ڈرامے ضرور دیکھتی ہوں۔ انڈین ڈراموں سے سخت چڑ ہے۔ شعاع کو وقت سب کاموں سے فارغ ہونے کے بعد دیتی ہوں۔ مجھے لکھنے پڑھنے کے لیے دو وقت مناسب لگتے ہیں۔ ایک وقت ہے گرمیوں کی طویل دوپہر جب ہر طرف سناٹا ہوتا ہے۔ وہ وقت لکھنے پڑھنے کے لیے مناسب ہے اور دوسرا وقت رات کا، جب کوئی ڈسٹرب نہیں کرتا اور نہ ہی وقت گزرنے کا پتا چلتا ہے۔ صرف گھڑی کی سوئیوں کی آواز ہی گھڑی کی سوئیوں کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ سناٹے میں دور کہیں سے آتی ریل کی چھک چھک ماحول کو پرفسوں بنا دیتی ہے۔ مصروفیت میں وقت نکالنا مشکل تو ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ شعاع کا ہر نیا شمارہ پڑھنے والوں کا منتظر ہوتا ہے۔ اسی طرح رات ہوتی ہے اور نئی صبح سے پھر وہی بندھی روٹین۔ میں نے اپنے بچپن کا زیادہ حصہ ننھیال میں گزارا ہے اور سب کا پیار سمیٹا ہے بلکہ اب تک سمیٹ رہی ہوں۔ میں عرصہ دراز تک نانی کو امی کہتی آئی ہوں۔ چھٹی والے دن بھی تھوڑی روٹین چینج ہو جاتی ہے۔

3۔ ایسی بے شمار تحریریں ہیں جو آج بھی روز اول کی طرح ذہن میں روشن ہیں اور بھلائے نہیں بھولتیں۔ مجھے ہمیشہ وہ تحریریں پسند رہی ہیں کہ جن کے اینڈ خوشگوار ہوں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ خوشی اور غم ساتھ ساتھ ہوتے ہیں اور دنیا میں رہتے ہوئے ہم حقیقت سے منہ موڑ نہیں سکتے۔ اسی لیے ناخوش گوار انجام بھی برداشت کرنے پڑتے ہیں۔

فرحت اشتیاق کی تحریر "وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر"...... بہت ہی زیادہ پسند ہے۔ اس ناول نے یقیناً ہر قاری کو رلایا ہے اور یہی حقیقت ہے کہ اس ناول کے بعد میں نے جانا کہ فرحت اشتیاق کون ہیں۔ اس کے علاوہ "میں روئے آنسو" اور فرحت اشتیاق کی ہر تحریر عزیز ہے۔ عمیرہ احمد کی "پیر کامل"، "ایمان امید اور محبت" اور رخسانہ نگار عدنان کی "آئینہ ذات سے بکھر کر" مریم عزیز کی "میری پرچھائیوں کو قرار دو" نزہت شبانہ حیدر کی "زندگی مجھے ذرا دیر سے جانا" "کل کی ساری باتیں بھلا دو اور آج کی" ساجدہ عارف کی "تم یاد آئے" اور "مجھے چاہا" شائستہ عزیز کی "ستاروں کا سفر" افشاں آفریدی کی تحریر "یہ سادہ دل بھی عجیب شے ہے" اور راحت جبیں کی خوشبوؤں میں بسی ہوئی تحریریں جو کہ دلوں کو چھو لیتی ہیں پسند ہیں۔

بہت سی تحریریں ایسی ہیں جنہیں پڑھ کر دل الجھ گیا اور عرصے تک الجھا رہا اس میں نگہت سیما کی "تحریر علینہ میں نے تمہیں خود کھویا ہے" اور نزہت شبانہ حیدر کی "دو ساحر آنکھیں" ان دونوں تحریروں نے ذہن کو الجھا دیا۔

4۔ خوبیاں تو میری وہ لوگ ہی بتا سکتے ہیں کہ جو میرے ساتھ ہوتے ہیں خامیاں مجھ میں بہت ہیں۔ میں مستقل مزاج نہیں ہوں۔ مجھے غصہ جلدی آجاتا ہے۔ پہلے تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر آنسو پلکوں کی باڑھ پھلانگ لیتے تھے لیکن اب کوشش کر کے میں نے اس خامی پر قابو پالیا ہے۔ میں فضول خرچ بھی بہت ہوں اور جلد باز بھی۔ کافی ہے یا مزید راز کھولوں؟

تعریفی جملہ کچھ یوں ہے کہ ایک دفعہ میرا کافی بڑا تعارف چھپا تھا جب وہ میری ماما نے پڑھا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ "اگر تم میں صلاحیت ہے تو کچھ اصلاحی تحریریں لکھو" یہ جملہ سن کر مجھے خوشی ہوئی تھی۔

5۔ ساون کے حوالے سے واقعہ یہ ہے کہ میری آنٹی روزینہ کی شادی کی شاپنگ کے لیے ہم نے حیدرآباد جانے کا پروگرام بنایا۔ جس دن ہم حیدرآباد جانے کے لیے نکل رہے تھے وہ دن بہت گرم تھا سخت دھوپ نکلی

ہوئی تھی۔ خیر سے حیدر آباد کی ریشم گلی پہنچے اور شاپنگ شروع کر دی۔ شاپنگ کرتے کرتے چار پانچ گھنٹے گزر گئے فارغ ہو کر باہر نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ چاروں طرف آسمان کالے سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ دوسرے شہر کا مسئلہ تھا اسی لیے باقی شاپنگ آئندہ پر چھوڑ کر فوراً واپس جانے کی تیاری کر لی۔ سب نے کہا جاتا تو ہے بہت گرمی ہے کولڈ ڈرنک پی لیتے ہیں پھر کولڈ ڈرنک کے ساتھ چاٹ بھی کھائی۔ آپی مسلسل ڈانٹ رہی تھیں کہ جلدی چلو ورنہ پھنس جائیں گے۔ میں نے کان نہیں دھرے اور جھٹ پٹ برگر بھی پیک کروا لیے۔ (اب آپ مجھے اتنی بھی پیٹو مت سمجھ بیٹھیے گا۔ سمجھا کریں سب نے مل بانٹ کر کھایا تھا) اپنے روٹ کی بس لی اور اسٹاپ تک پہنچے۔ پھر وین میں سوار ہوئے وین چلنے میں دیر تھی کہ ٹنڈو آدم سے کال آئی کہ یہاں شدید بارش ہو رہی ہے۔ آن کی آن میں حیدر آباد میں بھی آندھی چلنا شروع ہو گئی اور جب تک وین چلتی بارش شروع ہو گئی اور بارش بھی اتنی شدید کہ اگر میں گھر میں ہوتی تو کمرے تک ہی محدود رہتی۔ بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ دلوں کو دہلا رہی تھی اور ماحول کو مزید خوفناک بنا رہی تھی ہر زبان پر عافیت کی ہی

دعا تھی۔ لبوں پر بار بار یہی الفاظ آ رہے تھے کہ یا اللہ آج خیریت سے گھر پہنچ جائیں۔ ہر طرف گہرے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ دن میں رات کا سماں تھا۔ پانی روڈ پر ایسے بہہ رہا تھا کہ جیسے ساحل پر لہریں آتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ہوائیں شروع ہو گئیں اور بارش بھی اس قدر طوفانی ہو گئی کہ مجبوراً وین ایک طرف روکنا پڑی۔ ہر طرف دھند کا عالم تھا اور دور سے آنے والی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس ہی نظر آ رہی تھیں وہ بھی بمشکل پھر جب قریب سے گزرتے تو ہم خوف کے مارے آنکھیں بند کر لیتے ڈرائیور نے وین کے دروازے اور کھڑکیاں کھلوا دیں کیونکہ بہت حبس تھا۔

کھڑکیوں اور دروازوں کے کھلنے کے بعد جو منظر سامنے تھا۔ وہ حسین ترین تھا۔ کھیتوں میں کھڑی فصلیں، درخت، پھولوں اور پھلوں سے بھرے ہوئے اور بارش اس قدر طوفانی کہ بارش کا پانی جب زمین پر گر رہا تھا تو لہروں کی صورت میں بہہ رہا تھا اس وقت مجھے شدت سے راحت جبیں اور ان کی ساری خوب صورت تحریریں یاد آ گئیں۔ راحت جبیں بارش اور قدرتی مناظر کا جس خوب صورتی سے نقشہ کھینچتی ہیں کہ بندہ اسی میں گم ہو جاتا ہے۔

جہاں ہر طرف لہلہاتا سبزہ آنکھوں کو بھلا لگ رہا تھا وہیں گھر خیریت سے پہنچنے کی جلدی بھی تھی۔ اللہ کے فضل و کرم سے خوب صورت یادوں کے ساتھ گھر پہنچ گئے۔ ٹنڈو آدم پہنچے تو وہاں بھی جل تھل تھی۔ یہ بارش یادگار ہے اور ہمیشہ یاد رہے گی۔

قارئین یاد رہے کہ یہ حیدر آباد کی وہی بارش ہے جس میں شہر کے بعض علاقوں میں کشتیاں چلنے کی نوبت آ گئی تھی۔

6۔ لطیفے پڑھ کر بھول جاتی ہوں اس لیے معذرت۔

پسندیدہ شعر

ہیں کب کی زرد فضا میں بکھر چکی ہوتی
مجھے تو میری شکستوں نے پھر سنبھالا ہے
جو مطمئن تھے کہ دور خزاں تو بیت گیا
ستم کہ ان کو بہاروں نے روند ڈالا ہے

مریم مظہر، لاڑکانہ

شعاع کا اور ہمارا ساتھ کچھ اس طرح کا ہے بقول شاعر۔

ہم تمہیں چاہتے ہیں ایسے
مرنے والا کوئی زندگی چاہتا ہو جیسے

شعاع کے اور ہمارے بیچ ظالم سماج تو بہت آیا لیکن وہ ہم ہی کیا جو کسی کے آگے جھک جائیں۔ ہم بچپن سے اپنے گھر میں شعاع اور خواتین دیکھتے آئے ہیں۔ اس وقت تو ہم بس لمبی کہانیاں دیکھ کر سوچتے تھے کہ

ہماری سمجھ میں آ بھی جائیں۔ پھر جب ہم 9th میں آئے تو ہم نے بھی لمبی لمبی کہانیاں پڑھنا شروع کر دیں یعنی (ناول) میں اور میری بیسٹ فرینڈ (سادیہ) جو کہ میری کزن ہیں اس وقت پڑھائی کے سلسلے میں ہمارے گھر رہائش پذیر تھیں۔ میری بہنیں ہم دونوں کو یاجوج ماجوج کہا کرتی تھیں اور ایک جڑواں کہہ کر پکارتی تھیں۔ ہم دونوں ہر وقت ساتھ ساتھ ہوتے تھے اس لیے شعاع بھی ساتھ ہی پڑھتے تھے۔ میرے ابو اعتراض کرتے تھے کہ یہ دن تم لوگوں کے کورس کی کتابیں پڑھنے کے ہیں اور امی کہا کرتی تھیں کہ ابھی سے ڈائجسٹ پڑھنا شروع کر دو گی تو نظر کمزور ہو جائے گی اس لیے شروع شروع میں ڈرتے ڈرتے چھپ چھپا کر پڑھتے تھے لیکن اب کوئی ظالم سماج نہیں۔

2۔ میں ایسا تو نہیں کہوں گی کہ صبح کا آغاز اللہ کے نام سے ہوتا ہے کیونکہ میں نماز فجر نہیں پڑھتی۔ باقی کی چار نمازیں پڑھتی ہوں۔ میری امی اور بہن ہمیشہ نصیحت کرتی ہیں کہ نماز فجر کے لیے اٹھ جایا کرو لیکن شیطان ظالم اٹھنے نہیں دیتا تو میری صبح چائے کے کپ سے شروع ہوتی ہے اور ناشتے کے بعد جو وقت ہوتا ہے وہ میرا پڑھنے اور لکھنے کا وقت ہوتا ہے بارہ بجے کے بعد دوپہر کے کھانے کا وقت ہوتا ہے۔ دو بجے تک سے فارغ ہو کر نماز پڑھتی ہوں۔ اس کے بعد تسبیحات پڑھتی ہوں۔ شام کی چائے کے بعد برتن وغیرہ دھو کر فارغ ہوتی ہوں تو یہی وقت ہوتا ہے جب مجھے اپنی دوست سادیہ سے بات کرنا ہوتی ہے تو اس سے بات کرتی ہوں یا ایس ایم ایس کرتی ہوں کیونکہ کالج اور اسکول کے زمانے میں اس وقت ہم اوپر چھت پر بیٹھ کر خوب باتیں کرتے تھے اب تو وہ زمانے خواب ہو گئے۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔ مغرب کی نماز کے بعد رات کے لیے روٹی بناتی ہوں۔ کھانا کھا کر کچھ دیر ٹی وی دیکھتی ہوں نماز پڑھ کر سونے سے پہلے تھوڑی بہت شاعری یا نثر کی کوئی بھی کتاب پڑھ کر سو جاتی ہوں 10 یا 11 بجے تک۔ تو یہ تھا ہمارے بور ترین دنوں کا احوال۔

3۔ شعاع میں چھپنے والی تمام تحریریں اچھی ہوتی ہیں لیکن ان تحریروں کا ذکر کروں گی جو اب بھی دل و دماغ پر نقش ہیں۔ فرحت اشتیاق کا "بن روئے آنسو" عمیرہ احمد کا "دربار دل" "حاصل" اور "پیر کامل" بہت زبردست تحریریں تھیں۔ نگہت عبداللہ کا "ہمیں ساتھ ہے بوسہ دو" نے مجھے بہت رلایا ہے۔ اس کی ہیروئن کا کردار میری رشتے کی خالہ سے بہت ملتا ہے۔ اب وہ بھی اس دنیا میں نہیں رہیں۔

4۔ ہم تو سرتاپا خامیاں ہیں پھر بھی کچھ تو لکھنا ہوگا۔ ہر ایک پر جلدی اعتبار کر لیتی ہوں اور کسی کی بھی ظاہری خوبی دیکھ کر جلدی متاثر ہو جاتی ہوں بقول گھر والوں کے ضدی ہوں "کتابی" بہت بھی اور یہ کہ حساس بہت ہوں انسان کو اتنا حساس نہیں ہونا چاہیے۔

خوبیاں تلاش کرنا پڑیں گی۔ میں یہ نہیں سوچتی کہ میں کیا چاہتی ہوں بس یہ سوچتی ہوں کہ لوگ مجھ سے جیسی امید لگاتے ہیں وہ کروں۔ اپنی خوشیاں سب کے ساتھ شیئر کرتی ہوں لیکن اپنے غم اور پریشانی میں کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرتی۔ سادیہ کہتی ہے تم بہت اچھی ہو تم لوگوں کو جلدی معاف کر دیتی ہو۔

5۔ ساون کے اچھا نہیں لگتا۔ ویسے مجھے سردیوں کی بارش بہت پسند ہے۔ دسمبر کی بارش ہو ہاتھ میں چائے کا بھاپ اڑاتا کپ ہو اور ہم چھت پر بارش میں بھیگ رہے ہوں اس سے اچھا موسم ہو سکتا ہے؟ ساون کا کوئی یادگار قصہ تو نہیں لیکن ایک شام بارش مجھے بیک وقت اچھی بھی لگی تھی اور بری بھی اب ہر بارش میں وہ دن یاد آ جاتا ہے۔

ایک چھوٹی سی پسندیدہ نظم لکھ رہی ہوں۔

کس قدر دشوار ہے
اپنے آپ سے جھوٹ بولنا
اور یہ منوانا کہ
یہ جھوٹ ہی سچ ہے
جب میں اس میں کامیاب ہوتی
تو پتا چلا اس وقت تک
میں اندر سے ٹوٹ کر
بکھر چکی تھی

غزل قمر
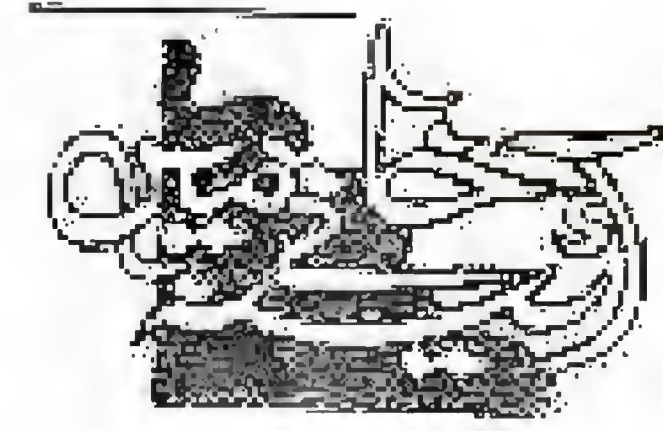
دھمکی

اداکار جاوید شیخ ہر جگہ معروف فنکارہ ثناء کی مالا جپتے نظر آتے تھے۔ پھر اچانک ان دونوں کے درمیان کیا ہوا کہ ثناء نے فخر امام نامی نوجوان کو جیون ساتھی چن لیا۔ اس بات کو انہوں نے اتنا دل پر لیا کہ اب ہر جگہ ثناء کو کوستے نظر آتے ہیں جس پر ثناء ہی نہیں ان کے منگیتر فخر امام بھی خاصے چراغ پا ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ

"اگر جاوید شیخ میں ہمت ہے تو پیچھے پیچھے باتیں کرنے کے بجائے میرے سامنے یہ باتیں کہیں۔ انہیں یہ کہنے سے پہلے اتنا تو سوچنا چاہیے کہ ثناء ایک عزت دار گھرانے کی بہو بننے جا رہی ہے۔ (عزت دار گھرانہ تو آپ کے انتخاب سے ظاہر ہے۔) اگر ان کے دل میں ثناء کے لیے کچھ تھا تو وہ اتنے عرصے چپ کیوں رہے؟ اب جبکہ ہم نئی زندگی شروع کرنے والے ہیں تو انہیں دل کے دورے پڑنے لگے (اب یہ تو ثناء کو ہی پتا ہوگا کہ انہوں نے جاوید شیخ کو کیا یقین دلایا تھا) اگر جاوید شیخ اپنی عزت چاہتے ہیں تو دوسروں کی عزت کرنا سیکھیں۔ (پھر وہی عزت کی بات؟) آخر وہ خود بھی بیٹی والے ہیں۔ اپنے سے زیادہ اب بیٹی کی شادی کی فکر کریں اور جہاں تک میرے روزگار کا تعلق ہے تو لاہور میں بننے والے فائیو اسٹار ہوٹل کا مالک ہوں اور یہ جو ان کا خیال ہے (وہ آپ کا نام) جاوید شیخ کی طرح میں ہوائی قلعے نہیں بناتا اور نہ ہی کسی کو اپنی ذاتی زندگی بگاڑنے کی اجازت دوں گا۔" (فخر امام! آپ تو خاصے باہمت لگتے ہیں۔ اگر آپ اچھے کاموں سے "نام" کمائیں تو زیادہ بہتر ہو۔)

ادھوری

اداکارہ مشی خان کو ادھورے کام کرنے کی عادت ہے چاہے اداکاری ہو یا گلوکاری ہر فیلڈ میں وہ کچھ عرصے بعد منظر سے غائب ہو جاتی ہیں۔ شاید اسی وجہ سے ابھی تک وہ کہیں بھی کوئی خاص مقام حاصل نہیں کر پائیں۔ گزشتہ دنوں وہ یہ کہتی نظر آئیں کہ "اپنی حد سے بڑھی مصروفیات کے باعث میں موسیقی کو بالکل توجہ نہیں دے پائی۔ میری البم اسی وجہ سے ادھوری پڑی ہے۔ جیسے ہی مجھے موقع ملا اسے مکمل کروں گی۔" (مشی جی! اگر آپ اپنے سابقہ ادھورے کاموں پر نظر ڈالیں تو فہرست خاصی طویل ہے۔ اس کے لیے مکمل توجہ اور لگن کی ضرورت ہے جو کم از کم آپ میں نہیں۔ کوشش کریں کہ پہلے آپ صرف اچھی اداکارہ بن جائیں۔ کہیں ہنس کی چال چلتے چلتے آپ اپنی چال بھی بھول جائیں۔)

مستقل مزاجی

کہتے ہیں کہ قابلیت اور صلاحیت اپنا آپ منوا کر رہتی ہے چاہے اس کے لیے کتنے ہی پاپڑ بیلنا پڑیں۔ ایسا ہی کچھ ابھرتے ہوئے کھلاڑی مصباح الحق کے ساتھ ہوا۔ جو ٹوئنٹی ٹوئنٹی کپ کے بعد ایسا چھائے کہ اب ان کی حیثیت لازم و ملزوم ہو چکی ہے۔ اپنی سابقہ کارکردگی کے حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ "بہر سال ڈومیسٹک کرکٹ میں بہترین کارکردگی کے باوجود میں ٹیم میں جگہ نہ حاصل کر پایا۔ یہ ایسا مشکل دور تھا جس میں مجھے صرف اپنی ہمت اور حوصلے سے کام لینا پڑا۔ میں نے ان ناانصافیوں کے باوجود ہمت نہیں ہاری اور اللہ پر کامل یقین رکھا کہ اگر اس نے عزت دینا چاہی تو کوئی مجھ سے چھین نہ سکے گا۔ اللہ تعالیٰ نے کرم کیا اور ٹوئنٹی ٹوئنٹی کپ نے میرے کیریئر کا رخ تبدیل کر دیا۔ (اسے کہتے ہیں قسمت اور ہمت کا دھنی) اگر ایسا نہ ہوتا تو جنوبی افریقہ کا یہ ٹور میرے کیریئر کا اختتام ثابت ہوتا۔ کوئی چیز میرے حق میں نہ تھی اور اسی چیز کو میں نے چیلنج سمجھ کر قبول کیا۔ اگرچہ میرے کیریئر کے چند قیمتی سال ضائع ہوئے تاہم مجھے ہر میچ میں سو فیصد کارکردگی پیش کرنے میں لطف آتا ہے۔" (شاید یہی مستقل مزاجی آپ کی کامیابی کی دلیل ہے۔)

دھماکہ

بعض اداکاروں کو دھماکے کرنے کی عادت سی ہوتی ہے۔ اب گلوکارہ کم اداکارہ سلمیٰ آغا کو ہی لیں جو جب بھی خبروں میں آئیں کچھ نیا ہی کیا۔ ان دنوں وہ ٹی وی پر دوبارہ نظر آ رہی ہیں جسے ان کی نو عمر بیٹی کی پروموشن سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ لیکن حقیقت اس سے کچھ مختلف ہے۔ وہ ایک بار پھر فلمی دنیا میں داخل ہونے کے لیے پر تول رہی ہیں اور اس مرتبہ بھی یہ آفر انہیں پڑوسی ملک سے موصول ہوئی ہے۔ جسے انہوں نے قبول تو کر لیا ہے۔ تاہم اس کے لیے شرط یہ رکھی ہے کہ وہ بھارت جا کر خود کہانی کا جائزہ لیں گی۔ پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی بھارت کے مشہور ہدایت کار ودھو ونود چوپڑا آفر کی جانب سے کی گئی ہے جو اس سے قبل اپنی فلم "نکاح" میں انہیں بطور ہیروئن متعارف کروا چکے ہیں۔ (ممکن ہے پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی وہ کچھ مختلف کر جائیں۔ ہوتے کو کیا نہیں ہوتا۔)
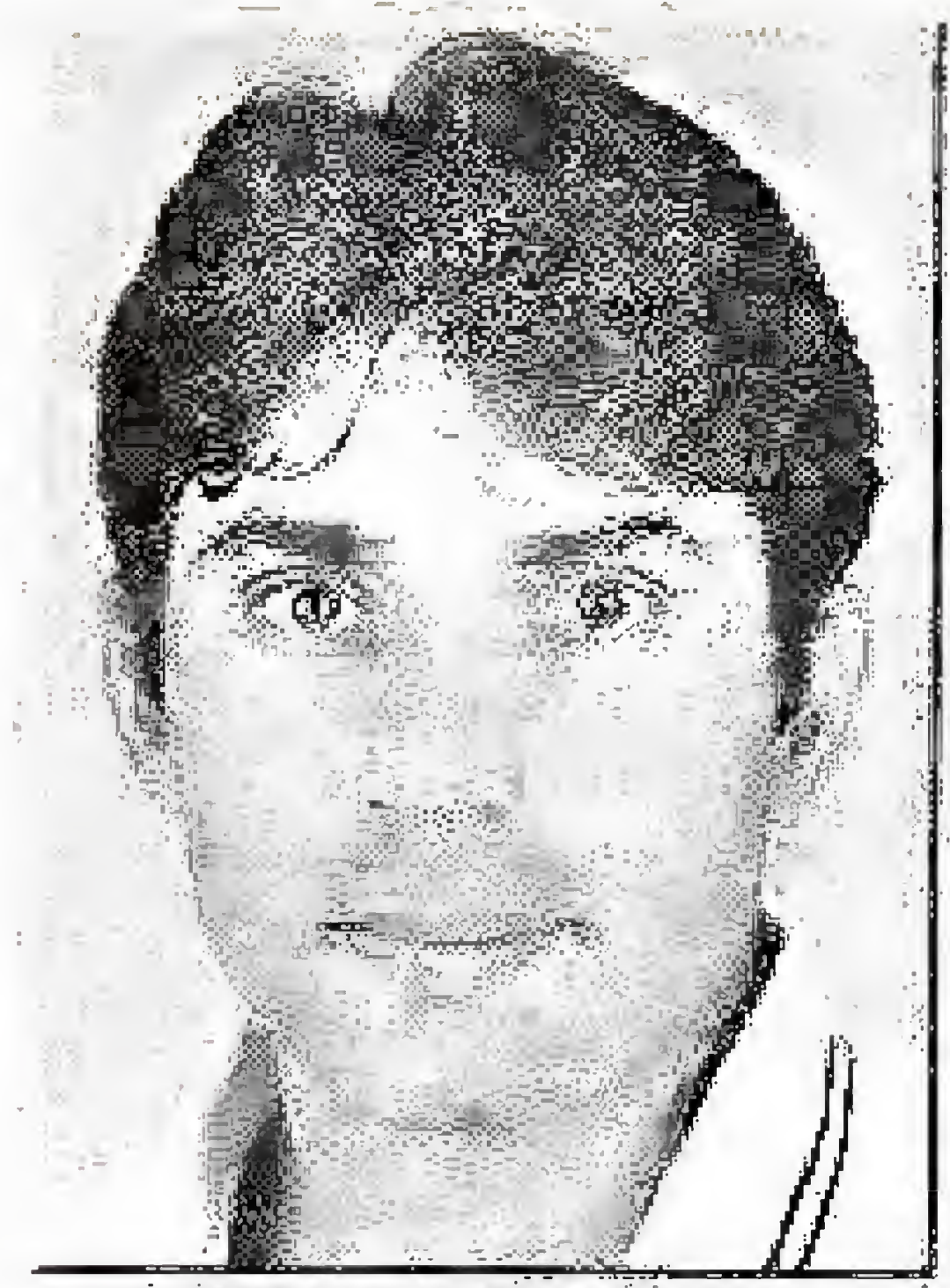
شوقین مزاج

انسان کے بھی کیا کیا شوق ہوتے ہیں۔ بات اگر شوبز کے فنکاروں کی ہو تو یہ ستارے دلچسپی کچھ زیادہ ہی لیتے ہیں۔ اب ہالی وڈ اسٹار نکولس کیج کو ہی لیں جنہیں پرانی ہڈیاں جمع کرنے کا شوق ہے حال ہی میں انہوں نے 67 ملین سال پرانا ٹائرانا سور نامی مخلوق کا ڈھانچہ خریدا ہے جس کی مالیت دو لاکھ 74 ہزار ڈالرز

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

کہتے ہیں کھانے پینے کا مزہ تو سردی کے موسم میں ہی آتا ہے۔ جو بھی کھاؤ ہضم ہو جاتا ہے اور بھوک بھی خوب کھل کر لگتی ہے گرما گرم سوپ کے ذائقے موسم کا لطف دوبالا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ خصوصاً رات کے کھانے سے قبل انہیں اہتمام سے پیش کیا جاتا ہے جو خوان کی رونق میں اضافہ کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ اس مرتبہ ہمارا دسترخوان سوپ کے مختلف ذائقوں سے سجا ہے۔ بنائیے اور داد وصول کیجیے۔

بیف اینڈ نوڈلز سوپ

ضروری اجزاء:

یخنی — دو پیالی
گوشت — ایک پاؤ
پیاز (چوپ کرلیں) — ایک عدد
سویا ساس — کھانے کے تین چمچے
سیاہ مرچ پاؤڈر — چائے کا ایک چمچ
نمک — حسب ذائقہ
چلی ساس — کھانے کا ایک چمچ
میکرونی (ابلی ہوئی) — ایک چوتھائی پیالی
کارن فلور پیسٹ — آدھی پیالی
انڈا — ایک عدد (پھینٹ لیں)

ترکیب:

گوشت میں نمک اور پانی ڈال کر اچھی طرح ابال لیں پانی اتنا ڈالیں کہ گوشت گلنے کے بعد باقی بچ جانے والی یخنی میں سوپ تیار ہو سکے۔ اس کے بعد ابلا ہوا گوشت نکال کر ریشے کرلیں۔ ایک دیگچی میں یخنی ڈال کر گرم کریں۔ اس میں پیاز، گوشت، میکرونی، سویا ساس، سیاہ مرچ پاؤڈر ڈال کر اچھی طرح ملائیں آخر میں انڈا، کارن فلور ڈال کر چمچہ چلائیں۔ گاڑھا ہونے

تک ہلکی آنچ پر پکائیں۔ مزیدار بیف اینڈ نوڈلز سوپ تیار ہے۔ سوپ باؤل میں نکال لیں اور چلی ساس کے ساتھ گرما گرم سرو کریں۔

چکن کارن سوپ

ضروری اجزاء:

مرغی (بون لیس ٹکڑیاں کر کے ریشے کرلیں) — ایک پاؤ
مرغی کی ہڈیاں — تین چوتھائی پیالی
نمک — حسب ذائقہ
مکئی کے دانے — آدھی پیالی
چینی — چائے کے دو چمچے
چائنیز نمک — چائے کے دو چمچے
سفید مرچ پاؤڈر — چائے کا ایک چوتھائی چمچ
کارن فلور — کھانے کا ایک چمچ
(کھانے کے دو چمچے پانی شامل کر کے آمیزہ بنا لیں)
انڈے — دو عدد
لیموں کا رس — کھانے کا ایک چمچ
سرکہ — کھانے کا ایک چمچ

ترکیب:

یخنی تیار کرنے کے لیے ایک بڑی دیگچی میں چھ لیٹر پانی ڈالیں اس میں مرغی کی ہڈیاں ڈال کر چار سے پانچ گھنٹے کے لیے پکائیں۔ پھر یخنی کو چھان لیں یخنی کو ایک دیگچی میں ڈال کر اس میں مکئی کے دانے، چینی، نمک، چائنیز نمک اور سفید مرچ پاؤڈر ڈال کر پکائیں۔ پندرہ منٹ کے بعد لیموں کا رس اور سرکہ ڈال کر پانچ منٹ تک پکائیں پھر کارن فلور کا آمیزہ ڈال کر اچھی طرح مکس کرلیں۔ ایک ابال آجائے تو انڈے پھینٹ کر ڈال دیں پانچ منٹ کے بعد مرغی کے ریشے شامل کر دیں۔ تھوڑی دیر پکنے دیں اور پھر چولہا بند کر دیں۔ چلی ساس ڈال کر گرما گرم سرو کریں۔

اسپائسی ویجی ٹیمپل سوپ

ضروری اشیاء:

اندر بارش کا دیوتا ہے۔ یہ بعد میں ان میدانی علاقوں میں پیدا ہوا، جہاں بارش کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے۔ ڈبلیو برانڈن اسٹائن نے لسانی معلومات کے ذریعے "ووروس" کے بارے میں کہا ہے کہ یہ لوگ کسی ایسے علاقے میں رہتے تھے، جہاں جنگلات تو نہیں تھے لیکن درختوں کے جھنڈ ضرور تھے۔ ان درختوں میں شاہ بلوط، بید، برچ اور کچھ کوندار اور پھلیلے درخت شامل ہیں۔ یہ پھل دار نہیں تھے۔

پالتو جانوروں میں یہ گھوڑے سے واقف تھے۔ کچھ پرندوں کا بھی علم تھا لیکن آبی جانوروں یعنی مچھلی وغیرہ سے واقف نہ تھے۔

جدید آریائی زبانوں میں جن علاقوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس میں ہندوکش، پامیر، کرغیز کے شمالی علاقے شامل ہیں۔ گویا آریائی اجداد جہاں رہتے تھے، ان ہی علاقوں میں اس پودے کو تلاش کرنا چاہیے۔ یہ علاقے اونچائی میں سمندر سے سات سے دس ہزار فٹ کے درمیان ہونا چاہیے اور ایسے علاقے ہندوکش اور پامیر کی سطح مرتفع ہی ہو سکتے ہیں اور جب ہم ان علاقوں میں ڈھونڈتے ہیں تو ہمیں واقعی ایک ایسا پودا مل جاتا ہے جو نہ صرف سوما کی نشانیوں پر پورا اترتا ہے بلکہ اس کا نام بھی سمیانی (SUMYANI) ہے۔

یہ پودا کالام سے اوپر "ماہوڈنڈ" کے آس پاس ملا۔ سوات کے لوگ اس کی راکھ سے نسوار بناتے ہیں۔ اس پودے میں پتے نہیں ہوتے۔ یہ جھاڑ نما تیلی ہے اور پتوں کی جگہ چھوٹی چھوٹی ڈالی اور دار شاخیں ہوتی ہیں۔ توڑنے پر اس سے ایک زرد رنگ کا رس نکلتا ہے جو انتہائی کڑوا ہوتا ہے اور یہ بہت کم پایا جاتا ہے کیونکہ نسوار کے لیے بہت بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا ہے اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بیج دار نہیں ہے۔ ایک ہی جڑ سے پھوٹتا رہتا ہے اور سدا بہار ہوتا ہے۔

ممکن ہے آگے چترال، قراقرم، پامیر اور وسطی ایشیا میں یہ پودا موجود ہو۔ میرے خیال میں سوما کا پودا یہی سمیانی ہے جسے آریاؤں کے اجداد پہچانتے اور استعمال کرتے تھے لیکن مختلف گروہوں کی صورت میں نقل مکانی کے بعد آریائی گروپ اس کی پہچان کھو بیٹھے اور مذہبی روایات، گیتوں اور کہانیوں میں اس کا ذکر باقی رہ گیا۔

(نادیہ اداس، ڈیرہ اسماعیل خان)

فاروق اعظم کا عدل

حضرت عمر فاروقؓ کے صاحبزادے ابو شحمہ جن کا نام عبدالرحمٰن تھا، مصر میں انہوں نے ایک روز ابو سروعہ کے ساتھ نبیذ پی (یعنی کھجور کا شربت، نبیذ حلال ہے اور اس کے استعمال کا عام رواج تھا۔ نبیذ اگر دھوپ میں رہ جائے یا گرمی کی شدت بڑھ جائے تو اس میں تخمیر پیدا ہو جاتی ہے جس سے ہلکا سا نشہ ہو جاتا ہے) ان پر نشہ طاری ہو گیا۔ وہ دونوں حضرت عمرو بن عاصؓ کے پاس پہنچے کہ وہ ان پر حد جاری کریں۔ ابن عاصؓ کہتے ہیں کہ میں نے انہیں جھڑک کر نکال دیا۔ اس پر عبدالرحمٰن بولے۔

"اگر آپ نے حد جاری نہ کی تو میں ناراض ہوں گے اور جب ان سے آپ کی شکایت کروں گا۔"

حضرت عمرو بن عاصؓ کہتے ہیں کہ میں جانتا تھا کہ اگر ان دونوں پر حد جاری نہ کی تو عمر فاروقؓ ناراض ہوں گے۔ میں انہیں گھر کے صحن میں لے آیا اور ان پر حد لگائی۔ عبدالرحمٰن بن عمرؓ گھر کی کوٹھڑی میں گھس گئے اور اپنا سر مونڈا۔ خدا کی قسم ابھی تک اس واقعے کے متعلق عمر فاروقؓ کو ایک حرف بھی نہیں لکھا تھا یہاں تک کہ ان کا یہ خط مجھے ملا۔

اللہ کے بندے عمرؓ کی طرف سے عمرو بن عاص کے نام

ابن عاص! تمہاری جرأت اور بد عہدی پر مجھے حیرت ہوتی ہے اور میں تمہیں معزول کر کے چھوڑوں گا۔ تم نے عبدالرحمٰن کو اپنے گھر میں حد لگائی اور وہیں اس کا سر مونڈا۔ حالانکہ تم جانتے تھے کہ یہ کام میری مرضی کے خلاف کر رہے ہو۔ عبدالرحمٰن تمہاری رعایا کا ایک فرد ہے۔ تمہیں اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کرنا چاہیے تھا جو تم دوسرے مسلمانوں کے ساتھ کرتے ہو لیکن تم نے سوچا کہ وہ امیر المومنین کا بیٹا ہے۔ حالانکہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میرے نزدیک کسی شخص سے حق وصول کرنے میں نرمی و رعایت کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ جس وقت میرا یہ خط تمہارے پاس پہنچے، اس وقت اسے ایک اونی عبا پہناؤ اور کاٹھی پر بٹھا کر خود میرے پاس بھجواؤ، تاکہ وہ خود کو اپنی کرتوت کی حقیقت سے آگاہ ہو جائے۔"

ابن عاصؓ کہتے ہیں۔ "جیسا کہ حضرت عمر فاروقؓ نے کہا تھا، میں نے ویسے ہی انہیں بھیج دیا اور معذرت نامہ لکھا۔

"میں نے اپنے گھر کے صحن میں انہیں حد لگائی اور خدا کی قسم اس سے بڑی کوئی قسم نہیں۔ میں ذمی اور مسلمانوں کو اپنے گھر میں ہی حد لگاتا ہوں۔"

اور یہ خط عبدالرحمٰن بن عمرؓ کے ہاتھ روانہ کر دیا۔ عبدالرحمٰنؓ اپنے والد کے پاس پہنچے تو اونی عبا ان کے جسم پر تھی۔ تکلیف کی وجہ سے چل بھی نہ سکتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے پوچھا۔

"عبدالرحمٰن! تم نے یہ حرکت کی ہے؟"

عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ان کی سفارش کی اور کہا۔

"امیر المومنین! ان پر حد لگائی جا چکی ہے۔"

لیکن حضرت عمر فاروقؓ نے ان کی بات پر دھیان نہ دیا اور عبدالرحمٰن بن عمرؓ چلانے لگے۔

"میں بیمار ہوں، آپ مجھے مار رہے ہیں۔"

روایت ہے کہ اس کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے ان پر دوبارہ حد لگائی۔

(کلثوم شاہین، فتح جنگ)

چناب رنگ

جھنگ کی سرزمین حسن و عشق، انوار و معرفت اور لوک کہانیوں کا ایک تاریخی گہوارہ ہے۔ جھنگ اور ملتان کے پہلے مقامی حکمران ملک کبیر خان نے رضیہ سلطانہ کو تخت دہلی پر بٹھانے میں اہم کردار ادا کیا۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے بھی جھنگ کی سرزمین کو اپنے بابرکت قدموں سے نوازا۔ وہ نواب سعد اللہ خان کے دوست تھے اور ان کی معیت میں ایک ہفتہ چنیوٹ میں قیام فرمایا۔ نواب سعد اللہ خان بعد میں شاہجہان کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ حضرت سلطان باہوؒ کی "ہو" کی گونج نے اس سرزمین کو شاد اور آباد کیا۔ عشق حقیقی کی داستان والی "ہیر" بھی جھنگ کے ایک گاؤں میں چوچک سیال کے ہاں پیدا ہوئی جو ایک معمولی زمیندار اور عمر رسیدہ شخص تھا۔ یہ اولاد حضرت شیر شاہ جلال سرخ بخاری کی دعا سے نصیب ہوئی تھی جن کا مدفن اچ بہاولپور میں ہے۔ بچی کا نام عزت بی بی رکھا گیا لیکن اپنی عبادت گزاری، ریاضت اور زہد و تقویٰ کے باعث عوام الناس پیار سے "ہیر" کے لقب سے پکارنے لگے۔ اس کے ایک مرید اور خلیفہ کا نام مراد بخش تھا جس کی ذات رانجھا تھی۔ عشق حقیقی کے یہ دونوں پرستار بھی جھنگ شہر میں ایک ہی قبر میں آسودہ ہیں۔

وارث شاہؒ کے روحانی شاہکار ہیر رانجھا کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ وارث شاہ خود بھاگ بھری نامی ایک عورت کی محبت میں گرفتار تھا جب ان کے عشق کا راز فاش ہوا تو گھر والوں نے بھاگ بھری کی شادی کہیں اور کر دی اور صاحب حیثیت ہونے کی وجہ سے وہ لوگ بھی ہاتھ دھو کر غریب وارث شاہ کے پیچھے پڑ گئے۔ محبت کی ناکامی کے غم میں ڈوب کر موزوں طبیعت والے نامراد عاشق نے اپنا یہ شاہکار تصنیف کیا جس میں اپنے وقت کی ایک عارفہ اور پاکباز خاتون بھی ان کے قلم کی زد میں آکر عشق مجازی کا ایک لازوال کردار بن گئی۔

(شہاب نامہ، قدرت اللہ شہاب)

رابعہ رشید، جھنگ

ادارہ

خوبصورت بنیے
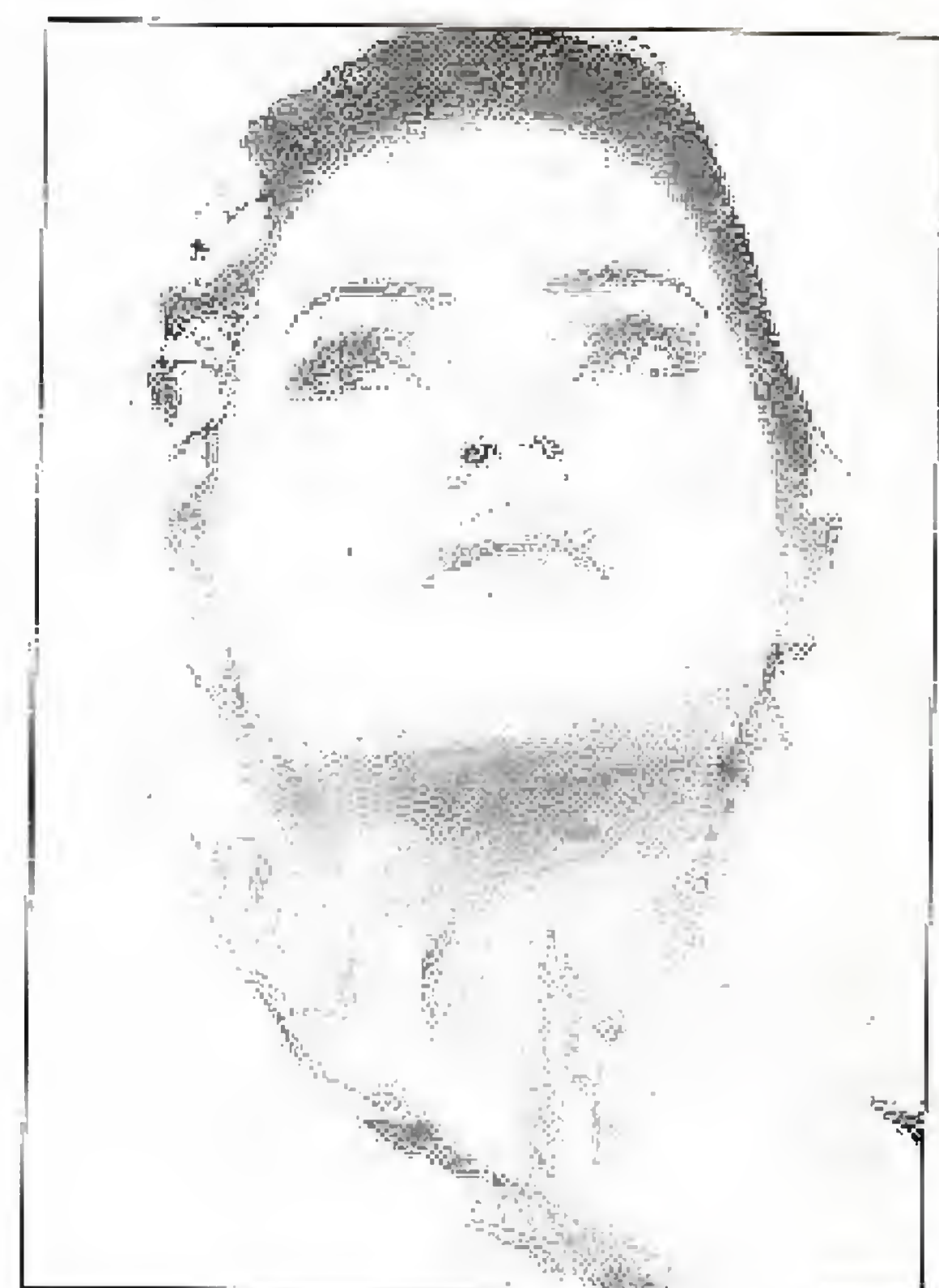
موسم سرما اور آپ کی جلد

سرد موسم کا آغاز ہو گیا ہے ہر موسم کا اپنا مزا ہوتا ہے لیکن یہ موسم جلد کے لیے بہت سی مشکلات لے کر آتا ہے اس لیے اس موسم میں جلد کی بہتر حفاظت کرنی چاہیے۔ ہماری جلد اس بدلتے ہوئے موسم کے لیے انتہائی حساس ہے اور فوری طور پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتی ہے۔ کبھی اس پر خارش ہونے لگتی ہے۔ کبھی خشک ہو جاتی ہے۔ کبھی پھٹنے لگتی ہے اور کبھی سوجن آجاتی ہے۔ ان جلدی بیماریوں کی تکلیف میں سرد موسم میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

سرد موسم میں جلد کو نمی کی ضرورت عام دنوں سے زیادہ ہے۔ اس موسم میں درجہ حرارت اور ہوا کی رطوبت دونوں میں ہی کمی واقع ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہماری جلد خشک ہونے لگتی ہے۔ حساس جلد والے لوگ تو اس موسم میں بہت پریشان ہو جاتے ہیں۔ ان کی جلد نہ صرف خشک ہو جاتی ہے بلکہ ہاتھوں کی کھال اترنے لگتی ہے۔ پانی لگنے سے چلن محسوس ہوتی ہے۔ ہونٹ اور ایڑیاں الگ پھٹنے لگتی ہیں۔ ہاتھوں کی انگلیاں سوج جاتی ہیں۔ ہاتھوں کی کھال اترنے سے بعض اوقات خون تک نکل آتا ہے۔

کسی بھی چکنی کریم یا لوشن سے جلد کو نرم کیا جا سکتا ہے۔ یہ عرف عام میں موئسچرائزر کہلاتے ہیں عموماً ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم بازار میں دستیاب مروجہ پروڈکٹ استعمال کر لیتے ہیں لیکن کام کے نام ہیں [illegible] جلد کے حساب سے یہ کریمیں لی جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔

ایگزیما.... یہ بیماری خشک جلد پر زیادہ اثر کرتی ہے۔ جلد کے پھٹنے کی یہ بیماری تاحیات رہتی ہے۔ جلد میں رطوبت کی مقدار کم ہو جاتی ہے اور سردی کے ساتھ ہی اس بیماری میں اضافہ ہو جاتا ہے پچاس سے ساٹھ سال کی عمر کے درمیان ذرا سی بھی خشکی یا ٹھنڈک ایگزیما پیدا کر دیتی ہے جو ٹانگوں، ہاتھوں، بازوؤں میں زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ زیادہ شدت سے ہاتھوں سے خون بھی جاری ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر کے مشورے سے کریم یا لوشن استعمال کریں۔ اونی کپڑے پہننا اس موسم میں مجبوری ہے اور اس مرض میں مبتلا افراد اونی لباس کی وجہ سے مزید بے حال ہو جاتے ہیں اس سے محفوظ رہنے کے لیے کوشش کریں کہ زیادہ تر کاٹن کا

لباس پہنیں، [illegible] کاٹن کے ہوں۔ صابن اور ڈٹرجنٹ سے بچیں۔ برتن وغیرہ دھوتے وقت دستانے استعمال کریں۔ غسل کے وقت پہلے باتھ آئل لگا لیں۔ غسل کے فوراً بعد جسم خشک کر کے لوشن لگائیں۔
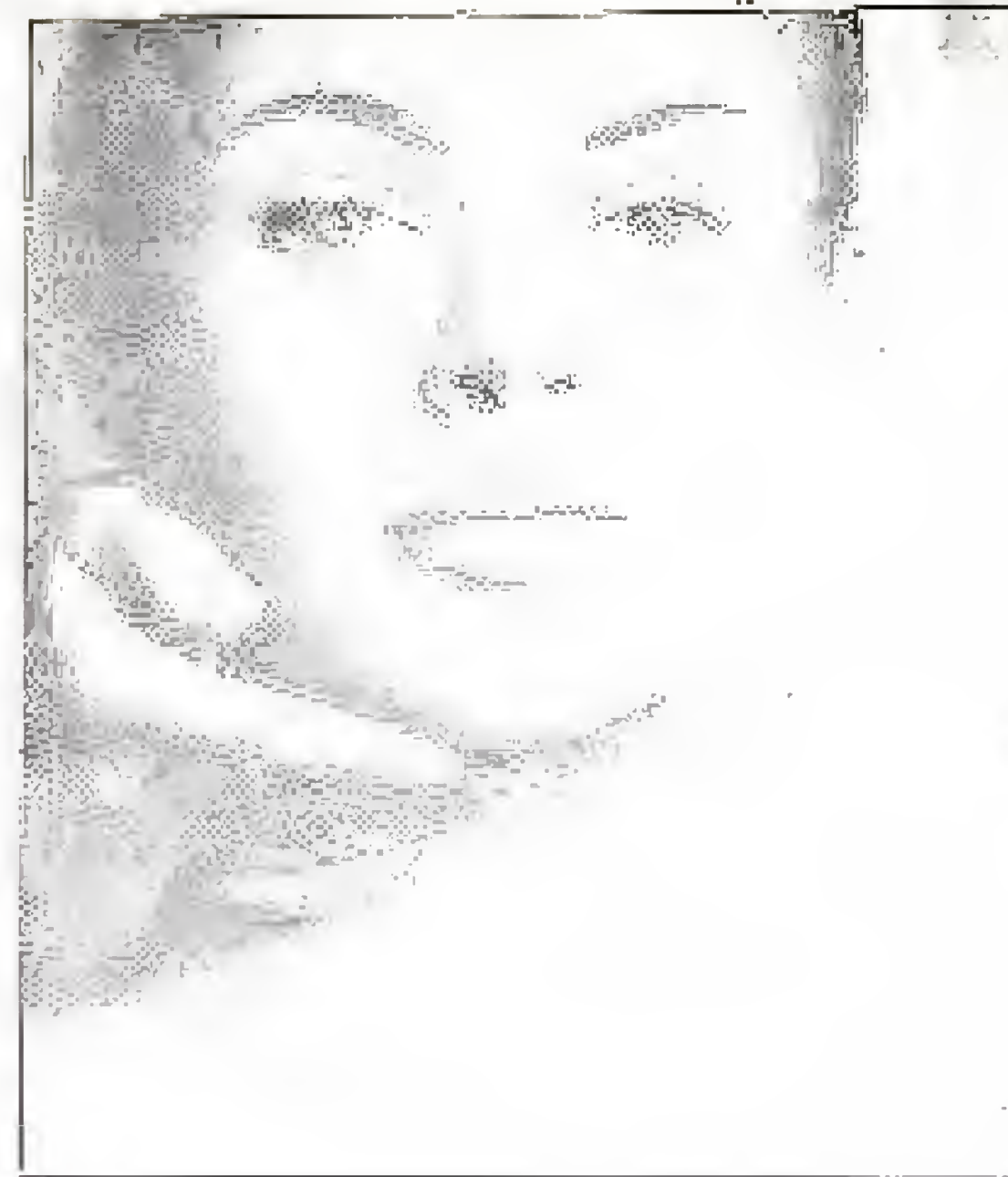
جوڑوں کا درد.... یہ مرض بھی سردیوں میں شدت اختیار کر لیتا ہے۔ یوں تو یہ مرض بڑی عمر کے لوگوں کو ہوتا ہے لیکن موجودہ دور میں اب کم عمر افراد بھی اس کا شکار ہو رہے ہیں۔ عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ مرض بھی بڑھتا جاتا ہے۔ سردیوں میں جوڑوں میں درد تو ہوتا ہی ہے ساتھ ساتھ ورم بھی آجاتا ہے جو کہ تکلیف دہ ہے۔ آپ اپنے ڈاکٹر سے پہلے ہی مشورہ کر لیں کہ جو دوا آپ استعمال کر رہے ہیں۔ وہ صحیح ہے یا سردیوں میں مزید کوئی دوا استعمال کرنا ہو گی۔ ایسا ہے تو یہ تمام دوائیاں سامنے رکھیں۔ اگر آپ گولیاں کھا رہے ہیں تو نیم گرم پانی یا دودھ کے ساتھ استعمال کریں۔ سوجن اور درد کم کرنے کے لیے متاثرہ جگہ پر "روغن زیتون" کی مالش کریں۔ اپنے قریب [illegible] تیل والی چیزیں، بازاری اشیاء سے مکمل پرہیز کریں۔ لہسن، ادرک، کریلا، مرغ کی ٹانگ کا نچلا حصہ زیادہ استعمال کریں۔ مریض آرام ضرور کرے لیکن متاثرہ جوڑوں کو حرکت دیتا رہے اور کوئی ہلکی پھلکی ورزش مستقل اپنا لے۔

غسل کے فوراً بعد خشکی.... یوں تو یہ کوئی مرض نہیں ہے لیکن سردیوں سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ یہ ایک بڑا مسئلہ ہے اس لیے اس کا ذکر بھی یہاں کرنا ضروری ہے۔ زیادہ گرم پانی اور صابن اس کا باعث بنتے ہیں اس لیے ان کا استعمال کم سے کم کرنا چاہیے۔ جاڑوں کے موسم میں ایسے صابن استعمال کریں جن میں گلیسرین یا چکنائی کی مقدار زیادہ ہو 'موئسچرائزر' کے علاوہ باتھ آئل بھی بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔ باتھ آئل دو ملی لیٹر کی مقدار میں پانی میں ملا کر اچھی طرح سے حل کریں پھر اس سے غسل کریں۔ یا پانی میں آئل شامل کریں اور اگر باتھ آئل دستیاب نہ ہو سکے تو عام تیل بھی اس مسئلے کا حل بن سکتے ہیں ان کا استعمال آپ غسل سے قبل اور بعد میں کر سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ناریل کا تیل، بادام کا تیل اور زیتون کا تیل بہت مفید ہے۔

ہونٹوں کا پھٹنا.... یہ مسئلہ بھی سردیوں کے موسم کی ابتدا سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ نرم و نازک ہونے کی وجہ سے ہونٹ حساس ہوتے ہیں۔ سردی سے متاثر ہو کر خشک ہو جاتے ہیں اور پھٹنے لگتے ہیں بعض اوقات ان سے خون رسنے لگتا ہے۔ درد الگ ہوتا ہے اور کھانے پینے میں دشواری ہوتی ہے وہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ ایسے میں سیب کے بیج فائدہ مند ہیں سیب کے بیج باریک پیس لیں۔ رات کو ان کا گاڑھا لیپ ہونٹوں پر لگائیں۔ صبح دھو کر بالائی لگا لیں۔ تین دن میں ہونٹ صحیح ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ دودھ کی بالائی میں لیموں کا رس چند قطرے ملا کر لگائیں ہونٹ نہ صرف نرم ہوں گے بلکہ ان کی رنگت بھی

نکھر آتی ہے۔ اس کے علاوہ شہد میں زیتون کا تیل شامل کر کے لگائیں۔ روغن بادام اور شہد ملا کر روزانہ لگائیں۔ پیٹرولیم جیلی کا باقاعدہ استعمال کریں۔ روغن بادام ہونٹوں کے لیے بہترین ہے۔ اپنی غذا میں گریپ فروٹ، سنگترہ اور مالٹا شامل کریں۔

بالوں کا مسئلہ۔۔۔ سرما کی ٹھنڈی ہوائیں بالوں کو خشک کر دیتی ہیں۔ بالوں کو نرم اور چمک دار رکھنے کے لیے زیتون یا روغن بادام کو نیم گرم کر کے انگلی کی پوروں سے بالوں کی جڑوں میں لگائیں اور گول گول دائرے بناتے ہوئے پوروں کی مدد سے سر پر ہلکی ہلکی مالش کریں۔ اب انڈے کی زردی خوب پھینٹ کر لگائیں گرم پانی میں تولیہ بھگو کر نچوڑ لیں پھر دس سے پندرہ منٹ تک سر پر تولیہ لپیٹ لیں اس کے بعد شیمپو سے سر دھو لیں۔ اس کے علاوہ سرسوں کے تیل میں لیموں کا رس ملا کر غسل سے پہلے سر کی خوب مالش کریں۔ دس سے پندرہ منٹ تک گرم تولیہ سر پر لپیٹ لیں پھر دو سے تین منٹ تک تولیہ کھول کر بالوں کو ہوا لگنے دیں اب نیم گرم پانی سے سر دھو لیں۔ اچھے بالوں کی ساخت کے حساب سے اچھا شیمپو استعمال کریں۔ پانی کبھی بھی تیز گرم نہ استعمال کریں۔

سردی سے آواز کا بیٹھنا۔۔۔ ادرک کا درمیانہ ٹکڑا لیں۔ نوک دار چھری سے سوراخ کریں اور اس میں نمک بھر دیں۔ ادرک کے ٹکڑے سے سوراخ بند کر لیں۔ تھوڑا سا گندھا ہوا آٹا ادرک کے چاروں طرف لگائیں اور چولہے میں دبا دیں۔ آٹا پک جائے تو نکال کر الگ کر دیں۔ ادرک تھوڑی تھوڑی سی لے کر چباتی رہیں۔ آواز ٹھیک ہو جائے گی۔

اس کے علاوہ سات بادام کی گریاں اور سات کالی مرچیں لے کر تھوڑے سے پانی میں چٹنی کی طرح پیس لیں۔ ایک چمچ چینی ملا کر چاٹ لیں۔ نیم گرم پانی میں نمک ملا کر صبح و شام غرارے کریں۔ کھٹی اور ٹھنڈی چیزوں سے مکمل پرہیز کریں۔

سردی سے انگلیاں سوج جائیں تو۔۔۔ آٹا چھان کر جو بھوسی نکلے اس میں نمک ملائیں۔ پانی میں جوش دے کر نیم گرم پانی کر کے اس میں ہاتھ بھگوئیے۔ ہاتھ دھو کر کریم لگائیں۔ شلجم کے ابالے ہوئے پانی سے بھی ہاتھ ٹھیک ہو جاتے ہیں۔

ہاتھ پیروں کی حفاظت۔۔۔ باقاعدگی سے پیٹرولیم جیلی لگائیں۔ پانی کا کام دستانے پہن کر کریں۔ ایک گلاس گلاب کے عرق میں دو بڑے چمچے گلیسرین اور ایک بڑے لیموں کا رس نچوڑ لیں اور بوتل کو شیشی میں بھر لیں۔ رات کو سوتے وقت مل لیں۔ جلد ٹھیک ہو جائے گی۔

اگر پیروں کی جلد خراب ہو رہی ہے تو دو شلجم لیں۔ چھلکوں سمیت ٹکڑے کر لیں۔ کسی بڑی دیگچی میں پانی بھر کر شلجم ابالیں۔ شلجم گل جائیں تو یہ پانی کسی ٹب میں ڈال کر آدھا چمچ (چھوٹا) نمک ملائیں اور اتنا ہی سرسوں کا تیل۔ اب پانی میں پاؤں ڈال کر بیٹھ جائیں۔ پانی نیم گرم ہو۔ پانی کے ٹھنڈا ہونے پر پاؤں صاف کر کے پیٹرولیم جیلی لگا لیں۔ تین چار راتوں میں پاؤں ٹھیک ہو جائیں گے اگر سوتی موزے دستیاب ہوں تو ضرور پہنیں۔

اس کے علاوہ سردی میں پانی بھی خوب پیا کریں۔ سردی کی وجہ سے پانی نہ چھوڑیں۔ پانی ٹھنڈا ہو تو تھوڑا سا ہی پیا کریں۔ ایسی کریمیں اور لوشن استعمال کریں جن میں چکنائی کا تناسب زیادہ ہو۔